حقیقتِ گمشدہ

میری شیعہ مذہب قبول کرنے کی داستان

شیخ معتصم سیّد احمد سوڈانی

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا
وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ

مجمعِ علمیِ اسلامی

حقیقت گمشدہ

میری شیعہ مذہب قبول کرنے کی داستان

شیخ معتصم سید احمد سوڈانی

مجمع علمی اسلامی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تالیف ..... شیخ مقتدم سید احمد سوڈانی

ترجمہ ..... علامہ محمد حسن جعفری

تطبیق وتہذیب ..... رضا حسین رضوانی

طبع اول ..... اگست ۲۰۰۸ء

انتساب

آل ابی طالبؑ کی شیر دل خاتون

شہزادی زینب سلام اللہ علیہا

کے نام

جو خاندان عصمت و ہدایت

کے فضائل کی وارث،

عالمہ غیر معلّمہ اور پروردۂ ادب و رضا تھیں۔

جنھوں نے منافقوں اور فتنہ گروں کو

بازاروں اور درباروں میں رسوا کیا اور

اپنی قوت قلب سے ظالموں کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا

کہ انسانی عقلیں محو حیرت ہیں۔

نگاہ کرم کا طلبگار

معتصم سید احمد سوڈانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ
وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○

وہ لوگ جو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں
اللہ سے ڈرتے ہیں اور اُس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حساب لینے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔
(سورۂ احزاب: آیت ۳۹)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا نَكَتَ فِيْ قَلْبِهٖ نُكْتَةً بَيْضَاءَ
فَجَالَ الْقَلْبُ يَطْلُبُ الْحَقَّ ثُمَّ هُوَ اِلٰى اَمْرِكُمْ اَسْرَعُ مِنَ الطَّيْرِ اِلٰى وَكْرِهٖ

جب خدا کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اُس کے دل میں ایک سفید نقطہ لگا دیتا ہے پس
وہ دل حق کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ پھر وہ تمہارے عقیدے کی طرف آنے میں گھونسلے کی طرف لوٹنے
والے پرندے سے بھی زیادہ جلدی کرتا ہے۔
(بحار الانوار، ج ۵، ص ۲۰۴)

فہرس

اظہار خیال ۹
پیش لفظ ۱۱
میری زندگی کی یادیں ۱۳
تحقیق کی ابتدا ۱۵
کالج کی لائبریری میں احادیث کی جستجو ۲۰
اپنے گاؤں میں واپسی ۲۴
ایک وہابی شیخ سے مناظرہ ۲۴
محققین کی خدمت میں چند گزارشات ۲۸
پردہ اٹھتا ہے ۳۱
حدیث عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ اور تاریخی واقعات ۳۶
دمشق کے ایک محدث سے مباحثہ ۴۴
خلفائے راشدین سے ائمہ اہل بیتؑ مراد ہیں ۵۱
اہل بیتؑ کے واسطے سے ہی کتاب وسنت سے تمسک ممکن ہے ۵۴
حدیث ثقلین مصادر اہل سنت میں ۵۶
کتب حدیث میں کتاب وعترت کی حدیث ۵۸
حدیث ثقلین پر اعتراضات ۶۵
ابن عبدالقدوس پر ابن جوزی کی جرح کا جواب ۶۸
عبداللہ بن واہر پر ابن جوزی کا اعتراض اور اس کا جواب ۷۰

حدیث ثقلین پر ابن تیمیہ کے اعتراضات ۷۱
حدیث ثقلین امامت اہل بیتؑ پر دلالت کرتی ہے ۷۳
اہل بیتؑ کون ہیں؟ ۷۸
اہل بیتؑ در آیت تطہیر ۷۹
حدیث کساء — عظمت اہل بیتؑ کی داستان ۷۹
ابن کثیر کا اشکال اور اس کا جواب ۸۳
اہل بیتؑ در آیت مباہلہ ۸۵
ولایت علیؑ در قرآن ۸۹
(۱) آیت ولایت ۹۰
(۲) آیت بلّغ آیت ولایت کی تصریح کرتی ہے ۹۸
اسلامی مآخذ میں واقعہ غدیر ۹۹
خطبہ غدیر کا متن ۱۰۲
شوریٰ اور اسلامی خلافت ۱۰۹
آیات شوریٰ کے مفہوم کی تحقیق ۱۰۹
شوریٰ کی عملی واقعیت، شوریٰ اور سقیفہ ۱۱۶
امام علیؑ نے مخالفین سے جنگ کیوں نہیں کی؟ ۱۲۷
صحابہ اور آیت انقلاب ۱۲۸
ایک سوال اور اس کا جواب ۱۳۵
پیغمبر اسلامؐ نے کس کی خلافت کا اعلان کیا تھا؟ ۱۳۰
تحریف حقائق میں مؤرخین کا کردار ۱۳۳
تحریف تاریخ میں حکومتوں کا کردار ۱۳۴
مؤرخین نے تاریخ شیعہ کو کس طرح سے پیش کیا؟ ۱۳۵
سیف بن عمر کے متعلق علماء کی آراء ۱۳۸
تحریف حقائق میں محدثین کا کردار ۱۵۵
عہد معاویہ میں حدیث پر کیا گزری؟ ۱۵۵

محدثین اور حقیقت پوشی ۱۶۴
تحریف حقائق میں مؤلفین کا کردار ۱۶۹
شیعوں کی طرف سے جوابی کتابیں ۱۷۲
سنی علماء اور روشن فکر افراد شیعہ ہو رہے ہیں ۱۷۶
جدید مؤلفین کی تحریفات کے چند نمونے ۱۷۹
شیعوں کے خلاف جہان کی کذب بیانی کے نمونے ۲۰۵
مذاہب اربعہ کا دقیق مطالعہ ۲۰۸
پیر خود نہیں اڑتے مرید اڑاتے ہیں ۲۱۳
مذاہب اربعہ کے بانیوں کے بارے میں ۲۱۶
امام ابوحنیفہ ۲۱۷
فقہ حنفی ۲۱۷
امام ابوحنیفہ پر اعتراضات ۲۲۰
امام ابوحنیفہ اور امام جعفر صادق علیہ السلام ۲۲۲
امام مالک بن انس ۲۲۸
مذہب مالکی کے فروغ کے اسباب ۲۳۳
امام مالک پر چند اشکالات ۲۳۵
امام شافعی ۲۳۷
امام شافعی پر اشکالات ۲۴۱
امام شافعی اور محبت آل محمدؐ ۲۴۲
امام احمد بن حنبل ۲۴۶
امام حنبل کے علمی آثار ۲۴۶
امام حنبل کی آزمائش ۲۴۷
گمنام ہیرو ۲۵۰
امام حنبل متوکل کے عہد میں ۲۵۲
فقہ امام حنبل ۲۵۶
شیعہ فقہ کی طرف اشارہ ۲۶۳

وہابیوں کا مذاہب اربعہ کے علماء سے مناظرہ ۲۶۴
عقائد اہلسنت ۳۱۶
حنبلی (سلفی) کتب ۳۱۷
(۱) امام احمد بن حنبل کا دور ۳۱۷
ضرورت عقل کی روایات ۳۲۰
احادیث تجسیم کے چند نمونے ۳۲۳
حضرت رسول اکرمؐ کا خطبہ ۳۳۵
امام علی رضا علیہ السلام کی حدیث ۳۳۵
امیر المومنین علیہ السلام کا خطبہ ۳۳۷
(۲) ابن تیمیہ کا دور ۳۴۸
(۳) محمد بن عبدالوہاب کا دور ۳۵۵
مسئلہ "توحید ربوبیت" کی تحقیق ۳۶۰
توحید الوہیت کا مفہوم ۳۶۲
مفہوم عبادت کے متعلق ایک وہابی سے مباحثہ ۳۶۳
قرآن میں عبادت کا مفہوم ۳۶۷
توحید و شرک کا فرق ۳۶۹
کیا قادر ہونا یا نہ ہونا توحید و شرک کا معیار بن سکتا ہے؟ ۳۷۲
رسول اکرمؐ کے وسیلے سے نابینا کا بینا ہونا ۳۷۴
اشاعرہ کی تضاد بیانی ۳۷۶
رویت خدا کا عقیدہ ۳۷۶
کلی رویت کے متعلق اہل بیتؑ کی احادیث ۳۸۰
امکان رویت کے متعلق اشاعرہ کے عقلی دلائل کا جائزہ ۳۸۲
اشاعرہ کے قرآنی دلائل کا جائزہ ۳۸۳
رویت کے لیے فخر رازی کے دلائل کا جائزہ ۴۰۰
امام علی رضا علیہ السلام کا خطبہ ۴۰۵

اظہار خیال

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ
وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَسَلَّمْ

اللہ تبارک وتعالیٰ سورہ مبارکہ عنکبوت کی آیت ۶۹ میں ارشاد فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے راستے دکھا دیں گے۔

حق وصداقت کی تلاش کے لیے انسان کو بہت طویل اور کٹھن سفر کرنا پڑتا ہے لیکن اگر جذبہ صادق اور طلب سچی ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کے سفر کو ناکام نہیں ہونے دیتا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے تلاش حق کے لیے طویل سفر کیا تھا جس کے نتیجے میں انھیں اسلام کی دولت نصیب ہوئی تھی اور اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ نے حق کی جستجو کی تھی اور انھیں بھی حق سے آشنائی نصیب ہوئی تھی۔

یوں تو متلاشیان حق کی فہرست بہت طویل ہے لیکن دور حاضر میں اس فہرست میں مندرجہ ذیل اہل قلم دانشوروں کا اضافہ ہوا ہے۔

(۱) ڈاکٹر محمد سادی تیجانی (تیونس)
(۲) جناب صالح الورداني (مصر)
(۳) جناب محمد عبدالحفیظ (مصر)
(۴) جناب ادریس الحسینی (مراکش)
(۵) ڈاکٹر احمد حسین یعقوب (اردن)

(۶) جناب یاسین معیوف البدری (شام)
(۷) جناب شیخ عبداللہ ناصر (کینیا)
(۸) جناب سید عبدالکریم محمد حسن (سوڈان)
(۹) جناب شیخ مقتدم سید احمد (سوڈان)

شیخ مقتدم سید احمد ایک طویل عرصے تک حق کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں بھی کھائیں اور پاؤں میں آبلے بھی پڑے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مذہب اہل بیتؑ کا کوئی تعارف کرانے والا موجود نہیں تھا، انھوں نے خدا کے بھروسے پر بحر انکار کا سفر کیا اور خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور انھیں صراط مستقیم کی ہدایت فرمائی۔

انھوں نے ایک کتاب میں اپنے تشیع کی داستان لکھی اور اُس کا نام الحقیقۃ الضائعۃ رکھا۔ اُن کی عربی کتاب کا جناب سید محمد رضا مہری نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اُس کا نام "حقیقت گمشدہ" رکھا اور علامہ محمد حسن جعفری نے فارسی سے اُردو میں جس خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا ہے وہ قابل داد ہے۔

ادارہ مجمع علمی اسلامی اس کتاب کو اُردو میں شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے اور امید کرتا ہے کہ یہ کتاب مزید متلاشیان حق کے لیے مدد و معاون اور مشعل راہ ثابت ہوگی۔

ناچیز
رضا حسین رضوانی

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جب کسی انسان سے کوئی گراں قیمت موتی گم ہو جائے تو وہ اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور گمشدہ موتی جتنا قیمتی ہوتا ہے اُسے اتنا ہی زیادہ تلاش کیا جاتا ہے۔ انسان کا عقیدہ سب سے قیمتی موتی ہے۔ عقیدہ ہی انسان کو جہنم سے بچا سکتا ہے اور عقیدہ ہی انسان کو جنت میں لے جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ لوگ اس نفیس ترین گمشدہ موتی کو ڈھونڈ ہی نہیں رہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کو اس گنج گراں مایہ کے زیاں کا احساس تک نہیں ہے۔

عقیدے کا قیمتی موتی سینکڑوں ادیان اور عقائد میں کھو چکا ہے۔ اُس کی تلاش کے لیے حوصلہ، لگن، مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ ... مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا یعنی جس کو خدا راہ راست کی ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑ دے تو تم اس کے لیے کوئی رہنما دوست کو نہ پاؤ گے۔ (سورۂ کہف۔ آیت ۱۷)

زیر نظر کتاب میں ایک طالب حق انسان کی داستان بیان کی گئی ہے جس نے گمراہی سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھا تو اُسے حق کا نورانی چہرہ نظر آ گیا۔ اصول دین اور فروع دین پر سیر حاصل تحقیق نے اُس کے سامنے سے گمراہی کا پردہ ہٹا دیا۔ اس طالب حق کو قدم قدم پر غلط تفاسیر، غلط روایات اور غلط تاویلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور تاریکیوں کو چیرتا ہوا نقطۂ امید کی طرف گامزن رہا یہاں تک کہ منزل مقصود تک پہنچ گیا۔

ابتدا میں اُس نے اپنے آبائی عقیدے عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ[1] کو خیرباد کہا اور یوں اپنے اجداد کی پیروی سے بچ گیا اور اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ

1۔ یہ ایک وضعی حدیث ہے۔ اس کے مطابق حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ تم میری سنت پر عمل کرو اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو۔

مُقتدوُن[1] کی فکر سے رہائی پا کر اُس خیمے میں پناہ گزین ہوا جس کا محور رسول خداؐ کی معتبر اور متواتر حدیث اِنّیِ تارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ مَا اِنْ تَمَسَّکتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِیْ اَبَدًا کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ پر قائم تھا۔[2]

جب وہ قرآن اور اہلبیتؑ سے وابستہ ہوا تو اُس کے لیے ہدایت کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ آیت تطہیر، آیت مباہلہ، آیت مودت، حدیث کساء اور حدیث غدیر سے اُسے اتنا سکون اور اطمینان حاصل ہوا کہ اُس کی ساری تھکان کافور ہوگئی اور وہ مؤرخین، محدثین اور مفسرین کے فریب سے بچ گیا۔ اس محقق کا نام شیخ معتصم سید احمد سوڈانی ہے۔ جناب معتصم نے اس کتاب میں اپنی داستان تشیع کی تفصیل بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ وہ کتنی مشکلات جھیل کر اہلبیتؑ کی چوکھٹ عصمت پر پہنچے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ حضرت ولی العصر ارواحنا لہ الفداء میری اس کاوش کو قبول فرمائیں گے۔

سید محمد رضا مہدی

۱۔ قرآن مجید میں کفار کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقے پر پایا اور ہم اُن کے راستے کی پیروی کرنے والے ہیں۔ (سورۂ زخرف، آیت ۲۲)

۲۔ میں تم لوگوں میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت اہل بیتؑ۔

میری زندگی کی یادیں

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں بچپن ہی سے دین کا شیدائی تھا اور میری فطرت نے مجھے دین سے وفاداری کا سبق دیا تھا۔ میں اپنے ننھے سے ذہن میں مستقبل کی جو بھی تصویر کھینچتا وہ دین کے دائرے کے اندر ہی ہوتی۔ میں اپنے آپ کو ایک اسلامی مجاہد اور دینی ہیرو کے روپ میں دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ میری خواہش تھی کہ بڑا ہوکر حرمت دین کا دفاع کروں اور اسلام کو اُس کی کھوئی ہوئی عزت واپس دلاؤں۔ دنیا کے ہر بچے کی طرح میرا ذہن بھی چھوٹا تھا اور مسلمانوں کی تاریخ وتمدن کے متعلق میری معلومات انتہائی کم تھیں۔ مجھے حضرت رسول اکرمؐ کی زندگی کے چند واقعات یاد تھے اور آنحضرتؐ کے چند غزوات کے نام بھی میں نے سن رکھے تھے۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اُن غزوات میں امام علیؑ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

پھر جب میں نے مدرسے میں مہدی سوڈانی کے واقعات سنے اور اُس کے جرنیل عثمان دقنہ کی بہادری کے قصے سنے تو میں نے عثمان دقنہ کو اپنا آئیڈیل بنالیا۔ جب استاد ہمیں فخر سے یہ بات کلاس میں بتاتے کہ عثمان نے پہاڑوں اور وادیوں میں دشمنوں کو کیسے للکارا تھا اور انھیں شکست سے دوچار کیا تھا تو میں بڑی خوشی محسوس کرتا تھا اور اپنے قومی ہیرو پر فخر کرتا تھا اور دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ میں بھی بڑا ہوکر عثمان دقنہ بنوں گا۔ اُس زمانے میں میں اپنی چھوٹی سی عقل کے ساتھ سوچتا تھا کہ آخر اتنے بڑے کارنامے کیسے سرانجام دوں گا؟

اس سوال کا جواب میں اپنے آپ کو یہ دیتا تھا کہ کالج سے فارغ ہوکر ملٹری اکیڈمی میں بھرتی ہو جاؤں گا اور وہاں جدید اسلحہ چلانے کی ٹریننگ لوں گا اور جنگ کے گر سیکھوں گا۔

چنانچہ اس امید کے سہارے میری زندگی کے ماہ وسال گزرتے رہے۔ پھر جب میں پرائمری اسکول سے فارغ ہوکر ہائی اسکول میں آیا تو میری معلومات میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں آکر میں نے عبدالرحمٰن کواکبی، سنوسی، عمر مختار اور جمال الدین افغانی جیسے اکابرین کے نام سنے اور اِن تمام اکابرین میں سے میں سید افغانی سے بہت متاثر ہوا کیونکہ ان کی انقلابی تعلیمات صرف ایک ملک تک محدود نہیں

تھیں۔ وہ افغانستان[1] سے اٹھے اور اسلامی ممالک اور غیر اسلامی ممالک کے دارالحکومتوں میں گئے اور انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کی کوششیں کی تھیں۔

سید افغانی اپنے علمی افکار کی نشر و اشاعت کو جہاد قرار دیتے تھے۔ انھوں نے ہتھیار اٹھائے بغیر امت اسلامیہ کو فکری رُشد عطا کیا تھا۔ جب تک مجھے سید افغانی کی شخصیت سے آشنائی نہیں تھی اُس وقت تک میں یہ سوچا کرتا تھا کہ میں ہاتھ میں تلوار لوں اور مسلمانوں کے لیے جہاد کروں لیکن جب مجھے اُن کی شخصیت سے آشنائی نصیب ہوئی تو میں ان سے متاثر ضرور ہوا لیکن میرے پرانے افکار ابھی تک مجھ میں موجود تھے۔ اگرچہ میں نے یہ حقیقت جان لی تھی کہ امت کی سب سے بڑی مشکل علم و تحقیق کے میدان میں پسماندگی ہے کیونکہ شاندار علمی و تحقیقی ورثہ ہی ہر فرد کی ذمے داریوں کا تعین کرتا ہے۔ سید افغانی نے اسی مقصد کے لیے جہاں گردی کی تھی۔ انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں میں علم و آگہی کے چراغ روشن کیے تھے اور اُن کے افکار کو بڑی پذیرائی ملی تھی۔ اس پذیرائی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُن کا صحیح علاج تجویز کیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو زندگی کے حقائق سے آشنائی کا درس دیا تھا اور اُن کی ان حیات بخش تعلیمات نے استعمار گروں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔

سید افغانی کا رسالہ العروۃ الوثقیٰ اس وقت کی کئی حکومتوں سے بھاری ثابت ہوا اور جب استعماری قوتوں نے دیکھا کہ یہ رسالہ ان کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے تو انھوں نے اس رسالے کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا اور اس پر پابندی عائد کر دی۔

میں جب بھی سید جمال الدین افغانی کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتا تو یہی سوچتا کہ ایک فرد واحد نے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا کیا۔ اس کے قلم میں اتنی قوت کہاں سے آگئی تھی کہ استعمار اس سے لرزہ براندام ہونے لگا تھا!!

اس ایک سوال کے جواب کے لیے میرے ذہن میں سوالات کا لامتناہی سلسلہ پیدا ہوا۔ ان میں سے کچھ سوالات کے جواب آسان تھے اور کچھ ایسے تھے جن کا سوڈانی معاشرے میں کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ ان اسباب نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ میں اس معاشرے سے آزادی پاؤں اور تمام زنجیریں توڑ ڈالوں۔ سوڈان کے معاشرے میں میرے لئے اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرنا ضروری تھی۔

اس عرصے میں میرے دل میں سید جمال الدین افغانی کی عقیدت بڑھتی گئی اور میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ کیا میں بھی کبھی ان کی طرح بن سکوں گا؟ اور کیا میرا موروثی مذہب مجھے اس مقام پر پہنچا سکے گا؟ پھر میں اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ کیوں نہیں؟ سید جمال الدین بھی تو آخر ہمارے ہی

۱۔ ایک تحقیق کے مطابق افغانی کے نام سے شہرت پانے والے جمال الدین ایرانی (اسد آبادی) تھے۔ (رضوانی)

ہم مسلک تھے اور وہ بھی ہمارے ہی اسلام کے پیروکار تھے۔

اس سوال کے جواب میں میں کئی برس تک متحیر رہا۔ البتہ مجھ میں جو ذہنی تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ میں نے "عثمان وقمہ" کی بجائے جمال الدین افغانی کو اپنا ماڈل بنالیا تھا اور اب میں کسی فوجی اکیڈمی میں داخلہ لے کر حرب وضرب کا فن سیکھنے کی بجائے اسلامی تہذیب وتمدن کو سیکھنے کا خواہشمند بن گیا۔

تحقیق کی ابتدا

میرے لیے اسلامی تہذیب وتمدن اور عقائد کی تحقیق ہی مشکل تھی۔ اگرچہ جذبہ تحقیق مجھ میں فطری طور پر موجود تھا لیکن میری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور وہابی عقائد نے سوڈان پر اچانک یلغار کر دی۔ مذہبی فعالیت کی وجہ سے بہت سے حقائق واضح ہونے لگے اور تاریخی، اعتقادی اور فقہی اختلافات منظر عام پر آنے لگے اور کچھ اسلامی فرقوں پر کفر کے فتوے لگنے لگے۔ اس طرح مختلف عقائد میں اختلاف کی خلیج وسیع ہونے لگی۔ اختلافات کے تلاطم میں مجھے اپنا گوہر مقصد حاصل کرنے کا موقع ملا اور میں نے اپنی پوری توجہ وہابیت کی طرف مبذول کر دی۔ میں ان کے مناظروں میں شرکت کرتا اور ان کی گفتگو سنتا تھا۔ ان ایام کی یہ بات مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہابی ہمارے پورے سماج کو زیر وزبر کرنا چاہتے تھے جبکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے عقائد ورسوم بڑے مقدس ہیں، ان پر تنقید اور جرح نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ بعض رسومات سے مجھے بھی اختلاف تھا اور کبھی کبھی میں بھی کچھ عقائد ورسوم پر اعتراض کرتا تھا۔ میں نے وہابیوں کے ساتھ سفر شروع کیا اور اُن سے کئی بار چھوٹے موٹے مباحثے کیے۔ کچھ سوالات کے جوابات دے کر وہ مجھے مطمئن کر دیتے تھے لیکن اکثر سوالات کے اُن کے پاس جوابات نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود میں کچھ نہ کچھ وہابیت سے متاثر ضرور ہوا لیکن بہت سے سوالات کے تسلی بخش جوابات نہ ملنے کی وجہ سے میں مکمل طور پر وہابیت میں داخل نہ ہوسکا کیونکہ وہابیت کے دامن میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو مجھے دلی اطمینان پہنچاتی اور میری بلند آرزوؤں کی تسکین کا سامان کرتی۔

بعض اوقات میں اپنے آپ سے خود کلامی کرتا کہ تو جس آئیڈیل کی تلاش میں ہے وہ خواب و خیال ہے۔ وہابیت اسلامی عقائد کا بہترین نمونہ ہے اور یہ بے نظیر مذہب ہے۔ اُس زمانے میں مجھے دوسرے اسلامی مذاہب کی خبر نہیں تھی۔ میں نے صرف وہابیت کا چہرہ دیکھا تھا اسی لیے میرے اندر اس طرح کے وسوسوں کا پیدا ہونا فطری تھا لیکن بعد میں یہ سوچتا تھا کہ سید جمال الدین تو وہابی نہیں تھے مگر انھوں نے اسلام کی عظیم خدمت انجام دی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہابیت کے متعلق میں نے یہ نظریہ قائم

کیا کہ سوڈان میں موجود اسلامی فرقوں کے پاس وہابیوں کی طرح کے دلائل نہیں ہیں اسی لیے وہابی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کا مذہب اسلام تک پہنچنے کا قریبی راستہ ہے۔ ایک اور چیز جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ ریاضی کے مضمون کی طرح وہابیت بھی انتہائی خشک عقائد کا مجموعہ ہے جو انسانی تمدن میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کرسکتا اور اس سے انسان کی انفرادی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ وہابیت میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہے کہ وہ انسان کا خدا سے رابطہ استوار کراسکے۔ اس کے برعکس وہابیت دوسروں کی تحقیر اور تذلیل کرتی ہے اور کوئی سچا وہابی اپنے ماحول کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتا کیونکہ اُس کا لباس، اُس کی رفتار و گفتار دوسروں سے جدا ہے اور وہ اپنے ہم مذہب افراد کے علاوہ کسی دوسرے سے مانوس ہونا نہیں جانتا۔ وہابی جہاں بھی ہوگا وہ نہایت مغرور اور متکبر ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو بلند اور باقی خلق خدا کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا عادی ہوگا۔

وہابی لوگوں کی روزمرہ زندگی میں اور خوشی و غم میں شریک نہیں ہوتے۔ اس مردم بیزاری کی وجہ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف وہی عقیدۂ توحید پر کاربند ہیں اور اُن کے سوا پورا عالم اسلام بدعتی اور گمراہ ہے۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب وہابیت کے پرچار سے ہمارے گاؤں کے بہت سے جوان کوئی مطالعہ و تحقیق کیے بغیر تھوڑے عرصے میں وہابی بن گئے تھے۔ پھر جلد ہی وہ سب وہابیت سے تائب ہوگئے کیونکہ وہابی بہت شدت پسند تھے۔ وہ جوانوں کو معاشرے کے ساتھ راہ و رسم سے منع کرتے تھے اور بہت سی بے ضرر رسومات کو حرام قرار دیتے تھے حالانکہ وہ رسومات اسلام سے متصادم نہیں تھیں۔ وہابیت سے جوان اس لیے بھی علیحدہ ہوئے تھے کہ ہمارے گاؤں میں یہ رواج تھا کہ چاندنی راتوں میں نوجوان گھروں سے باہر نکل کر بیٹھ جاتے اور گپ شپ لگاتے۔ اس طرح وہ دن بھر کی تھکان اتارتے۔ وہابی عالم نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ یہ فعل حرام ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کی رسول خداؐ نے لوگوں کو سڑک کے کنارے بیٹھنے سے منع کیا تھا۔ حالانکہ نوجوانوں کا یہ عمل راستے پر بیٹھنے میں شامل نہیں تھا۔

وہابیوں کی دوسری مشکل یہ ہے کہ جو بھی شخص وہابیت اختیار کرتا ہے وہ معمولی سا علم کیوں نہ رکھتا ہو اپنے آپ کو مجتہد سمجھنے لگ جاتا ہے اور ہر مسئلے میں فتویٰ دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ ایک وہابی سے کچھ مسائل پر گفتگو کر رہا تھا اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ جونہی اذان شروع ہوئی تو وہ فوراً اٹھ کر مسجد کی طرف جانے لگا۔ میں نے اُس سے کہا کہ دو منٹ ٹھہر جاؤ تاکہ ہماری بات مکمل ہوسکے۔ اُس نے کہا کیسی بات؟ اذان ہورہی ہے۔ چلو مسجد میں چل کر نماز پڑھیں۔ میں نے کہا تم جاؤ۔ میں اپنے گھر میں ہی نماز پڑھ لوں گا۔ اس پر اُس نے کہا کہ تیری نماز

باطل ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارے پاس میری نماز کے باطل ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اُس نے کہا کہ رسول خداؐ کا فرمان ہے۔ لَا صَلَاۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ (مسجد کے ہمسائے کی نماز مسجد میں ہی ہوتی ہے) میں نے کہا کہ یہ بات تو درست ہے کہ مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ گھروں میں نماز ہی نہیں ہوتی۔ یہ حدیث فضیلت مسجد پر دلالت کرتی ہے۔ گھر کی نماز کو حرام قرار نہیں دیتی کیونکہ فقہ کی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ گھر میں نماز پڑھنا مبطلات نماز میں سے ہے اور آج تک کسی فقیہ نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔ اگر تم یہ فتویٰ دیتے ہو تو کیا تم فقیہ ہو؟ فتویٰ دینا تو انتہائی مشکل کام ہے۔ ایک فقیہ فتویٰ دینے کے لیے اس موضوع کی تمام روایات پر نظر کرتا ہے۔ پھر دیکھتا ہے کہ یہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے یا استحباب پر۔ اسی طرح وہ ہر نہی کو دیکھتا ہے پھر فیصلہ کرتا ہے کہ یہ نہی حرمت پر دلالت کرتی ہے یا کراہت پر۔ تب کہیں جا کر وہ فتویٰ دیتا ہے۔ لہٰذا تمہیں بھی فتویٰ دیتے وقت احتیاط کرنی چاہیے۔ اس وقت اُس میں شکست خوردگی کے آثار پیدا ہوئے اور وہ کہنے لگا کہ تم حدیث کی تاویل کر رہے ہو اور تاویل حرام ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدایا میرا واسطہ کس احمق سے پڑ گیا ہے۔ یہ شخص تو بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔

الغرض وہابیت کے اس خشک رویے نے مجھے وہابیت میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ میں کچھ عرصے تک اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ مجھے نہ تو آگے جانے کا راستہ سجھائی دیتا اور نہ پیچھے ہٹنے کی راہ دکھائی دیتی۔ اگر ایک دن وہابیت کے قریب ہوتا تو دوسرے دن اُس سے دور ہو جاتا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ملٹری اکیڈمی کی بجائے کسی اسلامی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر کتابوں کا سیر حاصل مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ میں گہری تحقیق کے میدان میں قدم رکھ سکوں۔ جب میں نے ایف اے پاس کیا تو چھ قسم کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے میرے لیے کھل گئے۔ مجھے یہ حق حاصل تھا کہ چھ قسم کے علوم میں سے جس علم کا چاہوں انتخاب کروں لیکن میں نے اپنے شوق سے اسلامی کالج کا انتخاب کیا۔ میرے کالج کا الحاق سوڈان کی وادیٔ نیل یونیورسٹی سے تھا۔ میرے کالج میں اسلامی علوم اور عربی ادبیات سکھائے جاتے تھے۔

سوڈان میں ہر طالبعلم کو کچھ عرصے کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ میں نے بھی ایک مخصوص وقت تک فوجی تربیت حاصل کی۔ پھر میں کالج میں آ گیا۔ کالج کے پرنسپل نے میرا انٹرویو کیا۔ انٹرویو کے دوران انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

میں نے کہا کہ سید جمال الدین افغانی میرے آئیڈیل ہیں اور میں نے اس کی وجوہات بھی بیان کیں۔ پرنسپل صاحب میرے اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر انھوں نے کچھ دوسرے سوالات

بھی پوچھے جن کا میں نے تسلی بخش جواب دیا۔

الغرض مجھے اس کالج میں داخلہ مل گیا۔ داخلے کے بعد میں کالج کی لائبریری میں گیا تو دیکھا کہ لائبریری میں ہر موضوع پر بہت زیادہ کتابیں تھیں اور بہت سارے انسائیکلو پیڈیاز بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے باقاعدہ لائبریری جانا شروع کر دیا لیکن میرے لیے مشکل یہ تھی کہ کون سی کتاب پڑھوں اور کس طرح کی کتاب سے آغاز کروں۔ مجھے لائبریری کیا ملی گویا خزانہ مل گیا تھا۔ میں نے دل جمعی سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ کبھی اس کتاب کو پڑھتا کبھی اُس کتاب کو پڑھتا لیکن ابھی تک میں نے اپنے لیے کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا تھا۔ پھر ایک قریبی عزیز نے میرے لیے بحث و تحقیق کا دروازہ کھولا اور کہا کہ مذاہب اسلامی کی تحقیق اور مذہب حق کی تلاش کے لیے تاریخ کا مطالعہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا یہ مشورہ میرے لیے توفیق الٰہی تھا کیونکہ میں اس سے غافل تھا۔ میرے افکار میں تلاطم کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب میری عطیر و شہر میں اپنے کزن کے گھر عبدالمنعم سے ملاقات ہوئی۔ موصوف لاء کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ میں نے دیکھا کہ غروب آفتاب سے قبل وہ اخوان المسلمین کے ایک کارکن سے بحث کر رہے تھے۔ جب میں نے توجہ سے سنا تو معلوم ہوا کہ بحث کا تعلق مذہبی عقائد سے ہے۔ میں اُن کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ عبدالمنعم نے پورے اطمینان اور سکون سے اپنے دلائل دیئے جبکہ مدمقابل کا رویہ درشت تھا۔ میں بحث میں کافی دیر بعد شامل ہوا تھا ہی لیے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ اصل بحث کیا ہے۔ مجھے پوری بات اُس وقت سمجھ آئی جب اخوان کے کارکن نے کہا کہ شیعہ کافر ہیں اور خدا کی معرفت سے دور ہیں!!

جب میں نے یہ سنا تو میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر شیعہ کون ہیں اور یہ شخص انھیں کافر کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا عبدالمنعم شیعہ ہے؟ اُس نے جو گفتگو کی ہے کیا شیعیت میں ایسی مدلل گفتگو ہوا کرتی ہے؟ انصاف کی بات یہ ہے کہ عبدالمنعم نے اپنے مدمقابل کو مضبوط دلائل سے شکست دی تھی۔ وہ بہترین منطق اور محکم استدلال سے مسلح تھا۔

اس بحث کے بعد نماز مغرب پڑھی گئی۔ پھر میں نے عبدالمنعم سے تنہائی میں ملاقات کی اور پورے احترام کے ساتھ پوچھا کہ کیا آپ شیعہ ہیں؟ اور یہ بتائیں کہ شیعہ کون ہوتے ہیں؟ اور آپ نے شیعیت کہاں سے حاصل کی؟ میرے سوالات سن کر انھوں نے کہا کہ صبر کریں ایک ایک سوال علیحدہ علیحدہ کریں۔

میں نے کہا معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میں نے آپ سے جو دلائل سنے ہیں انھوں نے مجھے بے خود سا کر دیا ہے۔ عبدالمنعم نے کہا یہ ایک طویل بحث ہے۔ یہ میرے چار سال کی تحقیق کا ثمر ہے

اور مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے میں نے تحقیق کی تھی نتیجہ اُس کے برعکس نکلا۔ میں نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا کون سا نتیجہ؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی نادانی سے جو ذخیرہ جمع کر رکھا ہے اُس کی وجہ سے ہم اپنے معاشرے کے گرد طواف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ہم جس دین کے پیرو ہیں کیا یہی دین خدا کو بھی مطلوب ہے؟ اور ہم اسلام کی جو تعبیر کر رہے ہیں کیا یہی اسلام کی حقیقی تعبیر ہے؟ چنانچہ میں نے تحقیق کی اور ایک تھکا دینے والی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں حق موجود نہیں۔ حق اگر ہے تو صرف شیعیت میں ہی ہے۔

میں نے کہا کہ آپ نے نتیجہ اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے یا پھر آپ کو نتیجہ اخذ کرنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ میری یہ بات سن کر وہ مسکرائے اور کہا کہ تم خود تحقیق کیوں نہیں کر لیتے؟ تمہارے کالج میں تو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ہماری لائبریری میں تو سب سنی کتابیں ہیں بھلا مجھے وہاں سے شیعیت کو سمجھنے کے لیے کیا مدد ملے گی؟ انھوں نے کہا کہ مذہب شیعہ کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس کی حقانیت کی روایات سے اہل سنت کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور شیعہ، کتب اہل سنت سے اپنے مذہب کا اثبات کرتے ہیں۔ میں نے کہا تو کیا سنی اور شیعہ دونوں کا ماخذ ایک ہے؟

انھوں نے کہا نہیں! ''شیعوں کا اپنا مخصوص ماخذ ہے جو اہل سنت کے ماخذ سے کئی گنا بڑا ہے۔ شیعوں کی تمام روایات اہل بیت رسولؐ سے مروی ہیں اور اہل بیتؑ نے وہ روایات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہیں۔ لیکن جب وہ اہل سنت سے مباحثہ کرتے ہیں تو اپنی کتابوں کی بجائے کتب اہل سنت سے ہی اپنے مطالب کا اثبات کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ اہلسنت کو خود اُن کی کتابوں سے ہی لاجواب کرتے ہیں۔''

مجھے اُن کی گفتگو اچھی لگی اور میں نے تحقیق کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ میں اپنی تحقیق کا آغاز کہاں سے کروں؟ انھوں نے کہا کہ تمہاری لائبریری میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن نسائی اور مسند احمد موجود ہیں؟ میں نے کہا کہ ہماری لائبریری میں ان کتابوں کے علاوہ حدیث کی اور بھی بہت ساری کتابیں موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ انہی کتابوں سے اپنی تحقیق شروع کریں۔ پھر آپ تفسیر اور تاریخ کی کتابیں پڑھیں۔ ان کتابوں میں بہت سی احادیث آپ کو ایسی ملیں گی جو مکتب اہل بیتؑ کی پیروی کو واجب قرار دیتی ہیں۔ پھر انھوں نے مجھے چند احادیث اور اُن کے ماخذ کی صفحہ سمیت نشاندہی کی تو میں وہ احادیث سن کر دنگ رہ گیا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں ایسی

احادیث کبھی نہیں سنی تھیں۔ پہلے تو مجھے یہ شک گزرا کہ نجانے یہ احادیث ہماری کتب میں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ پھر میں نے ان احادیث کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور دل میں کہا کہ کوئی بات نہیں میں لائبریری میں جا کر ان کو تلاش کروں گا۔ اس کے بعد میں نے عبدالمنعم سے کہا کہ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ خدا نے چاہا تو اگلی جمعرات آپ سے ملاقات ہوگی۔

کالج کی لائبریری میں احادیث کی جستجو

میں اپنے کالج کی وسیع و عریض لائبریری میں گیا اور عبدالمنعم کی بتائی ہوئی احادیث کو بخاری و مسلم اور دیگر کتابوں میں دیکھا تو وہ احادیث موجود تھیں۔ اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ انھوں نے سچ کہا تھا۔ مطالعے کے دوران مجھے بہت سی ایسی احادیث دکھائی دیں جن میں اتباع اہلبیتؑ کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان احادیث کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ آخر یہ احادیث میں نے آج تک کیوں نہیں سنی تھیں؟ میں نے اپنے کالج کے دوستوں سے اس موضوع پر بات کی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس بحران میں وہ بھی میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ کچھ دوستوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کچھ نے توجہ ہی نہ دی لیکن میں نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ میں اس مسئلے پر پوری تحقیق کروں گا چاہے میری ساری عمر اس کی نذر کیوں نہ ہو جائے۔ جمعرات کا دن آیا اور میں عبدالمنعم سے ملنے چلا گیا۔ انھوں نے بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور مجھ سے کہا کہ آپ جلد بازی سے کام نہ لیں اور پوری تحقیق کریں۔

اس کے بعد دوسرے بہت سے مسائل پر ہماری بحثیں ہوئیں یہاں تک کہ شب جمعہ ان مباحث میں گزر گئی۔ اس ملاقات سے مجھے بہت فائدہ ہوا اور اُن مسائل سے آگہی حاصل ہوئی جن سے پہلے میں لاعلم تھا۔ عبدالمنعم نے مجھ سے کہا کہ چند مسائل پر مزید تحقیق کروں۔

میرے اور اُن کے درمیان کافی ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سے موضوعات پر ہمارے مباحثے بھی ہوئے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مجھے غصہ آجاتا تھا اور واضح حقائق کو بھی ماننے سے انکار کر دیتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ میں نے کچھ احادیث کو کتب حدیث میں پڑھا لیکن جب میری اُن سے بحث ہوتی تو میں جھوٹ کا سہارا لے کر اُن سے کہتا تھا کہ آپ جو احادیث پیش کر رہے ہیں وہ کہیں موجود نہیں ہیں۔ مجھے آج تک اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہے اور میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں آخر یہ حرکت کیوں کرتا تھا۔ کیا یہ حرکت شکست سے بچنے کی غرض سے تھی یا کامیابی حاصل کرنے کے لیے؟ اور یوں طویل بحثوں کے نتیجے میں میرے لیے بہت سے حقائق واضح ہوئے جن کی مجھے توقع نہ تھی۔ میں اپنے

دوستوں سے بھی یہ بحثیں کیا کرتا تھا۔ جب میرے دوست مجھ سے اکتا جاتے تو کہتے کہ بھائی ہم سے نہ الجھو۔ ہمارے کالج کے فلاں پروفیسر نے اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے آپ اُن سے بحث کرو۔

میں نے کہا اس میں حرج تو کوئی نہیں لیکن مجھے اُن سے بحث کرتے ہوئے حیا آتی ہے۔ دوستوں نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ تم استاد سے بحث کرو۔ اگر تم نے انھیں مطمئن کر دیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ میں نے کہا مسئلے کا تعلق صرف اطمینان سے نہیں ہے، اس کا تعلق دلیل و برہان اور حق کی تحقیق سے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے درس فقہ کے دوران پروفیسر صاحب سے بحث شروع کی اور چند سوالات پوچھے لیکن ہمارے استاد نے میری کچھ زیادہ مخالفت نہ کی۔ اس کی بجائے انھوں نے محبت اہل بیتؑ کی تاکید کی اور کہا کہ اُن کی پیروی باعث نجات ہے۔ پھر انھوں نے اہل بیتؑ کے کچھ فضائل بھی بیان کئے۔ چند دن بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم میرے دفتر میں آکر مجھ سے ملو۔

میں ان کے دفتر میں حاضر ہوا۔ ان کے دفتر میں کئی جلدوں پر مشتمل اصول کافی رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے وہ کتاب میرے سپرد کی اور کہا کہ یہ شیعوں کی مستند ترین کتاب ہے۔ انھوں نے مجھے تاکید کی کہ اس کتاب کی حفاظت کرنا کیونکہ اس میں اہل بیتؑ کی احادیث ہیں۔ میں نے استاد محترم سے کتاب لی اور ان کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ میں نے اس کتاب کا نام سن رکھا تھا لیکن آج تک اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ میرے استاد شیعہ ہیں حالانکہ میں جانتا تھا وہ مالکی ہیں۔ جب میں نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ وہ صوفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور محب اہل بیتؑ ہیں۔ جب میرے دوستوں کو یہ علم ہوا کہ ہمارے فقہ کے پروفیسر میرے ہم نوا ہیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم حدیث کے پروفیسر صاحب سے بحث کرو۔

ہمارے حدیث کے پروفیسر انتہائی دین دار، وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی۔ دوستوں کی فرمائش سے مجبور ہو کر میں نے ان سے چند احادیث کی صحت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ مذکورہ احادیث صحیح ہیں۔ پھر چند دن بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ میری مسلسل بحث سے عاجز آگئے ہیں اور یہی بات میرے دوستوں نے بھی محسوس کی۔ چنانچہ میں نے بحث کا انداز بدل دیا۔ زبانی بحث کی بجائے میں نے ایسی احادیث لکھ کر جو مذہب اہل بیتؑ کی پیروی کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں پروفیسر صاحب کے پاس بھیج دیں اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان احادیث کی صحت کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ میں روزانہ ان سے پوچھتا کہ کیا آپ نے ''احادیث'' کی چھان بین کی۔ وہ جواب دیتے کہ وقت نہیں ملا اس لیے میں نے تمہاری ارسال کردہ احادیث کی تحقیق نہیں کی۔ میں نے روزانہ سوال کرنے کو اپنا معمول بنالیا۔ آخرکار ایک دن انھوں نے

کہ کہ بھائی کیوں شک کرتے ہو۔ یہ ساری احادیث صحیح ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان احادیث سے تو مذہب اہل بیتؑ کی اتباع ثابت ہوتی ہے!! انھوں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کلاس چھوڑ کر اپنے دفتر میں چلے گئے۔

یہ مباحثہ میرے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا۔ اس سے مجھے لگا کہ شیعہ سچے ہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور کرلوں۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کالج کے پرنسپل درس تفسیر دینے آئے۔ انھوں نے سورۂ معارج کی پہلی آیت سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ پر بحث کے دوران اس آیت کی شان نزول بیان کرتے ہوئے بتایا کہ "رسول اکرمؐ نے غدیر خم میں لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو بازو سے پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ جب یہ خبر دور دراز کے علاقوں میں پہنچی تو حارث بن نعمان فہری اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور لمبا سفر طے کرکے رسول خداؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا "محمدؐ! آپ نے کہا کہ خدا ایک ہے۔ ہم نے سینکڑوں خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو مانا۔ آپ نے کہا کہ روزانہ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ہم نے آپ کے کہنے پر نمازیں پڑھیں۔ آپ نے کہا زکات واجب ہے۔ ہم نے زکات دی۔ آپ نے کہا کہ ماہ رمضان کے روزے واجب ہیں۔ ہم نے روزے رکھے۔ آپ نے کہا کہ حج فرض ہے۔ ہم نے حج کیا لیکن آپ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے ابن عم کا بازو پکڑ کر فرمایا کہ جس کا میں حاکم ہوں اس کے یہ علیؑ بھی حاکم ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ یہ کام آپ نے اپنی طرف سے کیا ہے یا خدا کی طرف سے؟" حضرت رسول خداؐ نے فرمایا واللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنَّ ھٰذَا مِنَ اللّٰہِ اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں یہ حکم خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یہ سن کر حارث چل دیا اور کہا: خدایا! اگر محمد (ص) سچے ہیں تو مجھ پر پتھروں کی بارش کر یا عذاب الیم نازل کر۔ ابھی حارث اپنے اونٹ تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک پتھر اُس کے سر پر گرا اور مقعد سے نکل گیا۔

اس واقعے کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ○ لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَہٗ دَافِعٌ ○ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الْمَعَارِجِ ○ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا جو نازل ہوکر رہا، ایسا عذاب جو کافروں پر اترا کرتا ہے اور کوئی اُس کو ٹال نہیں سکتا کیونکہ یہ بلندیوں کے مالک خدا کی طرف سے اترا کرتا ہے[1] (سورۂ معارج آیت ۱ تا ۳)

جب پرنسپل صاحب درس دے کر جانے لگے تو ایک طالب علم اُن کے پیچھے گیا اور اُن سے کہا کہ جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے یہی کچھ تو شیعہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ فرائد السمطین، حموینی ص ۵۹۔

پرنسپل صاحب نے کچھ دیر تک سوچا پھر کہا کہ جاؤ اور مقسم کو میرے دفتر میں بھیج دو۔ اس طالب علم نے مجھے پرنسپل صاحب کا پیغام پہنچایا۔ پیغام سن کر میں گھبرا گیا کہ نجانے کیا معاملہ ہے لیکن میں جی کڑا کر کے اُن کے دفتر میں چلا گیا۔ ابھی میں بیٹھا بھی نہیں تھا کہ پرنسپل صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ کیا تم شیعہ ہو؟

میں نے عرض کیا نہیں! ابھی میں تحقیق کی منزل میں ہوں۔

پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ تحقیق اچھی چیز ہے اور ہونی چاہیے۔ پھر انھوں نے چند گھسے پٹے اعتراضات بیان کئے جو مخالفین شیعوں پر کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے میں نے ان اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے۔ مجھے اپنی اُس ہمت پر آج بھی تعجب ہوتا ہے۔

بہرحال پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ تم شیعہ محقق سید شرف الدین عاملی کی کتاب المراجعات پڑھو۔ اس موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ چنانچہ میں نے المراجعات اور علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی معالم المدرستین کا مطالعہ کیا (یہ دونوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں) اس کے علاوہ کچھ دیگر کتابیں بھی پڑھیں۔ ان دو کتابوں کے مطالعے سے میرے عقائد کی دنیا ہی زیر و زبر ہو گئی اور میرے دل سے باطل کے نقوش مٹ گئے۔

ان دو کتابوں کے مطالعے سے مجھ میں بحث و تحقیق کی قوت پیدا ہوئی۔ خدا کے کرم سے میرے دل میں حق کی شمع روشن ہو گئی اور میں نے شیعیت کا اعلان کر دیا۔

اعلان تشیع کے بعد ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔ لوگوں نے مجھ سے بحثیں شروع کر دیں اور جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو انھوں نے میرا مذاق اڑایا، مجھ پر پھبتیاں کسیں اور میری توہین کی۔ پھر مجھ پر تہمتیں لگائی گئیں اور مجھے دھمکیاں دی گئیں۔ اُن کی ان حرکتوں پر میں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اعلان تشیع کے بعد میرے دوستوں نے مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور قطع تعلق کر لیا لیکن یہ تنہائی مختصر ثابت ہوئی۔ آہستہ آہستہ تعلیم یافتہ افراد کے ساتھ میرے تعلقات قائم ہوئے اور اُن سے مجھے بے حد احترام ملا۔ کچھ احباب تو گھریلو معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ لینے لگے لیکن یہ تعلقات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ جب میری تبلیغ کی وجہ سے تین طالبعلم ساتھیوں نے شیعیت کا اعلان کیا تو لوگوں کی دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ ہم نے اس موقع پر اخلاق کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے دشمنی کی چنگاریاں دب گئیں۔

اپنے گاؤں میں واپسی

ہمارے گاؤں کا نام "ندی" ہے اور یہ سوڈان کے شمال میں دریائے نیل کے کنارے آباد ہے۔ اس گاؤں میں "ریاطاب" قبیلہ کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ قبیلہ ذہانت و فطانت میں بڑا مشہور ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور یہاں کھجور کے درختوں کی بہتات ہے جس سے لوگوں کا روزگار چلتا ہے۔

وہابیوں نے اپنی تبلیغ کا دائرہ ہمارے گاؤں تک پھیلا رکھا تھا۔ انھوں نے مسلسل تقاریر کے ذریعے لوگوں پر اپنے اثرات مرتب کئے تھے۔ میں ابتدا میں بالکل خاموش رہا اور اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں گزارتا۔ کبھی کبھی اپنے رشتے داروں کو مذہب اہل بیتؑ کی دعوت دیتا اور اپنے بھائی سے اس موضوع پر مباحثہ کرتا تھا۔ میرا بھائی یہ کہہ کر مجھے ڈراتا تھا کہ لوگ شیعی عقائد کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ میٹنگ میں آکر تمہاری کتابوں کو جلا دیں لیکن میری مدلل گفتگو سے بالآخر وہ متاثر ہوا اور اُس نے اہلبیت قیادۃ روحانیۃ، المراجعات اور معالم المدرستین کا مطالعہ شروع کیا۔ بفضلہ تعالیٰ اُس نے بھی شیعیت کا اعلان کر دیا۔ ہمارے گھر کے باقی افراد نے بھی اس اعلان پر کسی ناراضگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

گاؤں میں آہستہ آہستہ لوگوں میں میرا چرچا ہونے لگا۔ میں نے گاؤں والوں کو مذہب اہلبیتؑ کی دعوت دینا شروع کی۔ اس موقع پر وہابیت کی دیگچی میں اُبال آیا اور اُن کے مبلغین کو سخت غصہ آیا۔ گاؤں میں جو بھی مذہبی تقریب ہوتی وہابی مبلغ اُس تقریب میں شیعیت پر حملے کرتے اور شیعوں پر تہمتیں لگاتے۔ بعض اوقات وہ لوگ براہ راست میرا نام لے کر مجھے تنبیہ کرتے تھے لیکن میں نے صبر و ضبط اور تحمل سے کام لیا۔

ایک وہابی شیخ سے مناظرہ

ہمارے گاؤں کی مسجد میں شیخ احمد الامین وہابیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ شیعیت پر حملے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ بدزبانی اور الزام تراشی کی تمام سرحدیں پھلانگ چکے تھے۔ اُن کی مسلسل دل آزار باتیں سن کر میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا چنانچہ میں نماز ظہر کے وقت اُن کی مسجد میں چلا گیا اور ظہر کی نماز اُن کے ساتھ پڑھی۔ بعدہٗ میں نے شیخ احمد الامین سے کہا کہ جناب آپ کافی عرصہ سے شیعوں پر الزامات لگا رہے ہیں اور شیعوں کو لاؤڈ اسپیکر پر برا بھلا کہہ رہے ہیں حتیٰ کہ اُن پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔ کیا اس پورے عرصے میں میں نے آپ سے کوئی تعرض کیا؟

کہنے لگے کہ نہیں۔

میں نے پوچھا کیا آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے؟

کہنے لگے کہ نہیں۔

میں نے کہا آپ کی گفتگو جاہلانہ چڑھائی ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ میرے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے جواب دیا تو یہ میری ذات کا دفاع ہوگا حق کا دفاع نہیں ہوگا۔ اب میں تنگ آچکا ہوں۔ آپ مجھ سے علمی اور منطقی مباحثہ کریں اور یہ مباحثہ لوگوں کے سامنے ہونا چاہیے تاکہ حق اور ناحق واضح ہو جائے؟

شیخ نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں نے کہا پہلے آپ موضوع مقرر کریں۔

شیخ نے کہا موضوع ہے تحریف قرآن اور عدالت صحابہ۔

میں نے کہا مجھے آپ کے موضوعات منظور ہیں لیکن آپ کو بھی اپنی کتابوں سے دو موضوعات کا اثبات کرنا ہوگا یعنی خدا کی صفات اور نبوت کی صفات۔

شیخ نے کہا مجھے یہ موضوع منظور نہیں ہیں۔

میں نے کہا آپ کو یہ موضوع کیوں منظور نہیں ہیں؟

شیخ نے کہا مناظرے کی پیشکش تم نے کی ہے لہٰذا موضوع کا تعین میں کروں گا۔ اگر مناظرے کی پیشکش میری طرف سے ہوتی تو موضوع کے تعین کا اختیار آپ کو ہوتا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ بتائیں کہ مناظرہ کب ہوگا؟

شیخ نے کہا آج رات نماز مغرب کے بعد۔

شیخ اتنا کم وقت دے کر دراصل مجھے ذہنی طور پر پریشان کرنا چاہتے تھے لیکن میں ان موضوعات پر بحث کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ لہٰذا میں نے پوری خوش دلی سے اُن کی پیشکش کو قبول کرلیا اور مسجد سے باہر آگیا۔

نماز مغرب کے بعد ہمارا مناظرہ شروع ہوا۔ شیخ احمد امین نے حسب عادت مناظرے کا آغاز شیعوں پر الزامات سے کیا اور کہا کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ یہ لوگ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ اُس نے محب الدین کی کتاب الخطوط العریضہ اٹھا رکھی تھی۔ جب شیخ کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے اُن کے لگائے ہوئے الزامات کے ترتیب وار جواب دیے اور دلائل سے ثابت کیا کہ شیعہ تحریف قرآن کے بالکل بھی قائل نہیں ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ تحریف قرآن کی آلودگی سے خود آپ کا

دامن صاف نہیں ہے۔ آپ کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو دکھائی دیتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ آپ کی کتابوں میں دسیوں ایسی روایات موجود ہیں جو تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں۔

پھر میں نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد بن حنبل اور سیوطی کی اتقان سے مندرجہ ذیل روایات پیش کیں:

احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) اپنی مسند میں ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک شخص سے کہا کہ سورۂ احزاب کی کتنی آیات ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ ستر سے کچھ زیادہ۔ ابی نے کہا کہ میں نے سورۂ احزاب رسول خداؐ سے پڑھی تھی۔ یہ سورۂ بقرہ جتنی یا اس سے کچھ زیادہ تھی اور اس میں آیت رجم بھی موجود تھی۔[1]

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ دیا اور کہا کہ خدا نے محمد مصطفیٰؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور اُن پر کتاب نازل فرمائی۔ خدا کی نازل کردہ آیات میں آیت رجم بھی شامل تھی۔ ہم نے اس آیت کو پڑھا اور یاد کیا تھا اور اس کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا تھا۔ رسول خداؐ نے رجم کیا تھا اور اُن کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے۔ اب مجھے یہ خوف ہے کہ کچھ عرصے کے بعد لوگ یہ کہیں گے کہ کتاب خدا میں ہمیں رجم کا حکم کہیں دکھائی نہیں دیتا اور یوں وہ خدا کے نازل کردہ حکم کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم کتاب خدا میں یہ آیت بھی پڑھا کرتے تھے اَنْ لَا تَرْغَبُوْا عَنْ آبَائِكُمْ فَاِنَّهٗ كُفْرٌ بِكُمْ اَنْ تَرْغَبُوْا عَنْ آبَائِكُمْ ...[2] یا یہ الفاظ تھے اِنَّ كُفْرًا بِكُمْ اَنْ تَرْغَبُوْا عَنْ آبَائِكُمْ خبردار! اپنے آباؤ اجداد سے منہ نہ پھیرنا کیونکہ آباؤ اجداد سے منہ پھیرنا کفر ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریان قرآن کو اپنے پاس بلایا۔ تین سو قاری اُس کے پاس جمع ہوئے۔ ابو موسیٰ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ بصرہ کے بہترین افراد ہو کیونکہ تم قرآن کریم کے قاری ہو۔ تم قرآن کی تلاوت میں مصروف رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ پچھلی قوموں کی طرح تمہارے دل بھی پتھر ہو جائیں۔ ہم ایک سورت پڑھا کرتے تھے جو جلال و ہیبت میں سورۂ توبہ کی مانند تھی۔ وہ سورہ میں بھول چکا ہوں البتہ اس میں سے مجھے صرف یہ فقرہ یاد ہے لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى وَادِيًا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ یعنی اگر اولاد آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں پھر بھی وہ تیسری وادی کی خواہش کرے گا اور اولاد آدم کا پیٹ تو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے۔[3]

اسی طرح قرآن میں "مسبحات" کی مانند ایک سورت ہوا کرتی تھی لیکن اس میں سے مجھے

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵، ص ۱۳۲۔ ۲۔ صحیح بخاری ج ۹، ص ۱۰۹۔ ۳۔ صحیح مسلم ج ۲، ص ۷۲۶، ح ۱۱۹۔

صرف یہ کلمات یاد ہیں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ فَتُکْتَبُ شَھَادَۃً فِیْ اَعْنَاقِکُمْ فَتُسْأَلُوْنَ عَنْھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یعنی اے ایمان والو! وہ باتیں کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل نہیں کرتے۔ تمہارے متعلق یہ گواہی لکھ دی جائے گی اور قیامت کے دن تم سے اس کی باز پرس ہوگی۔[1] واضح رہے کہ پہلی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے۔ دوسری آیت مَا لَا تَفْعَلُوْنَ تک قرآن مجید میں ہے اور آگے کے کلمات قرآن مجید میں نہیں ہیں۔

الغرض جب میں نے اس طرح کی روایات بیان کیں تو میں نے دیکھا کہ حیرت کی وجہ سے شیخ کا منہ کھل گیا اور اُن کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ان روایات کو ماننے پر آمادہ نہیں ہیں۔

چنانچہ جب میری تقریر ختم ہوئی تو شیخ نے کہا کہ میں نے آج تک یہ باتیں نہ پڑھی ہیں اور نہ سنی ہیں۔ تم نے ان روایات کے لیے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ کتابیں لے آؤ۔ میں نے کہا کہ ابھی آپ نے شیعوں پر تحریف قرآن کا الزام لگایا تو آپ نے مناظرہ میں شیعوں کی اصل کتابیں پیش کیوں نہیں کیں؟

پہلے آپ شیعہ کتابیں لے آئیں۔ پھر مجھے اپنے حوالے دکھانے کے لیے کہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ آپ کی مسجد کی لائبریری ہے۔ میں اسی میں سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم نکال کر آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔

جب شیخ نے محسوس کیا کہ اُن کے لیے فرار کا کوئی راستا نہیں ہے تو انھوں نے کہا کہ شیعہ تقیہ کے قائل ہیں اس لیے اُن کی کسی بات کو مانیں تو کیسے مانیں۔ پھر اُس نے مسئلہ تقیہ کو لے کر مذہب شیعہ کی خوب ہتک کی۔ اتنے میں عشاء کی اذان بلند ہوئی۔ نماز عشاء کے بعد طے ہوا کہ باقی موضوعات پر کل مناظرہ ہوگا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسرے دن صبح کے وقت وہی شیخ میرے پاس آئے اور پورے احترام سے مجھے سلام کیا اور کہا کہ عوام ان بحثوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں لہٰذا آپ اور میں تنہائی میں یہ بحثیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کی یہ بات بھی منظور ہے لیکن آپ وعدہ کریں کہ آئندہ آپ شیعہ مذہب کی کوئی توہین نہیں کریں گے۔ شیخ نے کہا کہ آج سے میرا وعدہ ہے کہ میں شیعہ مذہب کے خلاف ہرزہ سرائی نہیں کروں گا۔ شیخ نے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے کافی عرصے سے شیعوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم ج ۲، ص ۷۳۶، ح ۱۱۹۔

محققین کی خدمت میں چند گزارشات

اس کتاب میں اپنی تحقیقات بیان کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ دوران تحقیق مجھے جو تجربات حاصل ہوئے ہیں اُن کی وضاحت کردوں:

(۱) ایک طالب تحقیق کو خدا پر توکل و انحصار ہونا چاہیے۔ تحقیق کے لیے یہ نکتہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا نے انسان کو عقل اور علم کا نور عطا فرمایا ہے اور اُس سے مستفید ہونا انسان کے اختیار میں رکھا ہے۔ جو شخص خدا کے عطا کردہ نور سے استفادہ نہیں کرے گا وہ جہالت اور خرافات کی دلدل میں پھنس جائے گا اور جو شخص نور عقل سے کام لے گا اُسے خدا کی طرف سے ہدایت نصیب ہوگی۔ جس شخص کو خدا پر بھروسا نہ ہو وہ جب شکست کا احساس کرتا ہے تو اپنی عقل سے استفادہ نہیں کرتا اور جسے خدا پر بھروسا ہوتا ہے وہ ہمیشہ پُرامید رہتا ہے اور خدا کی عطا کردہ عقل سے علم و آگہی کے بلند درجات تک پہنچ جاتا ہے۔

جن دنوں میں تحقیق میں مصروف تھا میرے دوستوں نے میری ہمت افزائی کی بجائے ہمت شکنی کی اور وہ مجھ سے کہتے تھے کہ تم ان مسائل کی تحقیق کے قابل نہیں ہو۔ کیا ہمارے بزرگ علماء کو یہ باتیں معلوم نہیں تھیں؟ علماء کے مقابلے میں تم کیا چیز ہو؟ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ الغرض اس طرح کی باتیں کرکے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ میرے دوستوں کا یہ رویہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اُن سے پہلے کے لوگوں کے متعلق قرآن حکیم بتاتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۰۴)

(۲) اس سلسلے کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ خود فریبی سے بچیں۔ اگر آپ کی عقل تک حقائق پہنچ رہے ہیں تو انھیں پہنچنے دیں اور ذہن کے دریچے بند نہ کریں۔ کبھی بھی متعصب بن کر دوسروں کی بات سننے سے انکار نہ کریں۔ اسی طرح دوسروں کی کتابوں کے مطالعے سے اپنے آپ کو محروم نہ رکھیں۔ دنیا کی جو بھی جماعت تنہائی اور عدم تحقیق کی دعوت دے تو سمجھ لیں کہ یہ دعوت بذات خود ناقص ہے اور یہ جہالت اور حق سے دوری پر مبنی ہے۔ وہابیوں کی بھی یہی روش ہے وہ لوگوں کو شیعہ مذہب کی کتابیں پڑھنے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے ساتھ میل جول نہ رکھیں۔ یہ شکست خوردہ منطق ہے۔ قرآن کریم نے ایسی منطق کو رد کیا ہے اور اس کی بجائے دلیل و برہان کا مطالبہ کیا ہے۔ ارشاد اقدس الٰہی ہے: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ آپ کہہ دیں کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱)

(۳) قوت ارادی کو مضبوط کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ صبر و استقامت کے ساتھ چاروں طرف موجود خواہشات کی بپھری موجوں کا مقابلہ کرے۔ حق کبھی بھی معاشرے کی پیروی نہیں کرتا اور نہ ہی پسند عوام باتوں کو قبول کرتا ہے۔ انبیائے کرامؑ نے جاہل لوگوں کی طرف سے سخت اذیتیں اٹھائی تھیں۔ لوگوں نے انھیں شہید کیا لیکن اس کے باوجود اُن کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ ایک حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں ستر انبیاءؑ کو قتل کیا تھا۔ قرآن میں ہے کہ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ○ ان کے پاس جو بھی نبی آیا انھوں نے اُس کا مذاق اڑایا۔ (سورۂ زخرف آیت ۷)

(۴) بہت سے حجابات کشف حقیقت سے مانع ہیں۔ انسان کو ان حجابات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے تاکہ حق کھل کر ہمارے سامنے آسکے اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خود خواہی: یہ ایک بدترین بیماری ہے۔ اس سے حسد، کینہ اور خوشامد جیسی رذیل صفات پیدا ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنے نظریات کو اپنے وجود کا حصہ سمجھنے لگ جائے تو وہ مثبت تنقید کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ اس صورت میں وہ اپنے غلط عقیدے کا اسی طرح دفاع کرتا ہے جس طرح اپنی جان کا دفاع کرتا ہے۔ اس صورت میں وہ حقائق پر مبنی انکار کا انکار کرتا ہے لیکن اگر کوئی فکر و فلسفہ اُس کی خواہشات کا مؤید ہو تو وہ اُسے قبول کرتا ہے۔

۲۔ اندھی تقلید: آباؤ اجداد کی اندھی تقلید بھی انسان کو حق تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پہ اڑنا بہت سی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ لوگ اپنے آباء کی اندھی تقلید کو آباؤ اجداد کے احترام کا نام دیتے ہیں اور اُس سے انحراف کو بغاوت سمجھتے ہیں۔

وراثت اور تربیت کی تاثیر خواہ کتنی مؤثر کیوں نہ ہو انسان حق کو اُس سے زیادہ مؤثر جانے اور آباؤ اجداد کے نام پر حق کو قربان نہ کرے۔

۳۔ موروثی مذہب: انسان کو اپنے موروثی مذہب کے علماء اور فقہاء کا اتنا گرویدہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ "نصوص" پر علماء اور فقہاء کی آراء کو فوقیت دے اور نہ نصوص کی بجائے افراد کی پیروی کو اہمیت دے۔ یقیناً اس طرح کی اندھی تقلید حرام اور حق تک پہنچنے میں مانع ہے۔ ہمیں علماء اور فقہاء کا اتنا گرویدہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کفار کے اس قول کی تصویر بن جائیں۔ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا وہ کہیں گے کہ پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تھی انھوں نے ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا تھا۔ (سورۂ احزاب ۶۷)

۴۔ جلد بازی: جلد بازی بھی ایسا حجاب ہے جو انسان کو تحقیق کے صحیح نتیجے پر نہیں پہنچنے دیتا۔

جلد بازی راحت طلبی کا نتیجہ ہے۔ ایک آرام طلب شخص چاہتا ہے کہ وہ تحقیق کی کٹھن منزلیں طے نہ کرے اور اس راہ میں اپنے آپ کو نہ تھکائے۔ جو کچھ آسانی سے ہاتھ لگ جائے اسی پر اکتفا کرے جبکہ تلاش حق کے لیے پُرخار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

ان بنیادی نکات کے علاوہ کچھ اور نکات بھی ضروری ہیں۔ ایک محقق کو چاہیے کہ وہ تحقیق سے قبل اُن کی طرف دھیان دے اور اُن نکات میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ انسان جب کسی مسئلے کی تحقیق کرے تو مکمل غیر جانبدار بن کر تحقیق کرے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حق کو قبول کرنے پر ذہنی طور پر آمادہ رہے۔

ان تمام نکات سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان خدا سے دعا مانگے کہ خدا اُس کے دل کو نورِ حق سے منور کرے۔ حدیث شریف میں ہمیں رسول خداؐ کی یہ دعا ملتی ہے اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ خدایا! ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور اُس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو جیسا کہ وہ ہے ویسا دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عنایت فرما۔[1]

۱۔ احیاء علوم الدین ج ۵، ص ۵۳۰۔۵۳۲۔

پردہ اٹھتا ہے

وہابیت کے زمانے میں میں حسب ذیل دو احادیث پر بہت زیادہ زور دیا کرتا تھا:

۱۔ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ تَمَسَّکُوْا بِھَا وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ
تم میری سنت کی پیروی کرو اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو۔ ان سے وابستہ رہو اور مضبوطی سے انھیں پکڑے رہو۔[1]

۲۔ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا بِکِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ میں ایسا ترکہ چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے تو ہرگز نہ بھٹکو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب اور میری سنت۔[2]

یہ دونوں احادیث ہمیشہ میری زبان پر رہتی تھیں اور وہابی علماء بھی اپنی اکثر تقاریر میں انھیں پڑھا کرتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ ان احادیث کے ماخذ کی طرف رجوع کروں اور ان کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں علمائے حدیث سے پوچھوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان احادیث کو قرآن کی آیت کی طرح درست مانتا تھا۔

محترم قاری! ان دو احادیث پر سنی مذہب کی بنیاد استوار ہے۔ وہابی طرز فکر ان احادیث پر قائم ہے۔ اس لیے ان احادیث کی صحت کے متعلق میرے ذہن کے کسی کونے میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں ان احادیث کو سنی مذہب کے لیے مضبوط قلعہ خیال کرتا تھا اور ان احادیث میں شک کرنا سنی مذہب میں شک کرنے کے برابر سمجھتا تھا۔

اپنی طویل تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زیر نظر احادیث نہ تو ہمارے دور کی ساختہ پرداختہ ہیں اور نہ ہی سنی ذہن کی اختراع ہیں۔ دراصل یہ احادیث مذہب اہل بیتؑ یعنی اسلام کی شیعی تعبیر کا مقابلہ کرنے کے لیے گھڑی گئی تھیں۔ اسلام کی شیعی تعبیر کے مقابل مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کے اذہان میں یہ بات ڈالی گئی کہ گویا یہ حدیثیں ہر طرح کے شک و شبہے سے بالاتر ہیں۔ اسلام کے خلاف ایک منصوبے کے تحت یہ احادیث بنائی گئیں تاکہ مسلمانوں کو اختلافات کے

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۱۲۶۔ کنز العمال ج ۱، حدیث ۸۷۴۔ ۲۔ کنز العمال ج ، ص ۱۸۶، ۱۸۹۔

اندھے کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔

اس کتاب کے ہر باب میں ہم اس منصوبے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کریں گے۔ مذکورہ دو احادیث تحریف دین کی بنیاد ہیں اور مسلمانوں کو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقرر کردہ راستے سے ہٹانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان احادیث کے ذریعے آنحضرتؐ کی ایک صحیح السند اور صحیح المتن حدیث کو غیر مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی۔

آنحضرتؐ کی صحیح السند حدیث یہ ہے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم ان سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عترت میرے اہل بیتؑ۔[1]

اس صحیح السند اور متفق بین الفریقین حدیث کے مقابل منصوبہ ساز ذہنوں نے مذکورہ بالا حدیث تراشی تھی۔ ہم ان احادیث کے ضعف کو عنقریب واضح کریں گے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے پہلی بار کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ کی حدیث سنی تھی تو مجھے سخت تعجب ہوا تھا اور میں گھبرا گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ خدا کرے یہ حدیث ضعیف ثابت ہو ورنہ پورے سنی مذہب کو یہی ایک حدیث باطل کر دے گی لیکن ہوائیں میری کشتی کے رخ پر چلنے کی پابند نہیں تھیں۔ جب میں نے تحقیق کی تو نتیجہ میری خواہش کے مطابق نہیں تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ کی حدیث اتنی مستند ہے کہ کوئی اس میں شک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا جبکہ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ کی روایت کی حیثیت خبر واحد، مرفوع یا مرسل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ کی حدیث انتہائی ضعیف ہے۔ اس حدیث کے ضعف سے میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ پھر جب میں نے شکست کی تلخی کو چکھا تو اُسے خوش دلی سے تسلیم کیا۔ اس کے بعد قرائن و دلائل میرے لیے واضح ہو گئے یہاں تک کہ حقیقت کا حسین چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ اب ہم عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ اور کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ کا ضعف واضح کریں گے۔ میں یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ سنی مذہب ان احادیث پر قائم ہے۔ اگر یہ دو حدیثیں باطل ثابت ہو جائیں تو سنی مذہب کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

ضعیف احادیث

جو بھی شخص پہلی بار اس حدیث کو سنتا ہے وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ حدیث خلفائے راشدین

---

[1] معجم الاوسط ج ۳، ص ۲۶۲، حدیث ۳۲۶۳۔ جمع الجوامع ج ۱، ص ۳۷۔

کی پیروی کو واجب قرار دیتی ہے اور کتب خلفاء کی صداقت کے لیے حجت ہے۔ خلفائے راشدین سے مراد پہلے چار خلفاء ہیں۔ اس حدیث کی رو سے چاروں خلفاء کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس سے کتب تشیع پر خلفاء کی برتری ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے کہ اب آپ جان گئے ہوں گے کہ کتب اہل بیتؑ کے مقابلے پر دوسرے مکاتب فکر کیسے بنے؟ مذکورہ بالا حدیث اور اس جیسی دوسری موضوعی احادیث کی وجہ سے لوگوں کو یہ جرأت ہوئی اور انھوں نے بھی خودساختہ مکاتب فکر قائم کر لیے۔

جب ہم جرح و تعدیل کے اصولوں کی کسوٹی پر اس حدیث کو پرکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ حدیث باطل اور تارعنکبوت سے زیادہ کمزور ہے۔ اگر کوئی سنی اس حدیث کو کسی شیعہ کے سامنے بطور حجت پیش کرے تو اس کا یہ عمل بے خبری پر محمول کیا جائے گا کیونکہ کسی بھی شخص کے سامنے وہ حوالہ پیش کیا جاتا ہے جو اس کے ہاں مسلم ہو جبکہ شیعہ کتب میں تو اس حدیث کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے ہم کسی شیعہ کو تو ہرگز قائل نہیں کر سکتے۔ اب ہم سنی بن کر دیکھتے ہیں کہ اس حدیث کی کیا قدر و قیمت ہے۔

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ کی حدیث صرف سنی کتابوں تک محدود ہے۔ اس کے برعکس بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ کی حدیث متفق بین الفریقین حدیث ہے۔ شیعہ حضرات حدیث ثقلین سے استدلال کرتے ہیں تو ان کے استدلال میں وزن ہوتا ہے کیونکہ حدیث ثقلین دونوں مکاتب فکر کی کتب حدیث میں موجود ہے۔ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی حدیث صرف کتب اہل سنت میں ملتی ہے جبکہ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ کی حدیث سنی اور شیعہ دونوں مذاہب کی کتابوں میں مذکور ہے۔

مصادر حدیث

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ کی روایت پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس حدیث کو نہ تو امام محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) نے اور نہ ہی امام مسلم بن حجاج نیشاپوری (متوفی ۲۶۱ھ) نے لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث اُن کی شرائط پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اہل سنت محدثین یہ کہتے ہیں کہ صحیح ترین احادیث وہ ہیں جنھیں امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ پھر اُن احادیث کا نمبر آتا ہے جنھیں صرف امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ اُس کے بعد اُن احادیث کا نمبر آتا ہے جنھیں صرف امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد اُن احادیث کا نمبر آتا ہے جو اگرچہ بخاری و مسلم نے نقل نہیں کی ہیں لیکن وہ احادیث بخاری و مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہیں۔

ہمارے زیر بحث حدیث نہ تو "متفق علیہ" ہے اور نہ امام بخاری نے اور نہ ہی امام مسلم نے اسے نقل کیا ہے اور یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط پر بھی پوری نہیں اترتی اسی لیے امام حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) نے اسے مستدرک علی الصحیحین میں بھی نقل نہیں کیا۔ البتہ یہ حدیث سنن ابی داؤد، سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں موجود ہے۔[1]

یہ روایت جتنے بھی سلسلوں سے مروی ہے وہ سب کے سب مجروح اور ضعیف ہیں۔ جو بھی اس حدیث کے رجال کی تحقیق کرے گا وہ ہماری طرح اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ روایت جھوٹے راویوں کی اختراع ہے۔ اس کتاب میں ہم اس روایت کے تمام راویوں کے احوال بیان نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہر سلسلے کے ایک یا دو راویوں کا حال بیان کرتے ہیں۔ کسی بھی روایت کی تضعیف کے لیے یہی بات کافی ہوتی ہے کہ اُس کے سلسلۂ سند میں کوئی ضعیف راوی آجائے کیونکہ علمائے جرح و تعدیل کے بقول اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ ساری روایت اسی ضعیف راوی کی اختراع کردہ نہ ہو۔

ترمذی کی روایت

امام محمد بن عیسیٰ بن سورۃ سلمی ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ) نے اس روایت کو بقیہ بن ولید کے طریق سے نقل کیا ہے جس کے متعلق علمائے رجال نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

ابن جوزی حنبلی (متوفی ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ بقیہ ضعیف یا مجہول افراد سے روایت کرتا تھا اور اکثر اُن کے نام حذف کر دیتا تھا اور اُن افراد کے نام ظاہر کرتا تھا جن سے ضعفاء نے روایت کی ہوتی تھی۔[2] ابن حبان لکھتے ہیں کہ "بقیہ کی روایت حجت نہیں ہوتی۔"[3] مزید یہ کہ وہ عیب پوشی کرتا تھا اور ضعیف راویوں سے روایت نقل کرتا تھا۔ اُس کے شاگرد اس کی حدیث کو صحیح انداز میں منتقل نہیں کرتے تھے۔ وہ ضعفاء کے نام حذف کر دیتے تھے۔[4]

ابو اسحاق جوزجانی کہا کرتے تھے کہ خدا بقیہ پر رحم کرے۔ اگر وہ کسی خرافات کو بھی دیکھتا تو اہمیت نہیں دیتا تھا کہ اُسے کس سے نقل کر رہا ہے۔[5]

ترمذی کی بیان کردہ مذکورہ روایت پر علمائے رجال اور محدثین نے اور بھی بہت سے اعتراضات کیے ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ سنن ابی داؤد ج ۴، حدیث ۴۲۰۷۔ سنن ترمذی ج ۵، حدیث ۳۶۷۶۔ سنن ابن ماجہ ج ۱ حدیث ۴۴۔ ۴۳۔

۲۔ الموضوعات، ابن جوزی ج ۱، ص ۱۰۹۔ ۳۔ ایضاً ص ۱۵۱۔ ۴۔ ایضاً ص ۲۱۸

۵۔ خلاصہ عبقات الانوار ج ۲، ص ۱۰۱۔

ابو داؤد کی روایت

سلیمان بن اشعث بن اسحاق المعروف ابو داؤد سجستانی (متوفی ۲۷۵ھ) نے عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ کی حدیث کو ولید بن مسلم کے طریق سے نقل کیا ہے اور اُس نے یہ حدیث ثور ناجی سے سنی تھی۔ ابن حجر کہتے ثور ناجی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُس کا دادا جنگ صفین میں معاویہ کا ہم رکاب تھا اور امام علیؑ کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا چنانچہ ثور جب بھی امام علیؑ کا نام سنتا تو نفرت سے کہتا تھا کہ میں اپنے دادا کے قاتل سے محبت نہیں کرتا۔[1]

محمد بن احمد ذہبی (متوفی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ ابو مسہر کہتے تھے کہ ولید روایت کے نقص کو چھپاتا تھا۔ اُس نے کئی مشہور مجہولوں سے روایت کی اور اُن کی عیب پوشی کی۔[2]

احمد بن حنبل کے فرزند عبداللہ نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے ولید کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ولید نے بہت سی احادیث کسی سند کے بغیر رسول خداؐ سے روایت کی تھیں۔[3]

اس کے علاوہ بھی ابو داؤد کی نقل کردہ حدیث میں بہت سے نقائص ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ابن ماجہ کی روایت

ابو عبداللہ محمد یزید بن عبداللہ بن ماجہ قزوینی (متوفی ۲۷۳ھ) کی پہلی سند میں عبداللہ بن علاء موجود ہے جس کے متعلق ذہبی لکھتے ہیں:

ابن حزم نے کہا کہ یحییٰ اور دیگر محدثین نے اُس کی تضعیف کی ہے۔[4]

وہ یحییٰ سے روایت کرتا ہے اور ابن قطان کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔[5]

ابن ماجہ کی دوسری سند میں اسماعیل بن بشیر بن منصور موجود ہے جس کے متعلق ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ وہ قدری تھا۔[6]

ابن ماجہ کی تیسری سند میں عبدالملک بن صباح موجود ہے۔ اُس نے ثور ناجی سے روایت کی ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عبدالملک پر حدیث میں خیانت کا الزام لگایا جاتا تھا۔[7]

۱۔ خلاصہ تہذیب الکمال ص ۹۵ تا ۹۷۔
۲۔ میزان الاعتدال ج ۴، ص ۳۴۷۔
۳۔ تہذیب التہذیب ج ۱۱، ص ۱۵۵۔
۴۔ میزان الاعتدال ج ۲، ص ۴۶۳۔
۵۔ تہذیب التہذیب ج ۱۱، ص ۲۸۰۔
۶۔ تہذیب التہذیب ج ۱، ص ۲۸۴۔۲۸۵۔
۷۔ میزان الاعتدال ج ۲، ص ۶۵۶۔

اس کے علاوہ ان طرق حدیث پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور اس حدیث کے تمام سلسلے ایک صحابی عرباض بن ساریہ پر منتہی ہوتے ہیں اور خبر واحد عقیدے کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔ عرباض بن ساریہ معاویہ کا پیروکار تھا اور اس کی طرف سے عامل تھا۔

حدیث عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ اور تاریخی واقعات

تاریخی حقائق اس حدیث کو جھوٹی ثابت کرتے ہیں کیونکہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں سنت لکھی ہوئی شکل میں مدون نہیں ہوئی تھی۔ علمائے اہل سنت نے تو اس طرح کی احادیث بھی نقل کی ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا تھا: لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ، وَمَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ فَلْیَمْحُهُ میری حدیث مت لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا میری گفتگو لکھ لی ہو وہ اُسے مٹا دے۔ یہ حدیث سنن دارمی[1] اور مسند احمد میں مرقوم ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ صحابہ نے آنحضرتؐ سے احادیث لکھنے کی اجازت طلب کی تھی لیکن آپ نے انھیں اجازت نہیں دی تھی۔[2] اس کے علاوہ اور بھی روایات موجود ہیں جن سے کتابت حدیث کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حق کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اہل حکومت نے جو اقدامات کئے تھے حدیث پر پابندی بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ حضرت عمرؓ نے سنت کو ختم کرنے کے لیے واضح اجتہاد بھی فرمایا تھا۔

عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ سنت پیغمبرؐ کو لکھیں۔ اس کے لیے انھوں نے صحابہ سے مشورہ بھی کیا تھا۔ صحابہ نے کہا کہ حدیث کو لکھ لینا چاہیے۔ وہ ایک مہینے تک خاموش رہے اور اس دوران استخارہ کرتے رہے۔ آخرکار ایک دن انھوں نے اپنے حتمی فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ میں سنت رسولؐ کو لکھنے کا خواہش مند تھا لیکن مجھے پچھلی امتیں یاد آگئیں جو کتابیں لکھنے میں اتنے مصروف ہوگئے تھے کہ کتاب خدا کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ خدا کی قسم! میں کتاب خدا کو کسی دوسری چیز سے خلوط نہیں ہونے دوں گا۔[3]

یحییٰ بن جعدہ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ سنت کو لکھیں۔ پھر انھوں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے صوبوں کے والیوں کو لکھا کہ جس کسی کے پاس سنت لکھی

۱۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۲ و ۳۹۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۲۲۹۸، حدیث ۳۰۰۴۔ سنن دارمی ج ۱، ص ۱۳۰۔۱۳۱۔ اس کے علاوہ ترمذی اور نسائی نے بھی اسے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے۔

۲۔ سنن ترمذی ج ۵، حدیث ۲۶۶۵۔

۳۔ بروایت حافظ ابن عبدالبر ص ۵۴۔ بحیل در مدخل، نقل از عروہ تقیید العلم ص ۳۹۔

ہوئی ہو وہ اُسے تلف کر دے۔[1]

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب کسی شخص کو کسی شہر کا والی یا حاکم بنا کر بھیجتے تو اُس کو دوسری ہدایات کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی ضرور دیتے کہ قرآن کو جدا رکھنا اور محمدؐ سے روایت نہ کرنا۔ اس کام میں میں بھی تمہارا شریک ہوں۔[2]

اُن کے وہ جملے تاریخ میں محفوظ ہیں جو انھوں نے حضرت ابوذرؓ سے کہے تھے۔ نیز انھوں نے ابن مسعودؓ اور ابو درداءؓ سے کہا تھا کہ یہ کیسی حدیثیں ہیں جو تم محمدؐ سے نقل کر رہے ہو؟[3]

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے احادیث طلب کیں۔ لوگ سمجھے کہ وہ اُن احادیث کی تحقیق کر کے اُن کا تعارض دور کر دیں گے چنانچہ انھوں نے لکھی ہوئی احادیث حضرت عمرؓ کے سپرد کر دیں لیکن حضرت عمرؓ نے وہ تمام احادیث جلا دیں اور کہا کہ یہ اہل کتاب کی آرزوؤں کی طرح ایک آرزو ہے۔

سنت رسولؐ پر پابندی کا حضرت عمرؓ نے جو جواز پیش کیا تھا اُسے عالم تو درکنار جاہل بھی نہیں مان سکتا۔ حضرت عمرؓ کی دلیل قرآن اور دین و عقل کے خلاف تھی۔ اُن کے پاس اس بات کی کیا دلیل تھی کہ حدیث کو قرآن سے دور رکھو جبکہ قرآن خود تاکید کر رہا ہے کہ اُس کی دلالت سنت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ سنت قرآن کی تشریح کرتی ہے۔ رسول اکرمؐ قرآن کریم کے حدود و قیود اور امثال کو بیان کرنے والے تھے۔

فرمان الٰہی ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اے رسول!) ہم نے آپ پر ذکر یعنی قرآن نازل کیا کہ جو چیز لوگوں کی طرف نازل کی گئی ہے آپ اُس کی وضاحت کریں تاکہ لوگ غور و فکر کریں۔ (سورۂ نحل آیت ۴۴)

چنانچہ رسول اکرمؐ قرآن کی جو وضاحت فرمائیں گے اُسی کا نام سنت ہوگا۔

فرمان الٰہی ہے: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ تمہارے ساتھی (محمدؐ) نہ تو بہکے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔ اور وہ اپنی خواہش سے بات بھی نہیں کرتے۔ وہ تو وحی ہوتی ہے جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔ (سورۂ نجم آیت ۲ تا ۴)

خدا نے اس آیت میں اپنے رسولؐ کے قول کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ہم حکم دیں کہ اس وحی کو مت پڑھو یا یہ کہیں کہ اس وحی کو جلا دو تو اس وحی سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا؟!

۱۔ جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱، ص ۶۵۔ تقیید العلم ص ۵۲۔

۲۔ تاریخ طبری ج ۴، ص ۲۰۳۔ ۳۔ کنز العمال ج ۱۰، ص ۲۹۳۔

حدیث کو جلانے کے پیچھے ایک سوچ کارفرما تھی۔ حدیث جلانے کی ابتدا حضرت عمرؓ سے نہیں بلکہ حضرت ابوبکرؓ سے ہوئی تھی۔ اُن کے پاس رسول خداؐ کی پانچ سو احادیث لکھی ہوئی تھیں جو سب کی سب انھوں نے جلا دی تھیں۔[1]

بی بی عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میرے والد کے پاس پانچ سو احادیث جمع تھیں۔ ایک رات وہ صبح ہونے تک بستر میں بے چین ہو کر کروٹیں لیتے رہے۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹی! تمہارے پاس جو احادیث موجود ہیں وہ لے آؤ۔ میں نے احادیث لاکر اُن کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے تمام احادیث کو جلا ڈالا اور کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں اور یہ احادیث تمہارے پاس رہ گئیں اور اُن میں کوئی ایسی حدیث ہوئی جو میں نے کسی پر اعتماد کر کے لکھ لی ہو جبکہ وہ حدیث صحیح نہ ہو تو اس صورت میں یہ ذمے داری میری گردن پر آپڑے گی۔[2]

حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں دور دراز کے شہروں میں یہ حکم بھیجا کہ جس کسی کے پاس احادیث ہوں وہ اُسے تلف کر دے۔[3]

حضرت عثمانؓ بھی سیرت شیخین پر عمل کرتے رہے تھے کیونکہ انھیں خلافت ہی سیرت شیخین کی پیروی کے اقرار کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ برسر منبر کہا تھا کہ ہر وہ حدیث جو دورِ ابوبکر و عمرؓ میں بیان نہ ہوئی ہو اُسے بیان کرنا جائز نہیں ہے۔[4]

معاویہ بن ابی سفیان نے بھی اسی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ اُس نے یہ اعلان کیا تھا:

"اے لوگو! حدیث رسولؐ بیان کرنے سے پرہیز کرو۔ اگر کسی کو حدیث بیان کرنے کا شوق ہو تو وہ بس اسی حدیث کو بیان کرے جسے دورِ عمرؓ میں بیان کیا گیا تھا۔"[5]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خلفاء کی طرف سے حدیث بیان کرنے اور لکھنے پر پابندی تھی۔ حکمرانوں نے یہ پابندی صرف اس لیے عائد کی تھی کہ کہیں امت میں اہلبیتؑ کے فضائل پھیل نہ جائیں اور لوگ اُن کی حکومت کا تختہ نہ الٹ دیں۔

یہ بات اگرچہ بہت سے دوستوں کو ناگوار گزرے گی لیکن حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے اور تاریخ کے ہر قاری کو ان واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔

معلوم نہیں کہ جن احادیث کو شیخین نے نذرِ آتش کیا اور کرایا تھا اُن میں ایسی کون سی سنت تھی

۱۔ الاعتصام بحبل اللہ المتین ج ۱، ص ۶۰۔

۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص ۵۔ ۳۔ صحیح مسلم مقدمہ العلم ص ۵۳۔

۴۔ کنز العمال ج ۱۰، ص ۲۹۵، حدیث ۲۹۴۲۳۔ ۵۔ کنز العمال ج ۱۰، ص ۲۹۱، حدیث ۲۹۴۶۰۔

جس کی پیروی کا رسول اکرمؐ نے حکم دیا تھا؟ اگر مجموعہ احادیث میں شیخین کے فضائل ہوتے تو وہ انھیں کبھی بھی نذر آتش نہ کراتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا سنت وہی تھی جس کے تلف کرنے کا حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا یا جسے حضرت ابوبکرؓ نے نذر آتش کیا تھا؟ اگر سنت کی پیروی کا حکم اسلام کا جزو ہے تو خلفاء نے اس حکم کو کیوں نہیں مانا اور انھوں نے حدیث بیان کرنے، لکھنے سے کیوں روکا؟ جو شخص رسول خداؐ کے بعد آپ کی سنت پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو اُسے کیا کرنا چاہیے؟

فرض کریں کہ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ "میری سنت پر عمل کرو" اور سنت صدر اول میں مدون نہیں تھی تو دور صحابہ کا مسلمان سنت کو تلاش کرنے کے لیے کن صحابہ سے رجوع کرے گا کیونکہ صحابہ تو والی، حاکم اور سرحدوں کے نگہبان بن کر عرب و عجم میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس صورت میں اُس مسلمان پر اپنے "مرجع" کو تلاش کرنا فرض ہوگا؟! وہ مسلمان احکام زندگی جاننے کے لیے تمام صحابہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن سے احکام دریافت کرے یا پھر جن دو چار صحابیوں تک اُس کی پہنچ ہو اُن پر اکتفا کرے؟

اگر بالفرض وہ دو چار صحابہ پر ہی اکتفا کرتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اُن صحابہ کے پاس جو احادیث ہوں وہ منسوخ [1] ہوں اور ناسخ احادیث دوسرے صحابہ کے پاس ہوں اور وہ مدینہ میں موجود نہ ہوں

۱۔ ایک شخص نے حضرت امیر المومنینؑ سے من گھڑت اور متعارض حدیثوں کے متعلق دریافت کیا جو (عام طور سے) لوگوں کے ہاتھوں میں پائی جاتی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، ناسخ اور منسوخ، عام اور خاص، واضح اور مبہم، سچ اور غلط سب ہی کچھ ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں آپ پر بہتان لگائے گئے یہاں تک کہ آپ کو کھڑے ہو کر خطبہ میں کہنا پڑا کہ "جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر بہتان باندھے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

تمہارے پاس چار طرح کے لوگ حدیث لانے والے ہیں کہ جن کا پانچواں نہیں: ایک تو وہ جس کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ، وہ ایمان کی نمائش کرتا ہے اور مسلمانوں کی سی وضع قطع بنا لیتا ہے، نہ گناہ کرنے سے گھبراتا ہے اور نہ کسی الزام میں پڑنے سے جھجکتا ہے، وہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ باندھتا ہے، اگر لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ یہ منافق اور جھوٹا ہے، تو اس سے نہ کوئی حدیث قبول کرتے اور نہ اس کی بات کی تصدیق کرتے لیکن وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی ہے، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا بھی ہے اور ان سے حدیثیں بھی سنی ہیں اور آپ سے تحصیل علم بھی کی ہے۔ چنانچہ وہ (بے سوچے سمجھے) اس بات کو قبول کر لیتے ہیں

اور دوسرا شخص وہ ہے جس نے (تھوڑا بہت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا لیکن جوں کا توں اسے یاد نہ رکھ سکا اور اس میں اسے سہو ہوگیا۔ یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا، یہی کچھ اس کے دسترس میں ہے اسے ہی دوسروں سے بیان کرتا ہے اور اسی پر خود بھی عمل کرتا ہے اور کہتا بھی یہی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے۔ اگر

جبکہ اہل حزم تو کہتے ہیں کہ اُن کے بغیر حجت تمام نہیں ہو سکتی۔

دور صحابہ کے مسلمانوں کی مشکل یہ تھی کہ فتوحات کے نتیجے میں ریاست وسیع ہو چکی تھی جبکہ صحابہ کم تھے اور پھیلے ہوئے تھے اور فتوحات کے نتیجے میں نت نئے مسائل سے بھی مسلمانوں کو سابقہ رہتا تھا ان حالات میں اُن کے سوالات کا جواب دے تو کون دے؟!! اس طرح بہت سی احادیث و احکام ضائع ہو گئے اور حکمرانوں کا پہلے سے طے شدہ منصوبہ بھی یہی تھا۔

کتب حدیث ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ جب رسول خداؐ نے اپنے مرض الموت میں یہ فرمایا تھا کہ "میرے پاس اونٹ کے شانے کی ہڈی اور دوات لے آؤ تا کہ میں تمہارے لیے ایسی دستاویز لکھ دوں

مسلمانوں کو یہ خبر ہو جاتی کہ اس کی یادداشت میں کہیں چوک ہو گئی ہے تو وہ اس کی بات کو نہ مانتے اور اگر خود بھی اسے اس کا علم ہو جاتا تو اسے چھوڑ دیتا۔

تیسرا شخص وہ ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنا کہ آپ نے ایک چیز کے بجا لانے کا حکم دیا ہے پھر آپ نے اس سے روک دیا لیکن یہ اسے معلوم نہ ہو سکا یا یوں کہ اس نے پیغمبرؐ کو ایک چیز سے منع کرتے ہوئے سنا پھر آپ نے اس کی اجازت دے دی لیکن اس کے علم میں یہ چیز نہ آ سکی۔ اس نے (قول) منسوخ کو یاد رکھا اور (حدیث) ناسخ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ اگر اسے خود معلوم ہو جاتا کہ یہ منسوخ ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتا اور مسلمانوں کو بھی اگر اس کے منسوخ ہو جانے کی خبر ہوتی تو وہ بھی اسے نظر انداز کر دیتے۔

اور چوتھا شخص وہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ نہیں باندھتا۔ وہ خوف خدا اور عظمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش نظر کذب سے نفرت کرتا ہے، اس کی یادداشت میں غلطی واقع نہیں ہوتی بلکہ جس طرح سنا اسی طرح اسے یاد رکھا اور اسی طرح اسے بیان کیا، نہ اس میں کچھ بڑھایا، نہ اس میں کچھ گھٹایا۔ حدیث ناسخ کو یاد رکھا تو اس پر عمل بھی کیا، حدیث منسوخ کو بھی اپنی نظر میں رکھا اور اس سے اجتناب برتا، وہ اس حدیث کو بھی جانتا ہے جس کا دائرہ محدود ہے اور اسے بھی جو ہمہ گیر اور سب کو شامل ہے اور ہر حدیث کو اس کے محل و مقام پر رکھتا ہے اور یوں ہی واضح اور مبہم حدیثوں کو پہچانتا ہے۔

کبھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام دو رخ لیے ہوتا تھا، کچھ کلام وہ جو کسی وقت یا افراد سے مخصوص ہوتا تھا اور کچھ وہ جو تمام اوقات اور تمام افراد کو شامل ہوتا تھا اور ایسے افراد بھی سن لیا کرتے تھے کہ جو کہہ ہی نہ سکتے تھے کہ اللہ نے اس سے کیا مراد لیا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس سے مقصد کیا ہے۔ تو یہ سننے والے اسے سن تو لیتے تھے اور کچھ اس کا مفہوم بھی قرار دے لیتے تھے مگر اس کے حقیقی معنی اور مقصد اور مدعا سے ناواقف ہوتے تھے اور نہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سب ایسے تھے کہ جنہیں آپ سے سوال کرنے کی ہمت ہو، بلکہ وہ تو یہ چاہا کرتے تھے کہ کوئی صحرائی بدو یا پردیسی آ جائے اور وہ کچھ پوچھے تو یہ بھی سن لیں مگر میرے سامنے سے کوئی چیز نہ گزرتی تھی مگر یہ کہ میں اس کے متعلق پوچھتا تھا اور پھر سے یاد رکھتا تھا۔ یہ ہیں لوگوں کے احادیث و روایات میں اختلاف کے وجوہ و اسباب۔

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۱۰، بحوالہ اصول کافی، تحف العقول، مفتاح الاسباح) رشوانی

کہ تم میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا تھا اِنَّهٗ لَيَهْجُرُ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ یہ ہذیان کہہ رہا ہے۔ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔[1]

جس مقصد کے لیے حضرت عمرؓ نے رسول خداؐ کو دستاویز لکھنے سے روکا تھا اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے احادیث کی جمع و تدوین سے منع کیا تھا۔ جب سنت موجود ہی نہیں تھی اور احادیث بیان کرنے پر پابندی تھی تو پھر عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ تم میری سنت کی پیروی کرو کے کیا معنی ہیں؟

اگر بالفرض یہ حدیث صحیح ہوتی تو صحابہ اسی پر عمل کرتے جبکہ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ نہ تو خلفاء نے اور نہ ہی صحابہ نے اس پر عمل کیا تھا۔

اس سلسلے میں ذہبی تو اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ وہ تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:

وفات رسولؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ تم لوگ ایسی احادیث بیان کرتے ہو جن میں تم باہمی اختلاف رکھتے ہو۔ تمہارے بعد کے لوگ اس میں اور زیادہ اختلاف کریں گے لہٰذا تم کوئی حدیث بیان نہ کرو۔ اگر تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے۔ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانو۔[2]

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب تک کوئی ماخذ مرتب اور مدون نہ ہو تب تک اُس کو قانون سازی کا منبع تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔[3]

امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ سرکار رسالت مآبؐ اور خلفائے راشدین کے ادوار میں سنت مدون نہیں تھی۔ سچ یہ ہے کہ رحلت رسولؐ کے ڈیڑھ سو سال بعد حدیث مدون ہوئی تھی۔ جب حدیث رسول اکرمؐ کی حین حیات مدون ہی نہیں تھی تو آپ نے مسلمانوں سے یہ کیوں فرمایا عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ تم میری سنت پر عمل کرو؟!

دوسری حدیث

حدیث ثقلین کے مقابلے میں وضعی حدیث کے الفاظ یہ ہیں اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے اور وہ ہیں اللہ

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم ج ۱، ص ۳۹۔ ج ۷، ص ۱۱۰۔

۲۔ شیخ محمود ابریہ مصری، اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۵۳۔

۳۔ محمد تقی حکیم، اصول الفقہ المقارن ص ۷۳۔

کی کتاب اور میری سنت۔

یہ حدیث پہلی حدیث سے بھی زیادہ کمزور ہے اور یہ اس قابل ہی نہیں کہ اس پر بحث کی جائے۔ اس کے جواب کے لیے سابقہ بحث ہی کافی ہے۔ سابقہ بحث کے علاوہ چند مفروضات اور بھی عرض خدمت ہیں:

(۱) یہ حدیث "صحاح ستہ" کی کسی بھی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ یہی بات اس کی تضعیف کے لیے کافی ہے۔ آخر ایسی حدیث کو ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے جو صحاح اور مسانید میں سے کسی میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس حدیث کی اس قدر نشر و اشاعت کی گئی کہ عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حدیث حتمی طور پر بخاری و مسلم میں موجود ہوگی جبکہ یہ تو کتب صحاح میں سے کسی بھی کتاب میں موجود نہیں ہے۔

(۲) اس حدیث کا قدیم ترین ماخذ موطا امام مالک ہے۔ ان کے بعد ابن ہشام نے اسے سیرت میں اور ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں نقل کیا ہے۔ مذکورہ تین کتابوں کے علاوہ اس حدیث کو میں نے کسی کتاب میں نہیں پایا۔

(۳) صواعق محرقہ میں اسے "حدیث مرسل" کے طور پر نقل کیا گیا ہے اور سیرت ابن ہشام میں اس کی سند ناقص ہے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے[1] کہ انھوں نے یہ حدیث سیرت ابن اسحاق سے نقل کی ہے لیکن مجھے سیرت ابن اسحاق کے کسی نسخے میں یہ حدیث نہیں ملی۔ خدا جانے ابن ہشام نے یہ حدیث کہاں سے نقل کی ہے؟

(۴) امام مالک کی روایت اگرچہ مرفوع ہے لیکن اس کی بھی سند نہیں ہے۔ امام مالک ۱۷۹ھ کی موطا میں یہ روایت یوں آئی ہے "مالک سے مجھ تک یہ بات پہنچی ہے اور مالک تک یہ بات پہنچی کہ رسول خداؐ نے فرمایا اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ کِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ"[2]

محترم قاری! آپ نے دیکھا کہ اس حدیث کی سند ہی موجود نہیں ہے لہٰذا بے سند حدیث پر اعتماد کرنا درست نہیں ہے۔ امام مالک بن انس اس روایت کے بیان میں منفرد ہیں۔ اُن کے استاد امام ابوحنیفہ نے بھی یہ روایت بیان نہیں کی تھی اور امام مالک بن انس کے شاگردوں امام محمد بن ادریس شافعی اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہ روایت نہیں کی۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو ائمہ مذاہب اور ائمہ حدیث اسے ضرور نقل کرتے۔

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۴، ص ۱۵۱۔ صواعق محرقہ ص ۱۲۵۔ ۲۔ موطا ج ۲، ص ۸۹۹، حدیث ۳، حاشیہ محمد عبدالباقی۔

(۵) امام حاکم نے اس حدیث کو مستدرک میں دو طریقوں سے نقل کیا ہے۔[1]

الف: پہلی روایت زید الدبلمی نے عکرمہ سے اور اُس نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس کے رواۃ میں عکرمہ شامل ہے۔ وہ بدترین جھوٹا اور آل محمدؐ کا دشمن تھا۔ اُس نے امام علیؑ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور اُن کی تکفیر کرتا تھا۔

ب: دوسری روایت صالح بن موسیٰ طلحی کی ہے جو اُس نے عبدالعزیز بن رفیع سے، اُس نے ابن صالح سے اور اُس نے ابو ہریرہ سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ بقول ابو سعید خدریؓ رسول خداؐ نے یہ حدیث مرض الموت کے دوران ارشاد فرمائی تھی اور رسول خداؐ کی وفات کے وقت ابو ہریرہ بحرین میں تھے۔ ابو ہریرہ رسول خداؐ کی وفات سے ڈیڑھ سال قبل علاء بن حضرمی کے ساتھ بحرین گئے تھے۔ جب ابو ہریرہ وفات پیغمبرؐ کے وقت موجود ہی نہیں تھے تو انھوں نے یہ حدیث کیسے سنی تھی؟؟!

اصل حدیث ثقلین کو احمد بن حسین بن علی بیہقی نے السنن الکبریٰ (جلد ۱۰، ص ۱۱۴ مطبوعہ دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان) میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حدیث ثقلین کا وہ متن نقل کیا ہے جسے امام مسلم نے صحیح مسلم میں لکھا ہے اور اس میں بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ کے الفاظ موجود ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مستدرک کی دو احادیث کے متن نقل کئے ہیں۔

بیہقی کی اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حدیث صحیح اور دوسری ضعیف ہے۔

(۶) خطیب بغدادی کی کتاب الفقیہ المتفقہ[2] میں یہ حدیث موجود ہے۔ خطیب نے پہلے تو مستدرک کی عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ والی روایت نقل کی ہے اور پھر دوسری حدیث یہ نقل کی ہے عن سیف بن عمر عن ابن اسحاق الاسدی عن صباح بن محمد عن ابن حازم عن ابی سعید الخدری یہ روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ "سیف بن عمر" کے متعلق علمائے رجال کا اجماع ہے کہ وہ جھوٹا، بے دین اور زندیق تھا۔ سیف بن عمر کے متعلق علماء کے نظریات بعد میں بیان کئے جائیں گے۔

(۷) قاضی عیاض نے الفقیہ المتفقہ کی سند کے ساتھ اس حدیث کو اپنی کتاب الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ والسماع میں نقل کیا ہے۔[3]

۱۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۹۳ مطبوعہ دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان۔

۲۔ الفقیہ المتفقہ تالیف خطیب بغدادی ج ۱، ص ۹۳۔ شیخ اسماعیل انصاری، مطبوعہ دارالافتاء کی تصحیح شدہ، مطبوعہ بیروت۔

۳۔ الالماع تالیف قاضی عیاض ص ۹ تحقیق احمد صقر، طبع اول، ناشر دارالتراث، القاہرہ، المکتبۃ العتیقۃ، تیونس۔

یہ روایت بھی سیف بن عمر کی گھڑی ہوئی ہے۔

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی حدیث کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

یہ حدیث تین صحابہ یعنی ابن عباسؓ، ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے منقول ہے اور مؤلفین اہلسنت نے تقریباً پانچ سو سال کے بعد اس روایت کے راوی پیدا کئے تھے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ مستدرک سے قبل کسی بھی کتاب میں یہ حدیث ان صحابہ سے منقول نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مذکورہ تینوں صحابہ سے یہ حدیث بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ کے الفاظ سے بھی منقول ہے اور عِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ کے الفاظ صحیح مسلم میں موجود ہیں۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ کس حدیث ثقلین کو مانا جائے۔ اصلی کو یا وضعی کو؟[1]

اس طویل بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی روایت کی حیثیت ایک مرفوع، مرسل اور خبر واحد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس حدیث کے جعلی ہونے کا سب سے بڑا عقلی ثبوت یہ ہے کہ اگر قرآن و سنت ہی ثقلین ہوتے اور اُن سے وابستگی گمراہی سے بچنے کا ذریعہ ہوتی تو پھر پیغمبر اکرمؐ اس کا بار بار اعادہ کرتے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے۔ صحابہ اس حدیث کو یاد کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اتنی اہم چیز کو رسول رحمتؐ نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اس کے برعکس آپ نے بہت سے مواقع پر بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ کہہ کر یہ اعلان فرمایا تھا کہ اگر تمہیں گمراہی سے بچنا ہے تو پھر قرآن اور میرے اہلبیتؑ کے دامن سے وابستگی اختیار کرلو۔ گمراہی سے بچ جاؤ گے۔

جہاں تک بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کا تعلق ہے یہ روایت دلالت میں مبہم اور ناقص ہے اور اس کا ماخذ بھی مشکوک ہے۔

دمشق کے ایک محدث سے مباحثہ

میں نے شام کا سفر کیا تو وہاں کے ایک عالم شیخ عبدالقادر ارنؤطی سے میری ملاقات ہوئی۔ شیخ کے پاس اجازہ حدیث تھا۔ ہماری یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ کسی پروگرام کے بغیر اچانک ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

دمشق کے قریب حضرت سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کا روضہ مبارک ہے جہاں ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ اس علاقے میں میری ملاقات ایک سوڈانی بھائی سے ہوئی۔ اُس کا نام عادل تھا۔ اللہ نے اُس کے دل کو نور اہل بیتؑ سے منور کر رکھا تھا۔ اُس میں جتنے نیک اوصاف تھے وہ کسی مقدر

---

[1] بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی تصحیح کے لیے علامہ سید علی جدی نے مجھ سے کافی تعاون کیا تھا۔

والے کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ با اخلاق، دین دار اور متقی انسان تھا۔ گردش زمانہ سے مجبور ہو کر وہ شام چلا آیا تھا اور سیدہ زینبؑ کے روضے سے نو کلو میٹر جنوب میں ایک فارم میں کام کرتا تھا۔ اُس کے فارم کے ساتھ ایک دین دار بزرگ ابوسلیمان کا فارم تھا۔ جب ابوسلیمان کو معلوم ہوا کہ اُس کے برابر والے فارم کا کارکن شیعہ ہے تو وہ اُس کے پاس آیا اور اُس سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! سوڈان کے تمام لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں اور سنی ہوتے ہیں۔ تمہارا شیعیت سے کیا تعلق ہے؟ کیا تمہارے خاندان میں کوئی شیعہ ہے؟

عادل نے کہا کہ میرے خاندان میں کوئی شیعہ نہیں ہے لیکن دین و ایمان کا تعلق خاندان سے نہیں ہوتا اور نہ ہی دین کے لیے خاندان کی تقلید ضروری ہے۔

(ابوسلیمان اور عادل کی گفتگو کو ہم مکالمے کی صورت میں لکھ رہے ہیں)

ابوسلیمان: شیعہ جھوٹ بولتے ہیں اور لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔

عادل: میں نے تو اُن میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

ابوسلیمان: میں اُن کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

عادل: جناب! کیا آپ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور صحاح اہل سنت پر ایمان رکھتے ہیں؟

ابوسلیمان: ہاں۔

عادل: شیعہ اپنے تمام عقائد کا اپنی کتابوں نیز ان مصادر سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

ابوسلیمان: وہ جھوٹے ہیں۔ اُن کے پاس جعلی کتابیں ہیں۔

عادل: لیکن شیعوں نے مجھے کسی ایک لائبریری کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب دنیا کی جس لائبریری سے چاہو جا کر ان کتابوں کو پڑھ لو۔

ابوسلیمان: یہ جھوٹ ہے۔ میرا شرعی فرض ہے کہ میں تمہیں دوبارہ راہ اہل سنت میں لے جاؤں کیونکہ رسول خداؐ کا فرمان ہے کہ اگر تمہارے ذریعے ایک آدمی بھی ہدایت پا جائے تو وہ تمہارے لیے روئے زمین کی سلطنت سے بہتر ہے۔

عادل: ہم حق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔ ہم دلیل کے ساتھ سفر کرنے کے عادی ہیں۔ دلیل و برہان ہمیں جہاں لے جائے ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔

ابوسلیمان: دمشق کے سب سے بڑے عالم علامہ عبدالقادر ارناؤطی سے میری آشنائی ہے۔ وہ انتہائی جلیل القدر عالم ہیں۔ وہ محدث اور حافظ الحدیث ہیں۔ میں انھیں یہاں لے آؤں گا۔ ہاں! اور تمہیں بتاؤں کہ شیعوں نے انھیں کئی ملین لیرا (Lira) سے خریدنے کی کوشش کی تھی جو انھوں نے رد کر دی۔

عادل نے علامہ صاحب سے ملاقات کی ہامی بھرلی۔ ابو سلیمان نے کہا کہ یہ تبلیغ صرف تمہارے لیے ہی نہیں۔ اگر کوئی اور سوڈانی تمھیں تشیع کی طرف مائل دکھائی دے تو تم اسے بھی یہاں لے آنا۔ امید ہے کہ علامہ صاحب تمہاری تسلی کرائیں گے۔

عادل میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ایک سنی محدث ہم سے مباحثہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس مباحثے میں آپ کی شرکت انتہائی لازمی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے بیحد خوشی ہوگی۔ عادل نے کہا کہ آپ ۸ رصفر ۱۴۱۱ھ کو بارہ بجے دن میرے فارم پر تشریف لائیے۔ میں نے کہا انشاء اللہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

اُس دن گرمی بہت زیادہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سورج انگارے برسا رہا ہو۔ میں تین سوڈانی دوستوں کے ہمراہ عادل کے فارم کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو عادل نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ عادل کے سرسبز و شاداب فارم میں انواع و اقسام کے ایسے پھل دار درخت تھے جو ہمارے سوڈان میں نہیں پائے جاتے۔ پھر ہم سب مل کر ابو سلیمان کے فارم پر گئے۔ اُس نے شدید گرمی کے باوجود ہمارا استقبال کیا۔ وہاں کچھ دیر چہل قدمی کے بعد ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ جیسے ہی ہم نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے کاروں کا ایک کارواں اپنی طرف آتا ہوا دیکھا۔ معلوم ہوا کہ علامہ ارزوطی تشریف لا رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد علامہ صاحب اور اُن کے عقیدت مند کاروں سے اترے اور فارم میں قدم رنجا ہوئے۔ فارم لوگوں سے بھر گیا فارم کے باہر کاروں کی لائن لگ گئی۔ اس چہل پہل کو دیکھ کر میرے سوڈانی دوستوں کو حیرت سی ہوئی۔ انھیں اعتبار نہیں آتا تھا کہ چند دینی مسائل کے لیے اتنا بڑا اہتمام کیا جائے گا۔ فارم میں پہلے سے موجود افراد نے آنے والے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ پھر تمام لوگ بیٹھ گئے۔ میں علامہ صاحب کے بالکل ساتھ بیٹھ گیا۔

پہلے پہل تو رسم تعارف ہوئی۔ ہمارے میزبان نے کہا کہ شیخ معظم! یہ ہمارے سوڈانی بھائی ہیں۔ یہ جنید "نہب" کے علاقے میں رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سیدہ "نہب" کا علاقہ شیعوں کا مرکز ہے اور یہ لوگ شیعیت سے متاثر ہیں۔ اور ہمارے برابر والے فارم کا کارکن تو شیعہ ہے۔

شیخ نے کہا: وہ کہاں ہے؟

ابو سلیمان نے کہا کہ وہ اپنے فارم پر ہے۔ بس آیا چاہتا ہے۔

ہم میں سے ایک سوڈانی عادل کے پاس گیا اور اُسے بلا لایا۔ عادل کے آنے تک شیخ نے شام، دمشق اور حمص کی فضیلت کی بہت سی احادیث بیان کیں۔ شہروں کی فضیلت پر شیخ نے آدھے گھنٹے

یہ گفتگو کی۔ شیخ کی یہ گفتگو بے محل اور بے موقع تھی۔ مجھے اُن کے اس رویے پر تعجب ہوا کہ شیخ موقع سے فائدہ کیوں اٹھا رہے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ہمیں ایسی بھی احادیث سنا سکتے تھے جو ہم سب کے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھیں۔

اس کے بعد شیخ نے کہا کہ اسلام رشتے داری پر قائم نہیں ہے۔ اللہ کی نازل کردہ شریعت تمام انسانوں کے لیے مساوی ہے۔ اس لیے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنا دین اہل بیتؑ سے حاصل کریں؟

حضرت رسول اکرمؐ ہمیں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت کی پیروی کا حکم دے کر گئے تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم ان سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے کوئی بھی ضعیف قرار نہیں دے سکتا۔ قرآن و سنت کے سوا اور کوئی راستا نہیں ہے۔ یہ کہا اور عادل کی پیٹھ تھپتھپا کر بولے: بیٹا! شیعوں کی باتوں سے دھوکا نہ کھانا۔

عادل کی بجائے میں نے کہا جناب شیخ! ہم حق کی جستجو کر رہے ہیں اور ہمیں چند مسائل میں اشتباہ ہے۔ ہم آپ سے استفادہ کرنے کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ بہت بڑے عالم، محدث اور حافظ ہیں۔

شیخ نے کہا: ہاں! ایسا ہی ہے۔

میں نے کہا: جناب عالی! یہ ایک حقیقت ہے اور مریض دل کے سوا کوئی بھی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت مسلمان مختلف فرقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور ہر فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صرف وہی حق پر ہے۔ اب ہم حق کو تلاش کریں تو کیسے کریں جبکہ حق کو ڈھونڈنا بہت ضروری ہے کیونکہ خدا کا حکم ہے کہ ہم سچی شریعت کی پیروی کریں؟

کیا خدا یہ چاہتا ہے کہ ہم فرقوں میں بٹے رہیں یا اُس کی رضا اس میں ہے کہ ہم ایک امت ہو کر اور ایک شریعت کے پیرو بن کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو پھر یہ فرمائیں کہ خدا و رسولؐ نے ہمیں گمراہی سے بچانے کے لیے کوئی انتظام کیا تھا یا نہیں کیا تھا؟ اور اگر ہم گمراہی سے بچنا چاہیں تو کس طرح بچیں؟ ہمیں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ رسول خداؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی امت میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ کا یہ حق تھا کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھنے کا کوئی انتظام کرتے اور ایسے اسباب فراہم کرتے جو ہمیں گمراہی سے بچا سکیں۔ کیا حبیب خداؐ نے اس طرح کی کوئی ضمانت دی تھی؟!

شیخ نے کہا کہ حضرت رسول اکرمؐ کو امت کی بڑی فکر تھی۔ آپ نے امت کو اختلاف اور

افتراق سے بچانے کے لیے ہدایت کا سامان فراہم کیا تھا اور یہ ضمانت دی تھی کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے تو گمراہی سے بچ جاؤ گے یعنی اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ کی سنت۔

میں نے کہا: جناب! آپ کو یاد ہوگا کہ چند منٹ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ بہت سی احادیث زبان زد عام و خاص ہیں لیکن وہ کتب حدیث میں کہیں نہیں ملتیں۔

شیخ نے کہا: ہاں! صحیح ہے۔

میں نے کہا: جناب والا! کتاب و سنت والی جو حدیث آپ اس وقت پڑھ رہے ہیں یہ صحاح ستہ کی کسی ایک کتاب میں بھی موجود نہیں ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ محدث ہیں۔ اس کے باوجود اس طرح کی کمزور روایت کو کیسے مان رہے ہیں؟

یہ سن کر شیخ چراغ پا ہو گئے اور اونچی آواز میں کہنے لگے کہ کیا تم اس حدیث کو ضعیف کہنا چاہتے ہو؟ شیخ کے اس غصے کو دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی کہ انھیں غصہ آتا۔ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا محترم شیخ! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔ میں تو آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے یا نہیں؟ شیخ نے کہا: تم نے صحیح کتابوں کو صرف چھ کے عدد تک ہی کیوں محدود سمجھ لیا ہے۔ حدیث کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ یہ حدیث مؤطا امام مالک میں موجود ہے۔ میں نے حاضرین کی طرف دیکھا اور کہا کہ آپ گواہ رہیں کہ شیخ صاحب مان گئے ہیں کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ یہ حدیث مؤطا امام مالک میں ہے۔ شیخ صاحب نے بڑے تند لہجے میں میری بات کاٹی اور کہا کیا مؤطا حدیث کی کتاب نہیں ہے؟

میں نے کہا کہ مؤطا حدیث کی کتاب ضرور ہے لیکن بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی روایت مؤطا میں مرفوع ہے۔ اس کی سند بیان نہیں کی گئی ہے جبکہ مؤطا کی باقی روایات کی سند موجود ہے۔

شیخ کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اس لیے انھوں نے مجھے تھپڑ رسید کرنے شروع کر دیے اور کہنے لگے کہ تو حدیث کو ضعیف بنانا چاہتا ہے؟ تیری کیا مجال کہ تو حدیث کو ضعیف بنا سکے؟ الغرض شیخ کی غیر معقول حرکات کا تمام حاضرین نے نوٹس لیا اور ہر شخص نے اسے غلط سمجھا۔

میں نے کہا: محترم شیخ! آپ یہاں بحث و استدلال کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی اس روش سے مشکل حل نہیں ہوگی۔ میں بہت سے شیعہ علماء کے پاس بیٹھا ہوں لیکن انھوں نے کبھی غیر معقول طریقہ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ . . (اے رسول!) اگر آپ بدخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۹)

یہ سنا تو شیخ کی ہوا ہی ختم ہوگئی۔

میں نے کہا: شیخ محترم! یہ فرمائیں کہ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی جو روایت مؤطا میں ہے وہ صحیح ہے یا ضعیف؟

شیخ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ ضعیف ہے۔

میں نے کہا: جب آپ کو معلوم تھا کہ حدیث ضعیف ہے تو آپ نے مؤطا سے اس حدیث کو پیش کیوں کیا؟ شیخ کی آواز دوبارہ بلند ہوئی اور انھوں نے کہا کہ یہ حدیث دیگر اسناد سے بھی منقول ہے۔

میں نے حاضرین کو متوجہ کیا اور اُن سے کہا: بھائیو! اب آپ نے دیکھ لیا کہ شیخ محترم مؤطا سے دستبردار ہو چکے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دیگر اسناد سے بھی منقول ہے۔ اب ہم سننا چاہتے ہیں کہ دیگر اسناد کون سی ہیں جن سے یہ حدیث منقول ہے۔

شیخ کو اپنی شکست کا یقین ہوگیا تھا کیونکہ غالباً وہ جانتے تھے کہ اُن کے پاس صحیح اسناد موجود نہیں ہیں۔ اس وقت حاضرین میں سے ایک نے دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ شیخ نے بحث سے نجات کے لیے اسے مناسب جانا اور مجھے اشارہ کر کے کہا کہ ذرا اس آدمی کی بات سنو۔ مجھے شیخ کی بیچارگی کا پورا اندازہ ہو چکا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ شیخ اپنے موضوع سے انحراف کریں۔ اس لیے میں نے زور دے کر کہا شیخ صاحب! ہم سب طرق حدیث سننے کے منتظر ہیں۔

شیخ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا بھائی مجھے اس کی دیگر اسناد اس وقت یاد نہیں ہیں، میں وہ اسناد کتابوں سے دیکھ کر تمھیں لکھ بھیجوں گا۔

میں نے کہا سبحان اللہ! عجیب بات ہے۔ آپ کو شہروں کی فضیلت کی احادیث تو یاد ہیں لیکن جس حدیث پر مذہب اہل سنت قائم ہے اور جو حدیث امت کو گمراہی سے نجات دے سکتی ہے اُس کے اسناد یاد نہیں ہیں۔

شیخ بالکل خاموش رہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص جس نے شیخ کی شرمندگی کو بھانپ لیا تھا میری طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ بھائی! تم شیخ سے مزید کیا چاہتے ہو۔ انھوں نے کہہ تو دیا ہے کہ وہ اسناد لکھ بھیجیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تمہارے لیے مزید سہولت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث سیرت ابن ہشام میں بھی موجود ہے لیکن کسی سند کے بغیر۔

شیخ نے کہا کہ سیرت ابن ہشام، سیرت کی کتاب ہے حدیث کی نہیں۔

میں نے کہا تو کیا آپ سیرت ابن ہشام میں موجود حدیث کو ضعیف سمجھتے ہیں؟

شیخ نے کہا: ہاں!

میں نے کہا یہ تو آپ کا احسان ہے کہ آپ نے اس کی تضعیف کا بوجھ میرے کندھوں سے ہٹا دیا ہے۔

میں نے مزید کہا کہ یہ روایت قاضی عیاض کی کتاب الالماع میں بھی موجود ہے۔ نیز خطیب نے اسے الفقیہ المتفقہ میں بھی نقل کیا ہے۔ کیا آپ ان روایات کو تسلیم کرتے ہیں؟

کہنے لگے نہیں۔

یہ سنا تو میں نے کہا دوستو! شیخ محترم یہ گواہی دے رہے ہیں کہ بِکِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی حدیث ضعیف ہے مگر ہمارے پاس گمراہی سے بچنے کے لیے رسول خداؐ کی ایک ضمانت موجود ہے اور وہ ضمانت اس حدیث متواتر کی شکل میں ہے جو صحیح بخاری کے علاوہ صحاح ستہ کی باقی کتابوں میں مرقوم ہے۔ حضرت رسول خداؐ کا فرمان ہے: اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ کِتَابَ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ، وَعِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ فَاِنَّ الْعَلِیْمَ الْخَبِیْرَ اَنْبَاَنِیْ اَنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ یعنی میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب تک تم ان سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب آسمان و زمین کے درمیان لٹکی ہوئی رسی ہے اور میرے اہلبیت۔ خدائے علیم و خبیر نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر نہ پہنچ جائیں۔

احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق یہ حدیث ثقلین کا متن ہے۔ جو بھی شخص اسلام کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ اسی راستے پر چلے جس پر چلنے کا رسول خداؐ نے حکم دیا ہے۔ اُسے قرآن اور اہل بیتؑ کی قیادت تسلیم کرنی چاہیے۔ اہل بیتؑ کے متعلق قرآن نے یہ گواہی دی ہے کہ وہ ہر نجاست اور گناہ سے پاک ہیں۔

اس کے بعد میں نے کچھ فضائل اہل بیتؑ بیان کیے۔ اس دوران شیخ بالکل خاموش رہے انھوں نے ایک جملہ بھی منہ سے نہیں نکالا حالانکہ اس سے قبل وہ کئی بار میری بات کاٹ چکے تھے۔ جب شیخ کے مریدوں نے اپنے مذہب کی شکست دیکھی تو وہ شور مچانے لگ گئے۔

میں نے کہا: دوستو! مخالفت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ حق سے اتنی دوری اختیار نہ کرو کہ کل تمھیں شرمندہ ہونا پڑے۔ تم لوگ کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے رہو گے؟! جبکہ آیات حق واضح ہیں اور میں تم پر حجت قائم کر چکا ہوں اور حدیث ثقلینؑ کے ذریعے تمھیں بتا چکا ہوں کہ دین قرآن اور اہلبیتؑ کی پیروی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

شیخ صاحب خاموش رہے اور ایک لفظ تک نہیں بولے۔ پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا

کہ میں نے درس پڑھانے جانا ہے۔ میزبان نے بیٹھنے کا اصرار کیا۔ پھر طعام لایا گیا۔ شیخ صاحب نے خاموشی سے کھانا کھایا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

جی ہاں جو شخص حقائق کو تلخی رکھے اسے کسی نہ کسی دن مجمع عام میں رسوا ہونا پڑتا ہے۔

اگر بالفرض ہم یہ مان لیں کہ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ اور بِکِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّتِیْ والی دونوں احادیث صحیح ہیں تب بھی اس سے اہل سنت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ دونوں احادیث بھی مذہب اہل بیتؑ کی تائید کریں گی کیونکہ پہلی حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ تم میری سنت پر عمل کرو اور دوسری میں کہا گیا ہے کہ میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو۔[1]

خلفائے راشدین سے ائمہ اہل بیتؑ مراد ہیں

لفظ خلفاء عام ہے اور کسی گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اہل سنت خلفائے راشدین سے پہلے چار خلفاء مراد لیتے ہیں۔ اس لفظ سے پہلے چار خلفاء مراد لینے کے لیے اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جبکہ دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین سے پیغمبر اکرمؐ کے بارہ خلفاء مراد ہیں جنھیں شیعہ اپنا امام مانتے ہیں۔

قندوزی حنفی کی کتاب ینابیع المودۃ میں ہے کہ یحییٰ بن حسن نے اپنی کتاب العمدہ میں بیس طریقوں سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "میرے بعد میرے بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔" ان میں سے تین طرق بخاری میں، نو طرق مسلم میں تین طرق ابوداؤد میں، ایک ترمذی میں اور تین حمیدی میں مرقوم ہیں۔

صحیح بخاری میں جابر سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا یَکُوْنُ مِنْ بَعْدِیْ اثْنَا عَشَرَ اَمِیْرًا میرے بعد بارہ فرمانروا ہوں گے۔ پھر آنحضرتؐ نے ایک لفظ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول خداؐ نے کیا فرمایا تھا؟ میرے والد نے بتایا کہ آپ نے فرمایا تھا: کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

صحیح مسلم میں عامر بن سعد سے منقول ہے کہ میں نے سمرہ کو خط لکھا اور خط میں یہ فرمائش کی کہ جو کچھ تم نے رسول خداؐ سے سنا ہے وہ مجھے لکھ بھیجو۔ اُس نے جواب میں لکھا: جس شب رسول خداؐ نے اسلمی کو رجم کیا تھا اُس کے دوسرے دن جمعہ تھا۔ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں گیا تو میں نے سنا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا دین قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے اور بارہ خلفاء کی تعداد مکمل

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۳۷۱۔

ہو جائے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔[1] اس کے بعد کسی کو سنۃ الخلفاء کی روایت سے چار خلفاء مراد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بارہ خلفاء کی حدیث بیس طریقوں سے مروی ہے اور ہر روایت یہ گواہی دیتی ہے کہ خلفاء کی تعداد بارہ ہے اور اگر بارہ خلفاء کو تلاش کرنا ہو تو وہ شیعوں کے بارہ امام ہی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ شیعہ مذہب ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس نے آنحضرتؐ کی حدیث کی صحیح تشخیص کی ہے۔ بارہ امام یہ ہیں۔ امام علیؑ، اُن کے بعد امام حسنؑ پھر امام حسینؑ۔ اس کے بعد امام حسینؑ کی نسل سے تعلق رکھنے والے نو امام۔ یوں اُن کی تعداد بارہ ہے۔

روایات میں، اگرچہ کُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ کے الفاظ موجود ہیں پھر بھی دیگر روایات و قرائن کو ملانے سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس سے اہل بیتؑ کے بارہ امام مراد ہیں۔ اس سلسلے کی مزید روایات آئندہ بحثوں میں پیش کی جائیں گی۔ فی الحال ہم حدیث ثقلین پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ[2]

روایات میں رسول اکرمؐ نے اس امر کو واضح کیا کہ دین کا قیام بارہ خلفاء کی ذات سے وابستہ ہے۔ آنحضرتؐ سے ایسی روایات بھی منقول ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن اور اہل بیتؑ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور یہ اس امر کی بہترین دلیل ہے کہ بارہ خلفاء سے اہل بیتؑ کے ہی بارہ امام مراد ہیں۔ جہاں تک کُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ کے جملے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں راویوں نے تحریف کی ہے، اور تحریف کا مقصد یہ تھا کہ حدیث کو اس طرح مبہم بنا دیا جائے کہ ائمہ اہلبیتؑ کی امامت کے وجوب پر دلالت نہ کر سکے۔

حدیث کے اصل الفاظ کُلُّهُمْ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ[3] تھے لیکن کینہ پیشہ خیانت گروں نے تحریف

۱۔ ینابیع المودۃ، تالیف قندوزی حنفی ج ۱، ص ۲۸۹۔۲۹۰۔ الصواعق ص ۲۸۱۔ صحیح بخاری ج ۹، ص ۱۰۱۔ صحیح مسلم ج ۳، ص ۱۴۵۲۔۱۴۵۳۔ سنن ابی داؤد ج ۳، ص ۳۰۹، حدیث ۴۲۷۹۔ سنن ترمذی ج ۳، ص ۵۰۱، حدیث ۲۲۴۳۔

۲۔ امام علیؑ بارہ ائمہ کے سلسلے کے پہلے امام ہیں۔ مؤلف نے کتاب ہذا میں یہ بحث کی ہے کہ اس سے چار خلفاء مراد ہیں یا بارہ خلفاء مراد ہیں اور اگر اس سے بارہ خلفاء مراد ہیں تو وہ کون تھے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟

۳۔ امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۴ میں ارشاد فرماتے ہیں "کہاں ہیں وہ لوگ جو جھوٹ بولتے ہوئے اور ہم پر ستم روا رکھتے ہوئے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ راسخون فی العلم ہیں نہ کہ ہم۔ چونکہ اللہ نے ہم کو بلند کیا ہے اور انہیں گرایا ہے اور ہمیں منصب امامت دیا ہے اور انہیں محروم رکھا ہے اور ہمیں (منزل علم میں) داخل کیا ہے اور انہیں دور کر دیا ہے۔ ہم ہی سے ہدایت کی طلب اور گمراہی کی تاریکیوں کو چھانٹنے کی خواہش کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ امام قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے ابھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔" امام علی علیہ السلام کے اس خطبے کی روشنی میں تحریف حدیث کی بجائے کتمان حدیث کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس حدیث کے آخری الفاظ من بنی هاشم چھپائے گئے ہیں۔ (رضوانی)

کر کے اسے کُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ کر دیا۔

یہ تحریف کی ایک مثال ہے۔ لوگوں نے نور خدا کو بجھانے کی بڑی کوششیں کی ہیں لیکن خدا اپنے نور کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ چنانچہ سلیمان قندوزی حنفی ینابیع المودۃ میں رقمطراز ہیں: کتاب مودۃ القربیٰ کی مودت دہم میں سید علی ہمدانی قدس اللہ سرہ نے عبدالملک بن عمیر سے روایت کی ہے اور انھوں نے یہ روایت جابر بن سمرہ سے نقل کی ہے۔ اُس نے کہا کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول خداؐ نے فرمایا کہ میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی آواز دھیمی کی اور کچھ فرمایا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول خداؐ نے دھیمی آواز میں کیا فرمایا تھا؟ میرے والد نے کہا کہ آنحضرت نے فرمایا کُلُّهُمْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ وہ سب کے سب بنی ہاشم سے ہوں گے۔[1]

قندوزی نے اس مفہوم کی واضح ترین روایات بھی نقل کی ہیں مثلاً انھوں عبایہ بن ربعی کی زبانی جابر سے روایت کی کہ رسول خداؐ نے فرمایا اَنَا سَيِّدُ النَّبِيِّيْنَ وَعَلِيٌّ سَيِّدُ الْوَصِيِّيْنَ وَاِنَّ اَوْصِيَائِيْ بَعْدِي اثْنَا عَشَرَ اَوَّلُهُمْ عَلِيٌّ وَآخِرُهُمُ الْقَائِمُ الْمَهْدِيُّ میں انبیاء کا سردار ہوں اور علیؑ اوصیاء کے سردار ہیں اور میرے بعد میرے بارہ اوصیاء ہوں گے پہلے علیؑ اور آخری القائم المہدیؑ ہوں گے۔[2]

مذکورہ بالا احادیث نقل کرنے کے بعد قندوزی حنفی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"جو احادیث بارہ خلفاء پر دلالت کرتی ہیں بہت ہی مشہور ہیں اور مختلف اسناد سے مروی ہیں۔ تاریخ و شواہد دلالت کرتے ہیں کہ اس سے اہل بیتؑ کے بارہ امام مراد ہیں۔ ان احادیث کو بنی امیہ کے سلاطین پر منطبق نہیں کیا جاسکتا اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ سلاطین بنی امیہ کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی اور

دوسری وجہ یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ وہ سب کے سب ظالم تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اُن کا تعلق بنی ہاشم سے نہیں تھا جبکہ رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ اُن کا تعلق بنی ہاشم سے ہوگا اور رسول خداؐ کا آواز دھیمی کرنا اس روایت کے درست ہونے کی تاکید ہے کیونکہ لوگ بنی ہاشم کی خلافت پر خوش نہیں تھے۔ اس حدیث کو بنی عباس کے سلاطین پر بھی منطبق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں بنی عباس نے آیت مودت قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کی پاسداری نہیں کی تھی اسی لیے بارہ خلفاء کی حدیث کا بس یہی مفہوم ہے کہ اس سے عترت پیغمبرؐ کے بارہ امام مراد ہیں اور وہ بارہ امام اپنے دور میں علم، جلالت شان، ورع،

۱۔ ینابیع المودۃ ج ۳، ص ۲۹۰۔ ۲۔ ینابیع المودۃ ج ۳، ص ۲۹۱۔

تقویٰ اور حسب نسب میں تمام لوگوں سے ممتاز تھے۔ انھوں نے اپنے اجداد سے علم حاصل کیا تھا اور اُن کے اجداد کا علم رسول خداؐ کے علم سے متصل تھا۔"[1]

ان حقائق کی روشنی میں اگر عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے چار خلفاء مراد نہیں ہوں گے بلکہ بنی ہاشم کے بارہ امام ہی مراد ہوں گے۔

اہل بیتؑ کے واسطے سے ہی کتاب وسنت سے تمسک ممکن ہے

علمائے اہل سنت نے اپنے مذہب کی اساس کو قائم رکھنے کے لیے تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا بِکِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کی حدیث گھڑی تھی۔ اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تب بھی اس سے اہل سنت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ حدیث بِکِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ کے منافی نہیں ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ احادیث کو ایک دوسرے کا متضاد تب سمجھنا چاہیے جب اُن میں وجہ توافق باقی نہ رہے اور اگر دو احادیث میں وجہ توافق موجود ہو تو وہ ایک دوسرے کی متضاد نہیں ہوتیں۔

ابن حجر کا بھلا ہو کہ انھوں نے ہمیں وجہ توافق تلاش کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے صواعق محرقہ میں لکھا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ جب تک تم ان سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ ایک اللہ کی کتاب دوسرے میری عترت میرے اہل بیتؑ۔

طبرانی نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے ان دونوں کے لیے اللہ سے دعا کی ہے۔ لہٰذا اُن سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور اُن سے پیچھے نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور انھیں تعلیم نہ دینا کیونکہ وہ تم سے زیادہ علم رکھتے ہیں جبکہ ایک اور روایت میں بِکِتَابَ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ سنت سے وہ احادیث مراد ہیں جو کتاب اللہ کی تفسیر کرتی ہیں۔ سنت بذات خود مطلوب نہیں ہے۔ سنت کی ضرورت کتاب اللہ کے معانی کی وضاحت کے لیے ہے۔ لہٰذا ذکر سنت کی بجائے کتاب اللہ کا ذکر کفایت کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے آنحضرتؐ نے کتاب اللہ سے تمسک کی تاکید کی ہے۔ کتاب اللہ کی تشریح کے لیے سنت کی ضرورت ہے اور اہلبیتؑ کے علماء کتاب اور سنت سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حدیث میں کوئی منافات نہیں ہے۔ کتاب، سنت اور اہل بیتؑ یہ تینوں روز قیامت تک باقی رہیں گے۔[2]

ابن حجر مکی کے قول کی دقیق ترین تشریح یہ ہے کہ اہل بیتؑ کے بغیر سنت سے تمسک ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ گھر والے ہی گھر کی چیزوں کو بہتر جانتے ہیں۔ اَھْلُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فِیْہِ۔

۱۔ ینابیع المودۃ ج ۳، ص ۳۹۲۔ ۲۔ صواعق محرقہ ص ۱۵۰۔

روایات میں اس کی تاکید کی گئی ہے اور تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول خداؐ نے قرآن و اہل بیتؑ سے وابستگی کو واجب قرار دیا تھا اور جہاں تک سنت سے وابستگی کا تعلق ہے تو اس کی تشریح و تعبیر بھی اہل بیتؑ کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔

ابن حجر کی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آنحضرتؐ نے سنت سے وابستگی کی تاکید کی تھی کیونکہ وہ روایات جن میں بِکِتَابِ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ آیا ہے وہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ سنت کے متعلق ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ لوگوں نے اسے نذر آتش کیا تھا، اسے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی اور جو حدیث چھپ نہیں سکتی تھی اُس میں تحریف کی گئی تھی۔ اسی لیے قرآن و سنت تک اگر کوئی رسائی چاہتا ہے تو اہل بیتؑ کے سوا اُس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

رسول خداؐ نے فرمایا تھا:

"خبردار! اُن سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرنا کہ وہ تم سے بڑے عالم ہیں۔"

لہٰذا طبرانی کی روایت کے تحت اہلبیتؑ سے تمسک واجب ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

حدیث ثقلین مصادر اہل سنت میں

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ بکتابُ اللہ وَ سُنّتی کی حدیث بے بنیاد ہے حالانکہ اسی بنیاد پر مذہب اہل سنت قائم ہے۔ جب بنیاد ہی نہ رہے تو عمارت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے اہل سنت بکتابُ اللہ وَعِتْرَتِیْ کی حدیث کو چھپاتے ہیں اور بکتابُ اللہِ وَ سُنّتی کی تشہیر کرتے ہیں۔ اُن کے شبانہ روز پروپیگنڈے کا یہ اثر ہے کہ عام مسلمان بکتابُ اللہِ وَ سُنّتی کی حدیث کو مقدس مانتے ہیں۔ اگر کبھی عوام کے سامنے رسول خداؐ کی متواتر اور صحیح السند حدیث بکتابُ اللہِ وَعِتْرَتِیْ کو بیان کیا جائے تو لوگ تعجب کرتے ہیں اور انھیں اس حدیث کی صداقت کا یقین نہیں آتا۔

اتمام حجت کے لیے ہم اہل سنت کی کتابوں سے بکتابُ اللہِ وَعِتْرَتِیْ کی حدیث کو ثابت کریں گے اور جن جن صحابۂ کرام اور تابعین عظام سے یہ حدیث مروی ہے اُن کے نام بھی پیش کریں گے۔

حدیث ثقلین کے رُواۃ صحابہ

صحابہ سے حدیث ثقلین تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ جن صحابہ نے حدیث ثقلین بیان کی ہے اُن میں سے چند نام یہ ہیں:

۱۔ ابو سعید خدری	۲۔ ابوذر غفاری	۳۔ ابو رافع
۴۔ ابو شریح خزاعی	۵۔ ابو قدامہ انصاری	۶۔ ابو ہریرہ
۷۔ ابو الہیثم بن تیہان	۸۔ ام سلمہ	۹۔ ام ہانی بنت ابی طالب
۱۰۔ جابر بن عبداللہ انصاری	۱۱۔ حذیفہ بن اسید	۱۲۔ خزیمہ بن ثابت
۱۳۔ زید بن ارقم	۱۴۔ زید بن ثابت	۱۵۔ سہیل بن سعد
۱۶۔ ضمرہ اسدی	۱۷۔ عامر بن ابی لیلیٰ غفاری	۱۸۔ عبداللہ بن عباس
۱۹۔ عبداللہ بن عمر	۲۰۔ عبدالرحمٰن بن عوف	۲۱۔ عدی بن حاتم
۲۲۔ عقبہ بن عامر	۲۳۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم	

حدیث ثقلین کے رُواۃ تابعین

تابعین کے دور تک حدیث ثقلین خبر متواتر کے طور پر بیان ہوتی رہی۔ ویسے تو دسیوں تابعین سے یہ حدیث منقول ہے ہم یہاں چند تابعین کے نام نقل کرتے ہیں:

۱۔ ابو طفیل عامر بن واثلہ	۲۔ ابو حیّ مسلم بن صبیح	۳۔ اصبغ بن نباتہ
۴۔ حارث ہمدانی	۵۔ حبیب بن ابی ثابت	۶۔ حسن بن حسن بن علی
۷۔ حُنش بن معتمر	۸۔ حُصین بن سبرہ	۹۔ عبداللہ بن ابی رافع
۱۰۔ عبدالرحمٰن بن ابی سعید	۱۱۔ عطیہ بن سعید کوفی	۱۲۔ عمر بن علی بن ابی طالب
۱۳۔ عمرو بن مسلم	۱۴۔ علی بن ربیعہ	۱۵۔ علی بن حسین زین العابدین
۱۶۔ فاطمہ بنت علی بن ابیطالب	۱۷۔ قاسم بن حسان	۱۸ مطلب بن عبداللہ بن حنطب
۱۹۔ یحییٰ بن جعدہ رحمۃ اللہ علیہم		

حدیث ثقلین کے ناقل محدثین

بے شمار مؤلفین نے صحابہ، تابعین اور اکابرین سے حدیث ثقلین کو نقل کیا ہے اور یہ سلسلہ دوسری صدی سے لے کر اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ دوسری صدی سے لے کر چودھویں صدی تک اس حدیث کے ناقل تمام علماء کی فہرست خاصی طویل ہے چنانچہ ہم صرف اُن کی تعداد لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفصیل دیکھنے کے خواہش مند حضرات عبقات الانوار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر صدی کے محدثین کی تعداد حسب ذیل ہے۔

دوسری صدی	۳۶ افراد	تیسری صدی	۶۶ افراد
چوتھی صدی	۳۸ افراد	پانچویں صدی	۲۱ افراد
چھٹی صدی	۲۷ افراد	ساتویں صدی	۲۱ افراد
آٹھویں صدی	۲۳ افراد	نویں صدی	۱۳ افراد
دسویں صدی	۲۰ افراد	گیارہویں صدی	۱۱ افراد
بارہویں صدی	۱۸ افراد	تیرہویں صدی	۱۲ افراد
چودھویں صدی	۱۳ افراد	راویان حدیث کی کل تعداد ۳۲۳	

کتب حدیث میں کتاب وعترت کی حدیث

جن کتابوں میں حدیث ثقلین آئی ہے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مشتے از خروارے چند کتابوں سے اقتباسات پیش خدمت ہیں ورنہ تا سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔

(۱) امام مسلم[1] نیشاپوری نے محمد بن بکار بن ترجان سے، انھوں نے حسان بن ابراہیم سے، انھوں نے سعید بن مسروق سے، انھوں نے یزید بن حیان سے روایت کی ہے۔ اُس نے کہا کہ ہم زید بن ارقم کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ آپ بڑے خوش نصیب ہیں، آپ صحابی رسولؐ ہیں اور آپ نے حضورؐ کی اقتداء میں نمازیں پڑھی ہیں اور آپ نے بہت زیادہ بھلائیاں دیکھی ہیں۔ آپ نے رسول اللہؐ سے جو کچھ سنا ہے اُس میں سے کچھ ہمیں بھی سنایئے۔

زید بن ارقم نے کہا: اے ابن عم! میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور اب میرا زمانہ چلا گیا۔ میں نے رسول خداؐ سے جو کچھ سنا تھا اُس میں سے کچھ حصہ میری یادداشت سے محو ہو گیا ہے اور اب میں جو کچھ بیان کروں اسی پر قناعت کرنا اور زیادہ کا مطالبہ نہ کرنا۔

پھر انھوں نے کہا: ایک دن رسول اللہؐ مکہ و مدینہ کے درمیان ایک چشمے پر خطاب کے لیے کھڑے ہوئے جسے غدیر خم کہا جاتا تھا۔ آپ خدا کی حمد و ثنا بجا لائے۔ پھر آپ نے وعظ و نصیحت کی۔ پھر آپ نے فرمایا: اَمَّا بَعْدُ! اَلَا اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ رَسُوْلُ رَبِّیْ فَاُجِیْبَ وَاَنَا تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ اَوَّلُهُمَا کِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ مَنِ اتَّبَعَهُ کَانَ عَلَی الْهُدٰی وَمَنْ تَرَکَهُ کَانَ عَلٰی ضَلَالَةٍ. ثُمَّ قَالَ وَ اَهْلُ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ، اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ، اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ. اے لوگو! میں بھی ایک انسان ہوں۔ وہ وقت قریب ہے جب میرے رب کا بلاوا آجائے اور میں اُس کے بلاوے پر لبیک کہوں۔ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اُن میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے اور وہ خدا کی رسی ہے۔ جو اس کی پیروی کرے گا وہ ہدایت پر ہوگا اور جو اسے چھوڑ دے گا وہ گمراہی پر ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا دوسری چیز میرے اہل بیتؑ ہیں۔ میں اپنے اہل بیتؑ کے بارے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔ آخری جملہ رسول اللہؐ نے تین مرتبہ فرمایا۔

ہم نے کہا آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ کون ہیں۔ کیا اس سے آپ کی بیویاں مراد ہیں؟

زید بن ارقم نے کہا: خدا کی قسم! بیوی کچھ عرصے تک مرد کے پاس رہتی ہے۔ جب وہ اُسے طلاق دیدے تو اپنے باپ اور خاندان کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔ اہل بیتؑ سے آپ کا خاندان

۱۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۸۷۳، حدیث ۳۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔

مراد ہے جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام قرار دیا گیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ زہیر بن حرب اور شجاع بن مخلد دونوں نے ابن عُلَیّہ سے روایت کی۔ زہیر نے کہا کہ اسماعیل بن ابراہیم نے ابو حیان سے اور انھوں نے یزید بن حیان سے نقل کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم زید بن ارقم کے پاس گئے (پھر سابقہ حدیث بیان کی)۔

ایک اور سند یوں ہے: امام مسلم نے ابوبکر بن شیبہ سے، انھوں نے محمد بن فضیل اور اسحاق بن ابراہیم سے، انھوں نے جریر سے اور ان دونوں نے ابو حیان سے نقل کیا ہے (اس کے بعد انھوں نے سابقہ حدیث بیان کی)۔

صحیح مسلم کی تمام روایات ابو حیان بن سعید تیمی پر جا کر منتہی ہوتی ہیں جن کے متعلق ذہبی لکھتے ہیں کہ ثوری نے انھیں بزرگ شمار کیا ہے اور اُن کی توثیق کی ہے۔ احمد بن عبداللہ عجلی نے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ثقہ، صالح اور حدیث میں مشہور تھے اور صاحب سنت تھے۔[1]

ذہبی کتاب عبر کی ج اول، ص ۲۰۵ پر لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید تیمی مولی تیم الرباب کوفی امامی ثقہ اور صاحب سنت تھے۔ شعبی اور دیگر محدثین نے اُن سے احادیث لی ہیں۔

یافعی لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید تیمی کوفی امامی ثقہ اور صاحب سنت ہیں۔[2]

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ابو حیان تیمی کوفی ثقہ ہیں۔ انھوں نے چھ برس کی عمر سے عبادت شروع کی اور پینتالیس برس کی عمر میں وفات پائی۔[3]

نیز دیگر علمائے رجال نے بھی ابو حیان کوفی کی توثیق کی ہے۔

یہاں پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی حدیث کا صحیح مسلم میں آجانا اُس کی صحت کے لیے کافی ہے کیونکہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ اس کتاب کی تمام احادیث صحیح ہیں۔

امام مسلم خود فرماتے ہیں کہ اُن کی بیان کردہ احادیث کی صحت پر علماء کا اجماع ہے۔ علاوہ ازیں امام مسلم اپنی بیان کردہ ہر روایت کو صحیح سمجھتے تھے۔ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں کہ مسلم نے کہا کہ میں نے اپنی کتاب "صحیح" میں صرف ایسی احادیث نقل نہیں کیں جنھیں میں ذاتی طور پر صحیح سمجھتا تھا بلکہ وہ احادیث نقل کی ہیں جن کی صحت پر علمائے حدیث کا اجماع ہے۔[4] صحیح مسلم کے شارح امام نووی، امام مسلم کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ مسلم نے علم حدیث میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ اُن کی کتاب "صحیح مسلم" پروردگار کی طرف سے ملت مسلمہ پر احسان ہے۔

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۱، ص ۲۱۴۔۲۱۵۔
۲۔ مرآۃ الجنان ج ۱، ص ۳۰۱۔
۳۔ تقریب التہذیب ج ۲، ص ۳۲۹۔
۴۔ تدریب الراوی ج ۱، ص ۸۰۔

صحیح مسلم کی روایت کی تعدیل کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

(۲) اس حدیث کو امام حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک علی الصحیحین کی جلد ۳ ص ۱۰۹ پر لکھا ہے۔ یہ کتاب انتشارات دار المعرفہ، بیروت۔ لبنان نے شائع کی ہے۔

متن حدیث یہ ہے ابو عوانہ نے اعمش سے، انھوں نے حبیب بن ابی ثابت سے، انھوں نے ابو طفیل سے اور انھوں نے زید بن ارقم سے سنا کہ جب رسول خداؐ حجۃ الوداع سے واپس لوٹے تو آپ نے غدیر خم کے کنارے قیام کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس جگہ کو صاف کیا جائے۔ پھر آپ نے وہاں خطبہ دیا اور یہ کلمات ارشاد فرمائے كَأَنِّيْ قَدْ دُعِيْتُ فَأَجَبْتُ إِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ كِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِيْ فَانْظُرُوْا كَيْفَ تَخْلُفُوْنِيْ فِيْهِمَا فَإِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ وہ وقت قریب ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے بلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ان میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے۔ وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عترت۔ ان دونوں کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت خیال رکھنا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ مَوْلَايَ وَاَنَا مَوْلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ.

یعنی اللہ میرا مولا اور میں ہر مومن کا مولا ہوں۔ پھر آپ نے امام علیؑ کا بازو پکڑ کر فرمایا:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِيُّهُ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ ولی ہے۔

اس قول رسولؐ سے یہ واضح ہے کہ قرآن اور اہل بیتؑ دونوں کی پیروی واجب ہے اور اہل بیتؑ کے پہلے واجب الاطاعت فرد امام علیؑ ہیں۔

یہ حدیث اس سند کے ساتھ بھی منقول ہے اس حدیث کو ہم سے بیان کیا حسان بن ابراہیم کرمانی نے، ان سے محمد بن سنی بن کہیل نے، ان سے ان کے والد ابو طفیل نے، ان سے ابن واثلہ نے اور ان سے زید بن ارقم نے۔ اس حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا تَعْلَمُوْنَ اَنِّيْ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ تم جانتے ہو کہ میں مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ اختیار رکھتا ہوں۔

آنحضرت (ص) نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا اور ہر مرتبہ صحابہ نے کہا کیوں نہیں یا رسول اللہؐ! پھر آپ نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ

امام حاکم نے اس کے علاوہ دیگر دو اسناد سے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ ہمیں اختصار مطلوب ہے لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اس حدیث کی صحت اور تواتر کی دلیل یہ ہے کہ امام حاکم نے اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہے۔

(۳) امام احمد بن حنبل[1] نے لکھا ہے کہ ہم سے بیان کیا عبداللہ نے، اُن سے اُن کے والد نے، اُن سے ابونظر نے، اُن سے محمد بن ابی طلحہ نے، اُن سے اعمش نے، اُن سے عطیہ عوفی نے، اُن سے ابوسعید خدری نے اور انھوں نے رسول خداؐ سے کہ رسول خداؐ نے فرمایا قریب ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے بلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میں تمہارے درمیان دو قیمتی امانتیں چھوڑے جارہا ہوں اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عترت۔ اللہ کی کتاب خدا کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے اور میری عترت اہل بیتؑ۔ خداوند لطیف وخبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں۔ پس دھیان رکھنا کہ میرے بعد تم اُن کے ساتھ کیسا سلوک کرو گے۔

دوسری روایت کی سند یہ ہے ہم سے بیان کیا عبداللہ نے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے ابن نمیر سے، انھوں نے عبدالملک بن ابی سلیمان سے، انھوں نے عطیہ عوفی سے اور انھوں نے ابوسعید خدری سے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا میں دو قیمتی امانتیں تمہارے درمیان چھوڑے جارہا ہوں۔ اُن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے۔ کتاب خدا ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے اور میری عترت اہل بیتؑ۔ جان لو کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں۔ امام احمد نے اس حدیث کو دیگر طرق سے بھی نقل کیا ہے۔

(۴) امام ترمذی[2] نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ہم نے علی بن منذر کوفی سے سنا، انھوں نے محمد بن فضیل سے سنا، انھوں نے اعمش سے سنا، انھوں نے عطیہ عوفی سے سنا۔ ابوسعید اور اعمش دونوں نے حبیب بن ابی ثابت سے روایت کی ہے کہ انھوں نے زید بن ارقم سے سنا۔ زید بن ارقم نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا کہ میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جارہا ہوں کہ اگر تم اُس سے وابستہ رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ اُن میں ایک چیز دوسری سے بڑی ہے۔ ایک اللہ کی کتاب ہے جو کہ آسمان سے زمین تک خدا کی متصل رسی ہے اور دوسری میری عترت میرے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں۔ دیکھنا میرے بعد تم اُن سے کیا سلوک کرتے ہو؟

ہم سے بیان کیا نصر بن عبدالرحمن کوفی نے، اُن سے زید بن حسن انماطی نے، اُن سے جعفر بن محمد نے، اُن سے اُن کے والد نے اور اُن سے جابر بن عبداللہ انصاری نے۔ انھوں نے کہا کہ میں

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳، صفحات ۱۷، ۲۶، ۱۴، ۵۹، مطبوعہ دارصادر، بیروت، لبنان۔

۲۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۶۶۲۔۶۶۳۔ انتشارات دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔

نے رسول خدا کو عرفہ کے دن دیکھا کہ آپ اونٹ پر سوار تھے اور خطاب کر رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے۔ لوگو! میں اپنے بعد ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت میرے اہل بیتؑ۔

(۵) اس حدیث کو شیخ علی متقی ہندی نے کنز العمال[1] میں بھی نقل کیا ہے۔

اگر ہم تمام روایات کو یہاں نقل کرنا شروع کر دیں تو یہ کتاب ضخیم ہو جائے گی اس لیے ہم یہاں بطور نمونہ چند علماء و حفاظ کے نام لکھتے ہیں جنھوں نے حدیث ثقلین کو نقل کیا ہے۔ تفصیل کے لیے شہید ثالث قاضی نوراللہ حسینی شوستری (جنہیں مغل بادشاہ جہانگیر کے حکم سے شہید کیا گیا تھا) کی احقاق الحق ج ۹، ص ۳۱۱ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔	حافظ ابوالقاسم بن احمد یحیی طبرانی (متوفی ۳۶۰ھ)	معجم الصغیر
۲۔	احمد بن عبداللہ محب طبری (متوفی ۶۹۴ھ)	ذخائر العقبیٰ
۳۔	ابراہیم بن محمد بن ابی بکر حموینی شافعی	فرائد السمطین
۴۔	محمد بن سعد زہری بصری (متوفی ۲۳۰ھ)	الطبقات الکبریٰ
۵۔	علی بن ابی بکر ہیثمی (۸۰۷ھ)	مجمع الزوائد
۶۔	عبدالرحمن بن محمد سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)	احیاء المیت
۷۔	احمد بن علی، ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)	المواہب اللدنیہ
۸۔	علامہ نبہانی	الانوار المحمدیہ
۹۔	عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی (متوفی ۲۵۵ھ)	سنن دارمی
۱۰۔	ابوبکر احمد بن حسین بیہقی شافعی (متوفی ۴۵۸ھ)	السنن الکبریٰ
۱۱۔	حسین بن مسعود الفراء بغوی شافعی	مصابیح السنۃ
۱۲۔	اسماعیل بن عمر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ)	تفسیر القرآن العظیم
۱۳۔	علی بن محمد بن محمد، ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ)	جامع الاصول
۱۴۔	احمد بن حجر ہیثمی مکی (متوفی ۹۷۴ھ)	الصواعق المحرقہ

ابن حجر مکی رقمطراز ہیں کہ حدیث ثقلین بہت سے راویوں سے منقول ہے۔ اس حدیث کو پچیس صحابہ کرام نے بیان کیا ہے اور اس کے طرق بڑے مفصل ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے

۱۔ علامہ علاء الدین علی متقی بن حسام الدین ہندی متوفی ۹۷۵ھ در کتاب کنز العمال ج ۱، باب دوم فی الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۱۷۲۔ الناشر مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع پنجم ۱۹۸۵ء، حدیث ۸۷۳، ۸۷۰۔

یہ حدیث حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن ارشاد فرمائی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے مدینہ میں اپنے مرض الموت کے دوران یہ حدیث اُس وقت ارشاد فرمائی تھی جب آپ کا حجرہ صحابہ سے بھرا ہوا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ حدیث غدیر خم کے مقام پر ارشاد فرمائی تھی۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے طائف سے واپسی پر یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی۔ ان تمام روایات میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ نبی اکرمؐ قرآن حکیم اور اپنے اہل بیتؑ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے۔ اسی لیے آپ نے اسے متعدد مواقع پر ارشاد فرمایا۔

طبرانی کی روایت میں ابن عمر سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے حدیث کے آخر میں یہ فرمایا تھا: اُخْلُفُونِیْ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ میرے اہل بیتؑ کے متعلق میرا لحاظ رکھنا۔

طبرانی اور ابو الشیخ کی ایک اور روایت ہے کہ اِنَّ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ثَلَاثَ حُرُمَاتٍ فَمَنْ حَفِظَهُنَّ حَفِظَ اللّٰهُ دِیْنَهُ وَ دُنْیَاهُ وَمَنْ لَّمْ یَحْفَظْهُنَّ لَمْ یَحْفَظِ اللّٰهُ دُنْیَاهُ وَلَا آخِرَتَهُ خدا نے تین چیزوں کو محترم بنایا ہے۔ جو اُن کا احترام کرے گا خدا اُس کے دین و دنیا کی حفاظت فرمائے گا اور جو اُن کا احترام نہیں کرے گا خدا بھی اُس کی دنیا و آخرت کا لحاظ نہیں رکھے گا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا وہ کون سی چیزیں ہیں؟ فرمایا: حُرْمَةُ الْاِسْلَامِ وَحُرْمَتِیْ وَ حُرْمَةُ رَحِمِیْ اسلام کا احترام، میرا اور میرے قرابت داروں کا احترام۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ (ابوبکر) صدیقؓ نے یہ کہا تھا کیا محمد مصطفیٰؐ اپنے اہل بیتؑ سے دستبردار ہو گئے تھے؟ مقصد یہ ہے کہ اہل بیتؑ کی حرمت کو پہچانو اور انھیں اذیت نہ دو۔

ابن سعد اور ملا[1] نے اپنی اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا:

اُوْصِیْ بِاَهْلِ بَیْتِیْ خَیْرًا فَاِنِّیْ اُخَاصِمُکُمْ عَنْهُمْ غَدًا وَمَنْ اَکُنْ خَصِیْمَهُ اَخْصِمْهُ وَمَنْ اَخْصِمْهُ دَخَلَ النَّارَ میں تمھیں اپنے اہل بیتؑ سے نیک سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور میں کل تم سے اس کے لیے جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں وہ شکست سے دوچار ہو جاتا ہے اور جسے میں شکست دوں وہ داخل دوزخ ہوتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا: وَمَنْ حَفِظَنِیْ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ فَقَدِ اتَّخَذَ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا جو کوئی میری عزت کی خاطر میرے اہل بیتؑ کی عزت بچائے اُس نے خدا سے اپنی نجات کا عہد لے لیا ہے۔

ابن سعد نے یہ حدیث لکھی ہے اَنَا وَ اَهْلُ بَیْتِیْ شَجَرَةٌ فِی الْجَنَّةِ وَاَغْصَانُهَا فِی الدُّنْیَا فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا میں اور میرے اہل بیتؑ جنت کا ایک درخت ہیں جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی

۱۔ عمر بن فخر جنھوں نے وسیلۃ المعصومین لکھی ہے جو "سیرت ملا" کے نام سے مشہور ہے۔

ہوئی ہیں۔ جسے اپنے رب کے راستے کی تلاش ہو تو وہ اسی راستے سے آئے۔

ملا نے اپنی سیرت میں رسول خداؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے فِیْ کُلِّ خَلَفٍ مِنْ اُمَّتِیْ عُدُوْلٌ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ یَنْفُوْنَ عَنْ هٰذَا الدِّیْنِ تَحْرِیْفَ الضَّالِّیْنَ وَاِنْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ اَلَا وَاِنَّ اَئِمَّتَکُمْ وَفُوْدُکُمْ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَانْظُرُوْا مَنْ تُوَفِّدُوْنَ میری امت کی ہر نسل میں میرے اہلبیتؑ کے عادل افراد موجود ہوں گے جو گمراہوں کی تحریف سے، باطل نظریات سے اور جاہلوں کی تاویل سے اس دین کی حفاظت کریں گے۔ جان لو! تمہارے پیشوا خدا کے حضور تمہارے نمائندے ہیں۔ اچھی طرح دیکھ لو کہ تم کسے اپنا نمائندہ بنا رہے ہو۔

ابن حجر کہتے ہیں۔

"رسول کریمؐ نے قرآن اور اپنی عترت کو "ثقلین" کے نام سے یاد کیا ہے۔ "عترت" خانوادہ نسل اور قریبی رشتے داروں کو کہا جاتا ہے اور "ثقل" انتہائی گرانقدر اور اہم چیز کو کہا جاتا ہے اور یقیناً قرآن و عترت دونوں ہی گرانقدر اور انتہائی اہم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک علوم لدنی کا سرچشمہ ہے اور ہر ایک اسرار الٰہی، حکمت متعالی اور احکام شرعی کا مصدر ہے اسی لیے رسول اکرمؐ نے ان سے وابستہ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا الْحِکْمَةَ اَهْلَ الْبَیْتِ تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں جس نے ہم اہل بیتؑ میں حکمت رکھی ہے۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ قرآن و عترت کو ثقلین اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے حقوق بہت زیادہ وزن رکھتے ہیں۔ رسول خداؐ نے اپنی عترت اور اہل بیتؑ سے وابستگی کا حکم دیا ہے اور اس سے وہ افراد مراد ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے عالم ہیں۔ آنحضرتؐ نے اُن کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ قرآن سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آجائیں اور اس مطلب کی تاکید آنحضرتؐ نے ان الفاظ سے فرمائی کہ انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ باقی علماء کے مقابلے میں خدا نے انھیں یہ خصوصیت عطا کی ہے کہ اُن سے ہر قسم کی پلیدی کو دور رکھا ہے اور انھیں کامل طہارت عطا کی ہے۔"

محترم قاری! آپ نے حدیث ثقلین کے متعلق ابن حجر کا تبصرہ ملاحظہ فرمایا

اب ہم ابن حجر کی روح سے پوچھتے ہیں کہ ابن حجر! جو کچھ آپ نے لکھا ہے کیا آپ نے اُن مطالب کی پاسداری کی تھی؟ کیا آپ نے اہل بیتؑ کے حقوق کے متعلق رسول اکرمؐ کی حرمت کا لحاظ رکھا تھا؟ کیا آپ اہل بیتؑ کے محب تھے اور کیا آپ نے اپنا دین اہل بیتؑ سے ہی لیا تھا؟ یا یہ کہنا چاہیے کہ آپ کا قول اور تھا اور عمل اور جبکہ قول و فعل کے تضاد سے اللہ نے سختی سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم وہ باتیں کرو جن

پر عمل نہیں کرتے۔(سورۂ صف آیت ۳)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے۔" لوگ ہماری محبت کا دم بھرتے ہیں اور ہمارے حقوق پامال کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں" یَدَّعُونَ حُبَّنَا وَیَنْغَوْنَ غَفُوْقَنَا.

ابن حجر مکی اور اُن کے ہم نوا اہل بیتؑ کی محبت کا زبانی دعویٰ تو کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنا دین اُن لوگوں سے حاصل کیا جنھوں نے اہل بیتؑ پر ستم توڑے تھے۔ ابن حجر مکی اور اُن جیسے لوگوں نے مخالفین اہل بیتؑ کی پیروی کی ہے۔ اسے ابن حجر مکی کا دوہرا معیار کہیے یا دوغلا پن کہ ایک طرف سے تو وہ فضائل اہل بیتؑ کی بات کرتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اہل بیتؑ کی پیروی لازمی ہے لیکن اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے خلاف انھوں نے محاذ کھول رکھا تھا۔ ابن حجر مکی نے شیعیان آل محمدؐ کے خلاف انتہائی غلیظ زبان استعمال کی ہے اور اُن پر تہمتیں لگائی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ شیعوں کا قصور کیا ہے؟ صرف یہی کہ وہ اہل بیتؑ کے پیروکار ہیں اور انھوں نے دین اہل بیت طاہرینؑ سے حاصل کیا ہے؟!

حدیث ثقلین پر اعتراضات

۱۔ ابن جوزی کے اعتراضات۔

ابن جوزی نے حدیث ثقلین کی اسناد پر اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب العلل المتناهية في الاحاديث الواهية میں حدیث ثقلین لکھ کر یہ کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں عطیہ عوفی موجود ہے جبکہ احمد اور یحییٰ اور دوسرے علمائے حدیث نے اُن کی تضعیف کی ہے۔ اس حدیث کی سند میں ابن عبدالقدوس بھی موجود ہے جس کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ خبیث رافضی تھا۔ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن داہر بھی موجود ہے جس کے متعلق احمد اور یحییٰ نے یہ لکھا ہے کہ وہ قابل قبول نہیں اور علم رجال کے کسی بھی عالم نے اُس کے متعلق اچھائی کی گواہی نہیں دی ہے۔[1]

جواب

۱۔ ابن جوزی کو مغالطہ ہوا ہے۔ اس حدیث کی سند صرف اُن افراد تک محدود نہیں ہے جن پر ابن جوزی نے اعتراض کیا ہے۔ یہ حدیث بہت سی اسناد کے ساتھ مروی ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ امام مسلم نے اس حدیث کو متعدد طرق سے نقل کیا ہے جبکہ کسی روایت کا ایک بار صحیح مسلم میں

۱۔ العلل المتناهية في الاحاديث الواهية ج ۱، ص ۲۶۹۔

آجانا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ جب علمائے اہل سنت کا اجماع ہے کہ صحیح مسلم میں ایک ہی سند سے بیان کی جانے والی حدیث صحیح ہے تو جس حدیث کو امام مسلم نے متعدد اسناد سے بیان کیا ہے آخر اُس پر اعتراض کیوں ہے؟

۳۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو سنن ترمذی میں متعدد طرق سے نقل کیا ہے اور اس کی اسناد جابر بن عبداللہ، زید بن ارقم، ابوذر، ابوسعید اور حذیفہ پر منتہی ہوتی ہیں۔

۴۔ ابن جوزی اپنی کتاب الموضوعات کی ج ۱ ص ۹۹ پر لکھتے ہیں: "جب کسی حدیث کو متون اسلام (موطا، مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ) سے باہر پاؤ تو پھر حدیث پر خوب غور کرو۔ اگر کتب صحاح و حسان سے اس کی تائید میں کوئی روایت ملے تو اُس کے درست ہونے کا احتمال سمجھنا چاہیے۔"

جب ابن جوزی نے خود یہ قاعدہ مقرر کیا ہے تو پھر حدیث ثقلین کے متعلق اپنے قاعدے کی خلاف ورزی انھوں نے کیوں کی؟ ابن جوزی جن کتابوں کو "متون اسلام" کا درجہ دیتے ہیں ان متون میں حدیث ثقلین موجود ہے۔ اس کے باوجود انھیں اعتراض کیوں ہوا؟

۵۔ عطیہ کے متعلق ابن جوزی کی رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن سعد نے اُسے موثق کہا ہے۔

ابن حجر کی لکھتے ہیں کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ عطیہ عوفی نے ابن اشعث کے ساتھ سفر کیا۔ حجاج بن یوسف نے اپنے عامل محمد بن قاسم (فاتح سندھ) کو چٹھی لکھی کہ تم عطیہ کو اپنے دربار میں بلا کر اُس سے کہو کہ وہ علیؑ بن ابی طالبؑ پر لعنت کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُس کو چار سو کوڑے مارو اور اُس کا سر اور داڑھی موڈھ دو۔ محمد بن قاسم نے عطیہ[1] کو اپنے پاس طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ علیؑ بن ابی طالبؑ پر لعنت کریں۔ عطیہ نے انکار کیا تو محمد بن قاسم نے انھیں چار سو کوڑے لگوائے۔ اس کے بعد عطیہ خراسان چلے گئے۔ جب حجاج کے مرنے پر عمر بن ہبیرہ عراق کا والی بنا تو عطیہ خراسان سے عراق آگئے۔ انھوں نے ۱۱۰ھ میں انتقال کیا۔ عطیہ قابل اعتماد راوی تھے اور انھوں نے بہترین احادیث بیان کی تھیں۔[2]

ضمناً ہم یہ بھی بتا دیں کہ ابن سعد ناصبی تھا۔ وہ آل محمدؐ سے دشمنی رکھتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

۱۔ عطیہ عوفی کے نام سے تین اصحاب گزرے ہیں۔ ایک حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے — جو عطیہ بکاء کے نام سے مشہور ہیں — دوسرے امام محمد باقرؑ کے اور تیسرے امام جعفر صادقؑ کے صحابی تھے۔ امام باقرؑ کے صحابی عطیہ بن سعید عوفی کا یہ واقعہ طبقات ابن سعد ج ۶ کے علاوہ طبری کی منتخب ذیل المذیل میں بھی موجود ہے۔ (رضوانی)

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۳۱۔

امام جعفر صادقؑ ضعیف راوی ہیں۔ آل محمدؐ سے دشمنی کے باوجود ایک محب آل محمدؐ (حلیہ) کی تعریف کو خدائی تائید ہی کہا جا سکتا ہے۔

۶۔ حلیہ کا تعلق احمد بن حنبل کے رجال سے ہے اور احمد قابل اعتماد لوگوں کے علاوہ کسی سے روایت نہیں کرتے تھے۔ احمد بن حنبل نے حلیہ سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں لہٰذا ابن جوزی کا یہ کہنا کہ احمد، حلیہ کو ضعیف سمجھتے تھے، محض جھوٹ ہے۔

تقی سبکی لکھتے ہیں کہ خدا احمد پر رحمت کرے۔ وہ ہمیشہ بااعتماد راویوں سے ہی روایت کرتے تھے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ہمارے مشہور مخالف ابن تیمیہ نے بھی کیا ہے۔ ابن تیمیہ نے دمار بکری کے دس خطوط کے جواب میں جو کتاب لکھی تھی اس میں لکھا ہے کہ جرح و تعدیل کے قائل علماء کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے علماء بھی ہیں جو قابل بھروسا افراد کے علاوہ دوسروں سے روایت نہیں کرتے تھے مثلاً مالک اور احمد بن حنبل۔

ابن تیمیہ کی یہ گواہی کافی ہے کہ احمد بن حنبل ہمیشہ قابل بھروسا افراد سے ہی روایت کرتے تھے اور ان کے راویوں میں حلیہ بھی شامل ہیں جن پر ابن جوزی نے اعتراض کیا ہے۔[1]

۷۔ ابن جوزی نے تو حدیث ثقلین کو مخدوش ثابت کرنے کے لیے حلیہ کو مجروح کہا ہے لیکن اس کے نواسے سبط ابن جوزی نے حلیہ کے قابل اعتماد ہونے کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ اسے ضعیف راوی شمار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سبط ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے بند کرا دیے۔ صرف اپنا اور امام علیؑ کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔ جب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو رسول خداؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَجْنُبَ فِی هٰذَا الْمَسْجِدِ غَیْرِیْ وَ غَیْرُکَ میرے اور تمہارے علاوہ کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اس مسجد میں جنب ہو۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ اگر اس حدیث پر کوئی شخص یہ کہہ کر جرح کرے کہ یہ حدیث ناقابل اعتبار ہے کیونکہ اس کا راوی حلیہ عوفی ہے اور وہ ضعیف ہے اور اس کے ضعف کے لیے یہ کہے کہ ترمذی نے کہا کہ میں نے یہ حدیث امام بخاری کے سامنے پڑھی تو وہ اسے سن کر مسکرا دیے تھے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حلیہ عوفی نے ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ وہ موثق تھے اور یہ کہنا کہ امام بخاری اس حدیث کو سن کر مسکرا دیے تھے کیونکہ

۱۔ شفاء الاسقام ج ۱۰، ص ۱۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا میں حلال نہیں سمجھتا مگر پاک افراد کے لیے۔ حالت حیض اور جنابت میں مسجد سے گزرنا صحیح نہیں ہے۔
شافعی کہتے ہیں کہ حالت جنابت میں مسجد سے گزرنا جائز ہے۔ ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ جنب کے لیے مسجد سے گزرنا جائز نہیں ہے تا آنکہ وہ غسل جنابت نہ کرے اور امام علیؑ کو رسول خداؐ نے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ جس طرح چند مسائل میں خدا نے اپنے رسولؐ کو مخصوص کیا ہے اسی طرح اس مسئلے میں بھی رسول خداؐ نے امام علیؑ کو مخصوص کیا تھا اور یہ حکم آپ کا خاصہ تھا۔[1]

۸۔ ابن جوزی کا یہ کہنا بھی سراسر جھوٹ ہے کہ یحییٰ بن معین نے عطیہ کو ضعیف کہا ہے۔ ابن جوزی کے اس قول کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ "دوری" نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ عطیہ مرد صالح ہے۔
حافظ ابن حجر کی عطیہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ دوری نے ابن معین سے یہ نقل کیا ہے کہ عطیہ مرد صالح تھا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جوزی نے عطیہ کی تضعیف کے لیے ابن معین پر جھوٹ باندھا تھا۔ لگتا ہے کہ ابن جوزی حدیث ثقلین کے طرق سے ناواقف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عطیہ کی تضعیف سے حدیث ثقلین بھی ضعیف بن جائے گی جبکہ یہ حدیث اتنے زیادہ طرق سے منقول ہے کہ عطیہ کی تضعیف سے اس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔
عطیہ نے ابوسعید سے جو روایت کی ہے وہی روایت ابوطفیل نے بھی ابوسعید سے نقل کی ہے جبکہ ابوطفیل کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔ حدیث ثقلین خواہ عطیہ سے آئی ہو یا ابوطفیل سے نیز یہ کہ عطیہ اور ابوطفیل کو ضعیف بھی مان لیا جائے تب بھی حدیث کی صحت اس سے ہرگز متاثر نہیں ہوگی کیونکہ اس حدیث کے اور بھی طرق موجود ہیں۔[3]

ابن عبدالقدوس پر ابن جوزی کی جرح کا جواب

ابن جوزی نے عبداللہ بن عبدالقدوس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مشہور حافظ الحدیث محمد بن عیسیٰ نے عبداللہ بن عبدالقدوس کی تائید کی ہے لہٰذا ابن جوزی کا اعتراض باطل ہے۔ حافظ عقدی عبداللہ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ابن عدی نے محمد بن عیسیٰ سے نقل کیا کہ عبداللہ بن

۱۔ علامہ عبقات الانوار، ج ۱، ص ۳۳۹۔
۲۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۴۵۔
۳۔ علامہ عبقات الانوار ج ۱، ص ۳۳۱ بحوالہ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ج ۱۵، ص ۳۳۳۔

عبدالقدوس قابل اعتماد تھے۔[1]

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ محمد بن عیسیٰ سے عبداللہ بن عبدالقدوس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ قابل اعتماد راوی ہے۔[2] آیئے دیکھیں کہ محمد بن عیسیٰ کے متعلق محدثین کی کیا رائے ہے؟

ذہبی نے ابو حاتم کا یہ قول نقل کیا کہ وہ قابل اعتماد اور مورد اطمینان تھے۔ میں نے کسی ایسے محدث کو نہیں دیکھا جس نے ابواب حدیث کو محمد بن عیسیٰ سے بہتر طور پر حفظ کیا ہو۔

۱۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ وہ قابل بھروسا ہے۔

۲۔ محمد بن حبان نے بھی اسے قابل اعتماد کہا ہے۔ ابن حجر اس کے حالات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے ان کا نام قابل اعتماد افراد میں لیا ہے۔[3]

۳۔ ہیثمی مجمع الزوائد میں لکھتے ہیں کہ بخاری اور ابن حبان اسے قابل اعتماد قرار دیتے تھے۔

۴۔ ابن حجر عسقلانی اس کے حالات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ بخاری نے کہا وہ ذاتی طور پر سچا انسان ہے لیکن اس میں یہ نقص تھا کہ وہ ضعیف افراد سے روایت نقل کرتا تھا۔[4]

بخاری نے عبدالقدوس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے کہ وہ خود نہایت سچا تھا لیکن وہ ضعیف افراد سے روایت نقل کرتا تھا۔ بخاری کے اس تبصرے کا حدیث متقین پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اعتراض تب ہوتا جب وہ کسی ضعیف راوی سے روایت نقل کرتا لیکن یہاں تو معاملہ برعکس ہے۔ اس نے اعمش سے حدیث نقل کی ہے جبکہ اعمش قابل بھروسا راوی تھا۔

۵۔ تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب میں مرقوم ہے کہ عبداللہ بن عبدالقدوس رجال بخاری میں سے ہے اور وہ صحیح بخاری کے حاشیہ کے رجال میں سے ہے۔ اس کی تائید کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ رجال بخاری میں سے ہے اگرچہ حاشیہ کتاب ہی میں سہی۔

ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں ان لوگوں کے جواب میں جو رجال بخاری پر شک کرتے ہیں یوں رقمطراز ہیں: ہر صاحب انصاف شخص کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ امام بخاری جس سے بھی روایت کرتے تھے تو پہلے اس کی عدالت، وثاقت اور عدم غفلت پر توجہ دیتے تھے۔ ویسے بھی تمام محدثین نے بخاری و مسلم کے جمع کردہ مجموعوں کو صحیحین کے نام سے یاد کیا ہے۔ اگر ان دو کتابوں کے رجال ضعیف ہوتے تو علماء ان کتابوں کو صحیحین کا نام کیوں دیتے؟

۶۔ عبداللہ بن عبدالقدوس کا تعلق رجال ترمذی سے ہے۔

۱۔۳۔ تہذیب التہذیب ج ۵، ص ۳۰۲۔

۴۔ تہذیب التہذیب ج ۵، ص ۳۰۲۔ تقریب التہذیب ج ۱، ص ۴۳۰۔

۷۔ ابن عبدالقدوس کو اگر بالفرض ضعیف مان بھی لیا جائے تب بھی حدیث ثقلین کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حدیث ثقلین عبداللہ بن عبدالقدوس پر منحصر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ محمد بن طلحہ بن مصرف یامی اور محمد بن فضیل بن غزوان ضبی کی روایات مسند میں موجود ہیں۔ ترمذی نے اعمش سے روایت کی ہے۔ واضح رہے کہ اعمش نے اس حدیث کو صرف حبیہ سے ہی نقل نہیں کیا بلکہ عبدالملک بن ابی سلیمان میسری عزرمی اور ابو اسرائیل اسماعیل بن خلیفہ ملائی سے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ مسند احمد میں مرقوم ہے اور معجم طبرانی کے بقول یہ روایت ہارون بن سعد عجلی اور کثیر بن اسماعیل نمیری سے بھی مروی ہے۔

عبداللہ بن داہر پر ابن جوزی کا اعتراض اور اس کا جواب

۱۔ ابن جوزی کی طرف سے عبداللہ بن داہر کی تضعیف اصول جرح و تعدیل کے خلاف ہے کیونکہ غیر متخصص اشکال جس کی طرف سے بھی ہو قابل قبول نہیں ہوتا۔

۲۔ عبداللہ بن داہر پر اعتراض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ امیرالمومنینؑ کے فضائل بیان کرتا تھا۔ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن عدی کے بقول اُس کی عمومی روایات امیرالمومنینؑ کے فضائل پر مبنی ہوتی تھیں اور وہ اس سلسلے میں متہم تھا۔[1]

۳۔ اہل بیتؑ کی دشمنی میں ابن جوزی نے لکھا کہ حدیث ثقلین ضعیف ہے کیونکہ اس کے سلسلہ رواۃ میں عبداللہ بن داہر شامل ہے۔

محترم قاری سے ہماری گزارش ہے کہ وہ حدیث ثقلین کے رواۃ پر نظر ڈالیں۔ اس حدیث کے جتنے بھی طرق ہیں ان میں یہ نام دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن جوزی کو آل محمدؐ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ابن جوزی کی اس روش پر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ

ہائے استدلالیاں چوبیں بود
ہائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

۴۔ ابن جوزی کے نواسے سبط بن جوزی نے مسند احمد سے حدیث ثقلین نقل کرنے کے بعد لکھا کہ ممکن ہے کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ آپ کے نانا نے تو اپنی کتاب الواھیہ میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور اس کے راوی عبداللہ بن داہر پر تنقید کی ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ اس کے باوجود آپ اس حدیث کو کس طرح صحیح سمجھتے ہیں؟

---

[1] میزان الاعتدال ج ۲، ص ۴۱۴۔

میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ میرے نانا کو مغالطہ ہوا ہے۔ حدیث ثقلین جسے میں نے مسند احمد سے نقل کیا ہے اس میں وہ راوی موجود ہی نہیں جس پر انھوں نے تنقید کی ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے جامع ترمذی میں نقل کیا ہے۔ دیگر محدثین نے بھی اس حدیث کو اسناد سمیت نقل کیا ہے مثلاً رزین نے اس حدیث کو الجمع بین الصحاح میں نقل کیا ہے لیکن کسی بھی سلسلے میں مذکورہ راوی موجود نہیں ہے۔ مجھے تو اس بات پر تعجب ہے کہ ہمارے بزرگ نے صحیح مسلم کی وہ حدیث کیوں نہیں پڑھی جو زید بن ارقمؓ سے منقول ہے۔[1]

ہم سمجھتے ہیں کہ سبط بن جوزی اپنے بزرگ کے متعلق نیک گمان رکھتے تھے۔ وہ سمجھے کہ ان کے بزرگ سے قلمی سہو ہوا ہے جبکہ ہم علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ ابن جوزی نے یہ بات سہواً نہیں لکھی تھی۔ اسے حدیث ثقلین کے تمام طرق کا علم تھا۔ اُس نے حدیث ثقلین کی اہمیت کو فریب کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خدا نے اسے رسوا کیا۔

حدیث ثقلین پر ابن تیمیہ کے اعتراضات

ابن تیمیہ نے اپنی کتاب منہاج السنہ میں اس حدیث پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ اتنے بودے ہیں کہ انھیں لکھنا بھی وقت کا زیاں ہے۔ ابن تیمیہ کی آنکھوں میں آل محمدؐ کی فضیلت کھٹکتی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اس حدیث کی اسناد نہایت قوی ہیں تو یہ لکھ دیا کہ اس میں اہلبیتؑ سے تمسک کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ صرف قرآن سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قدر واضح متن حدیث کے بعد اس طرح کا اعتراض صرف ابن تیمیہ جیسا شخص ہی کرسکتا ہے۔ حدیث کا متن پکار پکار کر کتاب و عترت سے تمسک کا حکم دے رہا ہے۔ اگر صرف ایک سے تمسک کرنا ہی مطلوب ہوتا تو رسول خداؐ قرآن اور عترت کے لیے ثقلین کا لفظ کیوں ارشاد فرماتے؟ اور آنحضرتؐ نے یہ کیوں فرمایا: ''جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔''

ابن تیمیہ کی شوخ چشمی دیکھئے کہ اُس نے صحیح مسلم کی اُس روایت کو جو جابر سے منقول ہے پیش کیا ہے اور اس حدیث کے دوسرے تمام طرق کے متون سے روگردانی کی ہے حالانکہ اس موضوع کی دوسری احادیث کے متون کو غور سے پڑھا جائے تو یہ بات کھل جاتی ہے کہ صحیح مسلم کی جس حدیث سے ابن تیمیہ نے استدلال کیا ہے وہ ناقص ہے اور صحیح مسلم کی وہ

۱۔ تذکرہ خواص الامۃ ص ۳۲۲۔

ناقص حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ بِکِتَابَ اللّٰہِ میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔ ہے کہے یہ بات واضح ہے کہ یہ حدیث ناقص اور تحریف شدہ ہے کیونکہ اسی جابر کی یہ روایت اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا بِکِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ [1] ترمذی میں بھی موجود ہے۔ ابن تیمیہ پر یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر کتاب و سنت سے تمسک کا عقیدہ رکھتا تھا لیکن اس نے حدیث ثقلین پر جب تنقید کی تو کہا کہ صرف قرآن سے تمسک کرنا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے اگر تمسک صرف قرآن سے ہی کرنا ہے تو تمہارے مذہب کا نام اہل سنت کیوں ہے جبکہ سنت سے تمسک کا حکم ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اُس نے اپنی کتاب کا نام منہاج السنۃ کیوں رکھا جبکہ تمسک تو صرف قرآن سے ہی کرنا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب کا نام "منہاج القرآن" کیوں نہیں رکھا؟!!

اگر اس مقام پر ابن تیمیہ کا کوئی مرید یہ کہے کہ اُس نے مسلم کی جو حدیث نقل کی ہے اگرچہ اُس میں قرآن سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے لیکن وہ حدیث قرآن و سنت کی پیروی کے منافی نہیں ہے تو اس کے جواب میں ہم بھی یہ کہیں گے کہ اگرچہ مسلم کی حدیث میں قرآن سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے لیکن وہ قرآن اور اہل بیتؑ سے تمسک کے منافی نہیں ہے۔

ابن تیمیہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ وَعِتْرَتِیْ فَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ کے بارے میں لکھا کہ یہ الفاظ ترمذی نے نقل کئے ہیں اور احمد بن حنبل سے بھی اس کے متعلق سوال کیا گیا تھا۔ نیز چند اہل علم نے اس جملے کی تضعیف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جملہ صحیح نہیں ہے۔

ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ عِتْرَتِیْ۔ والا جملہ ترمذی کے سوا کسی نے نقل نہیں کیا ہے، حالانکہ بہت سے بزرگان اہل سنت اور حفاظ حدیث نے اسے نقل کیا ہے۔ پھر ابن تیمیہ کے اس جملے کا کیا مطلب ہے کہ وَعِتْرَتِیْ کے جملے کو ترمذی نے نقل کیا ہے؟ کیا ترمذی کی روایت ضعف حدیث پر دلالت کرتی ہے؟ ہم ابن تیمیہ اور اس کے پیروکاروں سے پوچھتے ہیں کہ احمد بن حنبل سے حدیث کے اس ٹکڑے کے متعلق کس نے سوال کیا تھا اور کیا کہہ کر سوال کیا تھا؟ اور کس کتاب میں اس سوال و جواب کا ذکر مرقوم ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ احمد

۱۔ ترمذی ج ۵، ص ۶۶۲، ح ۳۷۸۶۔

بن حنبل نے حدیث ثقلین نقل کی ہے اور اس کی تائید کی ہے۔

ابن تیمیہ نے جو یہ لکھا کہ کچھ اہل علم نے وَعِتْرَتِیْ کے جملے کی تضعیف کی ہے وہ اہل علم کون ہیں؟ اس کا کچھ پتا نہیں۔ الغرض ابن تیمیہ کی اس بات سے بہت سے سوال جنم لیتے ہیں۔ اگر آج ابن تیمیہ کا کوئی خالص مرید اُن سوالوں کے صحیح جواب دیتا ہے تو ہم مان لیں گے ورنہ ابن تیمیہ کا یہ مبہم اور بیکار انداز گفتگو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

حدیث ثقلین پر یہ تھے ابن جوزی اور ابن تیمیہ کے اعتراضات جن کے تحقیقی جواب ہم نے اپنے محترم قاری کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے تو مذکورہ دو افراد کے علاوہ کسی اور اہل علم نے حدیث ثقلین کا نہ تو انکار کیا ہے اور نہ ہی کسی نے اس کے مفہوم پر اعتراض کیا ہے۔ حدیث ثقلین ایک "متواتر" حدیث ہے جسے متعدد بزرگوں، حفاظ اور محدثین نے نقل کیا ہے اور اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔ اس پر سوالیہ نشان لگانے کی جرأت صرف وہی کرسکتا ہے جس کے دل میں منافقت کی بیماری ہو اور محمدؐ و آل محمدؐ کی دشمنی ہو۔ یہاں تک ہم نے حدیث ثقلین اور اس کے اسناد و متن پر گفتگو کی۔ اب ہم اس کے استدلال کو متعین کرنا چاہتے ہیں۔ جب استدلال متعین ہو جائے گا تو پھر ہم اُس دلیل کو مضبوطی سے تھام لیں گے۔

حدیث ثقلین امامت اہل بیتؑ پر دلالت کرتی ہے

اگر کوئی شخص نگاہ انصاف سے حدیث ثقلین کا مطالعہ کرے تو وہ دیکھے گا کہ یہ حدیث امامت اہل بیتؑ کی روشن ترین دلیل ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ جب تک تم قرآن اور عترت سے وابستہ رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

عترت اہل بیتؑ سے وابستگی کا مقصد یہ ہے کہ احکام و عقائد میں ان کی پیروی کی جائے اور قول و فعل میں ان کی مخالفت نہ کی جائے کیونکہ ہر وہ کام جو ان کے فرمان کے مطابق نہ ہو وہ قرآن سے باہر ہوگا اور جو کام قرآن سے خارج ہو وہ دین سے خارج ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل بیتؑ صراط مستقیم کا معیار ہیں اور ان کے راستے کو ہدایت اور ان کی مخالفت کو گمراہی کہا جاتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا "جب تک تم ان کا دامن تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔" قرآن سے تمسک کا مطلب قرآن کی پیروی اور اُس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ یعنی جن کاموں سے قرآن نے منع کیا ہے اُن سے باز رہا جائے۔ عترت سے

تمسک کی بھی یہی صورت ہے کہ ان کے فرامین پر عمل کیا جائے اور جن باتوں سے انھوں نے منع کیا ہے ان سے دور رہا جائے۔

عربی زبان کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جب جملے میں شرط ہو تو اس کی جزا کو بھی بعد میں بیان کیا جاتا ہے اور حدیث ثقلین میں بھی ایسا ہی ہے۔ فَاِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا یہ اس کی جزا ہے اور جزا کو حاصل کرنے کے لیے شرط پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اب اگر کوئی چاہتا ہے کہ گمراہی سے بچ جائے تو اس پر قرآن اور اہل بیتؑ کی پیروی کرنا لازم ہوگی۔

عربی زبان کی شد بد رکھنے والا بھی اس حدیث کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اہل بیتؑ کی پیروی کو قرآن کی پیروی کی طرح واجب قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہل بیتؑ کون ہیں جن کی پیروی قرآن کی طرح واجب ہے؟

اس سوال کا ہم عنقریب مفصل جواب دیں گے۔ اس مقام پر ہماری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ امر و نہی اور امامت و رہبری کا حق صرف اہل بیتؑ کے لیے ہی مخصوص ہے اور جہاں تک افراد اہلبیتؑ کے تعین کا سوال ہے تو فی الوقت یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ علمائے اصول کہتے ہیں، اِنَّ الْقَضِیَّةَ لَا تُثْبِتُ مَوْضُوْعَهَا یعنی جملہ اپنے موضوع کو ثابت نہیں کیا کرتا۔

البتہ یہ بات طے ہے کہ خلافت رسولؐ کا حق اہل بیتؑ کو ہی پہنچتا ہے اور آنحضرتؐ نے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ کے جملے سے خلافت اہل بیتؑ کو متعین کیا ہے اور آپ نے اس حدیث میں امت کو ان کی پیروی کی نصیحت کی ہے۔

اسی مفہوم کی تاکید کے لیے آنحضرتؐ نے یہ فرمایا تھا فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَخْلُفُوْنِیْ فِیْهِمَا دیکھنا کہ تم میرے ان دو خلیفہ کے ساتھ میری حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے کیسا سلوک کرتے ہو؟

قرآن کی خلافت واضح ہے جبکہ اہلبیتؑ کی خلافت کے لیے ان کا امام ماننا ضروری ہے۔

حدیث ثقلین سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ خدا کی کتاب اور رسول کریمؐ کی عترت ایک ایسا راستا ہے جو ہمیں رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ یہ خدا کی وہ رسی ہیں جس کے مضبوط تھامنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور فرمایا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا ... تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۳)

اللہ نے تمام مسلمانوں کو اپنی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا ہے اور رسول خداؐ نے اپنی حدیث کے ذریعے امت کو یہ پیغام دیا ہے کہ خدا کی مضبوط رسی قرآن اور عترت ہیں۔ نیز آپ نے

اپنی امت کو حکم دیا کہ وہ کتاب وعترت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے بھی یہی مفہوم لکھا ہے۔ چنانچہ ابن حجر نے صواعق محرقہ[1] میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: مَا اُنْزِلَ فِیْ اَهْلِ الْبَیْتِ مِنَ الْقُرْآنِ (اہل بیتؑ کی شان میں قرآن میں کیا کچھ نازل ہوا ہے) اور اس باب میں ابن حجر نے بھی یہ لکھا ہے کہ اہل بیتؑ ہی اللہ کی وہ مضبوط رسی ہیں جس کو مضبوطی سے پکڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔

قندوزی حنفی نے بھی ینابیع المودۃ میں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا ۔ کی تفسیر کرتے ہوئے یہی مطلب لکھا ہے۔

ثعلبی نے ابان بن تغلب سے اور اُس نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "ہم ہی خدا کی وہ مضبوط رسی ہیں جس کے تھامنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔"

کتاب مناقب میں مرقوم ہے کہ سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کی کہ انھوں نے کہا کہ ہم ایک دن رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی آیا اور اُس نے آنحضرتؐ سے کہا: یا رسول اللہؐ! سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو۔

آپ فرمائیں خدا کی وہ رسی کیا ہے جسے ہم مضبوطی سے پکڑ لیں؟

اُس وقت رسول خداؐ نے اپنا ہاتھ حضرت علیؑ کے ہاتھ پر مار کر فرمایا "اس آدمی کی پیروی کرو یہ خدا کی مضبوط رسی ہے۔"[2]

حدیث ثقلین کا ایک جملہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں۔

آنحضرتؐ کے فرمائے ہوئے اس جملے سے بہت سے مسائل واضح ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک کی ہم نشاندہی کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت خاتم الانبیاءؐ کا فرمایا ہوا یہ جملہ عصمت اہل بیتؑ کی دلیل ہے کیونکہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ قرآن سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور قرآن کریم نے اپنے متعلق یہ گواہی دی ہے لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ... باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے آسکتا ہے۔ (سورۂ فصلت: آیت ۴۲)

اہل بیتؑ قرآن کے حلیف ہیں اور وہ قیامت تک قرآن کے ساتھ رہیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قرآن کی کبھی مخالفت نہیں کریں گے۔ اُن کا ہر قول اور ان کا ہر فعل قرآن کے عین

۱۔ صواعق محرقہ ص ۱۵۱۔ ۲۔ ینابیع المودۃ ج ۱، ص ۳۵۲۔

مطابق ہوگا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ان سے صغیرہ و کبیرہ گناہ صادر ہوئے تھے تو انھیں قرآن سے دور ماننا پڑے گا جبکہ رسول خداؐ نے فرما دیا کہ وہ قرآن سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور جس کا ہر قول و فعل قرآن کے مطابق ہو اسے شریعت کی اصطلاح میں معصوم کہتے ہیں۔

۲۔ آنحضرتؐ نے حدیث ثقلین میں ارشاد فرمایا مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ یعنی جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے تو ہرگز ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔

آنحضرت نے لفظ لن ناصبہ سے اس امر کی تائید فرمائی کہ قرآن اور اہل بیتؑ دونوں معصوم ہیں اور ان دونوں کی پیروی کرنے والا بھی گمراہی سے بچا ہوا ہے۔

طبرانی کی روایت میں اسی مفہوم کی وضاحت کے لیے آنحضرتؐ سے یہ کلمات بھی منقول ہیں:

"خبردار! ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرنا وہ تم سے زیادہ جاننے والے ہیں۔"

۳۔ قرآن قیامت تک باقی رہے گا اور اس کے ساتھ سلسلۂ عترت کا بھی کوئی نہ کوئی فرد قیامت تک باقی رہے گا۔

اس مفہوم کو ابن حجر نے صواعق محرقہ میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے: "ایسی احادیث جن میں اہل بیتؑ سے تمسک کی تاکید کی گئی ہے، اُن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن تک اس خاندان میں سے کوئی نہ کوئی لائق اتباع فرد ضرور باقی رہے گا کیونکہ قرآن نے قیامت تک رہنا ہے اس لیے اہل بیتؑ کے لائق اتباع افراد کا سلسلہ قیامت تک باقی رہنا چاہیے۔ حضرت رسول خداؐ نے اپنے اہل بیتؑ کے لیے فرمایا تھا کہ وہ عذاب الٰہی سے زمین کو بچانے کا سبب ہیں۔ سابقہ روایت بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے۔

آنحضرتؐ کا یہ فرمان ہے فِیْ كُلِّ خَلَفٍ مِّنْ اُمَّتِیْ عُدُوْلٌ مِّنْ اَهْلِ بَیْتِیْ ... میری امت کی ہر نسل میں میرے اہل بیتؑ کے عادل افراد موجود رہیں گے اور اس خاندان میں جو شخص سب سے زیادہ اتباع کے قابل ہے وہ علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں۔[1]

۴۔ حضرت رسول اکرمؐ نے اہل بیتؑ کو قرآن کا حلیف قرار دیا اور قرآن کریم کا وصف یہ ہے کہ اس میں ہر خشک و تر کا علم موجود ہے۔ جب اہل بیتؑ حلیف قرآن ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی شریعت اسلام کی جزئیات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی لیے رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ ان کو پڑھانے کی کوشش نہ کرنا وہ تم سے بڑے عالم ہیں۔

۱۔ صواعق محرقہ ص ۱۵۱۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت تک اہل بیتؑ میں سے ایک فرد کا ہونا ضروری ہے جس کی پوری زندگی قرآن کے مطابق ہو اور وہ فرد قرآن سے کبھی جدا نہ ہو اور جو قول و فعل میں قرآن کے ساتھ ہو وہ معصوم ہوتا ہے اور معصوم اس قابل ہوتا ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے کیونکہ اُس میں گمراہی سے بچانے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔

شیعوں کے علاوہ اس مفہوم کا کوئی دوسرا مذہب قائل نہیں ہے۔ تمام مذاہب اسلامیہ میں سے شیعہ ہی وہ واحد مذہب ہے جو کہتا ہے کہ ہر زمانے میں اہل بیتؑ کا امام موجود ہوتا ہے جو ہر قسم کی غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ ایسے امام کی حکومت کو ماننا چاہیے اور ایسے امام کی معرفت حاصل کرنی چاہیے۔ اسی لیے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

قرآن کریم کی یہ آیت بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ۔ جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ (بنی اسرائیل: آیت ۷۱)

اہل بیتؑ کون ہیں؟

اہل بیتؑ کے افراد اتنے گمنام نہیں ہیں کہ انہیں تلاش بسیار کے بعد ڈھونڈا جائے بلکہ ہر انسان کے لیے انہیں ڈھونڈنا آسان ہے۔ ہم اُس ضدی دشمن کی بات نہیں کرتے جو اتباع اہل بیتؑ کے وجوب کے قطعی دلائل کے بعد اُن کی پیروی سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہو اور اس مقصد کے حصول کے لیے اہل بیتؑ کے مفہوم کو مشکوک بنانا چاہتا ہو۔ مجھے اس طرح کے کئی تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ جب میں اپنے ہم جماعتوں سے یہ بحث کرتا تھا کہ احادیث کی روشنی میں اہل بیتؑ کی اتباع واجب ہے تو وہ اہل بیتؑ کے مفہوم کو ہی مبہم بنانے کے لیے پوچھتے تھے کہ پہلے یہ بتاؤ کہ اہل بیت کون ہیں؟

کیا رسول خداؐ کی بیویاں اہل بیت نہیں ہیں؟

کیا رسول خداؐ نے یہ نہیں کہا تھا کہ سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے؟

کیا ابولہب رسول خداؐ کے اہل بیت میں سے نہیں تھا؟

ان تمام سوالوں کا اصل مقصد حدیث ثقلین کو مبہم بنانا ہے کیونکہ جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث ثقلین امامت اہل بیتؑ پر دلالت کرتی ہے تو وہ اہل بیتؑ کو ہی مبہم بنانے پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ خیال خام میں اپنے ذہن کے دریچوں کو بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حدیث ثقلین جیسی متواتر السند اور واضح المعنی حدیث کو اس طرح کے بے معنی سوالات سے غیر مؤثر نہیں بنایا جاسکتا۔ جب میرے ہم جماعت اس طرح کے سوال کرتے تو میں اُن سے کہتا تھا: بھائیو! تم لوگ تو "ریڈی میڈ" چیزوں کے عادی ہو چکے ہو۔ کبھی خود بھی محنت کر کے کسی حقیقت کو تلاش کرنے کی زحمت اٹھایا کرو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اہل بیتؑ کی پیروی کا حکم رسول خداؐ نے صرف مجھے دیا تھا یا پوری امت کو؟ اور کیا تم لوگ امت کے افراد نہیں ہو؟ اور کیا تم پر اہلبیتؑ کی پیروی واجب نہیں ہے؟ اگر تم مسلمان ہو تو پھر تم پر قرآن و عترت کی اتباع واجب ہے۔ تم بھی میری طرح انہیں تلاش کرو۔ امید ہے کہ جب تم تحقیق کے میدان میں اترو گے تو اہل بیتؑ سے تمہیں آشنائی حاصل ہو جائے گی۔

ہم اہل بیتؑ کی تعیین کے تمام دلائل پیش کرنے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ یہاں ہم چند واضح نکات کو اجاگر کریں گے۔ جسے مزید دلائل کی ضرورت ہو اسے خود تحقیق کرنی چاہیے۔

اہل بیتؑ در آیت تطہیر

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا اے اہل بیت! خدا بس یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر طرح کی پلیدی کو دور رکھے اور تمھیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جیسا پاکیزگی کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب، آیت ۳۳)

حدیث و تفسیر کی تحقیق کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ آیت حضرت علی، حضرت فاطمہ حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام کے حق میں نازل ہوئی تھی۔

ابن حجر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ "مفسرین کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ آیت تطہیر حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔"[1]

یہ آیت عصمت اہل بیتؑ کی واضح دلیل ہے۔ ہم پہلے ہی یہ عرض کر چکے ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد اہل بیتؑ اس امت کے ہادی ہیں اور رسول اکرمؐ نے اُن کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ البتہ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو صاحب دل ہو، گوش شنوا رکھتا ہو اور قول رسولؐ کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو کیونکہ یہ محال ہے کہ خدا تو اہل بیتؑ کی پاکیزگی کا ارادہ کرے لیکن انھیں پاکیزگی نصیب نہ ہو۔

اس آیت میں لفظ اِنَّمَا کلمہ حصر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رجس دور رکھنے کا ارادہ صرف حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے۔

بحث کی ابتدا میں ہم حدیث کساء کے چند طرق بیان کرتے ہیں جس سے اہل بیتؑ کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

حدیث کساء — عظمت اہل بیتؑ کی داستان

اہل بیتؑ کی عصمت کی واضح ترین دلیل وہ حدیث ہے جسے محدثین و مفسرین نے آیت تطہیر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کو علمائے حدیث کی اصطلاح میں "حدیث کساء" کہا جاتا ہے۔ حدیث کساء صحت اور تواتر میں حدیث ثقلین سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

۱۔ حاکم نیشاپوری مستدرک علی الصحیحین فی الحدیث میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نے دیکھا کہ رحمت نازل ہو رہی ہے تو آپ نے فرمایا: اُدْعُوْا لِیْ اُدْعُوْا لِیْ میرے پاس بلاؤ۔ میرے پاس بلاؤ۔

۱۔ صواعق محرقہ ص ۱۴۳۔

جناب صفیہؓ کہنے لگیں یا رسول اللہؐ! کسے بلاؤں؟
آپ نے فرمایا میرے اہل بیت علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلاؤ۔ جب وہ آگئے تو آنحضرتؐ نے اُن پر چادر ڈالی پھر آپ نے اپنے ہاتھ بلند کرکے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اٰلِیْ فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ خدایا! یہ میری آل ہیں۔ پس تو محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما تو خدا نے آیت تطہیر نازل فرمائی۔ حاکم لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔[1]

۲۔ حاکم نے اس سے ملتی جلتی دوسری حدیث جناب ام سلمہؓ سے نقل کی ہے۔ جناب ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آیت تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی تو رسول خداؐ نے کسی کو بھیجا کہ علیؑ، فاطمہؑ، حسن اور حسین علیہم السلام کو بلا کر لائے اور فرمایا کہ یہ میرے اہل بیتؑ ہیں۔
اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حاکم لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ حاکم نے حدیث کساء کو ایک اور مقام پر واثلہ سے نقل کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔

۳۔ امام مسلم نے اس حدیث کو بی بی عائشہؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا: ایک دن رسول خداؐ سیاہ بالوں کی چادر اوڑھے ہوئے تشریف لائے۔ کچھ دیر بعد حضرت حسنؑ آئے۔ پھر حضرت حسینؑ آئے۔ پھر حضرت فاطمہؑ آئیں۔ آپ نے اُن پر بھی چادر پھیلائی۔ پھر حضرت علیؑ آئے آپ نے انھیں بھی چادر میں جگہ دی۔ پھر آپ نے فرمایا اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ [2]
یہ واقعہ مختلف الفاظ و طرق کے ساتھ کتب صحاح، کتب حدیث اور کتب تفسیر میں مذکور ہے۔[3] یہ حدیث اتنی متواتر ہے کہ آج تک متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے اس کو ضعیف نہیں کہا ہے۔ اس مفہوم کی تمام روایات کو اگر ہم پیش کریں تو کئی صفحات درکار ہوں گے اس لیے ہم حسب ذیل چند روایت پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ تمام روایات صحیح ہیں۔

۱۔ تعیین اہل بیتؑ کی سب سے واضح روایت وہ ہے جو تفسیر درمنثور میں ابن مردویہ کے حوالے

۱۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۴۸۔
۲۔ صحیح مسلم باب فضائل اہل البیتؑ ج ۴، ص ۱۸۸۳، حدیث ۳۲۔
۳۔ سنن کبریٰ، بیہقی ج ۲، ص ۱۴۹۔ ۱۴۹، باب بیان اھل بیتہ والذین ھم آلہ۔ تفسیر طبری ج ۲۲، ص ۵۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۴۹۳۔ تفسیر درمنثور ج ۶، ص ۶۰۵۔ صحیح ترمذی ج ۵، ص ۶۹۹، حدیث ۳۸۷۱ باب فضائل فاطمہؑ۔ مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۲۹۲۔ ۳۲۳ وغیرہ۔

سے حضرت ام سلمہؓ سے منقول ہے۔ بی بی فرماتی ہیں کہ آیت تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت جبرئیل و میکائیل اور رسول خدا، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام میرے گھر میں ہی تھے۔ میں بھی گھر کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا میں آپ کے اہل بیتؑ میں سے نہیں ہوں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم خیر پر ہو۔ تم ازواج پیغمبرؐ میں سے ہو۔[1]

۲۔ حاکم مستدرک میں لکھتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ نے کہا: یا رسول اللہؐ! کیا میں آپ کے اہلبیتؑ میں سے نہیں ہوں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم خیر پر ہو جبکہ یہ میرے اہل بیتؑ ہیں۔ خدایا! میرے اہل بیتؑ بہت زیادہ حقدار ہیں۔[2]

۳۔ احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا: جب پانچ افراد چادر میں جمع ہو گئے تو میں نے چادر کا ایک کونہ اٹھایا تاکہ میں بھی اس میں داخل ہو جاؤں۔ اس وقت پیغمبرؐ نے میرے ہاتھ سے چادر کا کونہ کھینچ لیا اور فرمایا کہ تم خیر پر ہو۔[3]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام وہ افراد ہیں جنہیں رسول خداؐ نے قرآن کا حلیف قرار دیا ہے اور امت کو ان سے وابستہ رہنے کا حکم دیا ہے۔ پس اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "عترت" رشتے دار کو کہا جاتا ہے اور عترت رسولؐ سے آنحضرتؐ کے تمام رشتے دار مراد ہیں تو اس کا قول قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مفہوم ملت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ابن منظور لسان العرب میں لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ کی عترت سے اولاد فاطمہؑ مراد ہے اور یہی ابن سیدہ کا قول ہے۔ امام زہری کہتے ہیں کہ زید بن ثابت نے رسول خداؐ سے حدیث ثقلین نقل کی۔ پھر انھوں نے کہا کہ لفظ عترت سے اہل بیتؑ مراد ہیں۔

ابو عبید اور دیگر علمائے لغت نے کہا: عِتْرَةُ الشَّخْصِ، أُسْرَةُ وَ فَصِيلَةُ کسی بھی شخص کے قریبی رشتے دار اس کی عترت کہلاتے ہیں۔

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ کسی شخص کے سب سے قریبی رشتے داروں کو عترت کہا جاتا ہے۔

ابن اعرابی کہتے ہیں کہ عترت کسی شخص کی نسل، اس کی اولاد اور اس کی صلب سے پیدا ہونے والے افراد کو کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ابن اعرابی کہتے ہیں کہ عترت رسولؐ سے حضرت فاطمہ بتولؑ کی اولاد مراد ہے۔[4]

۱۔ درمنثور ج ۶، ص ۶۰۴۔ ۲۔ مستدرک حاکم ج ۲، ص ۴۱۶ تفسیر آیت سورۂ احزاب۔

۳۔ مسند احمد ج ۶، ص ۲۹۲۔۳۲۳۔ ۴۔ لسان العرب ج ۴، ص ۵۳۸۔

علمائے لغت کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل بیتؑ سے سارا خاندان بنی ہاشم مراد نہیں ہے بلکہ آپ کے قریب ترین رشتے دار مراد ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ جب زید بن ارقمؓ سے پوچھا گیا تھا کہ اہل بیت رسولؐ کون ہیں؟ کیا اس سے آنحضرتؐ کی بیویاں مراد ہیں؟ تو انھوں نے کہا تھا کہ نہیں۔ خدا کی قسم! عورت کچھ وقت اپنے شوہر کے پاس بسر کرتی ہے۔ جب شوہر اسے طلاق دیدے تو وہ اپنے والد اور قوم کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اہل بیتؑ سے آنحضرتؐ کی نسل اور وہ گروہ مراد ہے جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے۔

جب ہم تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی کسی بھی بیوی نے اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اہل بیتؑ کا فرد ہوں۔ اگر کوئی بیوی اس طرح کا دعویٰ کرتی تو تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہوتا۔ اگر آپ حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ بات کہیں نہیں ملے گی کہ آنحضرتؐ کی کسی بیوی نے آیت تطہیر پڑھ کر اپنی عصمت کو ظاہر کیا ہو جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو آیت تطہیر کے وارث تھے انھوں نے علی الاعلان اپنے اس شرف کا اظہار بھی کیا تھا جیسا کہ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں. اِنَّ اللّٰهَ فَضَّلَنَا اَهْلَ الْبَيْتِ وَكَيْفَ لَا يَكُوْنُ كَذٰلِكَ وَاللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ فِيْ كِتَابِهٖ "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" فَقَدْ طَهَّرَنَا اللّٰهُ مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ فَنَحْنُ عَلٰى مِنْهَاجِ الْحَقِّ. اللہ تعالیٰ نے ہم اہل بیتؑ کو فضیلت عطا کی ہے اور اُس نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: "اے اہل بیت! خدا تو بس یہ ارادہ رکھتا ہے کہ تم سے ہر پلیدی کو دور رکھے اور تمھیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جیسا پاکیزگی کا حق ہے" اللہ تعالیٰ نے ہمیں ظاہر و باطن ہر قسم کے تمام قبیح کاموں سے طاہر بنایا ہے اور ہم راہ حق پر ہیں۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا تھا: اَيُّهَا النَّاسُ اَنَا حَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ فَقَدْ عَرَفَنِيْ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْنِيْ فَاَنَا الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ وَاَنَا ابْنُ الْبَشِيْرِ النَّذِيْرِ الدَّاعِيْ اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَالسِّرَاجِ الْمُنِيْرِ، اَنَا مِنْ اَهْلِ الْبَيْتِ الَّذِيْ كَانَ يَنْزِلُ فِيْهِ جِبْرَئِيْلُ وَيَصْعَدُ وَاَنَا مِنْ اَهْلِ الْبَيْتِ الَّذِيْنَ اَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيْرًا. لوگو! جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں حسنؑ بن علیؑ ہوں۔ میں بشیر و نذیر (رسولؐ) کا فرزند ہوں جو خدا کے حکم سے خدا کی طرف بلانے والے اور روشن چراغ تھے۔ میرا تعلق اُس خاندان سے ہے جہاں جبرئیلؑ امینؑ آمدورفت رکھتے تھے۔ میں اُس خاندان کا فرد ہوں جن سے اللہ نے ناپاکی کو دور رکھا ہے اور ایسا پاک رکھا ہے جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔

ابن کثیر کا اشکال اور اس کا جواب

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ آیت تطہیر میں ازواج رسولؐ شامل ہیں کیونکہ آیات کا سیاق و سباق ازواج سے تعلق رکھتا ہے۔

ابن کثیر کے اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ازواج رسولؐ اس آیت میں تب شامل ہوتیں جب آیات کے صیغے ایک جیسے ہوتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب ازواج سے خطاب ہوا ہے تو وہاں مؤنث کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور جب اہل بیتؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے تو عَنْکُمْ اور وَیُطَهِّرَکُمْ جمع مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اگر آیت تطہیر کا خطاب ازواج سے ہوتا تو آیت یوں ہوتی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُنَّ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُنَّ تَطْهِیْرًا لیکن آیت میں عَنْکُنَّ کی بجائے عَنْکُمْ اور یُطَهِّرَکُنَّ کی بجائے یُطَهِّرَکُمْ کے صیغے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت تطہیر کا خطاب خواتین سے نہیں بلکہ مردوں سے ہے جبکہ بعد والی آیت میں پھر وہی مؤنث کے صیغے ہیں جیسا کہ فرمان خداوندی ہے وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ آیَاتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ. (سورۂ احزاب، آیت ۳۴) یہاں وَاذْکُرْنَ جمع مؤنث کا صیغہ ہے اور بُیُوْتِکُنَّ میں کُنَّ کی ضمیر جمع مؤنث حاضر کی ہے۔ عکرمہ کہا کرتا تھا کہ میں آیت تطہیر کے لیے مباہلہ کرنے پر تیار ہوں کہ یہ آیت ازواج رسولؐ کے متعلق ہے۔[1] عکرمہ کا یہ قول قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس کی بات اُن صریح اور صحیح احادیث کے خلاف ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد اہل کساء ہیں۔

سوال یہ ہے کہ عکرمہ کی باسی ہانڈی میں ابال کیوں آیا تھا اور وہ بازاروں میں چیخ چیخ کر کیوں کہتا تھا کہ میں اس بات پر مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ آیت تطہیر ازواج رسولؐ کے متعلق نازل ہوئی تھی؟ عکرمہ کو ازواج رسولؐ سے زیادہ محبت تھی یا پھر اسے اہل بیتؑ سے دشمنی تھی؟ آخر ان دو امور میں سے کوئی تو اس بات کا سبب ضرور بنا ہوگا۔ اگر بالفرض آیت تطہیر کا روئے سخن ازواج کی طرف ہی تھا تو عکرمہ کو مباہلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید اس لیے بلکہ یقیناً اس لیے کہ عام مسلمان اس آیت کو حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام سے مخصوص سمجھتے تھے۔

عکرمہ کے الفاظ دیکھئے۔ وہ کہتا تھا کہ "ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو بلکہ یہ آیت ازواج رسولؐ کے لیے ہے۔"[2] معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے تمام تابعین یہ نظریہ رکھتے تھے کہ آیت تطہیر اصحاب کساء کے ساتھ مخصوص ہے۔ عکرمہ کی روایت قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اسے امام علیؑ سے شدید دشمنی تھی۔ وہ خارجی تھا اور اُس نے امام علیؑ سے جنگ کی تھی۔ اب امام علیؑ کا دشمن بھلا یہ بات کیسے قبول

---

[1] و [2] درمنثور ج ۶، ص ۶۰۳۔

کرسکتا تھا کہ آیت تطہیر اصحاب کساء کے لیے ہے۔ اگر وہ ایسا کہتا تو اپنے مذہب سے ہی علیحدہ ہو جاتا اور اُس کے مذہب کی اساس ہی ختم ہو جاتی۔ اسی لیے اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ آیت تطہیر کا خطاب ازواج سے ہے۔ علاوہ ازیں بزم محدثین میں عکرمہ بڑا بدنام تھا۔ محدثین کہتے تھے کہ عکرمہ، ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ابن مینب نے اپنے غلام "برد" سے یہ کہا تھا کہ خبردار! مجھ پر جھوٹ نہ باندھنا جیسا کہ عکرمہ، ابن عباسؓ پر باندھتا ہے۔

میزان الاعتدال میں مرقوم ہے کہ ابن عمر نے یہی الفاظ اپنے غلام نافع سے بھی کہے تھے۔

عبداللہ بن عباس کے فرزند علی نے بڑی کوشش کی تھی کہ کسی طرح عکرمہ اُن کے والد پر دروغ گوئی سے باز آجائے۔ وہ اسے بیت الخلاء کے اندر بند کر دیتے تھے کہ شاید اس طرح یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے۔ عبداللہ بن ابی الحرث بیان کرتے ہیں کہ میں ابن عباس کے بیٹے علی کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ عکرمہ بیت الخلاء کے دروازے سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے علی سے کہا کہ کیا آپ اپنے غلاموں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ میرے والد پر جھوٹ باندھتا ہے۔[1]

عکرمہ کی طرح مقاتل بھی امام علیؑ کا بدترین دشمن تھا۔ وہ بھی عکرمہ کی طرح دروغ گوئی کے لیے بدنام تھا۔ سنن نسائی کے مؤلف امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) نے اسے جھوٹے افراد میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ جھوٹی احادیث بنایا کرتا تھا۔[2]

جوزجانی میزان الذہب میں لکھتے ہیں کہ مقاتل بے دھڑک جھوٹ بولتا تھا۔[3] مقاتل نے مہدی عباسی سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے دادا عباس کے لیے احادیث تیار کر دوں؟ مہدی نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[4]

لہٰذا اس طرح کے جھوٹے افراد کے نظریات قابل قبول نہیں ہیں اور ان نظریات کو تسلیم کرنا فریب خوردگی اور جہالت کے مساوی ہے۔ ہم پہلے ہی یہ عرض کر چکے ہیں کہ صحیح احادیث اور متواتر روایات سے مقاتل اور عکرمہ کے نظریات کی تردید ہوتی ہے۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آیت تطہیر کے نزول کے بعد رسول خداؐ پورے نو ماہ تک ہر نماز کے وقت امام علیؑ کے دروازے پر آتے اور فرماتے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

۱۔ وفیات الاعیان ج ۳، ص ۲۶۵۔۲۶۶۔ ۲۔ دلائل الصدق ج ۲، ص ۶۵۔

۳۔ علامہ شرف الدین، النکلمۃ الغراء ص ۲۱۷۔

۴۔ الغدیر ج ۵، ص ۲۲۶۔ مہدی عباسی بنی عباس کا خلیفہ اور ہارون رشید کا باپ تھا۔

اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ . آپ روزانہ پانچ مرتبہ ایسا کیا کرتے تھے۔[1]

صحیح ترمذی، مسند احمد، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، اسد الغابہ، تفسیر طبری، ابن کثیر اور سیوطی نے یہ لکھا ہے کہ رسول خداؐ مسلسل چھ ماہ تک ہر نماز کے وقت حضرت فاطمہؑ کے دروازے پر تشریف لاتے تھے اور فرماتے تھے اَلصَّلٰوۃَ یَا اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ.[2] اے اہل بیت نماز کا وقت ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اس جیسی اور بھی بہت سی روایات کتب حدیث و تفسیر میں مرقوم ہیں۔

ہماری ان گزارشات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اہل بیتؑ سے امام علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام مراد ہیں۔ کسی مخالف کو اس کے انکار کی جرأت نہیں ہے اور اس میں شک کرنا سورج کے وجود میں شک کرنے کے مترادف ہے۔

اہل بیتؑ در آیت مباہلہ

حق و باطل کی جنگ انتہائی دشوار ہے لیکن جب حق و باطل کی جنگ میدان کے بجائے محراب میں ہو تو وہ اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ خداوند عالم ہر طیب کا جاننے والا ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور اس طرح کی جنگ میں ایک معمولی گناہ بھی انسان کی بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول خداؐ کو کفار سے جنگ کرنا ہوتی تو آپ اس کے لیے ہتھیار جمع کرتے تھے اور ہر کلمہ گو خواہ وہ منافق ہی کیوں نہ ہوتا اس کو جنگ میں شرکت کی دعوت دیتے تھے لیکن جب آنحضرتؐ کو روحانیت کی جنگ درپیش ہوئی تو آپ نے جدید انداز سے نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کیا اور روحانیت کی اس جنگ میں آپ نے کوئی ہتھیار نہیں اٹھائے اور عام کلمہ گو افراد کو اس میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی۔ روحانیت کی اس جنگ کے لیے آنحضرتؐ نے اُن افراد کا انتخاب کیا جن کے دل سالم تھے اور گناہوں کی ہر نجاست سے پاک تھے۔ آیئے دیکھیں کائنات کے وہ برگزیدہ افراد کون تھے؟

نجران سے علمائے نصاریٰ کا ایک وفد آیا۔ آنحضرتؐ نے اُن سے بہترین انداز سے مباحثہ کیا لیکن انھوں نے آپ کے علمی اور عقلی دلائل کے مقابلے پر کفر و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔ اب مباہلہ کے علاوہ اور کوئی راستا باقی نہ رہا تو خدا نے آیت مباہلہ نازل فرمائی۔ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ

۱۔ درمنثور ج ۲، ص ۲۰۶۔

۲۔ مستدرک علی الصحیحین ج ۳، ص ۵۸۔ امام حاکم لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہے لیکن انھوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ حدیث حسب ذیل کتب میں بھی مذکور کی جا سکتی ہے۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۶۹۹۔ مسند احمد ج ۳، ص ۲۸۵۔ مسند طیالسی ص ۲۷۴۔ اسد الغابہ ج ۵، ص ۵۲۱۔

مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ علم آنے کے بعد جو بھی آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔
(سورۂ آل عمران: آیت ۶۱)

عیسائی پادریوں نے اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ پھر انھوں نے اپنے قریبی افراد کو مخصوص دن کے لیے جمع کیا۔ آخرکار وعدے کا دن آگیا اور عیسائی بڑی تعداد میں جمع ہوگئے۔ عیسائی علماء یہ سمجھتے تھے کہ رسول خداؐ اپنے صحابہ اور بیویوں کو میدان مباہلہ میں لے کر آئیں گے لیکن جب آنحضرتؐ مباہلہ کے لیے گئے تو اپنے خاندان کے مختصر افراد کو ساتھ لے کر گئے۔ امام حسنؑ رسول خداؐ کے دائیں جانب تھے اور امام حسینؑ آنحضرتؐ کے بائیں جانب تھے اور امام علیؑ اور حضرت فاطمہؑ آپ کے پیچھے چل رہے تھے۔ جب نصرانی علماء نے ان نورانی چہروں کو دیکھا تو وہ کانپ گئے اور انھوں نے اپنے اُسقف کی طرف رخ کرکے کہا:

ابو حارثہ! اب تم کیا محسوس کرتے ہو؟

اُسقف نے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں اگر ان کا واسطہ دے کر کوئی شخص خدا سے درخواست کرے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ جب عیسائیوں نے اُسقف کی یہ گفتگو سنی تو وہ فرار گئے۔ اُس وقت اُسقف نے کہا: کیا تم نہیں دیکھتے کہ محمدؐ نے اپنے ہاتھ بلند کر دیے ہیں اب انھیں ہمارے جواب کا انتظار ہے۔ مجھے حق مسیحؑ کی قسم! اگر انھوں نے بددعا کے لیے ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تو ہم میں سے کوئی بھی اپنے اہل وعیال کے پاس واپس نہیں جاسکے گا۔[1]

اس وقت نصاریٰ نے مباہلہ کا ارادہ ترک کر دیا اور جزیہ دینے پر رضامند ہوگئے۔ رسول خداؐ نے اصحاب کسا کے توسط سے عیسائیوں کو روحانی شکست دی اور وہ ذلت وخواری کے ساتھ واپس چلے گئے۔

رسول خداؐ نے فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ، اِنَّ الْعَذَابَ قَدْ تَدَلّٰی عَلٰی اَھْلِ نَجْرَانَ وَلَوْ لَا عَفَوْا لَمُسِخُوْا قِرَدَۃً وَّخَنَازِیْرَ وَلَاضْطَرَمَ عَلَیْھِمُ الْوَادِیْ نَارًا وَلَاسْتَاْصَلَ اللّٰہُ نَجْرَانَ وَاَھْلَہٗ حَتّٰی الطَّیْرَ عَلَی الشَّجَرِ وَمَا حَالَ الْحَوْلُ عَلَی النَّصَارٰی کُلِّھِمْ اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اہل نجران پر عذاب آنے ہی والا تھا۔ اگر خدا کی بخشش ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ مسخ ہوکر بندر اور خنزیر بن جاتے اور ان کے دشت و دمن آگ سے بھر جاتے اور سال بھر میں تمام

۱۔ درمنثور، سیوطی ج ۲، ص ۲۳۸، ۲۳۹، ذیل آیت مباہلہ۔

عیسائی ختم ہو جاتے حتیٰ کہ ان کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی مر جاتے۔

اب سوال یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے مباہلہ کے لیے صرف اپنے اہل بیتؑ کے چار افراد کا ہی انتخاب کیوں کیا تھا؟ اس کا جواب ایک جملے میں دیا جا سکتا ہے کہ اہل بیتؑ بھی آنحضرتؐ کی طرح طاہر و مطہر تھے اور انہی کے لیے اللہ نے آیت تطہیر نازل کی تھی۔ اگر ان کے ساتھ آیت تطہیر میں کوئی اور بھی شریک ہوتا تو آنحضرتؐ اسے بھی روحانیت کی اس جنگ میں اپنے ساتھ ضرور لے جاتے۔

آیت مباہلہ میں تین طبقات کو مباہلہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

۱۔ اَبْنَآءَنَا ہمارے بیٹے ۲۔ نِسَآءَنَا ہماری عورتیں ۳۔ اَنْفُسَنَا ہمارے نفوس

اَبْنَآءَنَا کے تحت رسول اکرمؐ حسن و حسین علیہم السلام کو ساتھ لے کر گئے اور نِسَآءَنَا کے تحت آپ نے حضرت فاطمہؑ کا انتخاب کیا (واضح رہے کہ لفظ نساء کے عربی زبان میں تین معانی ہوتے ہیں۔ نِساء کے ایک معنی ہیں عورتیں، دوسرا معنی ہے بیٹیاں اور تیسرا معنی ہے مائیں۔ رسول خداؐ کا حسن انتخاب دیکھئے کہ آپ نے جس مستور کا انتخاب کیا اس میں تینوں معانی پائے جاتے تھے۔

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

آپ رسولؐ کی بیٹی، امام علیؑ کی زوجہ اور حسنین کریمینؑ کی ماں تھیں۔ مترجم)

اَنْفُسَنَا کے تحت آپ نے امام علیؑ کا انتخاب کیا کیونکہ امام علیؑ اَبْنَآءَنَا اور نِسَآءَنَا میں شامل نہیں تھے۔ آپ نفس رسولؐ بن کر میدان مباہلہ میں تشریف لے گئے تھے۔

امام علیؑ کس طرح نفس رسولؐ ہیں، اس کی وضاحت آنحضرتؐ کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

اَنَا وَ عَلِیٌّ مِنْ شَجَرَةٍ وَاحِدَةٍ وَسَائِرُ النَّاسِ مِنْ اَشْجَارٍ شَتّٰی میں اور علیؑ ایک درخت (ایک ہی اصل و اساس) سے ہیں جبکہ باقی لوگ مختلف درختوں سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آیت مباہلہ میں امام علیؑ کو "نفس رسول" قرار دیا ہے۔ اب جس طرح رسول کو رہبری کا حق حاصل ہے اسی طرح امام علیؑ کو بھی رہبری کا حق حاصل ہے اور جس طرح رسول خداؐ کو مسلمانوں پر حق تصرف حاصل ہے اسی طرح امام علیؑ کو بھی تمام مسلمانوں پر حق تصرف حاصل ہے۔ البتہ امام علیؑ منصب نبوت میں شریک نہیں ہیں۔ اسی لیے حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اے علیؑ! تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔[۱]

۱۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب ج ۵، ص ۲۳۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ ج ۴، ص ۱۸۷۰۔ مسند احمد ج ۶، ص ۳۶۸۔

ہم آیت مباہلہ سے امامت امیر المومنین کا فی الحال اثبات نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے اہل بیتؑ کی تعیین کے لیے اس آیت پر مختصری گفتگو کی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مسلمانوں میں آیت مباہلہ کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مسلم اور ترمذی دونوں نے باب فضائل علیؑ میں یہ لکھا کہ سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول خداؐ نے امام علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو بلایا اور کہا:

اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلِیْ خدایا! یہ میرے اہل ہیں[1]

پیغمبر اکرمؐ کا یہ ارشاد ہے کہ خدایا یہ میرے اہل ہیں، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد یہی چار نفوس قدسیہ ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم ج ۲، ص ۱۸۷۱، حدیث ۳۲، طبع عیسی الحلبی اور ج ۱۵، طبع مصر ص ۱۷۶ باشرح نووی۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۶۳۸، حدیث ۳۷۲۴۔ مستدرک علی الصحیحین ج ۳، ص ۱۵۰۔

ولایت علیؑ در قرآن

اہل بیتؑ کی اتباع کے وجوب کے متعلق میں کافی عرصے تک ذہنی اور روحانی خلفشار میں مبتلا رہا۔ ایک طرف میں اپنے ضمیر سے الجھتا تھا اور دوسری طرف اپنے اساتذہ اور دوستوں سے مباحثے کرتا تھا۔ آخرکار مجھے یقین ہوگیا کہ سورج کے وجود میں تو شک کیا جا سکتا ہے لیکن اہل بیتؑ کی اتباع کے وجوب میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والی تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اہلبیتؑ کی پیروی تمام مسلمانوں پر فرض ہے اور تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ دین کو آل محمدؐ سے حاصل کریں۔

اہل بیتؑ کی اتباع کے وجوب کی حقیقت تو مجھ پر کھل گئی تھی لیکن میں اس پورے عرصے میں اپنے مذہب کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ میرا ضمیر مجھ سے مطالبہ کرتا تھا کہ میں شیعہ ہو جاؤں۔ دوسری طرف میرے گھر والے اور ہم جماعت بھی مجھے شیعہ سمجھنے لگ گئے تھے۔ میرے کئی دوست مجھے "شیعی" یا "کمینی" کہہ کر چڑاتے تھے لیکن میں نے ابھی تک باقاعدہ شیعہ ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا البتہ مجھے تشیع کی صداقت پر یقین آگیا تھا۔ دوسری طرف نفس امارہ مجھے اس سے منع کرتا تھا اور میرے دل میں یہ خیال پیدا کرتا تھا کہ پاگل ہوگئے ہو؟! اپنے باپ دادا کے مذہب کو چھوڑنا چاہتے ہو؟! اس معاشرے میں شیعہ بن کر کیسے جیو گے جبکہ سارا معاشرہ ہی سنی ہے؟ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ تم ان حقائق کا ادراک کر سکو جن کا بزرگ علماء ادراک نہ کر سکے؟ کیا تمام مسلمان ان حقائق سے ناواقف ہیں؟! ایسے ہزاروں سوالات اور شکوک و شبہات مجھے گھیر لیتے تھے جن کی وجہ سے میں اپنے تشیع کا حتمی اعلان کرنے سے باز رہتا تھا۔

عقل مصلحت بیں مجھے اعلان تشیع سے روک رہی تھی جبکہ حقائق کو عقل اور میرا ضمیر مجھ سے اعلان تشیع کا تقاضا کرتے تھے۔ میں دوراہے پر کھڑا "گویم مشکل وگر نگویم مشکل" کی کیفیت میں تھا۔ روح کی تشنگی کے اپنے تقاضے تھے جبکہ ماحول و معاشرے کے اپنے تقاضے تھے اور اس ماحول میں میرا کوئی ہمدم اور مونس و غمخوار نہیں تھا۔ میں نے روح کی آواز کو تھپکیاں دے کر سلانے کے لیے یہ فیصلہ کیا

کہ مجھے شیعہ مخالف کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ان کے ذریعے سے مجھے اندرونی کرب سے نجات مل جائے اور آبائی دین کے کچھ حقائق سامنے آجائیں تاکہ دل کو اطمینان نصیب ہو۔

وہابیت نے مجھے شیعہ مخالف کتابیں جمع کرنے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ شیعوں کی مخالفت میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب ہمارے گاؤں کے وہابی امام کے پاس موجود تھیں۔ میں اس سے جو بھی کتاب مانگتا وہ فوراً مجھے مطالعہ کے لیے فراہم کر دیتا تھا لیکن جب میں نے شیعہ مخالف کتابیں پڑھیں تو مجھے شیعوں کی صداقت کا یقین ہوگیا کیونکہ مذکورہ کتابیں منطق اور علمی دلائل سے یکسر خالی تھیں۔ اُن میں لعن طعن اور تہمتوں کے سوا کوئی علمی مواد موجود نہیں تھا۔ اُن کتابوں کے پڑھنے سے مجھے یہ یقین ہوگیا کہ مخالفین شیعہ کا دامن دلائل سے خالی ہے اور جو دلائل وہ پیش کرتے ہیں وہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی تحقیق کو مزید آگے لے جانا چاہیے۔ چنانچہ قلب و ضمیر کے اس فیصلے کے بعد میں نے امام علیؑ کی امامت و ولایت کے واضح ترین دلائل کو تلاش کرنا شروع کردیا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرے ذہن میں پہلے سے بھی کافی دلائل موجود تھے جنھوں نے مجھے میرے مقصد تک پہنچنے میں میری مدد کی تھی اور میں جلد ہی گوہرِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس تحقیق کے بعد وہ فیصلہ کن لمحہ آگیا جس میں مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا میں سنی رہوں اور اصحاب ثلاثہ کی عظمت اور اُن کی خلافت کے گن گاتا رہوں یا شیعہ بن جاؤں اور امام علیؑ کی امامت کا اقرار کروں؟ ایک صبر آزما تحقیق کے بعد میں ایک غیر مختصر نتیجے تک جا پہنچا اور امام علیؑ کی امامت پر ایمان لے آیا۔

امام علیؑ کی امامت کے دلائل بہت زیادہ ہیں لیکن بلحاظ دلالت اُن کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ دلائل ایسے ہیں جو سورج کی طرح روشن ہیں اور کچھ دلائل کے لیے تمہیدی مباحث کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس باب میں میں سورج کی طرح روشن دلائل کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ بحث مختصر بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی نیز طالبانِ حقیقت کے شوق میں اضافہ کا باعث بھی ہو۔ مجھے امید ہے کہ یہ مختصر بحث حقائق کے اثبات کے لیے کافی ثابت ہوگی اور تحقیق کی وادی میں قدم رکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

۱۔ آیتِ ولایت

خداوند سبحان کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ (ایمان والو!) اللہ اور اُس کا رسول نیز وہ صاحبان ایمان تمہارے ولی ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں۔ (سورۂ مائدہ آیت ۵۵) اس آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ جناب امیرؑ کی امامت و ولایت کو بیان کیا گیا ہے اور وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ سے اُن کی ذات والا صفات ہی مراد ہے۔ لفظ "ولی" یہاں پر حاکم اور متصرف امور کے معانی میں آیا ہے۔

سنی شیعہ کی متواتر اور مستند روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی تھی جب امام علیؑ نے حالت رکوع میں اپنی انگشتری ایک سائل کو زکات میں دی تھی۔

اس آیت کی شان نزول حسب ذیل دس صحابہ کرام سے منقول ہے۔

۱۔	ابوذر غفاریؓ	۲۔	مقداد بن اسودؓ
۳۔	ابو رافع قبطیؓ (رسول خداؐ کا غلام)	۴۔	انس بن مالکؓ (رسول خداؐ کا خادم)
۵۔	امام علی بن ابی طالبؑ	۶۔	عمار بن یاسرؓ
۷۔	عبداللہ بن سلامؓ	۸۔	عبداللہ بن عباسؓ
۹۔	جابر بن عبداللہ انصاریؓ	۱۰۔	عمرو بن عاص

اب جائزہ لیتے ہیں کہ کس کس صحابی سے کس کس عالم نے اس واقعے کو نقل کیا ہے:

(۱) حضرت ابوذرؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے علماء کے نام یہ ہیں

الف۔ ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی در تفسیر الکشف والبیان عن تفسیر القرآن

ب۔ حافظ حاکم حسکانی در شواهد التنزیل ج ۱، ص ۱۷۷، طبع بیروت۔

ج۔ سبط ابن جوزی در تذکرۃ الخواص الامۃ ص ۱۸۔

د۔ حافظ ابن حجر عسقلانی در الکاف الشاف ج ۱، ص ۶۴۹۔

بہت سے دیگر محدثین نے بھی اس روایت کو حضرت ابوذرؓ سے نقل کیا ہے۔

(۲) حضرت مقدادؓ سے اس حدیث کو حافظ حسکانی نے شواهد التنزیل ص ۱۷۷ پر نقل کیا ہے۔

(۳) حضرت ابو رافعؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے علماء کے نام یہ ہیں:

الف۔ حافظ ابن مردویہ در کتاب الفضائل۔

ب۔ حافظ جلال الدین سیوطی در الدر المنثور ج ۳، ص ۱۰۴۔

ج۔ محدث علی متقی ہندی در کنز العمال ج ۱، ص ۳۰۵۔

مذکورہ علماء کے علاوہ بھی بہت سے حفاظ نے اسے ابو رافعؓ سے نقل کیا ہے۔

(۴) حضرت انس بن مالکؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے علماء کے نام یہ ہیں۔
الف۔ حافظ حاکم حسکانی در شواھد التنزیل ج ۱، ص ۱۶۵۔
ب۔ محدث اکبر حموی جوینی خراسانی در فرائد السمطین ج ۱، ص ۱۸۷۔
(۵) حسب ذیل علماء نے اس روایت کو خود حضرت امیر المومنینؑ سے نقل کیا ہے۔
الف۔ حاکم نیشاپوری در کتاب معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۰۲، طبع مصر، سال طباعت ۱۹۳۷ء۔
ب۔ فقیہ ابن مغازلی شافعی در المناقب ص ۳۱۱۔
ج۔ حافظ حنفی خوارزمی در المناقب ص ۱۸۷۔
د۔ حافظ ابن عساکر دمشقی در تاریخ مدینۃ دمشق ج ۲، ص ۳۰۹۔
ہ۔ ابن کثیر دمشقی در البدایہ والنہایہ ج ۲، ص ۳۵۷، طبع بیروت۔
و۔ علی متقی ہندی در کنز العمال ج ۱۵، ص ۱۳۶۔
ز۔ ابن حجر عسقلانی در الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف ج ۲، ص ۶۳۹۔
(۶) حضرت عمارؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے علماء کے نام یہ ہیں:
الف۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ در الفضائل۔
ب۔ حافظ حاکم حسکانی در شواھد التنزیل ج ۱، ص ۱۷۳۔
ج۔ حافظ ابن حجر عسقلانی در الکاف الشاف ج ۱، ص ۶۳۹ بحوالہ طبرانی و ابن مردویہ۔
(۷) حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے علامہ محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ کے صفحہ ۱۰۲ اور الریاض النضرہ ج ۲، ص ۲۲۷ پر یہ روایت نقل کی ہے۔
(۸) حضرت ابن عباسؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے علماء کے نام یہ ہیں۔
الف۔ احمد بن یحییٰ بلاذری در انساب الاشراف ج ۲، ص ۱۵۰، طبع بیروت۔
ب۔ واحدی در اسباب النزول ص ۱۳۳۔
ج۔ حاکم حسکانی در شواھد التنزیل ج ۱، ص ۱۸۰۔
د۔ ابن مغازلی شافعی در المناقب ص ۳۱۱۔
ہ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی در الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف طبع مصر۔
و۔ علامہ جلال الدین سیوطی در الدر المنثور۔
(۹) حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے حاکم حسکانی نے شواھد التنزیل ج ۱، ص ۱۷۴ میں یہ روایت نقل کی ہے۔

(۱۰) یہ روایت عمرو بن عاص سے بھی منقول ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں۔ چنانچہ عمرو سے خطیب خوارزم حافظ ابوبکر مؤید نے المناقب کے ص ۱۲۸ پر اسے نقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا روایات میں سے ہم بطور نمونہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت کا انتخاب کرتے ہیں اور اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی بیان کردہ روایت مفصل ہے۔

حافظ حاکم حسکانی اپنی کتاب شواهد التنزیل ج ۱، ص ۱۷۷ طبع بیروت میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا "لوگو! جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں جندب بن جنادہ بدری ابوذر غفاریؓ ہوں۔ میں نے ان کانوں سے رسول خداؐ کو یہ فرماتے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے یہ کان بہرے ہو جائیں اور میں نے یہ منظر اپنی ان آنکھوں سے دیکھا تھا اور اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے کہ یہ اندھی ہو جائیں آنحضرتؐ نے فرمایا عَلِيٌّ قَائِدُ الْبَرَرَةِ، قَاتِلُ الْكَفَرَةِ، مَنْصُورٌ مَنْ نَصَرَهُ، وَ مَخْذُولٌ مَنْ خَذَلَهُ علیؑ نیک لوگوں کا رہبر ہے، کافروں کا قاتل ہے۔ جو اس کی مدد کرے خدا اُس کی مدد کرے گا اور جو اسے چھوڑے خدا اسے ذلیل کرے گا۔

ایک دن میں نے رسول خداؐ کے ساتھ نماز ظہر مسجد میں ادا کی۔ مسجد میں ایک سائل آیا اور اُس نے خیرات مانگی۔ کسی نے اسے کچھ نہ دیا۔ اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرکے کہا کہ خدایا تو گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسولؐ کی مسجد میں خیرات مانگی لیکن کسی نے مجھے کچھ نہ دیا اُس وقت امام علیؑ حالت رکوع میں تھے۔ آپ نے اپنی چھوٹی انگلی سے جس میں آپ نے انگوٹھی پہنی ہوئی تھی اسے اشارہ کیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر آپ کی انگلی سے انگوٹھی اتار لی۔

پیغمبر اکرمؐ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ نماز مکمل ہوتے ہی آپ نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف بلند فرمایا اور عرض کی "خدایا! میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے دعا کی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي۔ پروردگارا اُس وقت تو نے اُن کی دعا قبول فرمائی تھی اور اُن سے کہا تھا کہ ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرا بازو مضبوط کریں گے۔ پروردگارا! میں محمدؐ تیرا نبی اور رسول ہوں۔ پروردگار میرے سینے کو بھی کشادہ فرما، میرے معاملے کو بھی آسان فرما اور میرے خاندان میں سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر مقرر فرما اور اُس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط فرما۔"

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! ابھی رسول خداؐ کی دعا پوری نہ ہوئی تھی کہ جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور کہا کہ محمدؐ! مبارک ہو! آپ نے اپنے بھائی کے متعلق جو دعا مانگی ہے وہ قبول ہو چکی ہے۔

حقیقت گمشدہ

رسول خداؐ نے فرمایا کہ وہ کیسے؟ جبرئیل امینؑ نے کہا کہ خدا نے آپ کی امت کو حکم دیا ہے کہ وہ قیامت تک علیؑ کی پیروی کرے اور اُس نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ○

یہ روایت مختلف الفاظ سے ذخیرہ حدیث میں مرقوم ہے البتہ ہم صرف اسی روایت پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ امام علیؑ کی ایک ایسی فضیلت ہے جس میں آپ منفرد ہیں۔ پوری تاریخ اسلام میں کوئی ایک شخص بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں نے حالت رکوع میں زکات دی ہے اور کسی کا یہ دعویٰ نہ کرنا حضرت امیرالمومنینؑ کی فضیلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کے مفہوم کو مشکوک بنانے کی کوششیں کیں تاکہ حضرت امیرالمومنینؑ کی یہ فضیلت مشکوک ہو جائے اور اس کے لیے انھوں نے خودساختہ تاویلات کا سہارا لیا مثلاً آلوسی نے لکھا کہ یہاں لفظ رکوع نماز کے رکوع کے معنی میں نہیں ہے اس سے خشوع مراد ہے۔

آلوسی کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تاویل کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ آیت میں ایسا کوئی قرینہ نہیں جس کی وجہ سے ہم ظاہری معنی کو چھوڑ کر خشوع مراد لیں۔ یہاں رکوع سے نماز کا رکوع ہی مراد ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے یونیورسٹی میں یہ کہا کہ یہ آیت حضرت امیرالمومنینؑ کی ولایت کی واضح دلیل ہے۔ اس کے جواب میں میرے ایک ہم جماعت نے کہا کہ اگر تمہاری بات سچی ہے تو پھر امام علیؑ کی نماز ناقص ہے۔[1]

میں نے کہا: وہ کیسے؟ اُس نے کہا کہ نماز کے لیے خشوع و خضوع ضروری ہے اور حضرت علیؑ تو ویسے ہی خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ بھلا انھوں نے نماز کی حالت میں سائل کی آواز کیسے سن لی اور ہاتھ سے کیسے اشارہ کیا؟ میں نے کہا کہ پھر تم خدا سے اس کا شکوہ کرو کہ اُس نے علیؑ کی نماز کی قبولیت کی سند کیوں نازل فرمائی؟ خدا نے علیؑ کی صرف نماز ہی قبول نہیں کی بلکہ اُن کی ولایت و امامت کا بھی اعلان کر دیا۔ اگر تمھیں علیؑ کی نماز پر شک ہے تو قرآن سے جا کر کہو کہ اس نے علیؑ کی ولایت کا اعلان کیوں کیا؟

۱۔ حضرت زکریاؑ نے جب اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ پروردگار مجھے اپنی جناب سے صالح اولاد عطا فرما تو قرآن کریم میں ہے کہ فَنَادَتْہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ زکریا محراب عبادت میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے انھیں آواز دی کہ زکریا خدا تمھیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے زکریا نے حالت نماز میں کہا کہ اے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۳۹۔۴۰) (مترجم)

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں یونیورسٹی میں ساتھیوں سے بحث کر رہا تھا اور میں نے ان سے کہا کہ حضرت علیؑ مثیل ہارونؑ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی اور رسول خداؐ نے بھی ایسی ہی دعا امام علیؑ کے لیے مانگی تھی۔ پھر میں نے کہا کہ رسول خداؐ نے فرمایا تھا اے علیؑ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ کو جو جو مناصب حاصل تھے وہ سب حضرت علیؑ کو بھی حاصل ہیں البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ نبی تھے جبکہ حضرت علیؑ نبی نہیں ہیں۔ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے وزیر اور خلیفہ تھے اور حضرت علیؑ رسول خداؐ کے وزیر اور خلیفہ تھے۔

یہ سننا تھا کہ میرے دوست اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے تمہارے پاس اس گفتگو کا کیا ثبوت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ بھائیو! جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آیئے قرآن حکیم سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے کیا نسبت حاصل تھی؟

حضرت موسیٰؑ کی دعا قرآن میں موجود ہے۔ انھوں نے بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کیا تھا: خدایا! میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما۔ اس کے ذریعے سے میری کمر کو مضبوط فرما اور اسے میرے کام میں شریک فرما۔ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۲۹ تا ۳۲)

ساتھی یہ کہنے لگے کہ ہم نے ایسی بات نہیں سنی۔ ممکن ہے کہ آیت کسی اور طرح ہو... میں نے عرض کیا: ساتھیو! اس میں شک کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ تو قرآنی حقیقت ہے۔ ایک ساتھی نے کہا کہ بھائیو! لڑتے کیوں ہو؟ قرآن موجود ہے کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ پھر اس نے قرآن اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا اگر تم سچے ہو تو جو کچھ کہہ رہے ہو قرآن سے دکھاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ پریشان ہو گیا کیونکہ مجھے آیات یاد تھیں لیکن پارہ اور سورہ یاد نہیں تھا۔ کچھ دیر تو میں پریشان رہا۔ پھر دل میں میں نے محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجا اور قرآن کھولا۔ اسے قرآن کا معجزہ کہیں یا صداقت آل محمدؐ کا نام دیں میں نے جیسے ہی قرآن کھولا تو سامنے یہ آیات موجود تھیں: قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي. قرآن کریم کی مطلوبہ آیات جب اچانک سامنے آئیں تو میں شدت تعجب سے رونے لگا اور ساتھیوں سے کہا کہ لو خود ہی پڑھ لو۔

اس تصادف پر مجھے آج تک حیرت ہے اور آج کئی برس بعد بھی جب میں اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو اسے قدرت کی طرف سے غیبی امداد سمجھتا ہوں۔

ہماری سابقہ بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ کی آیت امام علیؑ کے بارے

میں نازل ہوئی تھی اور گویا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَعَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ تمہارے ولی بس اللہ اور اُس کا رسول اور علی بن ابی طالبؑ ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ، اللہ کے رسولؐ اور حضرت علیؑ یہ تینوں تمہارے سرپرست اور رہبر ہیں۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت علیؑ تو فرد واحد تھے اللہ نے اُن کے لیے جمع کی ضمیریں کیوں استعمال کیں؟ تو اس سوال کا جواب انتہائی آسان ہے۔ عربی زبان میں واحد کے لیے جمع کے صیغے استعمال ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً ... لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ خدا نے اُن لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۸۱)

تفاسیر میں مذکور ہے کہ یہ بات "ایک یہودی" حیی بن اخطب نے کہی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ وَمِنْھُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَیَقُوْلُوْنَ ھُوَ اُذُنٌ... اور اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو نبیؐ کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو بس کان ہے (سورۂ توبہ: آیت ۶۱)

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ کہنے والا جلاس بن سویلد یا نبتل بن حرث یا عتاب بن قشیرہ جیسے منافقین میں سے کوئی ایک شخص تھا۔[1]

اب صرف لفظ "ولی" کی بحث باقی رہ جاتی ہے۔

شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ولی سے اولیٰ بالتصرف مراد ہے۔ یعنی ولی اسے کہتے ہیں جو کسی کے جان و مال پر اُس سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتا ہو اور "ولی امر مسلمین" اُس کو کہا جاتا ہے جسے مسلمانوں کے جان و مال پر تصرف کا حق حاصل ہو۔ چنانچہ اسی دلیل کے تحت شیعہ امام علیؑ کی اتباع کو واجب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت قرآنی کے تحت انھیں امور مسلمین میں تصرف کا حق دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت ولایت کی ابتدا لفظ اِنَّمَا سے کی ہے جو کلمۂ حصر ہے گویا اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اعلان فرمایا ہے کہ ولایت کا حق اللہ، اللہ کے رسولؐ اور علیؑ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اگر لفظ "ولی" سے دینی محبت مراد ہوتی تو اس محبت کو تین افراد تک محدود نہ رکھا گیا ہوتا کیونکہ تمام مومن ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست ہیں جیسا کہ ارشاد اقدس الٰہی ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ (سورۂ توبہ، آیت ۷۱)

جبکہ آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ کلمۂ حصر کے ذریعے یہ اعلان کر رہی ہے کہ ولائے محبت اور ہے اور ولائے حکومت اور ہے۔ لفظ اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے اور یہ غیر کی نفی کا تقاضی ہوتا ہے۔ یہ لفظ صرف اللہ،

---

[1] تفسیر طبری ج ۱۰، ص ۴۷۶۔

اللہ کے رسولؐ اور حالت رکوع میں زکات دینے والا مومن (علیؑ) کے لیے مخصوص ہے۔ ان کے علاوہ اس مخصوص ولایت میں اور کوئی شامل نہیں ہے۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ آج تک امام علیؑ کے سوا کسی نے حالت رکوع میں زکات نہیں دی اور امام علیؑ کے سوا کسی نے اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔

اس آیت میں وَهُمْ رَاكِعُوْنَ کا جملہ "حال" ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں۔ رکوع سے مراد نماز کا رکوع ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دوسرے معنی کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آیت میں ایسا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا کہ رکوع کے کوئی دوسرے معانی لیے جائیں۔ اسی طرح وَهُمْ رَاكِعُوْنَ کے جملے کو يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ پر عطف کہنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ رکوع نماز کا ہی ایک جزو ہے اس سے جدا نہیں اور عطف تب ہوتا جب رکوع کا تعلق نماز سے نہ ہوتا۔ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ کا جملہ حال ہے اور اس میں زکات دینے والے کی حالت بیان کی گئی ہے کہ اس نے یہ زکات گھر میں یا بازار میں نہیں بلکہ حالت رکوع میں دی تھی۔ امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ امام علیؑ کے سوا کسی نے حالت رکوع میں زکات نہیں دی اور یہ آیت امام علیؑ کی ذات والا صفات سے ہی مخصوص ہے۔

تجرید کے شارح قوشجی لکھتے ہیں کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت اِنَّمَا امام علیؑ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب آپ نے حالت رکوع میں انگشتری خیرات میں دی تھی۔ ابن شہر آشوب نے کتاب المناقب میں بھی یہی روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہ آیت امیرالمومنینؑ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔[1]

اس سلسلے کی احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ سید ہاشم بحرانی نے غایۃ المرام میں لکھا ہے کہ اہل سنت کے چوبیس طرق اور شیعوں کے انیس طرق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ کی آیت کلمہ حصر اِنَّمَا کی وجہ سے جناب امیرؑ کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا یہاں ولی کے عمومی معانی مدد کرنا یا محبت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ یہ "ولایت" مخصوص ولایت ہے جو کہ اولی بالتصرف کے معانی کے نزدیک ہے۔

علامہ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ولی سے مراد مددگار ہے اور ولی یہاں ناصر کے معنی میں ہے تو اس سلسلے میں یہ دقت پیش آئے گی کہ اس آیت میں تین ولی بیان کیے گئے ہیں یعنی اللہ ولی ہے، اس کا رسول ولی ہے اور حالت رکوع میں زکات دینے والا (علیؑ) ولی ہے جبکہ تمام مومن ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اب اگر اس آیت میں ولی کے معنی ناصر کے لیے جائیں تو پھر

۱۔ الخاتم لوصی الخاتم ص ۳۹۲۔

نصرت کی دو میں سے ایک جہت مقرر کرنا ہوگی۔

پہلی جہت تو یہ بنے گی کہ اللہ، رسولؐ اور امام علیؑ امور ولایت اور اجتماعی امور میں تصرف کے لحاظ سے ولی ہیں تو ہمیں اس معنی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ اس معنی کے تحت امیرالمومنین کی مخصوص ولایت ثابت ہوتی ہے۔

دوسری جہت یہ بنے گی کہ مومنین ایک دوسرے کی جو مدد کرتے ہیں اُس مدد کی اللہ، رسولؐ اور علیؑ کی مدد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس جہت سے بھی حضرت کی امامت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امامت کے لوازم میں مومنین کی مکمل مدد بھی شامل ہے۔[1]

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ، رسولؐ اور حالت رکوع میں زکات دینے والے کی ولایت ایک مخصوص ولایت ہے جو کہ حق تصرف کے معانی میں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ، رسولؐ اور امام علیؑ تینوں کے لیے ایک ہی لفظ "ولی" استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا جس معنی میں خدا اور اُس کے رسولؐ کی ولایت ہے اسی معنی میں امام علیؑ کی ولایت ہے کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ تینوں کے لیے لفظ ایک ہو لیکن اسی ایک لفظ کے الگ الگ معانی ہوں۔ اگر ایک لفظ مختلف معانی میں استعمال ہو تو اس سے ابہام جنم لے گا اور مخلوق گمراہ ہو جائے گی جبکہ اللہ اپنے بندوں کو گمراہ نہیں کیا کرتا۔

جی ہاں اگر امام علیؑ کی ولایت کا مفہوم کچھ اور ہوتا تو آیت میں لفظ ولی کی تکرار ہوتی۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے.... اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ (سورۂ نساء، آیت ۵۹) اللہ کی اطاعت اور ہے اور رسول کی اطاعت اور ہے۔ اللہ کی اطاعت میں سجدہ شامل ہے جبکہ رسولؐ کی اطاعت میں سجدہ شامل نہیں ہے۔ اسی لیے اس آیت میں لفظ اطیعوا تکرار ہے۔ اگر اسی طرح اللہ، رسولؐ اور امام علیؑ کی ولایت کے معانی میں فرق ہوتا تو یہاں بھی لفظ "ولی" کی تکرار ہوتی لیکن اللہ نے اس لفظ کی تکرار نہیں کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امیرالمومنین ولی امرالمومنین ہیں۔

۲۔ آیت بَلِّغْ آیت ولایت کی تصریح کرتی ہے

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے: یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ اے رسول! آپ کے پروردگار نے جو بات آپ پر نازل کی ہے اسے پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ

---

[1] دلائل الصدق ج ۲، ص ۷۵۔

اُس کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ خدا آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (سورۂ مائدہ آیت ۶۷) یہ آیت حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر نازل ہوئی تھی جیسا کہ ہم اس سے قبل زید بن ارقمؓ کی صحیح مسلم میں موجود حدیث کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

میں ہمیشہ سے دوسروں کے متعلق نیک گمان کرنے کا عادی ہوں لیکن میں نے جب سوڈان سے شائع ہونے والا ایک مجلہ "آخر خبر" میں انجینئر صادق امین کا ایک مضمون پڑھا تو میرا سارا حسن ظن ہوا ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آج بھی حقائق کا منہ چڑانے والے افراد دنیا میں زندہ ہیں۔ میں نے موصوف کا مضمون پڑھا۔ اُس میں اُس نے یہ لکھا ہے کہ "غدیر خم کا واقعہ صرف شیعہ کتابوں میں ہی پایا جاتا ہے اور شیعہ علماء نے اس افسانے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور اس پر اپنے مذہب کی اساس قائم کی ہے۔"

موصوف کے مضمون کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے بیحد حیرت ہوئی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا یہ بندۂ خدا واقعی حدیث اور تاریخ سے بے خبر ہے یا پھر اسے امام علیؑ سے خدا واسطے کا بیر ہے اور اُن کے فضائل کو چھپانا چاہتا ہے؟

واقعہ غدیر کا انکار سورج کے وجود سے انکار کرنے کے برابر ہے اور مسلمانوں کی کوئی تاریخی کتاب ایسی نہیں جس میں اس واقعے کا ذکر موجود نہ ہو۔ تو کیا انجینئر موصوف اتنا جاہل ہے کہ اُس نے آج تک اس روایت کو نہیں پڑھا؟ اگر بالفرض اُس نے آج تک اس واقعے کو نہیں پڑھا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج تک تاریخ و حدیث کی کسی کتاب کی ورق گردانی ہی نہیں کی یا پھر اُس نے اس واقعے کو پڑھا ہوا ہے اور امیر المومنین کی دشمنی سے مجبور ہو کر اسے چھپانے کا خواہشمند ہے؟

انجینئر صادق امین کو چاہیے تھا کہ پہلے وہ اہل سنت کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور اگر اسے یہ واقعہ وہاں نہ ملتا تو پھر کہتا کہ اس واقعے کو صرف شیعہ علماء نے ہی نقل کیا ہے۔

اسلامی مآخذ میں واقعہ غدیر

دنیائے اسلام کی متواتر ترین روایات میں غدیر خم کی روایت بھی شامل ہے اور ایک سو دس صحابہ سے یہ روایت منقول ہے۔ علامہ امینی نے الغدیر کی جلد اول میں صفحہ ۱۶ سے صفحہ ۶۱ تک اُن صحابہ کے نام لکھے ہیں اور حدیث کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ امینی نے کتب اہل سنت کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ تابعین میں سے چوراسی افراد نے غدیر خم کا واقعہ بیان کیا ہے۔[1]

۱۔ الغدیر ج ۱، ص ۶۲ تا ۷۳۔

محدثین و حفاظ نے ہر دور میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور دوسری صدی سے چودھویں صدی تک تیس سو سائھ علماء نے اپنی کتابوں میں اسے نقل کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

مجھے تعجب ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کو ایک شخص یہ کہہ کر بے وقعت کرنے کا خواہشمند ہے کہ غدیر خم کا واقعہ شیعہ علماء کا تراشا ہوا افسانہ ہے جبکہ اہل سنت میں اس واقعے کے طرق شیعہ طرق سے دو گنا زیادہ ہیں!!

یہ مضمون صاحب مضمون کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور علمائے اہل سنت خواہ اُن کا تعلق متقدمین سے ہو یا متاخرین سے انھوں نے واقعہ غدیر کو نقل کیا ہے اور اس کی صحت کا اعلان کیا ہے۔ ذیل میں ہم چند علماء کی گواہی بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری کے مشہور شارح ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ کی حدیث کو ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث بہت سے طرق سے منقول ہے۔ ابن عقدہ نے اس حدیث کے طرق پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی اور اس حدیث کے اکثر سلسلے یا تو صحیح ہیں یا حسن ہیں۔[1]

ابن حجر نے جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے اُس کا نام الولایۃ فی طرق حدیث الغدیر ہے۔ یہ کتاب ابو العباس احمد بن محمد بن سعید ہمدانی نے تالیف کی ہے۔ مؤلف کتاب "ابن عقدہ" کے نام سے مشہور تھے اور انھوں نے ۳۳۳ھ میں وفات پائی تھی۔

ابن اثیر نے (اُسد الغابہ) میں اور ابن حجر نے ابن عقدہ سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔

ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۳۳۷ پر حدیث غدیر کے تذکرے کے بعد ابن عقدہ کو یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابو العباس بن عقدہ نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ اُس نے اس حدیث کے متفرق طرق کو جمع کیا ہے اور اسے ستر سے زائد صحابہ کی زبان سے نقل کیا ہے۔ ابن تیمیہ نے بھی حدیث غدیر کے طرق کے سلسلے میں ابن عقدہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابو العباس بن عقدہ نے اس حدیث کے طرق پر مستقل کتاب لکھی ہے۔[2]

۲۔ ابن مغازلی شافعی نے حدیث غدیر کے اسناد و طرق لکھنے کے بعد لکھا ہے

یہ حدیث صحیح ہے۔ ایک سو صحابہ نے رسول خداؐ سے اس کو روایت کیا ہے۔ ان میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ یہ حدیث ہر لحاظ سے مسلّم ہے اور ہمیں اس میں کوئی نقص دکھائی نہیں دیتا۔ یہ حدیث امام علیؑ کی فضیلت بیان کرتی ہے اور اس فضیلت میں آپ منفرد ہیں اور کوئی دوسرا

۱۔ فتح الباری ج ۷، ص ۶۰۔

۲۔ منہاج السنہ ج ۷، ص ۳۲۰۔

اس میں آپ کا شریک و سہیم نہیں ہے۔[1]

۳۔ مشہور مؤرخ ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے بھی حدیث غدیر کے طرق پر مفصل کتاب لکھی ہے چنانچہ کتاب العمدہ کے مؤلف نے اُن کی کتاب کا نام لیا ہے اور لکھا ہے کہ طبری جو کہ مشہور مؤرخ تھے، انھوں نے حدیث غدیر اور اُس کے طرق پر بحث کرتے ہوئے اس کے ۷۵ طرق بیان کئے ہیں اور اس کتاب کا نام کتاب الولایۃ رکھا۔[2]

اس کتاب کا تذکرہ محمد بن اسماعیل امیر نے اپنی کتاب شرح تحفہ علویہ میں بھی کیا ہے۔

حافظ ذہبی اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ محمد بن جریر نے اس حدیث پر مستقل کتاب لکھی تھی۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا اور اس کے طرق کی کثرت دیکھ کر حیران ہوا۔[3]

ابن کثیر نے بھی اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں تاریخ طبری کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے ایک کتاب دیکھی ہے جو دو موٹی موٹی جلدوں پر مشتمل تھی اور اس میں حدیث غدیر کے اسناد و طرق بیان کئے گئے تھے۔[4]

۴۔ حافظ (ابو سعید مسعود بن ناصر بن ابی زید) سجستانی متوفی ۴۷۷ھ نے حدیث غدیر پر السلوانۃ فی حدیث الولایۃ نامی مبسوط کتاب لکھی تھی جو سترہ جلدوں پر مشتمل تھی اور اس میں بھی حدیث غدیر کے طرق و اسناد پر بحث کی گئی تھی۔ مجموعی طور پر اس میں ۱۲۰ صحابہ سے حدیث غدیر کی روایت کی گئی ہے۔

علامہ امینی نے ۲۶ علمائے اہل سنت کے نام اور اُن کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے جنھوں نے حدیث غدیر پر مستقل کتابیں لکھی تھیں۔

ہم اپنی گفتگو کا اختتام ابن کثیر کے ان جملوں پر کرتے ہیں جو انھوں نے علامہ جوینی کے متعلق لکھے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جوینی تعجب سے کہتے تھے کہ میں نے بغداد کے ایک جلد ساز کے پاس ایک کتاب دیکھی جس میں حدیث غدیر کے طرق مرقوم تھے اور کتاب کے سرورق پر لکھا تھا کہ یہ حدیث مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ کے اثبات پر اٹھائیسویں جلد ہے۔ اس کے بعد انتیسویں جلد پیش کی جائے گی۔[5]

آیت بلغ کے متعلق جن مفسرین و محدثین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ولایت امیر المومنینؑ کے

۱۔ مناقب ابن مغازلی ص ۲۶، ۲۰ ۲۔ العمدہ ص ۱۷۵۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۱۰ ۴۔ تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۴۸۔ ۵۔ الغدیر ج ۲ ص ۲۹۸۔

اعلان کے لیے نازل ہوئی تھی ان میں سے چند نام یہ ہیں

۱۔ علامہ جلال الدین سیوطی تفسیر در منثور میں ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر سے نقل کرتے ہیں کہ ابو سعید نے کہا کہ آیت بلّغ غدیر کے دن امام علیؑ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ سیوطی ابن مردویہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ابن مسعود کہتے تھے ہم رسول خداؐ کے عہد میں اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے یاایّھا الرّسُوْلُ بلّغ ما انزل الیک من ربّک — انّ علیًا مولی المؤمنین — وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس [1]

۲۔ واحدی نے اسباب النزول میں ابو سعید سے روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے دن رسول خداؐ پر نازل ہوئی تھی۔ [2]

۳۔ حافظ ابوبکر فارسی اپنی کتاب ما نزل من القرآن فی امیر المؤمنین میں ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں علیؑ بن ابی طالبؑ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔

۴۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی اعمش کی سند سے لکھتے ہیں کہ علیہ کا بیان ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے دن رسول خداؐ پر نازل ہوئی تھی۔ [3]

۵۔ حافظ ابن عساکر شافعی ابو سعید خدری سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن علیؑ بن ابی طالبؑ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ [4]

۶۔ بدر الدین بن عینی حنفی عمدۃ القاری بشرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین نے فرمایا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اے رسول! آپ فضیلتِ علیؑ کا وہ پیغام پہنچائیں جو آپ کے پروردگار کی جانب سے آپ کی طرف بھیجا گیا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول خداؐ نے علیؑ کے بازو کو پکڑ کر فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ

خطبہ غدیر کا متن

مذکورہ بالا مصادر کے علاوہ اور بھی بیسیوں حفاظ نے لکھا ہے کہ آیت تبلیغ امام علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ خطبۂ غدیر کے لیے ہم نے ابن جریر طبری کی روایت کا انتخاب کیا ہے۔

طبری اپنی کتاب الولایۃ فی طرق احادیث الغدیر میں رقمطراز ہیں کہ زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر قیام فرمایا۔ ظہر کا وقت تھا اور گرم لو چل

۱۔ الدر المنثور ج ۳، ص ۱۱۷۔ ۲۔ اسباب النزول، واحدی ص ۱۳۵۔
۳۔ الخصائص ص ۲۹۔ ۴۔ الدر المنثور ج ۳، ص ۱۱۷۔

رہی تھی۔ رسول خداؐ نے حکم دیا کہ میدان کو صاف کیا جائے۔ اس کے بعد آپ نے اَلصَّلاۃُ جَامِعَۃً کی ندا کرائی۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے پرمغز خطبہ دیا پھر آپ نے فرمایا

" اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ کی آیت نازل ہوئی ہے اور جبرئیلؑ نے مجھے خدا کا یہ پیغام دیا ہے کہ میں اس جگہ رک جاؤں اور ہر گورے کالے تک یہ پیغام پہنچاؤں کہ علیؑ بن ابی طالبؑ میرا بھائی، میرا وصی اور میرے بعد امت کا امام ہے۔ میں نے جبرئیلؑ سے کہا کہ خدا سے کہو کہ وہ مجھے اس پیغام کے پہنچانے سے معاف رکھے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پرہیزگار کم ہیں اور تکلیف و اذیت پہنچانے والے زیادہ ہیں۔ وہ لوگ علیؑ کی حمایت پر پہلے سے ہی مجھے ملامت کرتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ان لوگوں نے میرا نام " کان " رکھ دیا ہے جیسا کہ خدا نے اُن کے متعلق فرمایا ہے۔ وَمِنْھُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَیَقُوْلُوْنَ ھُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّکُمْ اور اُن میں بعض ایسے ہیں جو نبی کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔ ان سے کہہ دو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لیے (سورۂ توبہ، آیت ۶۱) اور اگر میں اُن کا نام اور پتا بتانا چاہوں تو بتا سکتا ہوں لیکن میں اُن کا پردہ فاش کرنا نہیں چاہتا۔ میری درخواست کے باوجود اللہ علیؑ کے متعلق تبلیغ کے بغیر راضی نہ ہوا۔

لوگو! جان لو۔ اللہ نے علیؑ کو تمہارے لیے ولی اور امام قرار دیا ہے اور اس کی طاعت کو ہر شخص پر واجب کیا ہے۔ لہٰذا اس کا حکم واجب الاطاعت اور اس کا فرمان نافذ العمل ہے اس کا مخالف ملعون ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا رحمت کا حقدار ہے۔

علیؑ کا فرمان سنو اور مانو۔ خدا تمہارا مولا ہے اور علی تمہارا امام ہے۔ علیؑ کے بعد قیامت تک امامت اس کی نسل میں جاری رہے گا۔

حلال بس وہی ہے جسے خدا اور اُس کے رسولؐ نے حلال کیا ہے اور حرام بس وہی ہے جسے خدا و رسولؐ نے حرام کیا ہے۔ دنیا میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جو خدا نے اسے عطا نہ کیا ہو اور میں نے اُس تک منتقل نہ کیا ہو۔

علیؑ سے جدا نہ ہونا اور علیؑ کو مت چھوڑنا۔ وہ تمہیں راہِ حق دکھائے گا اور خود اس پر عمل کرے گا۔ علیؑ سے منہ موڑنے والے کو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ علیؑ کے مخالفین کے لیے خدا نے اپنے اوپر واجب کیا ہے کہ وہ انھیں سخت عذاب دے گا۔ جب تک رزق کے نزول کا سلسلہ

باقی ہے اور مخلوق آباد ہے تب تک علیؑ میرے بعد بہترین انسان ہے۔ جو بھی علیؑ کی مخالفت کرے وہ ملعون ہے۔

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ یہ بات خدا کی طرف سے جبرئیلؑ نے مجھ تک پہنچائی ہے۔ ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ وہ آنے والے کل کے لیے کیا کچھ آگے بھیج رہا ہے۔

قرآن کی آیات محکمات کا خیال رکھو اور متشابہ آیات کے پیچھے نہ پڑو اور آیت متشابہات کی تمہارے لیے وہی تفسیر کرے گا جس کا بازو میں نے بلند کر کے تم سے اس کا تعارف کرایا ہے کہ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علیؑ مولا ہے۔ اُس کی پیروی کا وجوب خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوا ہے۔

جاں لو کہ میں نے پیغام پہنچا دیا ہے اور جان لو کہ میں نے تبلیغ کر دی ہے اور یہ بھی جان لو کہ میں نے ہر ایک کے کان تک یہ پیغام پہنچا دیا ہے۔ جان لو کہ میں نے بیان کر دیا ہے کہ میرے بعد اہل ایمان کی رہبری اور امارت اس کے سوا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت رسول خداؐ نے علیؑ کو بلند کیا یہاں تک کہ اُن کے پاؤں آپ کے زانو کے سامنے آ گئے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا لوگو! یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرے علم کا حامل اور میرا جانشین ہے۔ یہ ہر اُس شخص کا حاکم ہے جو مجھ پر اور کتاب الٰہی کی تفسیر پر ایمان رکھتا ہو۔"

ایک اور روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اُس وقت رسول خداؐ نے فرمایا "خدایا! جو علیؑ سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو بھی اُس سے دشمنی رکھ اور جو اُس کا انکار کرے اُس پر لعنت کر اور جو بھی اُس کا حق غصب کرے اس پر اپنا غضب نازل کر۔ خدایا! جب تو نے اس مطلب کو نازل کیا تو یہ کہا کہ میں نے تمہارے دین کو اُس کی امامت کے ساتھ کامل کیا۔ جو لوگ علیؑ اور اُس کی اولاد کی پیروی نہ کریں اُن کے عمل باطل ہوں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ہوں گے۔ آدمؑ اگرچہ خدا کے چنے ہوئے فرد تھے لیکن ابلیس نے حسد کر کے آخرکار انھیں جنت سے باہر نکلوا دیا تھا۔ خبردار! علیؑ سے حسد نہ کرنا ورنہ تمہارے اعمال باطل ہو جائیں گے اور تمہارے قدم ڈگمگا جائیں گے۔ سورۂ وَالْعَصْرِ علیؑ کے متعلق نازل ہوا ہے۔ سورۂ تغابن آیت ۸ میں ہے "لوگو! خدا اور اُس کے رسول پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ۔"

"اس سے پہلے کہ ہم لوگوں کے منہ بگاڑ کر اُن کی پشت کی طرف پھیر دیں یا اُن پر اس طرح لعنت کریں جس طرح اصحاب سبت پر کی تھی۔" (سورۂ نساء، آیت ۴۷)

وہ نور الٰہی جو مجھ میں تھا میرے بعد علیؑ میں اور اُن کے بعد اُن کی نسل میں مہدیؑ تک باقی رہے گا۔ لوگو! میرے بعد ایسے امام بھی ہوں گے جو اپنے ماننے والوں کو دوزخ کی دعوت دیں گے اور وہ قیامت کے دن ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اُن سے خدا بھی بیزار ہے اور میں بھی بیزار ہوں۔ وہ اپنے دوستوں اور پیروکاروں کے ساتھ دوزخ کے نچلے طبقے میں ہوں گے اس وقت اے جن و انس! خدا تم سے حساب لے گا اور تم پر آگ اور دھوئیں کے شعلے برسائے جائیں گے۔ تم کسی سے مدد طلب کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا یہ خطبہ اتنا واضح اور صریح ہے کہ اس کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہر عقلمند شخص اس کے مطلب و مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ اس خطبے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام علیؑ کی پیروی ضروری ہے اور اس خطبے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہاں لفظ "ولی" دوست اور مددگار کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر بالفرض رسول خداؐ نے لوگوں کو صرف یہی بتانا ہوتا کہ لوگو! اس شخص کو علیؑ کہتے ہیں اس سے دوستی رکھنا اور اس کی مدد کرنا تو پھر آنحضرتؐ کو اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا بڑا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آنحضرتؐ نے لوگوں کو گرمی کے وقت چلچلاتی دھوپ میں کیا یہی بتانا تھا کہ علیؑ تمہارا دوست ہے اور تم بھی علیؑ سے دوستی رکھو؟

پیغمبر اکرمؐ کا اتنا بڑا اہتمام زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ اگر اہتمام اتنا زیادہ ہے تو پھر اعلان بھی اتنا ہی اہم ہے۔ اگر اعلان عمومی نوعیت کا ہوتا اور آپ اتنا اہتمام کرتے تو لوگ کہتے کہ آپ نے نعوذ باللہ غیر عاقلانہ کام کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ رسول خداؐ نے اپنے خطبے میں کسی ابہام کی گنجائش ہی باقی نہیں رکھی تھی آپ نے واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ "علیؑ بن ابی طالبؑ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین اور امت کا امام ہے۔"

آپ نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ "اللہ نے اسے تمہارے لیے ولی اور امام مقرر کیا ہے اور اس کی اطاعت کو ہر مسلمان پر فرض کیا ہے۔"

مسئلہ ولایت کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اسلام کا دارومدار اسی مسئلے پر ہے۔ کیا اسلام کا مطلب تسلیم یعنی سر جھکا دینا نہیں ہے؟!

پس جو شخص رہبری الٰہی کو تسلیم نہ کرے اور الٰہی رہبر کی اطاعت نہ کرے تو کیا اسے مسلمان کہنا چاہیے؟!

صاف ظاہر ہے کہ ہر صاحب عقل انسان اس کا جواب نفی میں دے گا ورنہ ہم تناقض میں پڑ

جائیں گے کیونکہ خدا بعض افراد کی پیروی کو شرک کی ایک قسم قرار دیتا ہے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے۔
اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے ربیوں اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہے۔ (سورۂ توبہ آیت ۳۱)

یہ آیت یہود و نصاریٰ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ بے شک وہ اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت نہیں کرتے تھے مگر اس کے باوجود خدا نے فرمایا کہ لوگوں نے انھیں اپنا رب بنا لیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حلال و حرام میں اپنے علماء و مشائخ کی پیروی کرتے تھے، اگر وہ حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال قرار دیتے تو وہ اُن کی بات مان لیتے تھے۔

یہود و نصاریٰ کا جرم یہ تھا کہ وہ خدائی رہبروں کی بجائے ربیوں اور راہبوں سے دین کو حاصل کرتے تھے اسی لیے خدا نے انھیں مشرک گردانا ہے۔

جو بھی شخص اس آیت کو توجہ سے پڑھے گا وہ اس مسئلے کا فوراً ادراک کرلے گا۔ مسلمانوں کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ آیت بَلِّغْ کا تعلق سورۂ مائدہ سے ہے اور امام حاکم کی تحقیق کے مطابق یہ قرآن مجید کا آخری سورہ ہے۔ اس سے پہلے ایک سو تیرہ سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور نماز، روزہ، حج، زکات، جہاد کے احکام نازل ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود خدا نے سخت تاکیدی الفاظ کے ساتھ اپنے حبیبؐ سے کہا کہ یہ مسئلہ اتنا ضروری ہے اگر آپ نے اس کی تبلیغ نہ کی تو آپ نے خدا کی رسالت کی تبلیغ ہی نہیں کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسلامی احکام ایک طرف اور یہ مسئلہ ایک طرف ہے۔ یہ مسئلہ اتنا خطرناک تھا کہ رسولؐ کی جان کو بھی اس سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا اسی لیے خدا نے فرمایا خدا آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

روایات میں مرقوم ہے کہ جب جبرئیل امینؑ یہ آیت لے کر آئے تو آنحضرتؐ نے اُن سے یہ کہا تھا کہ میں نے ان لوگوں سے جنگیں لڑی ہیں تب کہیں جا کر انھوں نے مجھے اللہ کا رسول مانا ہے۔ اب یہ لوگ ایک لمحے میں علیؑ کو امام کیسے مان لیں گے؟ اس کے جواب میں اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دی اور فرمایا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

بہرنوع پیغمبر اکرمؐ نے اللہ کے حکم کی تبلیغ کر دی اور یہ مسئلہ پورے احکام اسلام کے برابر ورثی تھا۔ جب آپ نے قیادت و رہبری کا اعلان کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی:
اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

بہت سے محدثین نے گواہی دی ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی آیت حضرت علیؑ کے

حق میں نازل ہوئی ہے۔ علامہ امینی نے الغدیر کی جلد اول کے صفحہ ۲۳۰ سے ۲۳۷ تک اہل سنت کے ۱۶ ماخذ کا حوالہ دیا ہے کہ یہ آیت اعلان غدیر کے بعد نازل ہوئی تھی۔

آیت تبلیغ اور آیت تکمیل دین کے آپس میں ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ولایت علیؑ تکمیل دین اور اتمام نعمت کی اساس ہے اور ولایت علیؑ کے بغیر نہ تو دین کامل ہوتا ہے اور نہ ہی نعمت تمام ہوتی ہے اور اس سے اُن روایات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ اعمال کی قبولیت ولایت اہل بیتؑ سے مشروط ہے چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ

بے حب اہلبیتؑ عبادت حرام ہے

اہل بیتؑ ہی وہ رہنما ہیں جن کی پیروی کا خدا نے حکم دیا ہے اور اُن کی مودت کو اللہ نے اجر رسالت قرار دیا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے .. قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳)

رسول خداؐ نے حکم خداوندی کے تحت اپنے قرابتداروں کی مودت کو بطور اجر رسالت طلب کیا تھا اور مودت کا مقصد یہ نہیں کہ اہل بیتؑ سے خالی محبت کا دعویٰ کیا جائے اس سے مراد یہ ہے کہ اُن کی ولایت کو تسلیم کیا جائے اور دین کے جملہ احکام اُن سے لیے جائیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے، آپ نے فرمایا قیامت کے دن بندے سے پہلا سوال اُس کی واجب نمازوں، واجب زکات، واجب روزہ، واجب حج اور ہم اہل بیت کی ولایت[1] کا کیا جائے گا۔ اگر کسی نے مرنے سے پہلے ہماری ولایت کو قبول کر لیا تو اللہ اُس کی نماز، روزہ، حج

۱۔ بحار الانوار ج ۲۷، ص ۱۹۷، ح ۲۔

ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ "رسول اکرمؐ نے لوگوں کو پانچ باتوں پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ انھوں نے چار باتوں پر تو عمل کیا لیکن پانچویں بات نظر انداز کر دی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ چار باتیں کون سی ہیں تو ابوسعید خدری نے کہا "نماز، زکات، روزہ اور حج۔" پھر اُن سے پوچھا گیا کہ وہ پانچویں چیز جسے نظر انداز کر دیا گیا کون سی تھی تو انھوں نے کہا: "ولایت علیؑ" پھر اُن سے پوچھا گیا کہ کیا علیؑ کی ولایت بھی وہی رتبہ رکھتی ہے جو یہ چاروں واجب اعمال رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا: "ہاں! ولایت علیؑ بھی وہی رتبہ رکھتی ہے جو یہ واجب اعمال رکھتے ہیں۔" صحابہ کرام کی ایک تعداد رسول اکرمؐ کے زمانے ہی میں حضرت علیؑ کی ولایت کی قائل تھی جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کہا کرتے تھے کہ ہم نے رسول اللہؐ سے بیعت اس بات پر کی کہ ہم مسلمانوں کے خیرخواہ رہیں گے اور علیؑ بن ابی طالبؑ کی پیروی اور ان سے محبت کریں گے۔ حدیث پاک ہے:

بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ عَلَى الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْوَلَايَةِ وَلَمْ يُنَادَ بِشَيْءٍ كَمَا نُوْدِيَ بِالْوَلَايَةِ

وسائل الشیعہ ج ۱ باب ۱ وجوب العبادات الخمس حدیث نمبر ۱ مطبوعہ دار احیاء تراث العربی، بیروت۔ (رضوانی)

اور زکات کو بھی قبول کرے گا اور اگر اُس نے خدا کے حضور ہماری ولایت کو قبول نہ کیا تو اللہ اُس کے کسی عمل کو قبول نہیں کرے گا۔

امام علیؑ کا فرمان ہے کہ دنیا میں اگر بھلائی ہے تو صرف دو افراد کے لیے۔ پہلا وہ شخص ہے جو روزانہ نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جو اپنے گناہ کی توبہ سے تلافی کرتا ہے لیکن توبہ قبول کیسے ہو؟ خدا کی قسم! اگر کوئی شخص اتنے سجدے کرے کہ سجدوں کی وجہ سے اُس کی گردن ٹوٹ جائے تب بھی خدا اُس کی توبہ قبول نہیں کرے گا جب تک وہ ہم اہل بیتؑ کی ولایت کو قبول نہیں کرے گا۔

انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا میرے پاس آنے والے لوگو! جب آل ابراہیمؑ کا نام لیا جاتا ہے تو تمہارے چہرے کھل اٹھتے ہیں لیکن جب آل محمدؐ کا نام لیا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ کسی نے تمہاری آنکھوں میں انار کا دانہ نچوڑ دیا ہو؟ اس ذات کی قسم! جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا اگر تم میں سے کوئی شخص قیامت کے دن پہاڑ کے برابر اعمال لے کر آئے لیکن اُس کے نامۂ اعمال میں علیؑ بن ابی طالبؑ کی ولایت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل دوزخ میں ڈال دے گا۔[1]

اس قسم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں لیکن ہم سردست اسی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ بحار الانوار ج ۲۷، ص ۱۷۱۔

شوریٰ اور اسلامی خلافت

آیات شوریٰ کے مفہوم کی تحقیق

امام اور خلیفہ کے تقرر کے متعلق امت اسلامیہ میں اختلاف رہا ہے۔ یہ اختلاف ماضی میں بھی تھا اور دور حاضر میں بھی ہے، البتہ ماضی اور حال کے اختلاف میں بڑا فرق ہے۔ ماضی میں خلیفہ کا تعین عملی طور پر ہوتا تھا اور آج کل خلافت کی بساط کو مسلمانوں نے خود ہی لپیٹ دیا ہے اسی لیے یہ بحث عملیت سے نکل چکی ہے اور صرف نظریاتی رہ گئی ہے۔

اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ کا انتخاب "شوریٰ" سے ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی نص کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے وہ قرآن کریم سے شوریٰ کی افادیت کے لیے تین آیات پیش کرتے ہیں اور ان آیات کو اپنے نظریۂ خلافت کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان آیات پر بحث کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آیا ان آیات کا انطباق مسئلہ خلافت پر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد ہم کچھ صحابہ کے الٹے پاؤں پھر جانے کی بحث بھی کریں گے۔

پہلے آیات شوریٰ سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ ارشاد باری ہے

۱۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○

(اے رسول!) خدا کی مہربانی سے تم اُن لوگوں کے لیے نرم ہو اور اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ تو اُن کو معاف کردو اور اُن کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرو اور اپنے کاموں میں اُن سے مشورہ کرو اور جب کسی کام کا مصمم ارادہ کرلو تو خدا پر توکل کرو۔ بے شک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
(سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹)

(علمائے اہل سنت کہتے ہیں کہ اس آیت میں مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا خلافت کو مشورے سے ہی طے کیا جائے گا۔ اس بابت علامہ ذیشان حیدر جوادی صاحب نے ترجمہ قرآن کے

حاشیہ پر لکھا ہے کہ اس آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ جنگ احد سے فرار کرنے والے اس قابل بھی نہیں تھے کہ انھیں بزم پیغمبرؐ میں جگہ دی جاتی اور سرکار اُن سے گفتگو کرتے لیکن رب العالمین نے تبلیغ اسلام کی مصلحتوں کے پیش نظر تمام باتوں کو نظرانداز کر کے نرم گفتگو، اچھے برتاؤ اور حسن سلوک کا حکم دیا تاکہ مسلمان، اسلام سے فرار نہ کرنے پائیں۔ یہاں تک کہ اتمام حجت کے لیے مشورے کا حکم بھی دیا کیونکہ اُن کا خیال یہ تھا کہ اگر ہمارے مشورے سے جنگ ہوتی تو ضرور کامیابی حاصل ہوتی۔ لہٰذا اب اُن سے مشورہ بھی کر لیا کرو تاکہ حجت تمام ہو جائے لیکن خبردار ان کے مشورے پر انحصار نہ کرنا اور جب عزم مصمم ہو جائے تو پھر بھروسا صرف اللہ پر ہی کرنا کیونکہ وہ اپنے اوپر بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور دوسروں پر اعتماد کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے بعد وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ میں وسعت پیدا کر کے اس سے خلافت کی مشاورت پر استدلال کرنا ایک کھلی ہوئی غفلت اور جہالت ہے کیونکہ نیابت رسولؐ کہاں اور مسلمانوں کی تالیف قلب کہاں؟ — مترجم)

۲۔ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ اگر میاں بیوی دونوں باہمی رضامندی اور صلاح مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔ اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ تم دودھ پلانے والی کو دستور کے مطابق اجرت ادا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۳)

۳۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ○ جو لوگ اپنے رب کی بات قبول کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور آپس کے معاملات میں مشورہ کرتے ہیں اور ہمارے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۳۸)

اہل سنت کہتے ہیں کہ خلافت کے لیے شوریٰ ضروری ہے، شوریٰ کے بغیر اسلامی خلافت قائم نہیں ہو سکتی اور سقیفہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت بھی شوریٰ کے تحت منعقد ہوئی تھی لہٰذا اُن کی خلافت درست ہے جبکہ شیعہ کہتے ہیں کہ خلیفہ مقرر کرنا خدا کا کام ہے اور خدا جس کا بھی انتخاب کرے گا وہ سب سے بہتر ہوگا۔ اگر بندوں کو خلیفہ مقرر کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو لوگ خلیفہ منتخب کرتے وقت اپنی خواہشات اور طبعی میلان نیز عقیدتی، سیاسی اور اجتماعی وابستگی سے متاثر ہوں گے اس لیے اس انتخاب کے محسوس اور غیر محسوس اثرات مرتب ہوں گے۔ اسی لیے رسول اکرمؐ نے اپنے جانشین کا معاملہ امت پر نہیں چھوڑا بلکہ حکم الٰہی کے مطابق نہ صرف اپنے جانشین کا اعلان کیا بلکہ قیامت تک آنے والے

سب جانشینوں کے ناموں کا بھی اعلان کیا تھا۔ شیعی عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے امام علیؑ کی خلافت و امامت کا اعلان کیا تھا۔ قرآن کریم میں جس شورائیت کا حکم ہے اس سے حکومت چلانے کے جزئی معاملات مراد ہیں۔ اس شوریٰ کا حاکم کے انتخاب سے جو ایک الٰہی منصب ہے کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ خلافت کے متعلق فریقین ان متضاد نظریات میں بٹے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں غیر جانبدار ہوکر ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ سوچنا چاہیے کہ آیا شوریٰ کے ذریعے سے خلیفہ کا انتخاب جائز ہے یا نہیں۔ اگر ایک نظریے کی حقانیت ثابت ہو جائے تو دوسرا نظریہ خود بخود باطل ہو جائے گا۔ اگر شوریٰ کا نظریہ ثابت ہو جاتا ہے تو پھر لامحالہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت ثابت ہے اور امام علیؑ کی خلافت بلافصل کا ابطال ہوتا ہے۔

تقرر خلیفہ کی بحث کے ضمن میں ہم گزشتہ صفحات میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ خلافت و امامت اہل بیتؑ کا حق ہے۔ اب ہم بحث کی تکمیل کے لیے شوریٰ پر بھی نظر ڈالتے ہیں کہ کیا شوریٰ کے ذریعے خلیفہ مقرر کرنا درست ہے؟ پھر ہم ضمناً یہ بھی واضح کریں گے کہ آیا خلفائے ثلاثہ کا انتخاب کسی غیر جانبدار شوریٰ نے کیا تھا یا یہاں پر نہ تو نص تھی اور نہ ہی شوریٰ تھا؟

شوریٰ کو ماننے والے دوست شوریٰ کے اثبات کے لیے تین مذکورہ بالا آیات کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان سے شوریٰ کی ضرورت اور افادیت واضح ہوتی ہے۔ ان تین آیات میں سے ایک آیت کا تعلق تو بچے کے دودھ چھڑانے سے ہے لہٰذا اس آیت میں جس شوریٰ کا ذکر ہے اُس کا اسلامی خلافت سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا یہ آیت زیر بحث نہیں ہے۔

اب شوریٰ سے متعلق دوسری دو آیات کے تحت ہم عرض کرتے ہیں کہ مشاورت ایک اسلامی حکم ہے اور اس کے اپنے حدود ہیں اور اپنے حدود میں مشورہ کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے لیکن ان آیات میں جس شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے اُس کی نوعیت کیا ہوگی؟ ایک امکان تو یہ ہوسکتا ہے کہ مشاورت کل اور عمومی امور کے لیے ہو جو تمام مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہوں مثلاً دشمن کے خلاف اعلان جنگ یا خلیفہ کا انتخاب۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مسئلے کے لیے رسول خداؐ اس اجلاس میں شریک ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اتنے اہم معاملے پر مشاورت ہو رہی ہو اور رسول خداؐ اُس اجلاس میں شرکت نہ فرمائیں کیونکہ شوریٰ کے اجلاس میں رسول خداؐ یا اُن کے کسی جانشین کی موجودگی ضروری ہے اور مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اتنے اہم فیصلے اپنی ذاتی صوابدید پر کرنے لگ جائیں۔ ارشاد پروردگار ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اور اگر وہ

معاملات کو رسول اور صاحبان امر کی طرف پلٹا دیتے تو ان میں سے استفادہ کرنے والے حقیقت حال جان لیتے۔ (سورۂ نساء آیت ۸۳)

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ تین بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۱۔ مشیر ہونے چاہئیں کیونکہ وشاورھم میں ھم کی ضمیر اُن کے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔ مشورے کا ایجنڈا اور مشورے کے حدود متعین ہونے چاہئیں۔

۳۔ مجلس مشاورت کو چلانے والا ولی امر بھی موجود ہونا چاہیے اور آخری فیصلے کا حق بھی اسے ہی حاصل ہوگا۔ وہ مجلس مشاورت کے فیصلوں کا آئینی طور پر پابند نہیں ہوگا جیسا کہ فاذا عزمت فتوکل کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔

شوریٰ کے مذکورہ تین عناصر میں سے اگر ایک عنصر بھی کم ہوگا تو شوریٰ ناقص ہو جائے گا مثلاً ولی امر بھی موجود ہو۔ مشورہ دینے والے مشیر بھی موجود ہوں لیکن ان کے پاس مشورے کے لیے کوئی ایجنڈا نہ ہو تو شوریٰ کا اجلاس بے ثمر اور بے نتیجہ رہے گا۔ اسی طرح اگر ولی امر بھی ہو اور ایجنڈا بھی ہو لیکن مشورہ دینے والے موجود نہ ہوں تو بھی شوریٰ کا اجلاس بے معنی ہوگا۔ اسی طرح مشورہ دینے والے بھی ہوں اور ایجنڈا بھی ہو لیکن ولی امر نہ ہو تو بھی شوریٰ کا اجلاس بے معنی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کے لیے قیم کے وجود کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اگر ولی امر کے ہاتھ میں آخری اختیار نہ ہو اور مشورہ دینے والے الگ الگ مشورہ دیں تو پھر اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اور جس مجلس شوریٰ میں قیم نہ ہو تو ایسی شوریٰ غیر آئینی ہوگی اور امت کو اس کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ اس طرح کی شوریٰ غیر شرعی اور فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کے تقاضوں کے خلاف ہوگی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کی آیت رسول خدا سے مخصوص ہے اور قرآن کریم میں وامرھم شوریٰ بینھم کی آیت میں کسی ولی امر کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا شوریٰ کسی قیم اور ولی امر کے بغیر بھی منعقد کیا جاسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی قیم اور ولی امر کا ہونا ضروری ہے کیونکہ پوری آیات یہ ہیں: فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ○ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ○ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ○ تم کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا سازو سامان ہے اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ کہیں بہتر اور پائیدار ہے۔ اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی

کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ ہوتے ہیں تو معاف کردیتے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے پروردگار کا کہا مانا اور نماز قائم کی اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے حل کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو رزق دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (سورۂ شوریٰ آیت ۳۶ تا ۳۸)

مندرجہ بالا آیت میں اہل ایمان کی صفات بیان کی گئی ہیں اور حضرت رسول خداؐ لفظ مومن کے کامل مصداق ہیں۔ جب آنحضرتؐ مومن کامل ہیں تو پھر ثابت ہوگا کہ اہل ایمان کی شوریٰ میں بھی آپ شامل ہوں گے اور جس مجلس شوریٰ میں آنحضرتؐ ہوں گے تو آپ کی حیثیت اس مجلس کے قیم کی ہوگی اور اس میں بھی آپ کو تمام مشورہ رد کرنے کا اختیار ہوگا اور آپ کو فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کا اختیار حاصل ہوگا۔ لہٰذا آیت خواہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کی ہو یا وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ہو ان دونوں آیات میں آنحضرتؐ کو قیم کی حیثیت حاصل ہے اور جب مجلس شوریٰ کے قیم آپ ہیں تو آپ پر لوگوں کے مشوروں کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ کا تعلق مسلمانوں کے باہمی اور جزئی معاملات سے ہے۔ شوریٰ کے اپنے حدود ہیں اور وہ اپنے حدود سے تجاوز کرے گی تو اس کے اقدام کی کوئی آئینی حیثیت نہیں ہوگی۔

ہم نے واضح کیا ہے کہ شوریٰ کے لیے تین عناصر کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ مشورہ دینے والے۔

۲۔ وہ معاملہ جس پر مشورہ کیا جارہا ہو۔

۳۔ مجلس شوریٰ کا ناظم اور قیم جس کے ہاتھ میں خصوصی اختیارات ہوں اور وہ اتنا بااختیار ہو کہ چاہے تو مجلس شوریٰ کے تمام مشوروں کو رد کردے۔

اگر مذکورہ عناصر میں سے ایک عنصر کم ہو تو پھر وہ شوریٰ، شوریٰ ہی نہیں ہے۔ اس طویل گفتگو کے بعد ہم برادران اہل سنت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا سقیفہ میں جو کارروائی ہوئی تھی اگر وہ شوریٰ کے اصول کے تحت تھی تو کیا اس میں شوریٰ کے تینوں عناصر موجود تھے؟

بالفرض مان لیا کہ وہاں مشورہ دینے والے موجود تھے اور مشورہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر ہورہا تھا۔

مجلس شوریٰ کا تیسرا اہم عنصر اس کا ناظم اور قیم ہوتا ہے۔ اگر سقیفہ کی کارروائی شوریٰ کے تحت ہوئی تھی تو اس کا قیم اور ناظم کون تھا؟ اگر کوئی کہے کہ اس کے ناظم حضرت ابوبکرؓ تھے تو اُس کی یہ بات غلط ہوگی کیونکہ اس اجلاس سے تو انھوں نے منتخب ہونا تھا جبکہ انھیں منتخب کرنے والے اُن کے ہی خود افراد تھے لیکن اس شوریٰ کا قیم کون تھا؟ خدارا جب تک سقیفہ کی کارروائی کا قیم دکھائی نہ دے اُس وقت

تک اسے شوریٰ کا نام دے کر شوریٰ کو بدنام نہ کریں۔

اگر یہ کہا جائے کہ خلیفہ بھی شوریٰ کا ناظم ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے۔ وہ ناظم تو تب بنے جب خلیفہ بن جائے ابھی تو وہ خلیفہ ہی نہیں بنا تو ناظم کیسے بن سکتا ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے خلیفہ کا دارومدار شوریٰ پر اور شوریٰ کا دارومدار خلیفہ پر ہوتا ہے تو پھر اس سے "دور" لازم آئے گا جو محال ہے کیونکہ یہ بات کسی طرح قرین عقل نہیں کہ ایک چیز خود اپنے وجود کا سبب ہو۔ دور سے وُقُوْفُ الشَّیْءِ عَلٰی نَفْسِہٖ لازم آتا ہے جو بدیہی طور پر باطل ہے۔

شوریٰ کا اپنا دائرۂ کار ہے اور اولی الامر کا چناؤ اس کے دائرۂ کار میں شامل نہیں ہے اور ویسے بھی سقیفہ کی کارروائی کو شوریٰ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں شوریٰ کا بنیادی عنصر قیم موجود ہی نہیں تھا اس لیے اس کے فیصلے کو امت پر رائے نہیں کیا جاسکتا۔

اگر کوئی شخص ہماری اس بات سے متفق نہ ہو اور کہے کہ مدینہ کے چند افراد کو خلیفہ کے انتخاب کا حق حاصل تھا تو وہ یہ بھی بتائے کہ انھیں یہ حق کس نے دیا تھا؟ اگر خدا اور اس کے رسولؐ نے انھیں یہ حق دیا تھا تو اس کے لیے نص کی ضرورت ہے جو موجود ہی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشراف مدینہ کی ایک اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ پوری امت پر اپنا فیصلہ مسلط کرے۔

حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کو شورائی انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔ خود حضرت عمرؓ نے یہ کہا تھا کَانَتْ بَیْعَۃُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلْتَۃً وَلٰکِنْ وَقَی اللّٰہُ شَرَّھَا ابوبکرؓ کی بیعت اچانک منعقد ہوئی تھی لیکن اللہ نے اس کے شر سے بچا لیا تھا البتہ اب اگر کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا۔ یعنی اگر مستقبل میں کوئی طالع آزما اس طرح برسر اقتدار آئے تو اسے اور اس کے تجویز کنندہ کو قتل کر دینا چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اہل سنت بھائی یہ کہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو رسول اکرمؐ نے اپنا جانشین بنایا تھا جبکہ کوئی بھی سنی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ اگر بالفرض رسول خداؐ نے انھیں خلیفہ بنایا ہوتا تو وہ انصار کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے کہ بھائیو! جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ رسول خداؐ نے مجھے اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا لیکن انھوں نے نہ تو سقیفہ میں اور نہ ہی بعد میں کبھی ایسی کوئی بات کہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی خلافت نص رسولؐ پر قائم نہیں تھی۔

ہمارے بھائی وشاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ کی جس آیت کو پیش کرتے ہیں اس سے اُن کی مشکل دور نہیں ہوسکتی کیونکہ جنگ احد کے بعد خدا نے اپنے حبیبؐ سے فرمایا کہ آپ کے اصحاب میں سے کچھ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ جنگ کے لیے ہم سے رائے نہیں لی گئی تھی اور اگر ہم سے رائے لی جاتی تو اس کا نتیجہ مختلف ہوتا لہٰذا اب آئندہ جنگ وغیرہ کے لیے اُن سے مشورہ کر لیا کریں تاکہ اُن کی تالیف قلب ہو سکے۔

البتہ آپ اُن کے مشورے کے پابند نہیں ہیں۔ جب آپ عزم مصمم کرلیں تو پھر خدا پر بھروسا کریں۔ جب خدا نے اپنے حبیبؐ کو جنگ کے لیے صحابہ کے مشورے کا پابند نہیں کیا تو وہ اُس سے زیادہ اہم مسئلے یعنی خلافت کے لیے اُن کے مشورے کو لازمی کیسے قرار دے سکتا ہے؟ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آپ ایک شخص کو ایک سو درہم کا امین بنانے پر راضی نہیں ہیں تو اسے ایک ہزار درہم کا امین کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

امت کو خلیفہ کے انتخاب کا حق دیا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ وفات پیغمبرؐ کے بعد بہت سے افراد کے مرتد ہونے کا خدشہ تھا جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف رسول ہیں۔ اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول ہوگزرے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوجائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴)

اس آیت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے مخاطب مسلمان ہیں کیونکہ کافروں کے الٹے پاؤں پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ نیز اس آیت کا مسیلمہ کذاب سے بھی تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ تو رسول خداؐ کی زندگی میں ہی اسلام سے پھر گیا تھا۔

جب امت کے کچھ افراد کے ارتداد کا خدشہ تھا تو خدا و رسولؐ امت کو بے وارث کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ جبکہ رسول خداؐ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر امت کا کوئی والی وارث نہ ہوا تو اس سے امت میں پراگندگی پھیلے گی اور خانہ جنگی ہو جائے گی لیکن اسے امت کی بے نصیبی ہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا و رسولؐ نے مسلمانوں کے لیے اولی الامر مقرر کیا تھا لیکن انھوں نے اپنی صوابدید سے خلیفہ چن لیا جس کی وجہ سے امت انحراف کا شکار ہوگئی اور یہ انحراف اس حد تک بڑھا کہ وفات پیغمبرؐ کے صرف پچاس سال بعد یزید جیسا فاسق شخص اس منبر پر بیٹھ گیا جس پر رسولؐ بیٹھا کرتے تھے۔ پھر فاسق و بدکار افراد یکے بعد دیگرے امت کے مقدر سے کھیلتے رہے اور غضب یہ ہے کہ جابر، ظالم اور رنگین مزاج حکمران اپنے آپ کو خلیفۂ رسولؐ کہلانے لگے۔ اُن میں ایسے خلفاء بھی تھے جو سرعام شراب پیتے تھے، اپنے کتوں کو ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں سے سجاتے تھے اور بندروں سے کھیلتے تھے۔ اپنے آپ کو خلیفہ کہلانے والوں نے وہ وہ برائیاں کیں جنھیں لکھتے ہوئے قلم کو حیا آتی ہے۔ امت کی اس بدبختی میں اُس کے ماضی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ لوگوں کے غلط انتخاب اور نظریہ شوریٰ کی غلط اساس کی وجہ سے امت کو بنی امیہ اور بنی عباس کے عیاش حکمرانوں کی غلامی کرنا پڑی تھی[1] اور خلیفہ گروں نے صرف خلیفہ بنانا کافی سمجھا۔

۱۔ اس موضوع پر علامہ محمد جواد مغنیہ کی کتاب "شیعہ اور جابر حکمران" مطبوعہ مجمع علمی اسلامی ایک قابل قدر تالیف ہے۔

انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر یہ خلیفہ امت کے مفادات پر پورا نہ اترے تو اسے کس طرح معزول کیا جائے؟

یہی وجہ ہے کہ قریباً پورا عالم اسلام خلیفہ ثالث کے طرز حکومت سے نالاں تھا۔ جب لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ خلافت چھوڑ دیں تو انھوں نے کہا کہ میں خلافت کی خلعت نہیں اتاروں گا کیونکہ خدا نے مجھے یہ خلعت پہنائی ہے۔ اُن کی حکومت نہ چھوڑنے کی ضد اُن کے قتل کا باعث بن گئی اور اُن کے قتل سے امت میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اگر پہلے ہی دن خلیفہ کے معزول ہونے کا طریقہ طے کر دیا جاتا تو امت کو یہ حادثہ نہ دیکھنا پڑتا۔

شوریٰ کی عملی واقعیت، شوریٰ اور سقیفہ

آیئے دیکھیں کہ شوریٰ کے عنوان سے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو کارروائی ہوئی اور جس کے نتیجے میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے کیا وہ کارروائی شوریٰ کے اصولوں کے مطابق تھی یا نہیں؟

دنیائے اسلام کے ہر مؤرخ نے سقیفہ کی کارروائی کو لکھا ہے لیکن ہم یہاں اہل سنت کے مشہور مؤرخ ابن جریر طبری کی کتاب سے اس داستان کو نقل کرتے ہیں۔ یہ داستان تاریخ طبری کی جلد سوم میں تفصیل سے موجود ہے اور صفحہ ۲۱۸ سے ۲۲۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ طبری لکھتے ہیں

انصار مدینہ پیغمبر اکرمؐ کے جسد مبارک کو اُن کے خاندان کے پاس چھوڑ کر سقیفہ چلے گئے اور کہنے لگے کہ محمد مصطفیٰؐ کے بعد ہم سعد بن عبادہ کو اُن کا جانشین بنائیں گے۔ چنانچہ کچھ افراد گئے اور سعد بن عبادہ کو وہاں لے آئے۔ سعد بیمار تھے۔ انھوں نے تقریر کی۔ خدا کی حمد و ثنا کے بعد انھوں نے اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے انصار کی قربانیوں کا ذکر کیا اور اُن کے فضائل شمار کرائے اور کہا کہ ہم نے رسول خداؐ اور اُن کے اصحاب کو پناہ دی تھی اور ہم نے رسول خداؐ کے دشمنوں سے جنگیں لڑی تھیں جس سے اہل عرب اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جب رسول خداؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ انصار سے راضی تھے۔ پھر سعد نے کہا کہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لو اور دوسروں کو اس میں شریک نہ کرو۔ انصار نے مل کر کہا کہ تم نے بالکل صحیح کہا ہے اور تمہارا خیال درست ہے۔ ہم تمہاری رائے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور ہم خلافت بھی تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ پھر وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے اور انھوں نے کہا کہ اگر ہم نے انھیں خلیفہ بنا دیا اور مہاجرین نے انھیں نہ مانا تو پھر کیا ہوگا؟ اور اگر مہاجرین نے یہ کہا کہ ہم وہ لوگ ہیں جنھیں آنحضرتؐ کی ابتدائی صحبت کا شرف حاصل ہے اور ہم نے رسول خداؐ کے ساتھ ہجرت کی ہے۔ ہم اُن کا خاندان ہیں اور ہم اُن کے مددگار ہیں۔ اس کے

باوجود تم نے ہم سے خلافت کو کیوں چھینا ہے تو ہم انھیں ان باتوں کا کیا جواب دیں گے؟ اس وقت انصار کے ایک گروہ نے کہا کہ ہم اُن سے کہیں گے کہ ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا ہونا چاہیے۔

سعد بن عبادہ نے یہ بات سنی تو کہا کہ یہ تمہاری پہلی کمزوری ہے۔

شیخین کو انصار کے ارادوں کا علم ہوا تو انھوں نے ابو عبیدہ کو ساتھ لیا اور سقیفہ کی طرف چل پڑے۔ اسید بن حضیر، عویم بن ساعدہ اور بنی محلان سے تعلق رکھنے والے عاصم بن عدی بھی اُن کے پیچھے سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔

حضرت عمرؓ ارادہ رکھتے تھے کہ وہاں کچھ گفتگو کریں لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انھیں بولنے سے روک دیا اور خود گفتگو شروع کی۔ گفتگو کا آغاز حمد الٰہی سے کیا۔ پھر مہاجرین کے فضائل بیان کیے، اور کہا کہ مہاجر وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے آنحضرتؐ کی نبوت کی تصدیق کی تھی اور سرزمین عرب پر سب سے پہلے مہاجرین نے ہی اللہ کی عبادت کی تھی اور رسول اکرمؐ پر ایمان لائے تھے۔ مہاجر رسول اکرمؐ کے مددگار اور اُن کا خاندان ہیں اور آپ کی جانشینی کے سزاوار ہیں۔ ان سے جھگڑنے والا ظالم ہے۔ پھر انھوں نے انصار کے فضائل بیان کیے اور کہا کہ مہاجرین اولین کے بعد کوئی بھی تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا لہٰذا حکمران ہم میں سے اور وزیر تم میں سے ہوں گے۔

اس وقت حباب بن منذر اٹھے اور کہا کہ اے گروہ انصار! اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ دوسرے تمہارے زیرسایہ ہونے چاہئیں اور کسی کو بھی تمہاری مخالفت کی جرأت نہیں ہونی چاہیے۔ ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرو ورنہ تمہاری رائے بے قیمت ہو جائے گی اور معاملات تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے تو ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک اُن میں سے۔

حضرت عمرؓ نے کہا یہ بات ہرگز ممکن نہیں۔ دو افراد آپس میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ بخدا! اہل عرب اس قبیلے کے ہاتھ میں اپنے معاملات کی باگ ڈور دے سکتے ہیں جس سے اُن کے نبی تھے۔ ہمارے پاس اپنی ہر بات کی دلیل موجود ہے۔ محمدؐ کی حکومت کے متعلق ہم سے کون جھگڑا کرسکتا ہے؟ جبکہ ہم نبی اکرمؐ کے مددگار اور اُن کے اہل خاندان ہیں البتہ جو شخص باطل کا پیروکار ہو، گناہ کی طرف آمادہ اور خود کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

حباب بن منذر اٹھے اور بولے اے گروہ انصار! اپنے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لو اور اس شخص اور اس کے ساتھیوں کی باتیں مت سنو۔ یہ لوگ تمہارے حصے کو تمہارے ہاتھوں سے کھینچ لینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر آمادہ نہ ہوں تو انھیں اپنے شہر سے باہر نکال دو اور اپنے معاملات پر قبضہ کرلو۔ خدا کی قسم! تم اس امر کے زیادہ مستحق ہو۔ تمہاری تلواروں سے تو لوگوں نے دین

اسلام کو تسلیم کیا ہے۔ تم لوگ میری رائے پر عمل کرو کیونکہ میں بہترین رائے رکھنے والا شخص ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا تم نے ایسا کیا تو خدا تمہیں قتل کر دے گا۔

حباب نے کہا خدا تمہیں قتل کرے گا۔

ابو عبیدہ نے کہا اے گروہ انصار! پیغمبرؐ کی سب سے پہلے مدد کرنے والے بھی تم ہی تھے اب دین میں پہلے تحریف کرنے والے تو نہ بنو۔

اُس وقت نعمان بن بشیر کا والد بشیر بن سعد خزرجی کھڑا ہوا اور بولا اے گروہ انصار! اگر ہم نے مشرکین سے جنگیں لڑی ہیں اور ہم نے دین میں سبقت کی ہے تو اس سے ہمارا ہدف صرف اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہؐ کی اطاعت تھا۔ ہماری کوششوں کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ اب اپنی قربانیوں کی وجہ سے دوسروں پر احسان جتلانا اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے یہ سب کچھ دنیا کے لیے نہیں کیا تھا۔ خدا ہمارا ولی نعمت ہے۔ خدا کی قسم! خدا مجھے ان لوگوں سے جھگڑتا ہوا نہ دیکھے گا۔ تم لوگ خدا سے ڈرو اور ان لوگوں کی مخالفت نہ کرو۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمرؓ اور ابو عبیدہ موجود ہیں۔ ان دو میں سے جس کی چاہو بیعت کر لو۔

حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہ نے کہا خدا کی قسم! آپ کی موجودگی میں ہم یہ عہدہ نہیں لیں گے۔

عبدالرحمن بن عوف نے کہا اے گروہ انصار! تم لوگ خواہ کتنی بھی فضیلت کے مالک کیوں نہ بن جاؤ پھر بھی تم میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؑ جیسا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔

منذر بن ارقم اٹھے اور کہا کہ تم نے جن لوگوں کا نام لیا ہے ہم اُن کی فضیلت کے منکر نہیں ہیں۔ ان لوگوں میں وہ شخص موجود ہے جو اگر اس امر کا مطالبہ کرے تو ہم میں سے کوئی بھی اس کی مخالفت نہیں کرے گا (اُن کا اشارہ امام علیؑ کی طرف تھا)۔

اس وقت انصار (یا اُن کے ایک گروہ) نے کہا کہ ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ اُس وقت مختلف قسم کی آوازیں اٹھنے لگیں اور مجھے اختلاف کا خطرہ محسوس ہوا اسی لیے میں نے ابوبکرؓ سے کہا کہ ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں تمہاری بیعت کروں جب عمرؓ اور ابو عبیدہ اُن کی بیعت کے لیے آگے بڑھے تو بشیر بن سعد خزرجی نے اُن پر سبقت کی اور اُن دونوں سے پہلے بیعت کی۔

حباب بن منذر نے کہا اے بشیر! تو نے نافرمانی کی ہے اور تو نے اپنے چچازاد کو حکومت سے محروم کیا ہے۔

بشیر نے کہا نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے اُن لوگوں کو جو اعزاز دیا

ہے میں اُس کے متعلق اُن سے جھگڑنا نہیں چاہتا۔ جب قبیلہ اوس نے بشیر بن سعد کے عمل کو دیکھا اور سعد بن عبادہ کے دعویٰ خلافت کو دیکھا تو اسید بن حضیر اور دوسرے لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر ایک بار حکومت قبیلہ خزرج میں چلی گئی تو وہ ہمیشہ تم پر اپنی برتری جتائیں گے اور تمھیں حکومت میں کبھی شریک نہیں کریں گے لہٰذا جلدی سے ابوبکرؓ کی بیعت کرو۔

اس کے بعد وہ لوگ اٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ اس طرح سعد بن عبادہ اپنے قبیلہ خزرج سمیت شکست کھا گئے۔ لوگ ہر طرف سے اٹھ اٹھ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ لوگ سعد کو کہیں کچل نہ دیں۔ سعد کے دوستوں میں سے کسی نے آواز دی کہ خیال رکھو سعد کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

حضرت عمرؓ نے کہا اسے مار ڈالو۔ خدا اسے مارے۔ پھر وہ اُن کے سر کے پاس کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں چاہتا تھا کہ تمھیں اتنا ماروں کہ تمہاری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ اس وقت قیس بن سعد نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم! اگر تم نے ان کا بال بھی بیکا کیا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی باقی نہیں بچے گا۔

اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ حوصلے سے کام لیں۔ اس وقت نرمی بہتر ہے۔ یہ سنا تو حضرت عمرؓ ہٹ گئے۔

سعد نے کہا: اگر آج مجھ میں کھڑا ہونے کی سکت ہوتی تو شہر اور شہر کی گلیوں میں تم میری ایسی گونج سنتے جو تمھیں اور تمہارے دوستوں کو سنگ کر دیتی اور میں تمھیں اُس گروہ میں پہنچا کر دم لیتا جہاں تم محکوم ہوتے حاکم نہ ہوتے۔ پھر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ چنانچہ لوگوں نے انھیں اٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیا۔

محترم قاری! آپ نے سقیفہ بنی ساعدہ کی کارروائی کا حال پڑھا۔ ان واقعات میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہو۔ اس سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کس طرح خلیفہ بنے تھے؟

سقیفہ کی دھینگا مشتی کو کسی طور پر بھی شوریٰ نہیں کہا جا سکتا۔ سقیفہ کی اس کارروائی پر ہمیں پہلا اعتراض یہ ہے کہ بنی ساعدہ کی یہ چوپال بیرون شہر تھی جبکہ شہر مدینہ میں مسجد نبوی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور مسجد مسلمانوں کے اجتماع کا مقام تھی۔ آخر ایسی کون سی مجبوری درپیش تھی کہ مسجد جیسے مرکزی مقام کو چھوڑ کر مسلمانوں کی خلافت کا فیصلہ بیرون شہر کی ایک بیٹھک میں کیا گیا اور ویسے بھی یہ کوئی مناسب وقت نہ تھا کیونکہ ابھی تو رسول مقبولؐ دفن نہیں ہوئے تھے اور آپ کا جنازہ گھر میں رکھا ہوا

تھا مگر مسلمانوں کی رسول اکرمؐ سے محبت کا مظاہرہ کچھ اس طرح سے ہوا کہ وہ اپنے رسولؐ کا جنازہ چھوڑ کر خلافت کے جھگڑوں میں پڑ گئے جبکہ آنحضرتؐ کے اہل خاندان اور بزرگ صحابہ آپ کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔

اس واقعے کو مولانا روم نے یوں بیان کیا ہے

چوں صحابہ حب دنیا داشتند　　مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

ہم کل کے مسلمانوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ذرا اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا ایسا کر کے حب رسولؐ کا ثبوت دیا گیا اور کیا اس دھینگا مشتی کو شوریٰ کہنا صحیح ہے؟

حصول خلافت کے لیے فریقین میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کے اتحاد اور اُن کے مستقبل پر بحث نہیں کی تھی۔ سقیفہ کی بحث میں عرب عصبیت اپنے عروج پر تھی اور وہاں کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی مثلاً سعد نے کہا کہ خلافت پر قبضہ کرلو اور کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کرو۔ انصار نے کہا کہ آپ نے بالکل درست کہا ہے۔ ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کون ہے جو محمدؐ کی حکومت کے لیے ہم سے جھگڑا کر سکے؟ حباب نے کہا کہ خیال رکھنا۔ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی باتوں میں نہ آنا ورنہ یہ تمہارا حصہ تم سے چھین لیں گے۔

فریقین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی امت کے مستقبل سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں اگر انھیں دلچسپی تھی تو فقط اقتدار حاصل کرنے سے تھی۔

فریقین کے مزاج کو بھی دیکھنا ضروری ہے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ۲۳ سالہ تربیت کا اُن پر کیا اثر پڑا تھا؟ مثلاً حضرت عمرؓ نے حباب سے کہا خدا تجھے قتل کرے۔ حباب نے بھی ترکی بہ ترکی ایسا ہی جواب دیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ سعد کو مار ڈالو۔ خدا اسے مارے اور حضرت عمرؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ تجھے اتنا ماروں کہ تیری ہڈیاں سرمہ ہو جائیں۔

(سقیفہ کا ایک اور منظر) قیس بن سعد نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ رکھی ہے اور کہہ رہے ہیں کہ اگر میرے والد کا بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک بھی دانت باقی نہیں رہے گا۔

سقیفہ کی اس تند و تیز گفتگو اور قتل کی دھمکیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے سینوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد، دشمنی اور بدنیتی بھری ہوئی تھی۔

اہل انصاف سے درخواست ہے کہ کیا اسی کو اسلامی شوریٰ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جس شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے اُس سے ایسی ہی شوریٰ مراد ہے؟

فریقین کی گفتگو پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ اُن کی گفتگو کتنی غیر مہذب اور غیر منطقی تھی مثلاً

حضرت عمرؓ کے استدلال کو ہی لیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ملت عرب تمھیں اپنا امیر بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ رسول اکرمؐ تمہارے خاندان سے نہیں تھے۔ البتہ عرب اس بات کو برداشت کریں گے کہ جس خاندان سے اُن کا نبی تھا خلیفہ بھی اسی خاندان سے ہو۔ اگر حضرت عمرؓ کی دلیل صحیح ہے تو پھر آنحضرتؐ کے قریب ترین رشتے دار علیؑ بن ابی طالبؑ کی بجائے آپ کے دور پار کے رشتے داروں کو خلافت کیوں دی گئی؟

اسی لیے امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ اُن لوگوں نے شجر سے تو استدلال کیا لیکن اُس کے ثمر کو چھوڑ دیا۔ یعنی رسول خداؐ اگر شجر تھے تو میں اُن کا ثمر ہوں۔[1]

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ عرب امام علیؑ کی خلافت پر راضی نہیں تھے جو آنحضرتؐ کے سب سے قریب ترین رشتے دار تھے مگر انھوں نے آنحضرتؐ کے دور پار کے رشتے دار کو خلیفہ بنانا قبول کر لیا جس کا تعلق بنی تیم سے تھا۔

اگر نبی کی رشتے داری کی وجہ سے خلافت ملتی ہے تو اس کے سب سے زیادہ حق دار امام علیؑ تھے۔ اُن کی موجودگی میں دوسرے افراد کو خلافت کیسے مل گئی؟!

ابوبکر جوہری امام علیؑ کے احتجاج کے متعلق لکھتے ہیں کہ امام علیؑ فرمایا کرتے تھے۔

اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ وَاَخُوْ رَسُوْلِهٖ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اُس کے رسولؐ کا بھائی ہوں۔

اراکین حکومت امام علیؑ کو ابوبکرؓ کے پاس لے گئے اور کہنے لگے بیعت کرو، بیعت کرو۔

امام علیؑ نے فرمایا۔ میں خلافت کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ میں تمہاری بیعت نہیں کر سکتا۔ تمھیں میری بیعت کرنی چاہیے۔ تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش کی کہ تم رسول خداؐ کے رشتے دار ہو۔ انصار نے خلافت سے دست برداری اختیار کر لی اور حکومت تمہارے سپرد کر دی۔ اب میں تمہارے سامنے تمہاری اس دلیل کو پیش کرتا ہوں جو تم نے انصار کے سامنے پیش کی تھی۔ اگر تمہارے اندر انصاف اور خوف خدا موجود ہے تو ہمارا حق اسی طرح سے ہمارے سپرد کر دو جس طرح سے انصار نے تمہارے سپرد کیا تھا ورنہ تم ظالم شمار کیے جاؤ گے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب تک آپ بیعت نہ کیجئے گا ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ امام علیؑ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ تم اس کے لیے اس اونٹنی کا دودھ دوہو تا کہ آدھا دودھ تمھیں مل سکے اور آج اس کی حکومت کو مضبوط کرو تا کہ کل وہ یہ حکومت تمہارے سپرد کر جائے۔ خدا کی قسم! میں تمہاری بات نہیں مانتا اور تمہارے سامنے سر نہیں جھکاتا۔[2]

۱۔ شرح ابن ابی الحدید ج ۶، ص ۴۔ ۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۶، ص ۱۱۔

حقیقت گمشدہ

سقیفائی حکومت نے امام علیؑ کو اپنی اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے کئی حربے استعمال کیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں عباس بن عبدالمطلب کے پاس جانا چاہیے اور انھیں اپنا ہمنوا بنانا چاہیے۔ چنانچہ وہ عباس کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ ہم اس حکومت میں آپ کو اور آپ کے بیٹوں کو حصہ دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے یہ کوشش کی کہ عباس کو علیؑ سے جدا کر دیا جائے۔ اگر عباس نے اُن سے الحاق کر لیا تو وہ لوگوں سے کہیں گے کہ دیکھو چچا ہماری حکومت کو مان چکا ہے لیکن بھتیجا ہم سے جدا ہے۔[۱]

عباس بن عبدالمطلب ارباب سقیفہ کے ارادے بھانپ گئے تھے۔ جب حکومت کی طرف سے انھیں اقتدار میں شراکت کی دعوت دی گئی تو انھوں نے کہا: آپ لوگ جو کچھ مجھے دینا چاہتے ہیں اگر یہ مومنین کا حق ہے تو آپ کو ایسی پیشکش کرنے کا حق ہی نہیں ہے اور اگر یہ ہمارا حق ہے تو ہم اس پر راضی نہیں ہیں کہ ہمیں کچھ حق دیا جائے اور باقی حق سے ہم دستبردار ہو جائیں۔

خبردار! سختی اور تندی سے پرہیز کرنا۔ رسول خداؐ جس درخت سے تعلق رکھتے تھے ہم اُس درخت کی شاخیں ہیں اور تم اُس کے ہمسائے ہو۔[۲]

ارباب حکومت کا جب یہ حربہ ناکام ہوا تو انھوں نے طاقت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ محدثین و مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا: ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وفات پیغمبرؐ کے وقت سے علیؑ، زبیر اور کچھ دوسرے افراد فاطمہؑ کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔[۳]

ابوبکرؓ نے عمرؓ کو بھیجا کہ وہ جائیں اور ان لوگوں کو حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر سے باہر نکالیں۔ اگر وہ باہر نہ نکلیں تو انھیں قتل کر دیں۔ حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر کی طرف چلے۔ اُن لوگوں نے آگ جلانے کی لکڑیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ نے اُن سے کہا: پسر خطاب! کیا تم لوگ ہمارا گھر جلانے کے لیے آئے ہو؟ عمرؓ نے کہا ہاں۔ یا پھر تم لوگ بھی اس کام میں داخل ہو جاؤ جس میں باقی امت داخل ہو چکی ہے۔[۴]

کتاب انساب الاشراف میں مرقوم ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ دروازے کی اوٹ میں آئیں اور فرمایا فرزند خطاب! کیا میرا گھر جلانا چاہتے ہو؟

۱۔ الامامۃ والسیاسۃ، ابن قتیبہ ج ۱، ص ۱۴۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۲۳۔

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۲۶۔

۳۔ مسند احمد ج ۱، ص ۵۵۔ طبری ج ۳، ص ۲۰۵۔ ابن اثیر ج ۲، ص ۳۳۱۔ ابن کثیر ج ۵، ص ۲۴۶۔

۴۔ العقد الفرید، ابن عبدربہ ج ۴، ص ۲۵۹۔ تاریخ ابو الفداء ج ۱، ص ۱۵۶۔

عمرؓ نے کہا: ہاں۔[1]

حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر پر جن لوگوں نے یورش کی تھی اور اُسے جلانے کی کوشش کی تھی مؤرخین نے اُن کے نام لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) عمرؓ بن خطاب (۲) خالد بن ولید (۳) عبدالرحمن بن عوف
(۴) ثابت بن قیس بن شماس (۵) زیاد بن لبید (۶) محمد بن مسلم
(۷) زید بن ثابت (۸) سلمہ بن سلامہ بن وقش
(۹) سلمہ بن اسلم (۱۰) اسید بن حضیر

یعقوبی لکھتے ہیں کہ اراکین حکومت ایک جماعت کے ساتھ آئے اور گھر پر حملہ کیا۔ اس دوران امام علیؑ کی تلوار ٹوٹ گئی اور حملہ آور گھر میں داخل ہو گئے۔[2]

طبری لکھتے ہیں کہ عمرؓ بن خطاب امام علیؑ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت طلحہ اور زبیر کے علاوہ مہاجرین کی ایک جماعت اس گھر میں موجود تھی۔ زبیر ہاتھ میں تلوار لے کر مقابلے پر آئے لیکن اُن کا پاؤں پھسلا اور ان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ اراکین حکومت نے اُن پر حملہ کیا اور انھیں گرفتار کر لیا۔[3]

جب حضرت فاطمہ زہراؑ نے اس سلوک کو دیکھا جو امام علیؑ اور زبیر کے ساتھ ہوا تھا تو وہ اپنے حجرے سے نکلیں اور ابوبکرؓ کے حجرے کی دہلیز پر بیٹھ گئیں اور فرمایا اے ابوبکرؓ! تم لوگوں نے تو بڑی جلدی رسول اللہؐ کے اہل بیتؑ سے اپنے چھپے ہوئے کینے کو ظاہر کر دیا ہے۔ خدا کی قسم! میں مرتے دم تک عمرؓ سے بات نہیں کروں گی۔[4]

حضرت فاطمہ زہراؑ ان مسائل اور میراث سے محرومی اور دوسرے مصائب کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ پر غضبناک ہوئیں اور اُن سے متنفر ہو گئیں اور مرتے دم تک اُن سے بات نہیں کی۔ آپ رسول خداؐ کی وفات کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو امام علیؑ نے انھیں رات کے وقت دفن کر دیا اور ابوبکرؓ کو اطلاع تک نہ دی۔[5]

ایک اور روایت میں مرقوم ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ نے ابوبکرؓ سے کہا تھا خدا کی قسم! میں ہر نماز میں تمہارے لیے بددعا کروں گی۔[6]

۱۔ انساب الاشراف ج ۱، ص ۵۸۶۔ کنز العمال ج ۵، ص ۶۵، حدیث ۱۴۱۳۸۔ الریاض النضرۃ ج ۱، ص ۳۳۱۔
۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۲۶۔ ۳۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۲۰۲۔ صلح امام حسنؑ، محمود مقاد ص ۱۷۳۔
۴۔ شرح نہج البلاغہ ج ۶، ص ۴۹۔ ۵۔ صحیح بخاری ج ۵، ص ۱۷۷۔ ج ۴، ص ۹۶۔
۶۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۲۰۔

حقیقت گمشدہ

یہی وجہ ہے کہ موت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کا احساس ہوا تھا اور انھوں نے کہا تھا کہ میں نے تین کام ایسے کیے کہ کاش نہ کیے ہوتے تو بہتر تھا۔ کاش میں نے فاطمہ زہراؑ کے گھر کی بے ادبی نہ کی ہوتی خواہ وہ جنگ کے لیے بھی بند ہوتا۔[1]

تاریخ یعقوبی میں ہے کہ کاش میں نے فاطمہؑ کے گھر کی تفتیش نہ کی ہوتی اور لوگوں کو اس میں داخل نہ کیا ہوتا اگرچہ وہ جنگ کے لیے بند ہوتا۔[2]

مصر کے شاعر حافظ ابراہیم نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے۔

وقولۃ لعلیٍ قالہا عمرٌ ۔۔۔ اکرم بسامعہا اعظم بمُلقیہا

حرقت دارک لا ابقی علیک بہا ۔۔۔ ان لم تبایع و بنت المصطفی فیہا

ما کان غیر ابی حفص یفوہ بہا ۔۔۔ امام فارس عدنان و حامیہا

عمرؓ کے اس قول کو یاد کرو جو انھوں نے علیؑ سے کہا تھا۔ سننے والے کا احترام کرو اور کہنے والے کی تعظیم کرو۔ اگر تم نے بیعت نہ کی تو میں تمہارا گھر جلا دوں گا اور تمھیں اس گھر میں آرام نہ کرنے دوں گا اگرچہ بنت رسولؐ ہی اس میں موجود ہے۔

حافظ ابراہیم حضرت عمرؓ کی جرأت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ صرف عمرؓ کا ہی دل گردہ تھا جس نے قہرمان عرب کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے۔ اُن کے سوا کسی اور کو یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔

سقیفائی حکومت کا اصل چہرہ اس وقت کھل کر سامنے آیا جب امام علیؑ کو قتل کی دھمکی دی گئی۔ پہلے تو امام علیؑ کو زبردستی گھر سے نکال کر ابوبکرؓ کے پاس لے گئے اور کہنے لگے بیعت کرو۔

امام علیؑ نے کہا اگر میں بیعت نہ کروں تو کیا کرو گے؟

انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم! ہم تمہاری رگ گردن کاٹ دیں گے۔

امام نے کہا کہ ایسا کر کے تم خدا کے بندے اور رسولؐ کے بھائی کو قتل کرو گے۔[3]

ہم یہاں کچھ دیر کے لیے رک کر ہر انصاف پسند شخص سے پوچھتے ہیں کہ جو حکومت طاقت کے بل بوتے پر بنی ہو قتل کی دھمکیوں سے چل رہی ہو کیا اسے نظریہ شوریٰ کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے؟؟!!

۱۔ طبری ج ۳، ص ۴۳۰۔ مروج الذہب ج ۲، ص ۳۰۱۔ العقد الفرید ج ۳، ص ۶۸۔ کنز العمال حدیث ۱۴۱۱۳۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۲۳۔ تاریخ ذہبی ج ۳، ص ۱۱۷۔

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۳۷۔

۳۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۱۲۔

بنت رسولؐ کے گھر کی بے ادبی کے بعد شیخین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ معذرت طلب بھی ہوئے لیکن اب پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ وہی بات تھی کہ

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حضرت فاطمہؑ نے اُن سے فرمایا کہ اگر میں رسول خداؐ کی ایک حدیث سناؤں تو کیا تم اُس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو؟

شیخین نے کہا: ہاں۔

حضرت سیدہؑ نے فرمایا کہ میں تمھیں خدا کی قسم دے کر پوچھتی ہوں کہ تم نے رسول خداؐ سے یہ حدیث نہیں سنی تھی: رِضَا فَاطِمَةَ مِنْ رِضَایَ وَسَخَطُ فَاطِمَةَ مِنْ سَخَطِیْ فَمَنْ اَحَبَّ فَاطِمَةَ ابْنَتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَرْضٰی فَاطِمَةَ فَقَدْ اَرْضَانِیْ وَمَنْ اَسْخَطَ فَاطِمَةَ فَقَدْ اَسْخَطَنِیْ فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جس نے فاطمہؑ سے محبت رکھی اُس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے فاطمہؑ کو راضی کیا اُس نے مجھ کو راضی کیا اور جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا اُس نے مجھ کو ناراض کیا۔

شیخین نے کہا: ہاں۔ ہم نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث سنی تھی۔

حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ میں خدا اور اُس کے فرشتوں کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا ہے۔ میں پیغمبرؐ سے ملاقات کروں گی تو تم دونوں کی شکایت کروں گی۔ پھر آپ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ میں ہر نماز میں تمہارے لیے بددعا کیں کروں گی۔[1]

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو شوریٰ سے منتخب ہونے کا حق ہی نہیں تھا کیونکہ وہ شوریٰ نظریاتی طور پر باطل تھی اور اُس کا کہیں خارجی وجود نہ تھا۔ اگر ہم آنکھیں بند بھی کریں اور یہ مان لیں کہ حضرت ابوبکرؓ شوریٰ کے ذریعے خلیفہ بنے تھے تو پھر انھوں نے شوریٰ کو باقی کیوں نہ رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ کو نامزد کیوں کیا؟

حضرت ابوبکرؓ اور اُن کی خلافت دو خلاف شرع امور کی مرتکب قرار پائے گی۔

اول۔ مان لیا کہ خدا نے تعین خلیفہ کے لیے شوریٰ کا حکم دیا ہے تو پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر کے حکم خدا کی مخالفت کی تھی۔

دوم۔ شوریٰ کا دائرہ کار محدود ہے، خلافت اس کے دائرے میں شامل نہیں ہے اور حضرت ابوبکرؓ

۱۔ الامامة والسیاسة ج ۱، ص ۳۰۔

شوریٰ کے ذریعے منتخب ہوئے تھے لہٰذا اُن کا اپنا انتخاب غلط تھا۔
حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافتیں کسی غیر جانبدار شوریٰ کی پیداوار نہیں تھیں لہٰذا وہ بھی غیر قانونی اور غیر آئینی قرار پائیں گی جبکہ امام علیؑ کی خلافت ہر اشکال اور ہر سوالیہ نشان سے آزاد ہے کیونکہ اگر نص کو خلافت کا ذریعہ مانا جائے تو خدا و رسولؐ کی طرف سے آپ منصوص تھے اور اگر امت کے آزادانہ اجماع کو دیکھا جائے تو قتل عثمانؓ کے بعد امت نے آزادانہ اجماع کر کے آپ کی بیعت کی تھی۔
لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر معیار خلافت نص ہے تو اس معیار پر بھی امام علیؑ کی خلافت پوری اترتی ہے۔
ہم اس گفتگو کی تکمیل ایک مناظرانہ بحث پر کرتے ہیں۔
لوگوں نے مشہور شیعہ مناظر علی بن میثم سے کہا کہ اگر فلاں کی حکومت صحیح نہ تھی تو امام علیؑ نے جنگ کیوں نہ کی؟
علی بن میثم نے کہا کہ جن وجوہات کی بنا پر حضرت ہارونؑ نے سامری اور اُس کے ساتھیوں سے جنگ نہ کی تھی اُن ہی وجوہات کی بنا پر امام علیؑ نے بھی جنگ نہیں کی تھی۔[1]
امام علیؑ نے حضرت نوحؑ کی طرح سے جنگ نہیں کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا: اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ خدایا میں اُن کے مقابلے میں مغلوب ہوں۔ میری مدد فرما۔ (سورۂ قمر آیت ۱۰)

۱۔ حضرت ہارونؑ کے جنگ نہ کرنے کی دو وجوہات تھیں۔
(۱) انھیں ساتھی میسر نہ تھے۔ (۲) وہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم میں تفرقہ پیدا ہو۔
یہی بات ان کی زبانی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ (۱) اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَکَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۔ لوگوں نے مجھے کمزور بنا دیا تھا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔ (سورۂ اعراف ۱۵۰) (۲) اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ ۔ میں ڈرا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ (سورۂ طٰہٰ آیت ۹۴)
علامہ محمد جواد مغنیہ اپنی کتاب "شیعہ اور حاکمان" میں ۳۸ پر لکھتے ہیں کہ امام علیؑ نے فرمایا:
میں اس معاملے میں سات پیغمبروں کی سنت پر عمل کرتا ہوں۔
۱۔ حضرت نوحؑ جنھوں نے دعا کی کہ (بارالٰہا) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو میری مدد فرما۔ (سورۂ قمر ۱۰)
۲۔ حضرت ابراہیمؑ جنھوں نے کہا: میں تم لوگوں سے اور جس کو تم لوگ خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔ (سورۂ مریم ۴۸)
۳۔ حضرت لوطؑ جنھوں نے کہا: کاش کہ مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میرا کوئی مضبوط پشت پناہ ہوتا۔ (سورۂ ہود ۸۰)
۴۔ حضرت یوسفؑ جنھوں نے کہا: بارالٰہا جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔ (سورۂ یوسف ۳۳)
۵۔ حضرت موسیٰؑ جنھوں نے کہا: جب مجھے تم سے ڈر لگا تو میں تم میں سے بھاگ گیا۔ (سورۂ شعراء ۲۱)
۶۔ حضرت ہارونؑ جنھوں نے کہا: بنی اسرائیل نے مجھے کمزور بنا دیا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔ (سورۂ اعراف ۱۵۰)
۷۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ جب وہ ہجرت کے موقع پر مشرکین سے بچنے کے لئے غار ثور میں چھپ گئے۔ (رسول)

امام علیؑ نے جنگ نہ کر کے حضرت لوطؑ کی پیروی کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ اے کاش! مجھ میں تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا مجھے کسی زبردست ہستی کا آسرا حاصل ہوتا۔ (سورۂ ہود: آیت ۸۰)

امام علیؑ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی پیروی کی تھی۔ جب وہ شہر عمالقہ کے قریب پہنچے اور بنی اسرائیل نے لڑنے سے انکار کر دیا تو حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۲۵)

امام علیؑ نے مخالفین سے جنگ کیوں نہیں کی؟

احتجاج طبرسی، عبقات الانوار فی الامامۃ اور مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ امام علیؑ سے لوگوں نے کہا کہ آپ نے شیخین سے جنگ کیوں نہیں کی؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے جنگ نہ کر کے چھ انبیاء کی پیروی کی ہے۔

۱۔ میں نے جنگ نہ کر کے حضرت ابراہیمؑ کی سیرت کی پیروی کی ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی مشرکین سے جنگ نہیں کی تھی اور فرمایا تھا وَاَعْتَزِلُکُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اگر تم یہ کہو کہ حضرت ابراہیمؑ نے کسی ناپسندیدہ فعل کو دیکھے بغیر لوگوں سے دوری اختیار کی تھی تو کافر بن جاؤ گے اور اگر کہو کہ انھوں نے ناپسندیدہ فعل دیکھ کر دوری اختیار کی تھی تو پھر مجھے بھی معذور سمجھو۔ (حضرت ابراہیمؑ نے اگرچہ بت پرستوں سے جنگ نہیں کی تھی پھر بھی بت پرست سچے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح امام علیؑ کے جنگ نہ کرنے سے ان کے مخالف بھی سچے نہیں بن سکتے)۔

۲۔ میں نے جنگ نہ کر کے حضرت لوطؑ کی پیروی کی تھی۔ انھوں نے بھی بدقماش لوگوں کے ساتھ جنگ نہیں کی تھی اور فرمایا تھا لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ. اب اگر تم کہو کہ حضرت لوطؑ کے پاس جنگ کرنے کی قوت موجود تھی لیکن انھوں نے جنگ نہیں کی تو تم کافر قرار پاؤ گے اور اگر کہو کہ وہ اس لیے نہیں لڑے تھے کہ ان کے پاس قوت نہیں تھی تو یہ بات صحیح ہوگی۔ جس بنا پر نبی نہیں لڑا تھا اسی بنا پر وصی بھی نہیں لڑا۔

۳۔ حضرت یوسفؑ نے زنان مصر سے الجھنے کی بجائے زندان جانے کی درخواست کی تھی اور کہا تھا رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ جب ایک نبی مخالفین سے نہیں الجھے تو وصی بھی نہیں الجھے۔

۴۔ میں نے جنگ نہ کر کے حضرت موسیٰؑ کی پیروی کی۔ آپ نے فرعون سے کہا تھا فَفَرَرْتُ مِنْکُمْ

لِمَا خِفْتُکُمْ اب اگر تم کہو کہ حضرت موسیٰؑ کسی خطرے کے بغیر بھاگ گئے تھے تو تم کافر بن جاؤ گے یا پھر یہ کہ انہیں واقعی خطرہ تھا اس لیے وہ جان بچانے کی خاطر چلے گئے تھے۔ جب نبی کے عذر کو مانتے ہو تو وصی اس سے زیادہ معذور ہے۔

۵۔ حضرت ہارونؑ نے سامری اور اُس کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کی تھی اور میں نے بھی اپنے مخالفین سے جنگ نہیں کی۔ جب نبی کے عذر کو مانتے ہو تو وصی اس سے زیادہ معذور ہے۔

۶۔ میں نے جنگ نہ کر کے حضرت رسول اکرمؐ کی پیروی کی ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی اور اثنائے راہ میں مشرکین سے بچنے کے لیے غار میں چھپ گئے تھے۔ اگر کہو کہ رسول خداؐ نے بلاوجہ ہجرت کی تھی تو کافر بن جاؤ گے۔ جب نبی کو معذور مانتے ہو تو وصی ان سے بھی زیادہ معذور ہے۔

جب لوگوں نے یہ جواب سنا تو کہا کہ آپ نے بالکل بجا فرمایا۔[1]

صحابہ اور آیت انقلاب

فرمان خداوندی ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ اُن سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹا پھرے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اُس کی جزا دے گا۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴) ترجمہ مولانا مودودی۔

اس آیت کی گفتگو کا محور وفات پیغمبرؐ اور صحابہ کا الٹے پاؤں پھرنا ہے اور اس مطلب کو آیت کے تین حصوں وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ، اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ اور انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کی توضیح کے لیے ایک مفصل تمہید کی ضرورت ہے تاکہ آیت کا مطلب واضح ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ نے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کے بعد اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کے الفاظ ارشاد نہیں فرمائے اور اگر بالفرض اللہ آیت کو اسی انداز میں نازل فرماتا تو بھی اس کا مفہوم کامل کہلاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ آیت کچھ اس طرح سے ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کے بغیر بھی جملہ مکمل ہو سکتا تھا تو پھر اس جملے کو

۱۔ مناظرات فی الامامۃ۔ مناقب ابن شہر آشوب ج ۱، ص ۱۷۰۔

یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ "موت" اور "قتل" میں کیا فرق ہے اور عربی حرف اَوْ کے ذریعے سے معطوف اور معطوف علیہ کے مفہوم میں جو فرق پیدا کیا گیا وہ کیا ہے؟ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اُس کے حبیبؐ کی وفات طبعی ہوگی تو پھر اس نے اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کہہ کر ابہام پیدا کیوں کیا؟ اور اِنْقَلَبْتُمْ کا خطاب کن افراد سے ہے اور الٹے پاؤں پھرنے سے کیا مقصود ہے؟ جبکہ یہ موقع تو صبر و استقامت اور پامردی کا تھا۔ موقع کا تقاضا تو یہ تھا کہ خدا فرماتا کہ اللہ استقامت رکھنے والے مسلمانوں یا مومنوں کو جزا دے گا لیکن آیت میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ یہاں تو یہ کہا جا رہا ہے وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ یعنی اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔ شکر تو نعمت پر ہوتا ہے۔ جنگ احد میں نعمت کا کون سا موقع تھا کہ یہاں شکر کرنے والوں کو جزائے خیر دینے کا اعلان کیا گیا ہے؟ الغرض اس طرح کے سوالات کا جواب دینے کے لیے پہلے تو ہم آیت کا شان نزول دیکھیں گے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ جب جنگ احد میں حضرت رسول خداؐ کی شہادت کی افواہ اڑائی گئی تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تب خدا نے مسلمانوں کی سرزنش کے لیے یہ آیت اتاری۔

پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیت صرف شان نزول سے مخصوص ہوتی ہے یا ابدی ہوتی ہے یعنی اگر ہم یہ مان لیں کہ آیات شان نزول تک محدود نہیں بلکہ ابدی ہیں تو پھر ہم اس آیت کو جنگ احد تک محدود نہیں رکھیں گے اور اس میں توسیع پیدا کریں گے اور اگر یہ طے ہو جائے کہ آیات اپنے شان نزول تک ہی محدود ہوتی ہیں تو پھر ہم جنگ احد سے آگے اس آیت کو کہیں اور منطبق نہیں کر سکیں گے۔ امت کے تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آیت شان نزول تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کا حکم عام ہوتا ہے اور مفہوم آیت کے لیے شان نزول زیادہ مؤثر نہیں۔

علمائے اسلام کہتے ہیں کہ اگر آیات کو صرف شان نزول تک محدود کر دیا جائے تو پھر قرآن ابدی اور آفاقی نہیں رہے گا۔ قرآن کی آیات ایک مخصوص زمانے کے لیے ماننا پڑیں گی اور اس کے نتیجے میں یہ تکلیف دہ پہلو سامنے آئے گا کہ قرآن صرف اپنے نزول کے زمانے کے لیے تھا۔ بعد کے زمانے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں قرآن کی اکثر آیات بے فائدہ ہو کر رہ جائیں گی اور یہ عقیدہ اسلام کی آفاقیت کے خلاف ہے۔ اس عقلی دلیل کے علاوہ خود قرآن میں اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کسی ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ عمومی ہیں۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ آیات کی دلالت ان کے شان نزول تک محدود ہے تو پھر قرآن کی یہ آیت بے معنی ہو کر رہ جائے گی: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ جب قرآن پڑھا جائے تو خاموش ہو جاؤ اور اسے غور سے سنو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورۂ اعراف آیت ۲۰۴)

اس آیت میں چند آیات کے خاموش ہو کر غور سے سننے کا حکم نہیں ہے بلکہ پورے قرآن کو توجہ سے سننے کا حکم دیا گیا ہے اور اگر قرآن کی آیات صرف شان نزول تک محدود ہوتیں تو امت کو قیامت تک قرآن کو توجہ سے سننے کا حکم نہ دیا جاتا۔

قرآن نے تدبر و تفکر کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا کیا وہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ (سورۂ محمد آیت ۲۴)

قرآن کریم نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو بعض آیات پر ایمان رکھیں اور بعض کو چھوڑ دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ جن لوگوں نے قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ (سورۂ حجر آیت ۹۱) مقصد یہ ہے کہ وہ جس حصے کو چاہتے ہیں مان لیتے ہیں، اور جو آیات اُن کے مطلب کی نہیں ہوتیں انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ہم نے اس قرآن میں بدل بدل کر ہر طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ (سورۂ کہف آیت ۵۴)

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان بنایا ہے کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟ (سورۂ قمر آیت ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کے معنی واضح ہیں۔ یہ قرآن عربی زبان میں اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ (فصلت: آیت ۳)

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ (سورۂ زخرف: آیت ۳)

مذکورہ آیات مسلمانوں کو اشتیاق دلاتی ہیں کہ وہ قرآن کے ایک حصے کی بجائے پورے قرآن کے پابند بنیں۔ اس بحث سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ قرآنی آیات صرف اپنے شان نزول تک محدود نہیں ہیں اور ہر مسلمان اس بات کو مانتا ہے۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ آیات اپنے شان نزول تک محدود ہوتی ہیں تو بھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کی آیت اپنے زمانہ نزول تک محدود نہیں بلکہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیات اور وفات کے بعد کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

یہ درست ہے کہ مذکورہ آیت جنگ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھی جب یہ افواہ اڑائی گئی تھی کہ رسول اکرمؐ شہید ہو گئے ہیں اور اس خبر سے اسلامی لشکر کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے تھے لیکن یہ آیت صرف جنگ احد تک محدود نہیں ہے۔ اگر یہ آیت صرف اسی واقعے کے ساتھ مخصوص ہوتی تو آیت

میں موت اور قتل دو علیحدہ علیحدہ الفاظ نہ آئے ہوتے اور اللہ تعالیٰ صرف لفظ قُتِلَ ارشاد فرماتے جبکہ آیت میں مَاتَ اَوْ قُتِلَ کے دو علیحدہ علیحدہ الفاظ آئے ہیں۔ آیت میں لفظ مَاتَ بتاتا ہے کہ جس طرح سے اصحاب رسول اکرمؐ کے قتل کی خبر سن کر الٹے پاؤں پھر گئے تھے اسی طرح جب رسول اکرمؐ رحلت فرمائیں گے تو اُس وقت بھی وہ الٹے پاؤں پھر جائیں گے۔

اس تمہید کا عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر اصل اول (یعنی آیت شان نزول تک محدود نہیں ہیں) ثابت ہو جائے تو پھر اس شکل میں ہمیں اس آیت کی عمومیت ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہے گی اور اگر دوسرا موقف کہ آیات اپنے شان نزول سے مخصوص ہیں مان لیا جائے تب بھی آیت کی اندرونی شہادت بڑی زبردست ہے۔ وہ زبان حال سے اعلان کر رہی ہے کہ یہ آیت صرف جنگ احد سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کا تعلق رسول کریمؐ کی پوری حیات طیبہ اور آپ کی وفات کے بعد کے حالات سے بھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ آپ کی پوری حیات طیبہ اور وفات کے بعد کے حالات پر بھی منطبق ہوتی ہے تو اس کا انطباق کب اور کیسے ہوسکتا ہے؟

''کب'' کا جواب تو قرآن مجید میں اَفَائِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ کے الفاظ سے دیا گیا ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح سے تم جنگ احد میں الٹے پاؤں پھرے تھے اسی طرح وفات پیغمبرؐ کے بعد بھی الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اگر خدا کا ارادہ اسے صرف جنگ احد تک ہی محدود رکھنے کا ہوتا تو پھر اَفَائِنْ قُتِلَ کے الفاظ نازل کرتا اور اَفَائِنْ مَاتَ کا سابقہ نہ لگاتا۔

اَفَائِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ شرط ہے اور اس شرط کا جواب اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے لفظ اِنْ حرف شرط کے ساتھ لفظ اَوْ حرف استفہام لگا کر مفہوم میں تاکید پیدا کی ہے اور اسے علم بلاغت کی اصطلاح میں استفکار تو بیخی کہتے ہیں یعنی نبی کی موت اور قتل کا سن کر تمہارا الٹے پاؤں پھر جانا قابل مذمت ہے۔ اور اگر آیت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ اگر رسولؐ میری مشیت کے تقاضوں کے تحت کفار کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ یقیناً یہ مفہوم ناقابل قبول ہے کیونکہ اس مفہوم کے تحت تو بیخ میں انتہائی تخفیف ہو جاتی ہے جبکہ واقعات تخفیف کے متقاضی نہیں ہیں اور کوئی بھی صاحب حکمت اس طرح کی گفتگو نہیں کرتا تو ''خداوند علی الحکیم'' سے اس کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

ہم اصل اول کے تحت آگے چل کر ثابت کریں گے کہ یہ آیت صرف ''یوم احد''[1] تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق حبیب خداؐ کی پوری زندگی اور آپ کی وفات کے بعد کے واقعات سے بھی ہے لیکن پہلے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ لفظ ''موت'' کے دو معانی ہیں:

۱۔ جنگ جاری رہنے کے پورے عرصے کو ''یوم'' کہا جاتا ہے مثلاً یوم الخندق، یوم صفین۔ (رضوانی)

ایک اس کا عمومی مفہوم ہے جس سے قبض روح مراد ہے جیسا کہ فرمان قدرت ہے:
اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ یعنی تم کہیں بھی رہو موت تو تمہیں آکر رہے گی خواہ اونچی اونچی عمارتوں میں رہو۔ (سورۂ نساء آیت ۷۸)
اسی طرح سے اللہ کا فرمان ہے۔ وَھُوَ الَّذِیْ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ یعنی وہی تو ہے جس نے تمہیں زندگی دی پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ (سورۂ حج آیت ۶۶)
یہ تو موت کا عمومی مفہوم ہے جس سے قبض روح مراد ہے اور اگر لفظ "قتل" کے مقابلے میں لفظ "موت" آئے تو اس سے صرف طبعی موت مراد ہوتی ہے۔ اور اگر کہیں لفظ قتل اور موت کے درمیان حرف اَوْ کا استعمال ہو تو پھر ہر قیمت پر اس سے طبعی موت مراد ہوتی ہے۔ نمونے کے طور پر آل عمران کی حسب ذیل آیات دیکھئے۔

۱۔ لَوْ کَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا (منافقین نے کہا کہ) اگر وہ یہاں ہمارے پاس رہتے تو نہ تو مرتے اور نہ ہی وہ مارے جاتے۔ (آیت ۱۵۶)

۲۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ○ اگر تم راہ خدا میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ (آیت ۱۵۷)

۳۔ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ ○ اور اگر تم مر جاؤ یا مارے جاؤ تو تم خدا کے حضور میں ضرور اکٹھے کئے جاؤ گے۔ (آیت ۱۵۸)

مذکورہ تین مثالیں یہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ جب بھی لفظ قتل کے مقابلے پر لفظ موت استعمال ہو تو اس سے طبعی موت مراد ہوتی ہے اور اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کی آیت میں بھی موت سے طبعی موت مراد ہے۔

اب زیر بحث آیت کے ایک اور لفظ پر توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ پھر کہتا اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ لیکن ایسا نہیں ہے۔ آیت میں صرف حبیب خداؐ کی صفت رسالت بیان نہیں کی گئی بلکہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ کہہ کر دیگر رسولوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ آخر اس آیت میں دیگر رسولوں کے تذکرے کی کیا ضرورت تھی؟ کچھ مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ دوسرے رسولوں کے ذکر کی حکمت یہ ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ محمدؐ ہمیشہ کی زندگی ساتھ لے کر نہیں آئے۔ جس طرح سے دوسرے رسول دنیا میں آئے اور چلے گئے اسی طرح سے احمد مرسلؐ بھی اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

ہمیں مفسرین کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ اگر خدا نے اپنے رسولؐ کے لیے موت کا اثبات کرنا ہی تھا تو وہ اس کی بجائے اس طرح کے الفاظ بھی کہہ سکتا تھا جن کا مفہوم یہ ہوتا کہ "محمدؐ بھی ایک انسان ہیں ان سے پہلے اور بھی انسان گزر چکے ہیں" اس سے بھی پیغمبر اکرمؐ کی موت کا اثبات ممکن تھا مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں انسانوں کا حوالہ نہیں دیا بلکہ رسولوں کا حوالہ دیا ہے۔ آخر اس میں کون سی حکمت مضمر ہے؟

۱۔ اگر آیت کے مفہوم پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ محمدؐ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں اور دین انبیاء کی زندگی سے وابستہ نہیں تھا۔ وہ رسول آئے اور چلے گئے لیکن اُن کے جانے کے بعد دین باقی رہا۔ اسی طرح سے محمدؐ بھی ایک رسول ہیں۔ دین اُن کی زندگی سے وابستہ نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ کی موت کے بعد بھی دین باقی رہے گا۔

۲۔ اگر اس آیت کو اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں "تطابق سنن" کا اصول بھی مضمر ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی موت کے بعد امتوں نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہی رویہ امت مسلمہ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنائے گی اور اس امت اور سابقہ امتوں کے کردار میں ہاں برابر بھی فرق نہیں ہوگا۔

یہ حقیقت قرآن، سنت اور تاریخ سے ثابت ہے۔ ہم پہلے قرآن حکیم سے اس کی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ○ ان رسولوں میں سے (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اُن میں سے کوئی ایسا تھا جس سے خود خدا ہم کلام ہوا۔ کسی کو اُس نے دوسرے امور میں بلند درجے عطا کیے اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے روشن نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے اُن کو مدد دی اور اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ اُن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے مگر (اللہ کی مشیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے) اُن لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔ پھر بعض تو ایمان لائے اور بعض کافر ہی رہے۔ ہاں! اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۵۳)

اس آیت میں مِنْ بَعْدِهِمْ کی ضمیر لفظ الرُّسُلُ کی طرف پلٹ رہی ہے۔ اگر اس سے صرف حضرت عیسیٰؑ مراد ہوتے تو مِنْ بَعْدِ کے الفاظ ہوتے اور یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ یہاں هُمْ کی ضمیر جمع

سے حضرت عیسیٰؑ کی عظمت کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو یہ فصاحت قرآن کے خلاف ہوگا اور ویسے بھی مجازی معانی وہاں لیے جاتے ہیں جہاں حقیقی معانی محال ہوں جبکہ یہاں اس طرح کی کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ضمیر جمع کا مرجع تِلْکَ الرُّسُلُ ہے اور ہمارے رسول بھی اُن رسولوں کی جماعت کے ایک فرد ہیں کیونکہ آیت کا مکمل یہ ہے۔ تِلْکَ آیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَاِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ○ یہ خدا کی آیات ہیں جن کی ہم آپ پر تلاوت کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریمؐ کو رسولوں کی جماعت کا ایک فرد بیان کرکے اُس کی متصل آیت میں فرمایا تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔

کتب حدیث میں ایسی کئی صحیح السند احادیث موجود ہیں جو "تطابق سنن" پر دلالت کرتی ہیں اور علمائے حدیث نے ان احادیث کی صحت پر اجماع کیا ہے۔ رسول اکرمؐ کی چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ سَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ وَحَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْہُ تم ہم سابق کے طریقوں کی پیروی کرو گے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئی ہوں گی تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہوگے۔[1]

۲۔ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ۔

۳۔ اِفْتَرَقَتِ الْیَھُوْدُ اِلٰی اِحْدٰی وَسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً وَافْتَرَقَتِ النَّصَارٰی اِلَی الثِّنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً وَسَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ اِلٰی ثَلَاثٍ وَّسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً، اِثْنَتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِی النَّارِ وَ وَاحِدَۃٌ نَاجِیَۃٌ۔ یہودیوں کے اکہتر فرقے ہوئے تھے اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے تھے اور عنقریب میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے بہتر دوزخ میں جائیں گے اور ایک فرقہ ناجی ہوگا۔

تطابق سنن پر حسب ذیل آیات بھی دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ فَھَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِھِمْ (سورۂ یونس، آیت ۱۰۲)

۲۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِہٖ

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ سَتَتَّبِعُوْنَ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ حَذْوَ الْقُذَّۃِ بِالْقُذَّۃِ وَحَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْہُ۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۳)

۳۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (سورۂ عنکبوت، آیت ۲۔۳)

قرآن کریم کی ان آیات سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ امت محمدیہ بھی دوسری امتوں کے نقش قدم پر چلے گی اور دوسری امتوں کی طرح آپس میں جدال و قتال کرے گی اور ان میں سے کچھ حق پر ہوں گے اور کچھ باطل پر ہوں گے اور وہ ایک دوسرے کی تکفیر کریں گے۔

تاریخ اسلام کا ہر قاری اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ رسول خداؐ کی وفات کے فوراً بعد قرآن کریم کی یہ پیشین گوئی منظر عام پر آگئی۔ صحابہ کے آپس میں شدید اختلافات ہوئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو کافر کہا اور ایک دوسرے کو فاسق کہا اور پھر یہ لڑائی زبان کی حد تک محدود نہ رہی اور مسلمانوں میں ایسی خانہ جنگی ہوئی کہ لاکھوں لوگ اس جنگ کا ایندھن بنے اور عملی طور پر قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت منظر عام پر آئی "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا اور اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ اُن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے مگر اُن لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔

ایک سوال اور اُس کا جواب

اگر اس مقام پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ صحابہ الٹے پاؤں کیسے پھر سکتے ہیں، انھوں نے اپنی جان اور اپنے مال کو راہ خدا میں قربان کیا تھا اور انھیں اسلام سے اتنی محبت تھی کہ انھوں نے اسلام کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے اپنے رشتے داروں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا اور اُن لوگوں نے ہر دکھ سکھ میں آنحضرتؐ کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور انھوں نے روشن ترین نبوت کے معجزات دیکھے تھے لہٰذا اُن کے متعلق یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ الٹے پاؤں پھر سکتے ہیں؟!!

اس سوال کا جواب اگرچہ سابقہ صفحات میں دیا جا چکا ہے لیکن یہاں بھی ہم اس سوال کے چند جواب دینا چاہتے ہیں:

(۱) قرآن کریم کی آیت کے لفظ اِنْقَلَبْتُمْ میں جو ضمیر جمع مذکر حاضر ہے اس کا خطاب صحابہ سے ہے۔ کسی اور سے نہیں ہے۔ اور یہ کہنا انتہائی غلط ہوگا کہ اس کا خطاب کفار و منافقین سے ہے کیونکہ کفار و منافقین تو پہلے سے ہی گمراہی میں مبتلا تھے۔ یہ خطاب کفار و مشرکین کی بجائے صحابہ سے ہے کہ اِنْقَلَبْتُمْ تم محمدؐ کی موت کے ساتھ ہی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے۔

(۲) علم بھی انسان کو انحراف سے نہیں روک سکتا۔ بعض اوقات لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ فلاں شخص حق پر ہے لیکن نفسانی تقاضوں کی وجہ سے انسان اُس کی مخالفت کرتا ہے اور گمراہی کی زیادہ تر صورتیں علم آنے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی اختلاف کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۹)

ارشاد خداوندی ہے۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جاچکا تھا انھوں نے واضح ہدایات پالینے کے بعد حق کو چھوڑ کر محض اسی لیے طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ حق واضح تھا اور باطل بھی واضح تھا لیکن لوگوں نے پھر بھی اختلاف کیا تھا اور ایک دوسرے سے خونریز جنگیں لڑی تھیں۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ اُن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے۔ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے بھی اُس کو گمراہی میں چھوڑ دیا ہے۔ (سورۂ جاثیہ: آیت ۲۳)

(۳) سابقہ جانفشانی اور قربانی بھی انسان کو انحراف سے نہیں روک سکتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی قربانیاں بنی اسرائیل نے دی تھیں اتنی کسی بھی قوم نے نہیں دی تھیں۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے حضرت موسیٰؑ کی وجہ سے قتل ہوئے تھے۔ فرعون نے اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوائے تو بھی انھوں نے صبر کیا تھا اور حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر قائم رہے تھے لیکن جب فرعون غرق ہوگیا اور بنی اسرائیل کو دشمنوں سے آزادی ملی تو چند دن گزرے تھے کہ انھوں نے سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی؟

معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اُن کی آزمائش ہوتی رہی وہ ایمان پر قائم رہے اور جونہی آزمائش ختم ہوئی اور انھیں آرام نصیب ہوا اور اُن کا پیٹ بھر گیا تو وہ سرکشی پر اتر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس حالت کو یوں بیان فرمایا ہے۔ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ ○ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ ○ بیشک انسان سرکش ہو جاتا ہے جب وہ اپنے تئیں مستغنی سمجھتا ہے۔ (سورۂ علق آیت ۶۔۷)

(۴) یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ بعض انسان ایمان کی بلندی پر پہنچ کر بھی پھسل جاتے ہیں۔ جو بھی شخص خدا کی طرف سے معصوم نہ ہو وہ ایمان کی بلندی کے بعد کفر کی پستی میں بھی گر سکتا ہے اور بلعم بن باعور کا واقعہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ

آیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى
الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ذّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ
الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ○ سَآءَ مَثَلًا ۟ الْقَوْمُ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا
وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ○ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ اور
ان کو اُس شخص کا واقعہ سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں پھر وہ اُن سے بالکل الگ ہوگیا اور
شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اُن آیتوں کے سبب
بلندی پر لے جاتے مگر وہ خود پستی کی طرف جھک گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا تو اس کی مثال
کتے کی سی ہوگئی کہ اگر اُس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔
یہی مثال اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو آپ اُن واقعات کو بیان کر دیں تاکہ یہ
لوگ غور و فکر کریں۔ کس قدر بری مثال ہے اُن لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ لوگ
اپنے ہی نفس پر ظلم کر رہے تھے۔ جس کو خدا ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑ
دے وہی خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۷۵۔۱۷۸)

مفسرین لکھتے ہیں کہ بلعم باعور ایمان کے بلند درجے پر فائز تھا اور اُس کے پاس اسم اعظم
تھا مگر پھر بھی وہ منحرف ہوگیا تھا۔ دوسری طرف اکثر صحابہ کو ایمان کا وہ بلند ترین درجہ بھی حاصل نہیں تھا
اور نہ ہی اُن کے پاس اسم اعظم تھا تو وہ آخر منحرف کیوں نہیں ہوسکتے تھے؟

آیت کی تحلیل سے بہرحال جواب دیا جاسکتا ہے کہ الٹے پاؤں پھرنے کا تعلق کس چیز سے تھا؟

۱۔ الٹے پاؤں پھرنے کا تعلق وفات پیغمبرؐ سے ہے چنانچہ فرمایا اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ.

۲۔ الٹے پاؤں پھرنا ایک ہدف پر دلالت کرتا ہے جو تمام الٹے پاؤں پھرنے والوں کے لیے معین
تھا۔ اگر انھیں اس ہدف کا علم نہ ہوتا تو اِنۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِكُمۡ کہہ کر خطاب نہ کیا جاتا اور
جس ہدف کی وجہ سے وہ الٹے پاؤں پھرے تھے وہ پہلے سے طے شدہ تھا۔

۳۔ اس مسئلے کا خدا و رسولؐ سے براہ راست تعلق ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ الٹے پاؤں پھرنے
والوں نے خدا اور رسولؐ کے فرمان کی خلاف ورزی کی تھی۔

۴۔ اس عمل کا نقصان الٹے پاؤں پھرنے والوں کو ہی ہوگا کیونکہ اللہ نے فرما دیا ہے وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ
عَلٰی عَقِبَیۡهِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیۡـًٔا یعنی جو بھی الٹے پاؤں پھرے گا وہ خدا کا کچھ نقصان نہیں
کرے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ خدا نے یہ بھی فرمایا وَسَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیۡنَ عنقریب خدا
شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔ ویسے بھی شکر ایک ایسا عمل ہے جو شکر کرنے والے کو فائدہ

پہنچاتا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ جو شکر کرے وہ اپنے لیے ہی شکر کرتا ہے۔ (سورۂ لقمان: آیت ۱۲) شکر کا فائدہ ہمیشہ شکر گزار کو ہی پہنچتا ہے۔ خدا کے اس فرمان سے ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شکر نہ کرنے کا نقصان ناشکرے کو پہنچتا ہے۔

۵۔ الٹے پاؤں پھرنے کے عمل کا تعلق بھی گزشتہ اقوام کی تاریخ و سیرت سے مربوط ہے۔ سابقہ امتیں جس طرح الٹے پاؤں پھری تھیں اسی طرح سے اس امت کے اکثر افراد بھی الٹے پاؤں پھریں گے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مومنین یا مسلمین کو جزا دے گا اس کی بجائے یہ فرمایا ہے کہ وہ "شاکرین" کو جزا دے گا۔ اور یہی جملہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ الٹے پاؤں نہ پھرنے والے افراد کم ہوں گے کیونکہ یہاں اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ شاکرین کو جزا دے گا اور دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ○ میرے بہت کم بندے شکر گزار ہوتے ہیں۔ (سورۂ سبا: آیت ۱۳) لفظ انْقَلَبْتُمْ سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے کہ الٹے پاؤں پھرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ اگر الٹا پھرنے والوں کی تعداد کم ہوتی تو اللہ تعالیٰ اِنْقَلَبْتُمْ کی بجائے اِنْقَلَبَ بَعْضُكُمْ کہتا اور یوں اکثریت کو توجہ نہ فرماتا۔

۷۔ لوگوں کا پھر جانا یقینی تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسے "شرط و جزا" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور جب شرط موجود ہو تو اس کی جزا کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ اِنْقَلَبْتُمْ فعل ماضی کا صیغہ ہے جو اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہے۔

۸۔ یہ خطاب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کا کافروں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ کافر تو پہلے سے ہی الٹے پھرے ہوئے تھے۔ اس آیت کو منافقین سے مخصوص کرنا بھی صحیح نہیں۔ اگر ان سے خطاب ہوتا تو اَظْهَرْتُمُ انْقِلَابَكُمْ کے جملے ہوتے۔ اس انقلاب کی شناخت کے لیے تجزیہ و تحلیل کرتے وقت مذکورہ بالا نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے تاکہ بحث کا نتیجہ برآمد ہو سکے۔
پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کے حاکم تھے۔ آپ کی وفات کے بعد انقلاب کا عمل شروع ہوگا۔
اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ حاکم کی موت کے بعد عام طور پر الٹے پاؤں پھرنے کا عمل کس بات سے ہوتا ہے؟

قرآن کریم میں اشارہ ہے کہ ایک ایسا اہم معاملہ بھی تھا جس کی تبلیغ سے آنحضرتؐ خائف تھے چنانچہ خدا نے زور دے کر کہا يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی اے رسول! اُس مسئلے کی تبلیغ کر دیجیے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اُس کا پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

درج بالا آیت پر توجہ کرنے سے ہم حسب ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

۱۔ وہ مسئلہ جس کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ اتنا اہم ہے کہ اس کی تبلیغ، تبلیغ رسالت کے مساوی ہے اور اگر اس کی تبلیغ نہ کی گئی تو پوری رسالت کی تبلیغ نہیں ہوئی اور اس مسئلے کا انکار پوری رسالت کے انکار کے مساوی ہے اور اس سے پھر جانا رسالت سے پھر جانے کے مترادف ہے (کیونکہ یہ آخری رسالت ہے اور اس مسئلے کی تبلیغ اُس کا تسلسل ہے)۔

۲۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں لوگوں کے زبردست اختلاف کا خدشہ موجود تھا۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ اس کی تبلیغ سے گریزاں تھے یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اپنی حفاظت کا یقین دلایا اور فرمایا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

۳۔ اس مسئلے کی اہمیت، اتنی زیادہ ہے کہ اس کی تبلیغ اگر نہ کی جائے تو پوری رسالت کی تبلیغ ختم ہو سکتی ہے اور جب اس مسئلے کی تبلیغ ہوئی تو اُس سے دین مکمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۂ مائدہ، آیت ۳) اس آیت کو مدنظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ اس پیغام سے انحراف تمام دین سے انحراف کے مترادف ہے۔

۴۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس مسئلے کو سننے پر آمادہ نہیں ہیں اور اُن کی طرف سے مزاحمت کا بھی امکان ہے۔

آخر وہ مسئلہ کون سا تھا جس کی تبلیغ رسول اسلامؐ نے کرنا تھی؟ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے الٹے پاؤں دین سے پھر جانا ہے۔

۱۔ اس مسئلے کا تعلق رسالت سے ہے اور اس کی مخالفت رسالت کی مخالفت ہے۔

۲۔ لوگ اس مسئلے کی تبلیغ پر راضی نہیں تھے اور اُن کی اکثریت اس کے خلاف تھی۔

۳۔ پیغمبر اس مسئلے کی تبلیغ پر مجبور تھے کیونکہ آپ کو اپنی وفات نزدیک دکھائی دے رہی تھی اور آپ نے یہ فرمایا تھا اِنِّيْ اُوْشِكُ اَنْ اُدْعٰى فَاُجِيْبَ "وہ وقت قریب ہے جب مجھے بلاوا آئے گا اور میں اُس پر لبیک کہوں گا۔" اسی لیے نبی اکرمؐ اتمام حجت کرنا چاہتے تھے تاکہ کسی کے لیے انحراف کا بہانہ باقی نہ رہے۔

۴۔ آنحضرتؐ نے جس اہم مسئلے کو پہنچانا ہے اس کے متعلق لوگوں کے ابھی سے تیور بنا رہے تھے کہ وہ اسے قبول نہیں کریں گے جبکہ اسلام کے باقی احکام کی آنحضرتؐ نے تبلیغ کی تو کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب اس مسئلے کی تبلیغ کی باری آئی تو آنحضرتؐ کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا اسی لیے اللہ نے آپ سے یہ وعدہ کیا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

۵۔ پیغمبر اس مسئلے کی تبلیغ سے پیدا ہونے والی شورش پر قابو پا سکتے تھے لیکن یہ بات یقینی تھی کہ آپ کی وفات کے بعد لوگوں کا شدید ردعمل سامنے آئے گا اور وہ اس سے انحراف کریں گے۔

۶۔ خلیفہ کے تعین کے سوا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کو لوگ ناپسند کریں اور اس کی مخالفت کریں۔

پیغمبر اسلامؐ نے کس کی خلافت کا اعلان کیا تھا؟

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دنیائے اسلام کی دسیوں کتابوں میں تواتر کے ساتھ واقعہ غدیر منقول ہے اور محدثین نے خلافت علیؑ کے اعلان کو ہر زمانے میں بیان کیا ہے۔ حدیث غدیر اور اس کے علاوہ دیگر احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ اور امت کا امام مقرر کیا تھا لیکن یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ جیسے ہی آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو لوگوں نے خلافت علیؑ سے انحراف کیا اور ان کے حق کو غصب کر لیا۔ چند افراد کے سوا باقی تمام لوگ راہ حق سے منحرف ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے آیت کے اختتام پر جو یہ فرمایا ہے وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ولایت علیؑ پر ثابت قدم رہنے والے افراد انتہائی کم تھے۔

۱۔ اِنْقَلَبْتُمْ میں اکثریت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اللہ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ وہ پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی منحرف ہو جائیں گے۔

۲۔ ولایت علیؑ پر ثابت رہنے والوں کو "شاکرین" کا خطاب دیا گیا ہے اور سورۂ سبا میں آیا ہے وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ بہت تھوڑے بندے ہی شکر گزار ہوتے ہیں۔

سابقہ امتوں کی بھی یہی تاریخ رہی ہے کہ انبیاءؑ کے بعد کچھ ایمان پر قائم رہتے تھے اور کچھ کفر اختیار کر لیتے تھے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ

اللہ کسی کو جبراً ہدایت کے راستے پر نہیں چلاتا۔ وہ تو صرف سچے راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔ پھر یہ انسان پر موقوف ہے کہ وہ شکر کرے یا کفر کرے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے چاہے تو شکر گزار بنے

چاہے تو ناشکرا ہو جائے۔ (سورۂ دہر، ۳) یہ راستا حسب ذیل دلیل سے مشخص ہوتا ہے۔

۱۔ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ ہم نے اسے راستا دکھا دیا ہے۔

۲۔ اب انسان کی صوابدید پر ہے کہ وہ شاکر بنے یا کافر بنے اور وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کی آیت میں اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ وہ شکرگزاروں کو عنقریب جزا دے گا اور شاکر وہ ہیں جو اس مخصوص راستے پر ثابت قدمی سے چلتے رہیں ورنہ وہ کافر قرار پائیں گے۔

۳۔ لفظ اَلسَّبِيْلَ پر الف لام تعریف کو داخل کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ایک مخصوص راستا مراد ہے اور اسی راستے کی تبلیغ کے لیے انبیاءؑ کو بھیجا گیا تھا۔ جو اس راستے پر قائم رہے گا وہ شاکر ہوگا ورنہ کافر ہوگا۔

اور یہ راستا ایک ایسا راستا ہے جو بیک وقت آزمائش اور نعمت کا ذریعہ ہے۔ اسی کی وجہ سے لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے اور جو اس راستے پر ثابت قدم رہیں اُن کے لیے یہ راستا نعمت ہے۔ شکر، نعمت کے مقابلے پر ہوتا ہے اور اس راستے سے انحراف کفرانِ نعمت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ولایت علیؑ خدا کی عظیم نعمت ہے کیونکہ جیسے ہی اس کا اعلان ہوا تو خدا نے فرمایا وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ خدا کا وعدہ پورا ہوا۔ وفات پیغمبرؐ کے بعد لوگ اس نعمت سے الٹے پاؤں پھر گئے اور معدودے چند افراد اس راہ پر ثابت قدم رہے اور انھوں نے نجات پائی۔

اس مطلب کی مزید تاکید کے لیے ہم رسول خداؐ کی ایک حدیث یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں قیامت کے روز کھڑا ہوں گا کہ اچانک میں ایک گروہ کو دیکھوں گا۔ جب میں انھیں پہچان لوں گا تو ایک شخص میرے اور ان کے درمیان نمودار ہوگا اور اُن سے کہے گا کہ آؤ۔ میں پوچھوں گا کہ کہاں؟ یعنی تم اُن کو کہاں لے جانا چاہتے ہو۔ وہ کہے گا کہ خدا کی قسم! میں انھیں دوزخ کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ میں کہوں گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا؟ وہ کہے گا کہ یہ لوگ آپ کے بعد الٹے پاؤں پھر گئے تھے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جیسے قافلے کے اونٹوں سے چند اونٹ بچھڑ جاتے ہیں۔ بس اتنے ہی افراد نجات پائیں گے۔[1]

یہ حدیث اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اُن میں سے صرف چند افراد ہی نجات پائیں گے اور اس کی تمثیل آنحضرتؐ نے یوں دی ہے کہ جیسا کہ شتران قافلہ سے چند اونٹ بچھڑ جاتے ہیں بس اتنے ہی افراد ان میں سے نجات پائیں گے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ. مَنْ وَرَدَهُ شَرِبَ.

۱۔ صحیح بخاری، ج ۸، ص ۱۴۸۔۱۵۱۔ کتاب الرقاق، باب فی الحوض۔

حقیقت گمشدہ

ومن شرب لم یظمأ أبدًا ولیردنّ علیّ أقوام أعرفهم ویعرفونی ثم یحال بینی وبینهم. یعنی میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہنچ جاؤں گا اور جو وہاں میرے پاس آئے گا وہ کوثر کا جام پئے گا جس کے بعد اسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی اور وہاں میرے پاس ضرور ایسے لوگ آئیں گے جن کو میں جانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے جانتے ہوں گے۔ پھر میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ کہیں گے انهم منی، فیقال انک لا تدری ما عملوا بعدک. یہ مجھ سے ہیں۔ کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تھا۔[1]

ایک اور روایت ہے لیردنّ علیّ الحوض رجال ممّن صاحبنی حتی إذا رأیتهم ورفعوا إلیّ اختلجوا دونی فلا فولنّ ای ربّ! أصیحابی أصیحابی فلیقالنّ لی: إنک لا تدری ما أحدثوا بعدک. یعنی حوض (کوثر) پر ضرور ایسے لوگ میرے پاس آئیں گے جو میری صحبت میں رہ چکے ہوں گے یہاں تک کہ جب میں انہیں دیکھوں گا اور وہ میری طرف بڑھیں گے تو ان کو مجھ سے دور ہٹا دیا جائے گا۔ تب میں کہوں گا پروردگارا یہ میرے اصحاب ہیں۔ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ بدل دیا تھا۔

(صحیح مسلم میں آگے ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ ایک اور حدیث ہے کہ کہا جائے گا

فما زالوا یرجعون علی أعقابهم یعنی آپ کے یہ اصحاب آپ کے بعد دین سے الٹے پاؤں پھر گئے تھے)۔

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے شہدا کے ایمان و بہشت کو دیکھا تو فرمایا:

أما هؤلاء فإنی أشهد لهم بأن ایمانکم ایمانهم

اسی وقت حضرت ابوبکرؓ نے کہا: یا رسول اللہؐ! ہم کیسے ہیں؟ آپ نے فرمایا: أما أنتم فلا أدری ما تحدثون بعدی. تمہارے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے کہ تم لوگ میرے بعد کیا کیا بدعتیں ایجاد کرو گے۔[2]

۱۔ صحیح مسلم ج ۱، ص ۲۱۷۔ ۲۱۸، کتاب الطہارۃ، باب استحباب اطالۃ الغرۃ ج ۴، ص ۱۷۹۲۔ ۱۸۰۰، کتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبینا و صفاتہ ج ۴، ص ۲۱۹۳، کتاب الجنۃ باب فناء الدنیا صحیح بخاری ج ۹، ص ۵۸، کتاب الفتن میں بھی اس مفہوم کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ موطا ج ۲، ص ۲۶۱۔ ۲۶۲، حدیث ۳۲ کتاب الجہاد، باب الشہداء فی سبیل اللہ، حدیث ۹۹۵۔

تحریف حقائق میں مؤرخین کا کردار

وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو تاریخ کے اصولوں کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کریں کہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں۔ چنانچہ اس کی تحقیق کرنے کے بعد ترقی کے اسباب کو اپناتی ہیں اور زوال کے اسباب سے پرہیز کرتی ہیں۔

فطرت الٰہی یا سنت الٰہی ہمیشہ یکساں رہتی ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی اور تمام قوموں پر قدرت کے قوانین یکساں لاگو ہوتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے: فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ○ خدا کی سنت میں تم ہرگز تبدیل نہ پاؤ گے اور خدا کی سنت میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔ (سورۂ فاطر: آیت ۴۳)

زندگی ازل سے ایک ہی حقیقت پر قائم ہے اور وہ حقیقت حق و باطل کی جنگ ہے۔ بقول اقبالؔ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

تاریخ میں آپ کو جتنے بھی واقعات نظر آئیں گے وہ حق و باطل کی جنگ سے ہی متعلق ہوں گے۔ ہم تاریخ کی گہرائی میں اتر کر ان کا مطالعہ کرسکتے ہیں اور پھر اُن قوانین کو اپنی روزمرہ زندگی پر نافذ کرسکتے ہیں۔ ہم امت اسلامیہ کی پراگندگی کی وجوہات کا پتا چلا سکتے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں خواہشات و جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے۔

اگر ہم قرآن کے اصولوں کو اپنا حکم بنائیں اور پوری غیرجانبداری سے اپنے مسائل کا تجزیہ کریں اور واقعات کے ظاہری چہروں کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کا پتا چلائیں تو غلط مشاہدے سے نجات حاصل کرسکیں گے اور حقائق کا پتا چلا سکیں گے۔ لہٰذا آیئے نئے سرے سے اس کام کا آغاز کریں اور یہ تصور کریں کہ قرآن ازسرنو ہم پر اتر رہا ہے اور تاریخ کا مطالعہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں کریں اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اُن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ انھوں زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انھوں نے نہیں کیا ہے۔ اُن کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ (سورۂ روم: آیت ۹)

غیر متحرک قومیں تاریخ کے قوانین و تجربات کی شناخت سے عاجز ہوتی ہیں اور وہ تاریخ کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتیں جس کی وجہ سے انھیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

تحریف تاریخ میں حکومتوں کا کردار

انسانیت کے لیے تاریخ ایک صاف شفاف آئینے کی مانند ہے اور وہ ماضی کی تصویر کو بلا کم و کاست دکھاتی ہے۔ تاریخ اختلافات کو جنم نہیں دیتی البتہ تاریخ میں روا رکھی گئی تحریف اور جھوٹ اختلافات کو جنم دیتے ہیں۔

تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ جب وہ غلط سیاست کاروں کے ہاتھ میں آئی تو اس کا حسین چہرہ داغدار بنا دیا گیا اور اس کے نقوش دھندلا دیے گئے۔ جب تاریخ پر یہ ظلم روا رکھا گیا تو لوگوں کی آراء و افکار میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور اگر تاریخ کو اس کی صحیح حالت میں رکھا گیا ہوتا تو حق و باطل واضح صورت میں دکھائی دیتے اور لوگوں میں یہ اختلاف نہ ہوتے۔ ملت اسلامیہ کا المناک افتراق ان انحرافات کا فطری نتیجہ ہے جو تاریخ میں روا رکھے گئے ہیں۔

مؤرخین نے تاریخ پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ کسی جگہ جھوٹ کا پیوند لگایا اور کسی جگہ حقائق کو پوشیدہ رکھا۔ اور یہ سب کچھ حکمرانوں کے اشارے پر ہوتا رہا۔ مؤرخین نے حکمرانوں سے مراعات حاصل کرنے کے لیے واقعات کو غلط رنگ دیا اور کتب اہلبیتؑ پر ناحق تنقید کی اور کتب اہلبیتؑ کو درباری مؤرخین نے کچھ ایسی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا کہ لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام اور ہے اور کتب اہلبیتؑ کچھ اور ہے۔ مؤرخین نے حکمرانوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالا اور جس غلطی کو وہ چھپا نہیں سکے اسے معمولی غلطی بنا کر پیش کیا۔

اسلامی تاریخ ہر دور میں سرکاری قلم سے لکھی گئی۔ کچھ مؤرخین نے حکام کے خوف سے اور کچھ نے لالچ سے مجبور ہو کر حقائق کو مسخ کیا۔ اموی اور عباسی حکمرانوں نے اپنے اپنے ادوار میں اہلبیت طاہرینؑ کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کوشش میں مؤرخین نے اُن کا ساتھ دیا۔ حکام کو اہلبیتؑ سے

اتنی دشمنی تھی کہ جو بھی امام علیؑ اور اہلبیتؑ سے محبت کا اظہار کرتا اُس کا گھر مسمار اور وظیفہ بند کر دیا جاتا۔ معاویہ نے شیعیان علیؑ پر جو مظالم ڈھائے اُس کی مثال نہیں ملتی۔ اُس کا حکم تھا کہ جس پر بھی علیؑ کے شیعہ ہونے کا شبہ ہو اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے اور دور معاویہ میں اہلبیتؑ کے فضائل بیان کرنا ناقابل معافی جرم تھا۔ ائمہ اہلبیتؑ اور اُن کے شیعوں پر جو قیامتیں ٹوٹی ہیں اُس کا ذکر ابو الفرج اصفہانی کی مقاتل الطالبین میں دیکھا جاسکتا ہے۔[1]

جب حالات اتنے خراب ہوں تو کیا مؤرخین آل محمدؐ کے فضائل بیان کرسکتے تھے؟ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت اسلامی نسل در نسل جھوٹ سن سن کر پروان چڑھی اور متاخرین نے متقدمین کی روایات کو آنکھیں بند کرکے تسلیم کیا اور یوں آل محمدؐ اور اُن کے شیعوں کی دشمنی دلوں میں راسخ ہوئی۔ ابن کثیر نے تاریخ کامل میں ۱۴۸ھ کے واقعات کے ضمن میں بس اتنا ہی لکھا ہے کہ اس سال جعفرؑ بن محمد صادقؑ کی وفات ہوئی۔ اسے اپنی کتاب میں امام جعفر صادقؑ کے واقعات لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں ابن کثیر کی اس روش پر ذرا بھی تعجب نہیں ہے کیونکہ اسے آل محمدؐ سے عقیدت ہوتی تو وہ آل محمدؐ کے عظیم امام کا ذکر ضرور کرتا۔ مؤرخین کی تحریف کی بیشمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے ہم چند مثالیں لکھ رہے ہیں۔

مؤرخین نے تاریخ شیعہ کو کس طرح سے پیش کیا؟

۱۔ محمد بن جریر طبری نے شیعیت کا سرچشمہ یہودیت کو قرار دیا اور لکھا کہ یمن کے علاقے صنعاء کے ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے شیعی عقائد کی بنیاد رکھی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے اپنے ایک وہابی دوست سے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ شیعہ یہودی ہیں۔ شیعیت کا بانی عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ پھر جب میں نے کتابوں کا مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ احسان الٰہی ظہیر نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو احسان الٰہی ظہیر کی کتاب الشیعۃ والتشیع میرے سامنے ہے جس میں اُس نے طبری اور دیگر مؤرخین کے سفید جھوٹ نقل کئے ہیں۔

احسان الٰہی ظہیر نے تاریخ طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ

عبداللہ بن سبا صنعاء کا ایک یہودی تھا۔ وہ ایک سیاہ فام عورت کا بیٹا تھا اسی لیے اسے "ابن السوداء" کہا جاتا تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمان ہوا تھا۔ پھر وہ مختلف شہروں میں

۱۔ اس موضوع پر علامہ محمد جواد مغنیہ کی کتاب شیعہ اور حاکمران ملاحظہ کیجئے۔

پھرا اور اُس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ حجاز سے بصرہ اور بصرہ سے کوفہ گیا۔ وہاں سے وہ شام گیا لیکن شام میں اسے کوئی پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ اسے شام سے نکال دیا گیا تو وہ مصر چلا آیا اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ وہ اہل مصر سے کہتا تھا:

"مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ کچھ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ واپس آئیں گے لیکن وہ حضرت محمدؐ کے دوبارہ آنے پر عقیدہ نہیں رکھتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ اے رسول! جس خدا نے آپ پر قرآن کو فرض کیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ضرور واپس پہنچا دے گا۔ (سورۂ قصص آیت ۸۵) حضرت محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کی بہ نسبت رجعت کے زیادہ مستحق ہیں۔ لوگوں نے عبداللہ بن سبا کی اس بات کو قبول کیا۔ اسی نے مسئلہ رجعت وضع کیا اور لوگوں میں اس مسئلے پر بحثیں ہونے لگیں۔ پھر اُس نے کہا کہ ہزارہا پیغمبر آئے ہیں اور ہر پیغمبر کے ساتھ اُس کا وصی ہوتا تھا اور حضرت محمدؐ کے وصی حضرت علیؑ ہیں۔ پھر اُس نے کہا کہ حضرت محمدؐ خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علیؑ خاتم الاوصیاء ہیں۔ وہ آدمی کائنات کا ظالم ترین آدمی ہے جو وصی کو اُس کے منصب سے دور رکھے اور امت کے امور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اُس نے کہا کہ عثمانؓ نے خلافت پر ناحق قبضہ کر رکھا ہے جبکہ علیؑ وصی رسولؐ ہیں۔ لوگو اٹھو۔ عثمانؓ کو ہٹا کر علیؑ کو مسند اقتدار پر بٹھا دو اور یہ کام اس طرح کرو کہ پہلے عثمانؓ کے عاملوں پر الزام لگاؤ اور انھیں خوب بدنام کرو اور اُس کے ساتھ مل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تاکہ لوگ تمہاری طرف مائل ہوں۔ جب دیکھو کہ لوگ تمہاری طرف مائل ہو چکے ہیں تو انھیں حکومت کا تختہ الٹنے کی ترغیب دو۔ پھر اُس نے جگہ جگہ اپنے مبلغ روانہ کیے اور جو لوگ اُس کی تبلیغ سے متاثر تھے اُس نے انھیں خطوط لکھے اور ان خطوط میں بھی یہی لکھا کہ وہ زیر زمین اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن علانیہ طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں اور عاملوں کو بدنام کریں۔ چنانچہ اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو خطوط لکھے مثلاً مصر والوں نے بصرہ والوں کو خطوط لکھے جس میں اپنے عاملوں پر تہمتیں لگائیں اور بصرہ والوں نے کوفہ والوں کو خطوط لکھے اور اپنے عاملوں کا شکوہ کیا اور اس طرح سے بے گناہ عثمانی عاملوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی گئی .. وغیر ذالک من الافتراءات۔

طبری اور اُس کے خوشہ چین افراد نے حقیقت اور محققین کے درمیان ایک دیوار کھڑی کی اور لوگوں نے طبری کے بیانات کو بن دیکھے سچ سمجھ لیا۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ طبری کے ماخذ کا پتا چلاتا۔ مشہور مصری مفکر احمد امین نے فجر الاسلام میں عبداللہ بن سبا کے مفروضے کو یوں پیش کیا ہے گویا وہ کوئی مسلمہ حقیقت ہو اور اُس کی آڑ میں اُس نے شیعوں پر خوب تہمتیں لگائی ہیں۔ موصوف نے اپنی کتاب

کے صفحہ ۲۶۹ پر لکھا کہ " غالی شیعوں نے امام علیؑ کے متعلق اسی قدر اکتفا کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ امام علیؑ کو پیغمبر اسلامؐ کے بعد افضل الخلق اور معصوم سمجھا جائے۔ اس کی بجائے انھوں نے امام علیؑ کو خدا کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان غالی شیعوں میں سے ایک نے یہ کہا: خدا کے ایک جزو نے علیؑ کے اندر حلول کیا اور خدائی اُن کے بدن سے متحد ہوگئی اسی لیے علیؑ غیب جانتے تھے۔"

اس کے بعد احمد امین نے ابن سبا کا افسانہ بیان کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ

" حقیقت یہ ہے کہ آج تک جسے بھی اسلام سے دشمنی تھی یا جو بھی کینے کی وجہ سے اسلام کو نابود کرنے کا خواہشمند تھا یا جو اپنے یہودی، عیسائی، زرتشی اور ہندی عقائد کو اسلام میں لانے کا خواہشمند تھا تو تشیع نے ایسے تمام لوگوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔"

سچ یہ ہے کہ احمد امین نے یہ جملے کسی تحقیق کے بغیر لکھے ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جو رات کے وقت ایندھن جمع کر رہا ہو اور معلوم نہ ہو سکے کہ لکڑیوں کے ساتھ کیا کچھ جمع کر رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم احمد امین کو ملامت نہیں کرتے کیونکہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ اور مؤرخین کے انحراف کی وجہ سے لکھا ہے۔

طبری اور اُس کے خوشہ چین افراد نے شیعیت کو سبائیت کا نام دے کر حقائق سے انحراف کیا اور امت کو گمراہ کیا۔ علمائے شیعہ نے اغیار کی خودساختہ روایات کا بغور جائزہ لیا اور دلائل قاہرہ سے ثابت کیا کہ ابن سبا کا دنیا میں کہیں وجود ہی نہیں تھا اور ابن سبا سے منسوب واقعات سفید جھوٹ ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ سید مرتضیٰ عسکری اعلی اللہ مقامہ نے دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام انھوں نے عبداللہ بن سبا واساطیر اخری رکھا یعنی عبداللہ بن سبا اور دوسرے افسانے۔ اس کتاب میں علامہ موصوف نے ابن سبا کی روایات کی مکمل تحقیق کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس نام کا کوئی شخص حضرت عثمانؓ کے دور میں تھا ہی نہیں۔

ہم تمام دلائل کو یہاں نقل کرنے سے قاصر ہیں لہٰذا صرف چند دلائل نقل کر رہے ہیں۔

یہ افسانہ سیف بن عمر تمیمی کا تراشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ واقعہ کسی دوسرے راوی سے منقول نہیں ہے۔ سیف بن عمر تمیمی نے الفتوح الکبیرۃ والردۃ اور الجمل ومسیرۃ عائشۃ و علی نامی دو کتابیں لکھی تھیں۔

طبری نے سیف بن عمر تمیمی کی دونوں کتابوں سے حوالے نقل کیے ہیں اور انھیں مختلف سالوں کے واقعات کی ترتیب کے تحت لکھا ہے۔ طبری کے بعد ابن عساکر اور ذہبی نے بھی اپنی تاریخ کبیر میں اسی کی کتاب کے حوالے نقل کیے ہیں۔

سیف بن عمر کے متعلق علماء کی آراء

آیئے ابن سبا کے افسانے کے خالق سیف بن عمر کی شخصیت کا جائزہ لیں کہ وہ کیا تھا اور علماء نے اُس کے متعلق کیا رائے پیش کی ہے۔

۱۔ یحیٰی بن معین متوفی ۲۳۳ھ کہتے ہیں۔ "اس کی حدیث ضعیف ہے اور وہ کوڑی کی قیمت بھی نہیں رکھتی۔"

۲۔ ابو داؤد متوفی ۲۷۵ھ کہتے ہیں "وہ لائق اعتبار نہیں۔ وہ کذاب ہے۔"

۳۔ سنن نسائی کے مؤلف نسائی متوفی ۳۰۳ھ کہتے ہیں۔ "وہ ضعیف ہے۔ علماء نے اُس کی حدیث کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ نہ تو قابل اطمینان ہے اور نہ ہی امین ہے۔"

۴۔ ابن حاتم متوفی ۳۲۷ھ کہتے ہیں۔ "اُس کی احادیث علماء کے نزدیک متروک ہیں۔"

۵۔ ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ کہتے ہیں۔ "وہ جھوٹی باتوں کی نسبت قابل اعتماد افراد کی طرف دیتا تھا۔ وہ زندیق تھا۔ اُس کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ وہ حدیثیں بنایا کرتا تھا۔"

۶۔ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ کہتے ہیں۔ "علماء نے اُس کی احادیث کو ترک کر دیا ہے اور اُس پر زندیق کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔"

۷۔ خطیب بغدادی متوفی ۴۰۶ھ کہتے ہیں "علماء کی نظر میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

۸۔ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ نے ابن حبان کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "سیف متروک ہے۔ ہم نے اُس کی پہچان کرانے کے لیے اُس کی احادیث نقل کی ہیں۔"
ابن عبدالبر نے ابن حبان کے اسی قول پر اکتفا کیا ہے اور اپنی کوئی رائے پیش نہیں کی۔

۹۔ فیروز آبادی نے اسے مؤلفین کی صف میں شمار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ بہت سے افراد کے نام لکھ کر کہا ہے کہ وہ سب کے سب ضعیف ہیں۔

۱۰۔ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نے ایک حدیث نقل کی۔ اس میں سیف کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے بعد ابن حجر نے اس کی سند پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی سند میں ضعیف افراد شامل ہیں اور اُن میں ضعیف ترین شخص سیف ہے۔

۱۱۔ صفی الدین متوفی ۹۲۳ھ لکھتے ہیں: علماء نے سیف کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ترمذی نے اس سے صرف ایک حدیث نقل کی ہے۔

محترم قاری! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دسویں صدی تک کے علماء نے سیف بن عمر کو جھوٹا، زندیق، ضعیف اور ناقابل اعتبار لکھا ہے مگر مؤرخین کی سادگی کو کیا کہیے کہ انھوں نے ایک زندیق اور

کذاب شخص کی روایات کو آنکھیں بند کر کے قبول کیا ہے؟!!

دور حاضر کے خود ساختہ محققین نے آخر ایسی واہی تباہی روایات کو کس وجہ سے قبول کیا اور کیا وہ اس کی کوئی علمی توجیہ پیش کر سکتے ہیں؟!!

ابن سبا کے نام کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ کیا اُس کا نام ابن السوداء تھا یا عبداللہ بن سبا تھا۔ جن مؤرخین نے ابن سبا کا تذکرہ کیا ہے وہ اس کے منظرعام پر آنے کے سال کی بھی کوئی خاص وضاحت نہیں کر سکے۔ طبری کے بقول یہ بات پوری طرح سے طے نہیں ہے کہ وہ دور عثمانؓ میں منظرعام پر آیا تھا یا خلافت علیؑ کے زمانے میں جبکہ سعد بن عبداللہ اشعری کے بقول وہ امام علیؑ کی شہادت کے بعد منظرعام پر آیا تھا۔

ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس نظریے کے حامی یہ بتائیں کہ اگر حضرت عثمانؓ کے خلاف ساری تحریک ابن سبا یہودی نے منظم کی تھی تو حضرت عثمانؓ اُس پر کیوں خاموش رہے تھے اور انھوں نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی جبکہ وہ اسے سخت گیر تھے کہ ابوذرؓ، عمارؓ اور ابن مسعودؓ جیسے بزرگ صحابہ کو بھی نہیں بخشتے تھے یا پھر حکومتی ایجنسیاں اتنی نااہل تھیں کہ انھیں حکومت کے سب سے بڑے مخالف کی سرگرمیوں کا پتا ہی نہیں چلا۔

حقیقت میں یہ ساری دروغ بافی شیعوں کو بدنام کرنے کے لیے کی گئی ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں۔ "ابن سبا ایک کاغذی اور فرضی شخص ہے جسے شیعہ دشمنوں نے شیعوں کے خلاف تخلیق کیا۔ یہ آدمی زمین پر کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔"

شیعوں کے وصیت اور عصمت کے عقائد قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔ مخالفین نے شیعوں کو بدنام کرنے کے لیے عبداللہ بن سبا کا کردار تخلیق کیا اور پھر تمام شیعہ عقائد کو اُس کی طرف منسوب کر دیا۔ ابن سبا کے افسانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صحابہ کی تمام غلطیاں پس منظر میں چلی گئیں اور اُن کی تمام تر غلطیاں ابن سبا کے کھاتے میں ڈال دی گئیں۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف صحابہ نے شورش برپا کرائی جس کے نتیجے میں انھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ بعدازاں امام علیؑ کے دور خلافت میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائی گئی جس میں ہزاروں انسان قتل اور لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ صحابہ کے ان تمام کارناموں کو ہضم کرنے کے لیے لوگوں کو کسی قربانی کے بکرے کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو سیف بن عمر نے پورا کیا۔ اُس نے عبداللہ بن سبا کی داستان گھڑ کر جہاں شیعوں کو بدنام کیا وہاں صحابہ کو بھی مسلمانوں کے قتل عام سے بری کر دیا۔

انسانی عقل یہ سمجھنے قاصر ہے کہ یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہونے والے عبداللہ بن سبا نے

اسلامی معاشرے میں اتنا اثر و رسوخ کیسے حاصل کرلیا کہ وہ ایک مذہب کی بنیاد رکھنے اور خلیفہ کو قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک یہودی یہ سب کچھ کرتا رہا اور تمام صحابہ خاموش تماشائی بنے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔[1]

تحریف حقائق کا ایک اور نمونہ

مؤرخین نے جان بوجھ کر امام علیؑ اور اہلبیتؑ کے فضائل کو چھپایا ہے۔ ابن ہشام کی سیرت دراصل سیرت ابن اسحاق سے ماخوذ ہے۔ ابن ہشام اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "کچھ چیزیں ابن اسحاق نے لکھی ہیں لیکن میں نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ ایسی چیزیں جن کے بیان سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور ایسی چیزیں جنھیں سن کر لوگوں کی طبیعت مکدر ہوتی ہے۔"

اس طرح اس نے اپنے آپ کو حقائق کے چھپانے بلکہ دفن کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔ جو چیز لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے اُن میں دعوت ذوالعشیرہ بھی شامل ہے۔ جب خدا نے اپنے رسول پر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کی آیت نازل فرمائی تو رسول خداؐ نے دین کی دعوت پہنچانے کے لیے اپنے قریبی رشتے داروں کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت کو "دعوت ذوالعشیرہ" کہا جاتا ہے۔

طبری نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ اس دعوت میں آنحضرتؐ نے یہ اعلان کیا تھا کہ تم میں سے کوئی ہے جو دین کی تبلیغ میں میری مدد کرے اور جو میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی اور تم میں میرا جانشین ہوگا؟ سب لوگ خاموش رہے۔ صرف امام علیؑ نے کہا: یا رسول اللہؐ! میں آپ کا وزیر ہوں ... رسول خداؐ نے فرمایا کہ یہ میرا بھائی ہے اور تم میں میرا خلیفہ اور جانشین ہے۔ تم اس کی بات سنو اور اس کا حکم مانو۔ دعوت میں شریک افراد ہنستے ہوئے اٹھ گئے اور ابو طالبؑ سے کہنے لگے کہ محمدؐ نے حکم دیا ہے کہ تم اپنے بیٹے کی بات سنو اور اس کا حکم مانو۔[2]

طبری نے اس واقعے کو اپنی تاریخ میں تو لکھ دیا لیکن جب وہ تفسیر لکھنے بیٹھے تو انھوں نے محسوس کیا کہ حضرت علیؑ کو خلیفہ لکھ کر انھوں نے اپنے مذہب کی مخالفت کی ہے۔ انھوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ الفاظ حدیث میں تحریف کردی اور یہ الفاظ لکھے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کون میری مدد کرتا ہے اور جو میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی اور "وہ وہ" ہوگا۔

۱۔ ہم اپنے قاری کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت نیز ملک برکت علی کی کتاب خلافت و ملوکیت کا تقابلی مطالعہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔

۲۔ طبری کے بیان کا خلاصہ ج ۲، ص ۳۱۹ تا ۳۱۷۔

امام علیؑ نے اپنی مدد کا اعلان کیا تو رسول خداؐ نے فرمایا کہ یہ میرا بھائی اور وہ وہ ہے۔ تم اس کی بات کو سنو اور اس کا حکم مانو لے

سوال یہ ہے کہ "کذا و کذا" کا کیا مفہوم ہے؟

لکھنے والا ایک ہی ہے۔ تاریخ میں اُس نے لفظ خلیفہ لکھا لیکن تفسیر میں "کذا و کذا" لکھ کر فرمان مصطفیٰؐ کو مبہم بنا دیا۔ کیا تحریف حقائق اس کے علاوہ کسی اور چیز کو کہا جاتا ہے؟

ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں یہی کچھ کیا ہے۔ جب انھوں نے دعوت ذوالعشیرہ کا ذکر کیا تو انھیں طبری کے الفاظ پسند آئے اور انھوں نے حیا کے تقاضوں کو خیرباد کہا اور امانت علمی سے تہی دامنی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا کہ طبری نے کذا و کذا لکھا ہے۔[۲]

دعوت ذوالعشیرہ سے امام علیؑ کی خلافت ثابت ہوتی ہے۔ اس واقعے کو مؤرخین نے مبہم بنا کر پیش کیا اور فرمان رسولؐ کو حذف کر کے کذا و کذا جیسے بے معنی الفاظ رکھ دیے۔ کیا ایسے خائن افراد پر کوئی شخص بنائی ہوش و حواس بھروسا کر سکتا ہے۔

ابن ہشام شاید طبری کی طرح سے چالاک نہیں تھے اور وہ اس میں تحریف نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے سرے سے تاریخ اسلام کے اس اہم واقعے کو نقل ہی نہیں کیا۔ جب مؤرخ اتنے بددیانت اور خائن ہوں تو اُن کی تاریخوں پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مؤرخین کی خیانت پر خوب توجہ فرمائیں۔

خیانت کا ایک اور نمونہ

تحریف کا ایک اور نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ یہ لوگ کتنے خائن تھے۔

مؤرخین نے ہمیشہ امام علیؑ اور اہلبیت طاہرینؑ کے فضائل کو دانستہ چھپایا اور جو بھی واقعہ خلفاء کی شان کو کم کرنے کا سبب بن سکتا ہے اسے بھی چھپایا۔ دجیل کا واقعہ دیکھئے۔ اس میں دونوں جہتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں امام علیؑ کے فضائل کو بھی چھپایا گیا ہے اور خلفاء کے قبح اعمال پر بھی پردہ ڈالا گیا ہے۔

مؤرخین نے بالخصوص طبری نے اُن خطوط کو چھپایا ہے جن کا تبادلہ محمد بن ابی بکر اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیان ہوا تھا اور اس کے چھپانے کی وجہ یہ تھی کہ ان خطوط میں امام علیؑ کی خلافت کا ثبوت دیا گیا تھا اور دوسرے خلفاء کی خلافت کو غیر آئینی کہا گیا تھا۔

طبری نے دونوں خطوط کی سند کو نقل کیا۔ پھر انھیں نقل کرنے سے معذرت کر لی اور کہا کہ ان

۱۔ تفسیر طبری، مطبوعہ بولاق ج ۱۹، ص ۷۴۔۷۵۔

۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۳، ص۔

خطوط میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جنھیں عوام برداشت نہیں کر سکتے (اسی لیے ہم انھیں نقل کرنے سے قاصر ہیں)۔

اس کے بعد ابن اثیر کی باری آئی تو انھوں نے بھی طبری کی پیروی کی۔ پھر ابن کثیر کی باری آئی تو انھوں نے بھی یہی روش اپنائی اور محمد بن ابی بکر کے خطوط کی طرف اشارہ کیا لیکن خط کے مضمون کو حذف کر دیا اور صرف اتنا لکھا "اس میں ایک طرح کی سختی پائی جاتی ہے۔"

مذکورہ تینوں مؤرخین نے حقائق کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اپنے عمل سے ثابت کیا ہے کہ اُن میں امانت علمی کا فقدان ہے۔ طبری کے ان الفاظ کا آخر کیا مفہوم ہے "عوام خطوط کے متن کو برداشت نہیں کر سکتے؟" کیا اس کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ اگر عوام نے مذکورہ خطوط کے متن کو پڑھ لیا تو وہ خلفاء کی عقیدتمندی سے پھر جائیں گے؟

آیئے دیکھیں کہ وہ خطوط کیا تھے اور اُن کا متن کیا تھا۔ مسعودی کی مروج الذہب میں لکھا ہے کہ

"منجانب محمد بن ابی بکر بنام معاویہ بن صخر گمراہ!

پھر محمد بن ابی بکر نے خط میں رسول اکرمؐ کا نام لیا اور اُن پر درود بھیجا اور لکھا کہ وہ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے۔ سب سے پہلے جس نے اُن کی دعوت قبول کی، اُن پر ایمان لائے، اُن کی تصدیق کی، اسلام لائے اور رسولؐ کے سامنے سراپا تسلیم ہوئے وہ اُن کے بھائی اور اُن کے ابن عم علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔ انھوں نے نبی کی غیب کی خبروں کی تصدیق کی اور ہر دوستی پر ایمان کو ترجیح دی اور ہر خطرے کے موقع پر اپنے آپ کو اُن کی ڈھال بنایا اور اُس کی جگہوں میں جنگ کی اور اُس کی صلح میں صلح کی۔ علیؑ کی کوئی مثال نہیں ہے۔ میں علیؑ کی پیروی کرتا ہوں اگرچہ میں اُن جیسا نہیں ہو سکتا۔ میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو ان سے جنگ کر رہا ہے جبکہ تو تو ہے اور وہ وہ ہے۔ علیؑ کی نیت تمام لوگوں کی نیت سے زیادہ سچی ہے۔ اُس کی اولاد تمام لوگوں کی اولاد سے افضل ہے اور علیؑ کی زوجہ تمام لوگوں کی ازواج سے افضل ہے ... تو ملعون ہے اور ملعون کا بیٹا ہے۔ تو نے اور تیرے باپ نے ہمیشہ گمراہی کو رواج دیا ہے اور تم لوگوں نے خدا کے نور کو بجھانے کی کوششیں کی ہیں اور اس مقصد کے لیے تم نے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کیا اور دولت خرچ کی اور قبائل کو ان کے خلاف متحرک کیا یہاں تک کہ تیرا باپ مر گیا اور تو اُس کے راستے پر چلنے لگا۔ (اس کے بعد محمد بن ابی بکر نے امام علیؑ کے مددگاروں اور پیروکاروں کو شمار کیا اور یہ لکھا) انھیں علیؑ کی پیروی میں حق دکھائی دیتا ہے اور ان کی مخالفت میں بدبختی دکھائی دیتی ہے۔ تجھ پر افسوس! تو اپنے آپ کو علیؑ کے برابر کیسے سمجھ سکتا ہے؟ جبکہ علیؑ تو وارث پیغمبرؐ اور وصی رسولؐ ہیں اور نبی کے بیٹوں کے باپ ہیں۔ علیؑ وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے نبی کی

پیروی کی تھی اور تمام لوگوں کی بہ نسبت علیؑ ہی سے زیادہ قریب ہیں۔ علیؑ اسرار پیغمبرؐ سے آگاہ اور اُن کے کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس تو پیغمبرؐ کا دشمن اور دشمن رسولؐ کا بیٹا ہے۔ اس دنیا میں تو باطل سے جس قدر لطف اندوز ہوسکتا ہے لطف اٹھا لے۔ عاص کا بیٹا تیری گمراہی میں مزید اضافہ کرے گا۔ یوں لگتا ہے جیسے تیری موت آنے کو ہے اور تیری تمام عیاریاں کمزور پڑنے کو ہیں۔ اس کے بعد تجھے پتا چلے گا کہ انجام کار کس کا بہتر ہے۔ تو کب تک خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے گا اور تو کب تک اپنے آپ کو تدبیر خداوندی سے امان میں سمجھتا رہے گا۔ یقیناً تو خدا کی رحمت سے ناامید ہے۔ جان لے کہ خدا تیری گھات میں ہے جبکہ تو اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی. سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔[1]

اس خط کے جواب میں جو کچھ معاویہ نے لکھا اسے ہم اختصار سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

معاویہ بن صخر کی طرف سے اپنے باپ کو ملامت کرنے والے محمد بن ابی بکر کے نام ..

تم نے اپنے خط میں فرزند ابو طالب کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے دیرینہ سوابق اور رسول خداؐ سے اس کی رشتے داری اور ہر خوف خطرے کے مقام پر اُس کی مدد کا تذکرہ کیا ہے۔ تم نے جس چیز کی وجہ سے میرے خلاف دلیل دی ہے اور میرے عیب جان گئے ہیں اس کا تعلق کسی اور کی فضیلت سے ہے۔ وہ فضیلت تم میں نہیں پائی جاتی۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے یہ فضائل تم سے سلب کیے ہیں کسی اور کو عطا کیے ہیں۔

ہم اور ہمارے ساتھ تمہارا باپ بھی تھا۔ وہ ابو طالب کے فرزند کی فضیلت کو جانتے تھے اور اُس کے حق کو اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے اپنے پیغمبر کو اپنی نعمتوں کی طرف بلا لیا اور اُن سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ اُن کی دعوت کو غلبہ دیا اور ان کی دلیل کو آشکارا کیا اور پھر انھیں اپنی طرف بلا لیا۔

اس کے بعد تمہارے باپ اور تمہارے باپ کے بعد فاروق ہی وہ پہلے افراد تھے جنھوں نے علیؑ کے حق کو غصب کیا تھا اور اُس کی مخالفت کی تھی اور اس معاملے میں دونوں میں مکمل اتفاق اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ پھر ان دونوں نے اسے اپنی بیعت کی دعوت دی لیکن اس نے انکار کیا اور اُن سے کچھ فاصلہ رکھا۔ لیکن وہ اس پر حملہ کرنے کے ارادے کرنے لگ گئے اور انھوں نے اس کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ پھر اُس نے آخرکار ان کی بیعت کر لی اور اُن کے معاملات کو تسلیم کر لیا لیکن

۱۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۳، ص ۱۱۔۱۲۔

انھوں نے کبھی بھی اسے اپنے کسی کام میں شریک نہیں کیا تھا اور اپنے راز اس سے نہیں کہے تھے یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

تمہارا باپ ہی وہ شخص تھا جس نے یہ راستا ہموار کیا تھا اور اُس نے اپنی حکومت کی بنا ڈالی تھی۔ اب اگر تمہاری یہ بات درست ہے تو پھر تمہارے باپ نے ہی خلافت پر ناحق قبضہ کیا تھا اور ہم اس کام میں اس کے شریک تھے۔ اگر اس دن تمہارے باپ نے یہ کام نہ کیا ہوتا تو ہم بھی فرزند ابو طالب کی مخالفت نہ کرتے اور حکومت اُس کے حوالے کر دیتے لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ تمہارے باپ نے اُس سے یہ سلوک کیا تھا تو ہم نے بھی اُس سے ویسا ہی سلوک کیا جو تمہارے باپ نے کیا تھا۔ اب جتنا چاہو اپنے باپ کی عیب جوئی کرو اور اگر باپ کی عیب جوئی منظور نہ ہو تو ایسی باتوں سے باز آجاؤ۔

سلام ہو اُس پر جو خدا کی طرف رجوع کرے۔[1]

مروج الذہب کی گواہی سے ہمیں یہ پتا چلا کہ طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر نے خطوط کا متن لکھنا مناسب کیوں نہیں سمجھا تھا۔ اُس کی اول و آخر وجہ یہی تھی کہ ان خطوط سے امام علیؑ کی خلافت ثابت ہوتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ معاویہ نے بھی اپنے جوابی خط میں امام علیؑ کی حقانیت کا اعتراف کیا البتہ اُس نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ ابوبکرؓ کی روش کو جاری رکھے ہوئے ہے اور اسی وجہ سے اس نے محمد بن ابی بکر کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر نے اگرچہ ان خطوط کو مخفی رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی محمد بن ابی بکر اور معاویہ کے خطوط کے متن کو ظاہر کر دیا ہے اور اہل باطل کو رسوا کیا ہے۔

مؤرخین کی دروغ گوئی اور تحریف حقائق کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں لیکن ہم کتاب کے حجم میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے اسی لیے صرف انہی مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر بابصیرت انسان اس طرح کی خیانتوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے البتہ یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے کہ مؤرخین نے اپنی تحریفات کو پوری طرح سے مخفی نہیں رکھا۔ انھوں نے کچھ ایسے قدموں کے نشان ضرور چھوڑے ہیں اگر اُن کی جستجو کی جائے تو انسان حقیقت کو پانے میں کامیاب ہو سکتا ہے مثلاً طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ سے توہین آمیز سلوک کیا اور انھیں شام بھیجا۔ پھر معاویہ نے انھیں شام سے جس طرح مدینہ بھیجا تھا اُس کے متعلق طبری نے لکھا ہے:

ابوذرؓ کی شام سے واپسی کے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں جن کا بیان کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

طبری کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کھل کر حقائق میں تحریف کر رہا ہے اور واقعات کو چھپا رہا ہے۔

۱۔ مروج الذہب ج ۳، ص ۱۲۔۱۳

تحریف حقائق میں محدثین کا کردار

حکومت کی خواہش پر محدثین نے حقائق میں تحریف کیسے کی اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن ان تمام معروضات سے پہلے ہم شیعی نظریہ بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ ایک حاکم اور معصوم امام ہونا چاہیے جو خدا کی شریعت کی حفاظت کرے اور شرعی قواعد کو استحکام عطا کرے۔ حاکم اگر غیر معصوم ہوگا تو وہ دین کے نام پر اپنے مفادات کا تحفظ کرے گا اور اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے حدیث میں تبدیلی کرائے گا اور غیر معصوم حاکم سے تو اس امر کی بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ اسے حدیث سے اتنی دشمنی ہو کہ وہ حدیث کی اشاعت پر پابندیاں لگا دے اور صدر اسلام کے خلفاء کی طرح سے احادیث کے مجموعے نذر آتش کرادے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چند حکمرانوں نے دیکھا کہ اگر حدیث پر پابندی عائد نہ کی گئی تو اُن کا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا چنانچہ انھوں نے نقل حدیث پر پابندی عائد کر دی اور حدیث کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا اور صحابہ پر پابندی عائد کر دی کہ وہ مدینہ سے باہر نہ جائیں۔

اس پابندی کا مقصد یہی تھا کہ اگر صحابہ کو باہر جانے کی اجازت دیدی گئی تو یہ جہاں بھی جائیں گے وہاں احادیث بیان کریں گے اور جب احادیث بیان ہوں گی تو وہاں فضائل علیؑ اور مناقب اہلبیتؑ کی احادیث بھی یقیناً بیان ہوں گی اور جب عوام آل محمدؐ کے فضائل سنیں گے تو وہ آل محمدؐ کے عقیدت مند بن جائیں گے اور عوام کی اس عقیدت مندی کی وجہ سے حکمرانوں کو اپنا بوریا بستر سمٹتا دکھائی دیتا تھا۔

امام علیؑ نے اس سلسلے میں فرمایا، "مجھ سے پہلے حکمرانوں نے رسول خداؐ کے احکام کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کی تھی۔ انھوں نے عہد پیغمبرؐ کو توڑا اور سنت پیغمبرؐ کو بدل دیا۔"

یہاں ہم امام علیؑ سے پہلے دور کے حکمرانوں کے رویوں پر بحث کرنا نہیں چاہتے ہم اسی ایک اشارے پر ہی فی الحال اکتفا کرتے ہیں۔ اس وقت ہماری بحث کا تعلق تدوین حدیث کے عہد سے ہے جسے اہلسنت حدیث کا سنہری دور کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی عرض کریں گے معاویہ بن ابو سفیان نے جھوٹی احادیث کو کیونکر اختراع کرایا تھا اور فضائل اہلبیتؑ کو کس طرح سے چھپایا تھا؟ [1]

عہد معاویہ میں حدیث پر کیا گزری؟

عہد معاویہ میں حدیث کی سرگزشت جاننے کے لیے کتاب الاحداث سے مدائنی کا قول

۱۔ علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی احادیث دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار مطبوعہ مجمع علمی اسلامی اور علامہ ہاشم معروف حسنی کی تاریخ فقہ جعفری مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی اس موضوع پر قابل مطالعہ کتابیں ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے۔ معاویہ نے عام الجماعت[1] لے کے بعد اپنے تمام حکام کے نام ایک خط بھیجا جس میں اس نے لکھا: "جو بھی ابو تراب اور اس کے خاندان کی فضیلت میں کوئی روایت بیان کرے گا میں اپنے آپ کو اس سے بری سمجھتا ہوں۔"

اس حکم کے بعد خطیبوں نے منبروں پر امام علیؑ پر لعنت کرنا شروع کی اور امام علیؑ اور اُن کے خاندان پر دشنام طرازی کو شعار بنالیا۔ یہ موقع اہل کوفہ کی آزمائش کا تھا کیونکہ شیعیان علیؑ کی اکثریت کوفہ میں رہائش پذیر تھی۔

معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا اور بصرہ بھی اسی کے انتظام میں دے دیا۔ زیاد کچھ عرصے تک امام علیؑ کا پیروکار رہا تھا اسی لیے وہ تمام شیعیان علیؑ کو اچھی طرح سے جانتا پہچانتا تھا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شیعوں کا قتل عام کیا۔ زیاد کے ان اقدامات کی وجہ سے شیعہ گھبرا گئے۔ زیاد نے شیعیان علیؑ کے ہاتھ پاؤں کٹوائے اور اُن کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا کر انھیں نابینا کیا اور درختوں کے تنوں پر صلیب پر لٹکایا۔ اس طرح کے اقدامات کرکے اُس نے شیعوں کو عراق سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد عراق میں شیعوں کی کوئی مشہور اور قابل ذکر شخصیت باقی نہ رہی۔

معاویہ نے اپنے حکام کے نام ایک اور حکم نامہ بھیجا جس میں لکھا تھا علیؑ اور اُس کے خاندان کے کسی پیروکار کی گواہی قبول نہ کرو اور اس کے برعکس عثمانؓ کے دوستوں، مددگاروں اور اُس کے راویاں فضائل کی خوب قدردانی کرو اور انھیں اپنے دربار میں عزت دو اور یہ لوگ جو روایت کریں وہ روایت لکھ کر میرے پاس بھیج دو اور راوی کا نام، نسب، قوم اور شہر وغیرہ لکھ کر بھیجو۔ اس حکم کے بعد لوگوں نے فضائل عثمانؓ کے لیے حدیثیں گھڑنا شروع کر دیں۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں فضائل عثمانؓ کی احادیث تیار ہونے لگیں اور حکام ان احادیث کو معاویہ کے پاس بھیجنے میں مصروف ہو گئے۔

حدیث گھڑنے والوں کے لیے شام سے دولت، خلعتیں، زیورات اور زمینوں کے کاغذات آنے لگے اور اُس کے ساتھ ساتھ حکام کو تاکید کی گئی کہ ان لوگوں کی عزت افزائی اور قدر دانی کی جائے۔ الغرض پوری مملکت اس فتنے میں مبتلا ہو گئی اور لوگ حصول دنیا کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ لوگ سرکاری حکام کے پاس جاتے اور فضائل عثمانؓ کی حدیثیں بیان کرتے۔ حکام ان کا نام اپنے رجسٹر میں لکھ لیتے اور اسے اپنے قرب سے نوازتے تھے۔ چنانچہ کئی برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۔ عام الجماعۃ سے مراد ۴۱ھ ہے جب تمام بلاد اسلامی پر معاویہ کی حکومت ہو گئی۔ اس سال کو عام الجماعۃ اس لئے کہتے ہیں کہ سب نے معاویہ کی بیعت پر اتفاق کیا اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ چنانچہ معاویہ نے اپنے پیروکاروں کا نام نفلست والجماعۃ رکھا تھا اور اسی مناسبت سے اس سال کو عام الجماعۃ کا نام دیا گیا۔
مولانا مودودی نے خلافت وملوکیت میں ربیع الاول ۴۱ھ کو عام الجماعۃ لکھا ہے۔ (رضوانی)

مدائنی لکھتے ہیں، اس کے بعد معاویہ نے ایک اور سرکاری حکم جاری کیا جس میں لکھا تھا کہ عثمانؓ کے فضائل کی احادیث بہت زیادہ ہوگئی ہیں اور آج ان احادیث سے تمام شہر اور دیہات گونج رہے ہیں۔ جیسے ہی میرا یہ خط تمھیں ملے تم لوگوں کو حکم دو کہ وہ صحابہ کے فضائل کی احادیث بنائیں اور خاص طور پر پہلے دونوں خلفاء کے فضائل کی احادیث وضع کریں۔ ہاں خیال رکھنا اگر کوئی مسلمان علیؑ کے حق میں کوئی حدیث بیان کرے تو تم اس جیسی حدیث صحابہ کے متعلق تیار کراؤ کیونکہ اس سے ابوتراب اور اُس کے شیعوں کی حقانیت کمزور دکھائی دینے لگے گی اور تمہاری یہ روش مناقب عثمانؓ سے بھی زیادہ مؤثر ہوگی اور میرے دل کو خوش کرے گی۔

مدائنی لکھتے ہیں کہ حکام نے لوگوں کو معاویہ کا خط پڑھ کر سنایا تو اُس کے بعد شان صحابہ کی جھوٹی احادیث کو فروغ ملا۔ لوگوں نے جھوٹی احادیث بنانے کو روزی روٹی کا ذریعہ بنالیا۔ آخرکار یہ خودساختہ روایات منبروں پر بیان ہونے لگیں اور مدارس و مکاتب میں بچوں اور جوانوں کو پڑھائی جانے لگیں۔ مدارس میں طالب علموں کو کہا جاتا کہ تم ان احادیث کو زبانی یاد کرلو۔ لوگوں نے ان روایات کو قرآن کی مانند پڑھا اور حفظ کیا اور لوگوں نے اپنے گھروں میں اپنی اولاد اور بہو بیٹیوں اور نوکروں کو اُن کی تعلیم دی۔ کچھ عرصے تک یہ حالت قائم رہی۔

مدائنی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد معاویہ نے اپنے حکام کو ایک اور خط میں لکھا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ علیؑ اور اُس کے خاندان سے محبت رکھتا ہے تو بیت المال کے رجسٹر سے اُس کا نام کاٹ دو اور اسے وظیفے سے محروم کردو۔ پھر معاویہ نے ایک اور خط میں لکھا کہ جس پر بھی اہلبیتؑ کی دوستی کا شبہ ہو اُس پر سختی کرو اور اُس کا گھر ڈھا دو۔

معاویہ کے ان احکام کی وجہ سے اہل عراق بالعموم اور اہل کوفہ کی آزمائش میں بالخصوص اضافہ ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی شیعہ کو دوسرے قابل اعتماد شیعہ سے گفتگو کرنا ہوتی تو وہ علی الاعلان گفتگو نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر میں بلاتا اور تنہائی میں باتیں کرتا تھا۔ شیعہ اتنے مظلوم بنا دیے گئے کہ وہ اپنے نوکروں اور غلاموں سے ڈرنے لگے اور اگر انھوں نے کسی کے سامنے حدیث کہنا ہوتی تو حدیث سے پہلے کئی بار قسم دیتے تھے کہ اسے میری زندگی میں افشا نہ کرنا۔ اس طرح سے جعلی احادیث کو لوگوں میں فروغ ملا اور فقہاء اور قاضی اور امراء جعلی احادیث کی بنیادوں پر فیصلے کرتے تھے۔ اس وقت دین کو سب سے زیادہ نقصان ریاکار قاریوں اور عبادت گزاروں نے پہنچایا۔ یہ لوگ بظاہر عبادت میں معروف رہتے تھے اور اس کے ساتھ وہ جعلی احادیث کا دھندہ کرتے تھے تاکہ اس طرح سے انھیں حکام کا قرب حاصل ہو اور اُن کے دربار میں جگہ ملے۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ جعلی احادیث کے ذریعے سے

حکام سے رزمین اور جائیداد حاصل کریں۔

وہ دیندار افراد جو جھوٹ اور بہتان کو ناپسند کرتے تھے جب انھوں نے ان ریاکار عبادت گزاروں سے جھوٹی احادیث سنیں تو وہ اُن کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے اور انھوں نے اُن روایات کو قبول کرلیا کیونکہ انھوں نے سمجھا کہ یہ روایات سچی ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ روایات جعلی ہیں تو وہ ان کو قبول نہ کرتے نیز اسے بیان نہ کرتے اور نہ اُس پر عمل کرتے۔[1]

اب ہم اُس خطرناک سازش کی طرف آتے ہیں جس کے تحت حقائق میں تحریف کی گئی اور رسول خداؐ پر جھوٹ باندھنا جائز قرار پایا۔ حدیث میں جھوٹ کو فروغ دینے کی بنیاد معاویہ نے رکھی تھی۔ اسے امام علیؑ اور آپ کے شیعوں سے سخت عداوت تھی اس لیے معاویہ نے اپنی تمام تر قوت اسی کام پر صرف کی تھی۔ اُس نے پہلے مرحلے میں یہ حکم دیا کہ کوئی بھی امام علیؑ کی فضیلت بیان نہ کرنے پائے اور تمام مبروں پر خطبات جمعہ وعیدین کے اختتام پر ابوتراب پر لعنت کی جائے۔ چنانچہ معاویہ نے لعنت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ۸۰ سال[2] تک جاری رہا۔

دوسرے مرحلے پر معاویہ نے صحابہ کو تقدس کا پیراہن پہنایا تاکہ امام علیؑ کی بجائے وہ مظہر فضائل معلوم ہوں اور ہوس زر میں منافقین نے جھوٹی احادیث بنائیں۔

(ابن ابی الحدید کے استاد) ابوجعفر اسکافی لکھتے ہیں کہ معاویہ نے صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اس کام پر لگا رکھی تھی کہ وہ امام علیؑ کی مذمت میں روایات بنائیں تاکہ لوگ اُن سے نفرت کریں اور اس کام کے لیے وہ اُن لوگوں کو بھاری معاوضہ دیتا تھا۔

معاویہ کے لیے حدیث سازی کرنے والوں میں ابوہریرہ، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ اور تابعین میں سے عروہ بن زبیر سرفہرست تھے۔[3] یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کمائی تھی۔ ابوہریرہ کے متعلق ابومحمد سلیمان بن مہران کوفی ۶۰ھ۔ ۱۴۷ھ کی رائے ملاحظہ فرمائیں جو اعمش کے نام سے مشہور ہیں۔

اعمش بیان کرتے ہیں کہ عام الجماعۃ میں معاویہ عراق آیا اور ابوہریرہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ معاویہ مسجد کوفہ پہنچا تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد اُس کے استقبال کے لیے جمع ہوگئی۔ جب ابوہریرہ نے

۱۔ تذکرات فی الصحیحین ص ۴۲۔۴۳۔

۲۔ مولانا شبلی نعمانی سیرت النبیؐ (جلد ۱، صفحہ ۶۹ مطبوعہ لاہور) میں لکھتے ہیں۔ حدیثوں کی تدوین بنی امیہ کے زمانے میں ہوئی جنھوں نے پورے ۹۰ سال تک منبر سے اشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہؑ کی توہین کی اور جمعہ میں برسرمنبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ بیکنوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنائیں۔ (رضوانی)

۳۔ علامہ محمود ابوریہ مصری، ابوہریرہ ص ۲۳۶۔

استقبال کرنے والوں کا ہجوم دیکھا تو دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور کئی بار اپنے گنجے سر پر ہاتھ مارا اور کہا اے اہل عراق! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ باندھتا ہوں اور اپنے آپ کو دوزخ کا ایندھن بنانا چاہتا ہوں؟" خدا کی قسم! میں نے رسول خداؐ سے سنا تھا آپ نے فرمایا کہ ہر پیغمبر کا ایک حرم ہوتا ہے اور مدینہ میرا حرم ہے۔ اس کی حدود عیر و ثور[1] تک ہے۔ جو کوئی اس میں بدعت ایجاد کرے اس پر خدا، ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ علیؑ نے اس حد میں بدعات ایجاد کی ہیں۔"

جب معاویہ نے ابو ہریرہ کی خودساختہ یہ حدیث سنی تو نہال ہو کر ابو ہریرہ کو انعام دیا اور مدینہ کا گورنر بنا دیا۔[2]

معاویہ نے سمرۃ بن جندب سے کہا کہ میں تمہیں ایک لاکھ درہم دیتا ہوں۔ تم یہ روایت بناؤ کہ یہ آیت علیؑ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ○ لوگوں میں وہ بھی تو ہے جس کی باتیں تم کو دنیا کی زندگی میں دلکش معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ بدترین دشمن ہے۔ اور جب وہ حکومت حاصل کرے گا تو زمین میں فتنہ برپا کرے گا، کھیتی کو برباد اور نسل کو نابود کرے گا جبکہ اللہ فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۴۔۲۰۵) اور اس کے ساتھ یہ بیان کرو کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۔ عبدالرحمن ابن ملجم کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

سمرۃ نے معاویہ کی پیشکش ٹھکرا دی۔ معاویہ نے بولی بڑھائی اور کہا کہ میں تجھے دو لاکھ درہم دوں گا مگر سمرۃ نے قبول نہ کیا۔ آخر چار لاکھ درہم میں جا کر بات بنی۔[3]

آیئے دیکھیں کہ چار لاکھ درہم میں ضمیر بیچنے والا کون تھا؟

طبری لکھتے ہیں کہ ابن سیرین سے پوچھا گیا کہ کیا سمرۃ بن جندب نے بھی کسی کو ناحق قتل کیا تھا؟ ابن سیرین نے کہا کیا اس کے مقتول بھی شمار کے قابل ہیں؟ زیاد اسے بصرہ کا والی بنا خود کوفہ چلا گیا۔ جب زیاد بصرہ واپس آیا تو اس وقت تک سمرۃ آٹھ ہزار افراد کو قتل کر چکا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے

۱۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حدیث بیان کرنے میں راوی کو اشتباہ ہوا ہے کیونکہ "ثور" نامی پہاڑ مکہ میں ہے۔ صحیح الفاظ یہ ہیں کہ میرے حرم کی حدود "عیر سے احد" تک پھیلی ہوئی ہیں۔

۲۔ علامہ سید مرتضیٰ عسکری، احادیث ام المومنین عائشہ ص ۲۰۴۔۲۰۵۔ ۳۔ ایضاً ص ۲۰۰۔

کہ اس نے ایک دن سینتالیس قاریان قرآن کو ذبح کیا تھا۔[1]

ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ شیعیان علیؑ کے سوا کوئی اور نہ تھے۔

طبری لکھتے ہیں کہ جب زیاد مرا تو اس وقت سمرۃ بن جندب بصرہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے چند ماہ تک اسے برقرار رکھا پھر معزول کر دیا۔ سمرۃ نے کہا کہ معاویہ پر خدا کی لعنت ہو۔ میں نے معاویہ کی جتنی اطاعت کی ہے اگر اتنی اطاعت خدا کی کرتا تو وہ مجھے کبھی عذاب نہ دیتا۔[2]

مغیرہ بن شعبہ نے واضح اقرار کیا تھا کہ معاویہ کی طرف سے سخت حکم ہے کہ علیؑ کا شکوہ کیا جائے۔ طبری لکھتے ہیں کہ معاویہ نے جب مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا اور وہ کوفہ آیا تو اس نے (امام علیؑ کے مشہور شیعہ) مصقلہ بن ہبیرہ عبدی سے کہا کہ خبردار میں یہ کبھی نہ سنوں کہ تو نے عثمانؓ کی بدگوئی کی ہے اور نہ یہ سنوں کہ تو نے علی الاعلان علیؑ کے فضائل بیان کئے ہیں۔ فضیلت علیؑ کے متعلق جو کچھ تم جانتے ہو، میں بھی جانتا ہوں بلکہ تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن ہمیں ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے علیؑ کی بدگوئی کریں۔ ہم اس کے بہت سے احکامات پر عمل نہیں کرتے لیکن جن پر عمل ضروری ہے ان باتوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہم ان احکام پر تقیہ کرتے ہیں۔ ہاں اگر تم علیؑ کے فضائل بیان کرنا چاہو تو اپنے دوستوں کی محفل میں اور وہ بھی گھر میں چھپ چھپا کر بیان کرو۔ مسجد میں علیؑ کی فضیلت بیان کرنے کی جسارت نہ کرنا کیونکہ بادشاہ اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا اور وہ ہمیں معاف نہیں کرے گا۔[3]

صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے معاویہ کے ڈر سے اس کی تائید کی تھی اور جس نے معاویہ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تو وہ حجر بن عدی اور میثم تمار کی طرح شہید ہوا۔

دور معاویہ میں صحابہ کے فضائل و شجاعت کے متعلق ہزاروں جھوٹی احادیث بنائی گئیں اور خلفائے ثلاثہ کی فضیلت میں تو احادیث کے ڈھیر لگ گئے۔ معاویہ کے لگائے ہوئی احادیث نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں اور یہ جھوٹ اس تسلسل سے بولا گیا کہ لوگ اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ ذیل میں ہم اس طرح کی چند جھوٹی احادیث پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو اس سے زیادہ جھوٹی احادیث پڑھنے کا شوق ہو تو وہ علامہ امینی کی کتاب الغدیر کی ساتویں، آٹھویں اور نویں جلد کا مطالعہ کرے۔

(۱) سورج حضرت ابوبکرؓ کا واسطہ دیتا ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا کہ شب معراج تمام چیزیں

۱۔ تاریخ طبری، حوادث ۵۰ھ ج ۵، ص ۲۳۶۔ تاریخ ابن اثیر ج ۳، ص ۴۶۲۔

۲۔ تاریخ طبری، حوادث ۵۳ھ ج ۵، ص ۲۹۱۔ تاریخ ابن اثیر ج ۳، ص ۴۹۵۔

۳۔ تاریخ طبری، حوادث ۴۱ھ ج ۵، ص ۱۸۱۔

یہاں تک کہ سورج بھی میرا دیدار کرنے کے لیے آیا۔ میں نے اسے سلام کیا اور اس سے سورج گرہن کے متعلق پوچھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے گویائی بخشی تو اس نے مجھ سے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک ملک میں قرار دیا ہے جو اس کے ارادے کے تحت حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی مجھ میں احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ جاتا ہوں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ملک مجھے ایک سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہاں مجھے دو افراد دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک اَحَد، اَحَد (یکتا، یکتا) کہہ رہا ہوتا ہے اور دوسرا صدق، صدق (اس نے سچ کہا، اس نے سچ کہا) کہہ رہا ہوتا ہے۔ میں خدا کو ان دونوں کا واسطہ دیتا ہوں تو خدا مجھے گرہن سے نکال لیتا ہے۔ اس وقت میں خدا سے پوچھتا ہوں کہ یہ بزرگوار کون ہیں؟ خدا کی آواز آتی ہے کہ جو ان میں سے "احد، احد" کہہ رہا ہے وہ میرا حبیب محمدؐ ہے اور جو "صدق، صدق" کہہ رہا ہے وہ ابوبکرؓ ہے۔[1]

(۲) شب معراج آواز یار: جب رسول خداؐ شب معراج مقام قاب قوسین پر پہنچے تو آپ پر تنہائی کا شدید غلبہ ہوا۔ خدا نے آپ کو ابوبکرؓ کی آواز سنائی تو آپ کے دل کو قرار آ گیا اور آپ اپنے دوست کی آواز سے مانوس ہو گئے۔[2]

(۳) قرآن میں حرف الف ابوبکرؓ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی شان میں قرآن کی بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں لیکن ہم یہاں ایک روایت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

الٓمٓ ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ الٓمٓ کے اندر الف ابوبکرؓ ہیں، لام اللہ ہے اور میم محمدؐ ہیں۔[3]

اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلینؑ کو جتنے بھی فضائل عطا کئے ہیں ان میں سے ایک حصہ ابوبکرؓ کو ضرور دیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے فضائل تو ماشاء اللہ اتنے زیادہ ہیں کہ آپ جو چاہیں کہتے جائیں۔

ہم یہاں ان کی ولایت تکوینی کی صرف دو روایات نقل کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر رازی میں ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں زلزلہ آیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنا کوڑا زمین پر مارا اور کہا خدا کے حکم سے ساکن ہو جا۔ زلزلہ فوراً رک گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک مدینہ میں دوبارہ زلزلہ نہیں آیا۔

۱۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۷، ص ۲۸۸ بحوالہ نزھۃ المجالس ص ۲۳۲۔

۲۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۷، ص ۲۹۳ بحوالہ عمدۃ التحقیق ص ۲۳۰ عبیدی مالکی۔ مالکی نے لکھا ہے کہ صدیق کی یہ کرامت اس کتاب کے مؤلف کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳۔ علامہ امینی، الغدیر ج ۸، ص ۲۹ بحوالہ عمدۃ التحقیق ص ۲۲۸ عبیدی مالکی۔

۲۔ روایات میں ہے کہ مدینہ کے کچھ گھروں میں آگ لگ گئی۔ حضرت عمرؓ نے کپڑے کے ایک ٹکڑے پر یہ الفاظ لکھے اے آگ! خدا کے حکم سے رک جا۔
حضرت عمرؓ کا لکھا ہوا ٹکڑا آگ میں ڈالا گیا تو آگ فوراً بجھ گئی۔

محدثین اور حقیقت پوشی

محدثین نے طرح طرح سے حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اور ان کی کتابوں میں ان کا تعصب جھلکتا ہے۔ امام علیؑ کی فضیلت میں جو حدیث ان کو ملی اسے انھوں نے ایسا گنجلک بنا دیا کہ حقیقت ہی واضح نہیں ہوتی۔ نیز انھوں نے ان احادیث کے سخت لفظوں کو نرم لفظوں میں بدلا جس کی زد ان کے ممدوح افراد پر پڑ رہی تھی تاکہ ان نازک آبگینوں کو چوٹ نہ لگے۔
ذیل میں ہم اس طرح کی خیانت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جائے گی۔

پہلا نمونہ

معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کا ارادہ کیا تو عامل مدینہ مروان بن حکم کو لکھا کہ تم اہل مدینہ سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے مسجد نبوی میں یہ تقریر کی:
"امیرالمومنین (معاویہ) نے اختیار کار تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اور وہ تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے فرزند یزید کا انتخاب کرو۔"
اس وقت مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے فرزند عبدالرحمٰن بھی موجود تھے۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور کھڑے ہو کر بولے "مروان! خدا کی قسم! تو جھوٹ بولتا ہے۔ تم لوگ تو امت محمدؐ کو اختیار دینے کے قائل ہی نہیں ہو۔ تم نے یہاں قیصر کی روش اپنائی ہوئی ہے۔ ایک قیصر مرتا ہے تو دوسرا قیصر اس کا جانشین بن جاتا ہے۔"
مروان نے کہا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے: وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَا یعنی وہ جس نے اپنے والدین سے کہا تھا کہ تم پر اُف ہو۔ (سورۂ احقاف آیت ۱۷)
حضرت عائشہؓ اپنے حجرے میں بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور بلند آواز سے مروان سے بولیں۔ اے مروان! اے مروان! لوگ خاموش ہو گئے اور مروان بھی آواز کی سمت متوجہ ہوا۔ اس وقت بی بی عائشہؓ نے کہا کہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن کے متعلق نازل ہوئی۔

خدا کی قسم! یہ آیت اس کے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ اس آیت کا تعلق فلاں بن فلاں سے ہے جو لعنت کا حقدار ہے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ بی بی عائشہؓ نے کہا: خدا کی قسم! تو جھوٹ بولتا ہے۔ یہ آیت اس کے متعلق نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ نے مروان کے باپ پر اس وقت لعنت کی تھی جب مروان اس کی پشت میں تھا اور اسی لعنت خدا سے مروان کی پرورش ہوئی ہے۔[1]

اس روایت میں معاویہ اور مروان کی توہین پائی جاتی ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ بخاری نے معاویہ کو کس طرح سے بچایا ہے۔ چنانچہ بخاری نے لکھا: مروان، معاویہ کی طرف سے حجاز کا حاکم تھا۔ اس نے یزید بن معاویہ کا نام لیا تاکہ معاویہ کے بعد لوگوں سے اس کی بیعت لے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے "کچھ" کہا۔ مروان نے حکم دیا کہ اسے پکڑو۔ عبدالرحمٰن بی بی عائشہؓ کے حجرے میں داخل ہوگیا۔ حکومتی کے کارندے اسے گرفتار نہ کرسکے۔ پھر مروان نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے متعلق خدا نے یہ آیت نازل کی ہے وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَا. بی بی عائشہؓ نے پردے کی اوٹ سے کہا کہ اللہ نے اس کے متعلق کچھ نازل نہیں کیا جبکہ خدا نے آسمان سے میری برأت نازل کی ہے۔[2]

بخاری کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی گفتگو حذف کر دی اور اس کی بجائے صرف یہ لکھا کہ اس نے "کچھ" کہا۔ اسی طرح بخاری نے مروان کو بچانے کے لیے بی بی عائشہؓ کی گفتگو میں بھی تبدیلی کی۔ بخاری کی اس "محنت" کا مقصد معاویہ اور مروان کو تحفظ دینا ہے جبکہ اس واقعے کو ابن حجر نے فتح الباری فی شرح صحیح بخاری میں پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اب محترم قاری خود ہی اندازہ لگائے کہ جسے اہل سنت امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے نہیں تھکتے وہ سچ بیان کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسے ہر قیمت پر معاویہ اور مروان کا تحفظ عزیز ہے۔

دوسرا نمونہ

بخاری نے نماز نہ پڑھنے کے متعلق حضرت عمرؓ کا فتویٰ حذف کر دیا۔

مسلم نے شعبہ سے اور اس نے کہا کہ حکم نے ذر سے اور اس نے سعید بن عبدالرحمٰن سے اور اس نے اپنے والد سے یہ روایت نقل کی: ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ مجھ پر غسل جنابت فرض ہو جائے اور پانی نہ ملے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

۱۔ تاریخ ابن اثیر ج ۳، ص ۵۰۶ حوادث ۵۶ھ۔

۲۔ بخاری ج ۶، ص ۱۲۶ کتاب التفسیر، باب وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَا در تفسیر سورۂ احقاف۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ نماز نہ پڑھو۔

عمار نے کہا کہ امیرالمومنین! کیا آپ کو وہ موقع یاد ہے جب ہم دونوں ایک جنگ میں شریک تھے اور ہم دونوں پر غسل جنابت فرض ہوگیا تھا اور ہمیں پانی نہیں ملا تھا۔ آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی اور میں مٹی پر لوٹتا رہا اور پھر میں نے نماز پڑھ لی تھی اور پیغمبرؐ نے فرمایا کہ تیمم کے لیے دونوں ہاتھ زمین پر مار کر چہرے اور ہاتھوں پر مارنا ہی کافی ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا عمار! خدا کا خوف کرو۔

عمار نے کہا اگر آپ کو یہ بات ناگوار ہے تو پھر میں اسے نقل نہیں کروں گا۔[1]

صحیح مسلم کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ شریعت کا سادہ سا مسئلہ بھی نہیں جانتے تھے جبکہ مسئلہ تیمم ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہر مسلمان جانتا ہے اور قرآن کریم میں اس کا حکم بھی موجود ہے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے بھی صحابہ کو اس کی تعلیم دی تھی لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ نماز نہ پڑھو۔ ان کے اس فتوے سے پتا چلتا ہے کہ وہ شرعی مسئلے سے نابلد تھے اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز کو خاص اہمیت نہیں دیتے تھے کہ جب بھی انسان جنب ہو اور پانی میسر نہ ہو تو نماز نہ پڑھے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ حضرت عمرؓ کے علم کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ حضرت عمرؓ اتنی عظیم شخصیت تھے کہ آپ نزول قرآن سے پہلے قرآن کے مطابق عمل کرتے تھے۔ پھر قرآن اتر کر ان کے عمل کی تصدیق کر دیتا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی خدا کا خوف کرو۔ اس لاف زنی کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ تو کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نزول قرآن سے پہلے قرآن پر عمل کرتے تھے لیکن صحیح مسلم تو یہ بتا رہی ہے کہ آیت نازل ہونے کے باوجود بھی وہ مسئلہ تیمم سے نابلد تھے اور ان کا علم اتنا "وسیع" تھا کہ حق مہر کے مسئلے پر ایک خاتون نے انھیں ٹوک دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ کا حکم آیت قرآن کے خلاف ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر خلیفہ کو سر منبر یہ کہنا پڑا تھا کہ عمر نے غلط کہا اور عورت نے صحیح کہا۔

بہرنوع صحیح مسلم کی اس روایت سے حضرت عمرؓ کی شخصیت کو ضرب پہنچتی ہے اور اس سے حضرت کی کم علمی واضح ہوتی ہے اور پھر اس روایت کے یہ الفاظ نہایت تعجب خیز ہیں کہ عمار نے انھیں شرعی حکم یاد دلایا تو اس کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔

آیئے اب امام المحدثین بخاری کی صحیح کی طرف رجوع کریں۔ بخاری نے یہ دیکھا کہ میں

۱۔ صحیح مسلم، باب تیمم ج ۱، ص ۲۸۰، حدیث ۱۱۲۔

ایسی روایت کو کیسے نقل کروں جس سے حضرت عمرؓ کی علمیت پر حرف آتا ہو جبکہ مسئلہ تیمم تو عام لوگوں کو بھی یاد ہے اسی لیے انھوں نے حضرت عمرؓ کے فتوے کو لکھنا گوارا نہ کیا جبکہ صحیح بخاری میں بھی وہی روایت ہے جو صحیح مسلم میں ہے اور بخاری کی روایت کے راوی بھی وہی ہیں جو صحیح مسلم کی روایت کے ہیں مگر اس کے باوجود بخاری نے خلیفہ کا بھرم رکھا اور امانت حدیث کو پس پشت ڈال دیا اور حضرت عمرؓ کے فتوے کو نقل نہیں کیا اور یہ عبارت لکھی۔ ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر میں جنب ہو جاؤں اور پانی بھی نہ پاؤں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ عمارؓ بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کیا آپ کو وہ موقع یاد ہے جب [1]

تیسرا نمونہ

ابن حجر فتح الباری فی شرح صحیح بخاری جلد ۱۷ صفحہ ۳۱ پر لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے کہا کہ وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا (سورۂ عبس، آیت ۳۱) میں اَبًّا سے کیا مراد ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہمیں گہرائی میں جانے اور اپنے آپ کو زحمت میں ڈالنے سے روکا گیا ہے۔

ابن حجر لکھتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ثابت نے انس سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا کی آیت پڑھی تو ان سے پوچھا گیا کہ اَبًّا سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں تکلف کی ضرورت نہیں ہے یا ان کے یہ الفاظ تھے کہ ایسی کسی چیز کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

آیئے اب دیکھیں کہ بخاری حضرت عمرؓ کے کس قدر مخلص ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ حقائق بدلتے ہیں تو بدلتے رہیں، شریعت بدلتی ہے تو بدلتی رہے لیکن خلفاء کی ذات پر انگشت نمائی نہیں ہونی چاہیے۔ بخاری کسی قیمت پر ایسی کوئی روایت لکھنے کے روادار نہیں تھے جس سے حضرت عمرؓ کے متعلق یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ وہ قرآن کے مطالب سے نابلد تھے جبکہ قرآن اور اسلوب قرآن کو سمجھنے والوں کے لیے یہ سوال انتہائی آسان ہے اور حضرت عمرؓ کا یہ کہنا کہ ہمیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے یعنی ہمیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ ہم اپنے آپ کو زحمت میں ڈالیں بالکل بے محل ہے کیونکہ اس میں اپنے آپ کو تکلف میں ڈالنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔

امام علیؑ سے یہی سوال کیا گیا تھا کہ وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا کی آیت میں اَبًّا کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سوال کا جواب تو خود آیت میں موجود ہے۔ آیت کا تسلسل یہ ہے۔ وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا ○ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ○ میوے اور گھاس جو کہ تمہارا حصہ ہے اور تمہارے چوپایوں کا حصہ ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ میوے تمہارے لیے ہیں اور گھاس اور چراگاہیں تمہارے جانوروں کے لیے ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ

۱۔ صحیح بخاری ج ۱، ص ۹۲ کتاب التیمم، باب تیمم من ینفخ فیھما

ابّا سے مراد گھاس ہے۔

اب آیئے بخاری کی امانت روایت ملاحظہ فرمائیں۔

بخاری لکھتے ہیں کہ ہم سے ثابت نے بیان کیا اس نے انس سے سنا کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں تکلف سے روکا گیا ہے۔[1]

یہ روایت ان سینکڑوں روایات میں سے ایک ہے جو بخاری کے مزاج کے خلاف ہیں اور بخاری کا یہ اصول ہے کہ جو بھی حدیث اس کے مزاج کے مطابق نہ ہو وہ اس میں کمی بیشی کر دیتے یا اس کو بدل دیتے تھے۔ اگر اسے بدلنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اس حدیث کو بالکل چھوڑ دیتے تھے۔ آپ کِتابُ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ کی حدیث ثقلین کو ہی لے لیں۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا اور مسلم کی شرط کے مطابق حاکم نے نقل کیا ہے۔ اور بھی سینکڑوں احادیث ہیں جو بخاری کے عقیدے اور افتادِ طبع کے مطابق نہ تھیں اور کافی محنت کے باوجود وہ ان میں تحریف نہیں کر سکتے تھے تو انھوں نے ان احادیث کو نہیں لکھا اور صحیح بخاری کی مقبولیت کا راز صرف یہی ہے کہ انھوں نے حکمرانوں کی کہیں بھی توہین نہیں ہونے دی تھی اسی لیے حکمرانوں نے اسے اَصَحُّ الْکُتُبْ کا اعزاز بخشا۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کو اَصَحُّ الْکُتُبْ کہنے کا مجھے تو کوئی سبب دکھائی نہیں دیتا۔

چوتھا نمونہ

یہاں ہم تاریخ و حدیث کی دنیا کا ایک مشہور واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اس واقعے کو اہلسنت کے حفاظ و علماء کی کثیر تعداد نے نقل کیا ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں، نسائی نے خصائص علیؑ میں، طبری نے تفسیر میں، جلال الدین سیوطی نے درمنثور میں، متقی ہندی نے کنزالعمال میں، ابن اثیر نے تاریخ کامل میں اور دیگر علماء نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات نازل فرمائیں تو رسول اکرمؐ نے وہ آیات حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کیں اور فرمایا کہ تم حج کے اجتماع میں ان آیات کو پڑھ کر سناؤ۔ حضرت ابوبکرؓ روانہ ہوئے۔ کچھ ہی دیر بعد آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا اور فرمایا کہ آپ ابوبکرؓ سے وہ آیات لے لیں اور اجتماع حج میں مشرکین کو سنا دیں۔ امام علیؑ روانہ ہوئے اور راستے میں ہی حضرت ابوبکرؓ سے جا ملے اور انھیں رسول خداؐ کا پیغام پہنچایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ آیات

۱۔ صحیح بخاری ج ۹، ص ۱۸، کتاب الاعتصام، باب ما یکرہ من کثرۃ السوال و تکلف مالا یعلم

امام علیؑ کے سپرد کیں اور خود رسول خداؐ کے پاس واپس آئے اور کہا: یا رسول اللہؐ! کیا میرے متعلق کوئی وحی نازل ہوئی ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں۔ جبریلؑ آئے اور انھوں نے کہا کہ اس پیغام کو یا خود میں پہنچاؤں یا وہ شخص پہنچائے جو مجھ سے ہو۔

جب بخاری نے دیکھا کہ اس حدیث کو اصل حالت میں لکھنے سے ان کے عقیدے کی نفی ہوتی ہے اور امام علیؑ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اور امام علیؑ کی حضرت ابوبکرؓ پر فضیلت ثابت ہوتی ہے تو انھوں نے اس روایت کو کچھ اس انداز سے بدلا کہ حضرت ابوبکرؓ کی پھر بھی عظمت بحال رہی اور امام علیؑ کی فضیلت چھپ گئی۔

آیئے دیکھیں بخاری نے اس روایت کو کس طرح لکھا ہے!!

صحیح بخاری کتاب التفسیر آیت فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ (سورۂ توبہ: آیت ۲) میں حمید بن عبدالرحمٰن نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ اس سال کے حج میں ابوبکرؓ نے مجھے کچھ منادیوں کے ساتھ قربانی کے دن روانہ کیا اور کہا کہ تم نے یہ اعلان کرنا ہے کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی شخص برہنہ ہوکر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔ حمید کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول خداؐ نے امام علیؑ کو بھی روانہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ مشرکین سے بیزاری کا اعلان کریں۔ ابو ہریرہ نے کہا کہ علیؑ بھی قربانی کے دن ہمارے ساتھ تھے اور انھوں نے اہل منیٰ کے سامنے مشرکین سے بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور برہنہ ہوکر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔[1]

ہم اپنے محترم قارئین کے ضمیر کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کرتے ہیں کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ بخاری نے کس چابکدستی سے روایت اختراع کر کے امام علیؑ کی عظمت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے اور اس روایت کے ذریعے حضرت ابوبکرؓ کے لیے ایسی فضیلت کا اثبات کیا ہے جس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول خداؐ نے انھیں تبلیغ آیات سے سبکدوش کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جبریلؑ نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ آیات تبلیغ یا تو خود آپ کریں یا اسے بھیجیں جو آپ میں سے ہو۔ اس حقیقت کو بخاری نے چھپایا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ معاملات کا اختیار حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا اور انھوں نے ہی تبلیغ آیات پر عمل کیا تھا اور منادی مقرر کر کے مشرکین سے بیزاری کا اعلان کرایا تھا۔

اس صورتحال پر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ "مقلب الاحوال" ہے۔ وقت حالات کو بدلتا ہے اور شاید یہاں بھی یہی صورتحال پیش آئی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری ج ۶، ص ۸۱۔

پانچواں نمونہ

ابن ہشام اور طبری کی طرح سے مسلم نے بھی اپنی روایت میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی توہین کی حدیث کے ایک حصے کو حذف کر دیا ہے۔

ابن ہشام نے جنگ بدر کے اسباب میں لکھا ہے کہ حضرت رسول خداؐ ابوسفیان کے تجارتی قافلے کو روکنا چاہتے تھے۔ پھر آنحضرتؐ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش نے اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے ایک لشکر روانہ کیا ہے۔ جب حالات نے یہ رخ اختیار کیا تو رسول خداؐ نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا اور کہا کہ قریش کا ایک لشکر روانہ ہو چکا ہے۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا یہاں سے واپس مدینہ چلے جانا چاہیے یا ان کا مقابلہ کرنا چاہیے؟

اس وقت ابوبکرؓ اٹھے اور انھوں نے اچھی باتیں کیں۔ عمرؓ بن خطاب بھی کھڑے ہوئے اور انھوں نے بھی اچھی باتیں کیں۔ پھر مقداد بن عمرو اٹھے اور انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! آپ راہ خدا پر چلیں۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ خدا کی قسم! ہم بنی اسرائیل نہیں ہیں جنھوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ آپ اپنے رب کو لے کر جائیں اور ان سے لڑیں ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۲۴) اس کی بجائے ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ ہمیں اس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے آپ اپنے رب کے ساتھ چلیں اور جنگ کریں ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے اور مقصد حاصل کر کے رہیں گے۔ رسول خداؐ نے فرمایا تم نے بہت اچھا کہا اور آپ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے کون سی اچھی گفتگو کی تھی؟ اور اگر وہ گفتگو واقعی اچھی تھی تو ابن مؤرخین نے اسے نقل کیوں نہیں کیا اور انھیں ان کی گفتگو نقل کرنے سے شرم دامن گیر کیوں ہوئی؟!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا مسلم نے بھی طبری اور ابن ہشام کی طرح سے خیانت کی تھی؟ مسلم نے لکھا ہے کہ جب ابوسفیان کے حملے کی خبر ملی تو رسول خداؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ ابوبکرؓ نے کچھ کہا لیکن رسول خداؐ نے منہ موڑ لیا۔ پھر عمرؓ نے کچھ کہا مگر رسول خداؐ نے ان سے بھی منہ موڑ لیا۔ . اس کے بعد مسلم نے آگے مقداد بن عمرو کی گفتگو نقل کی ہے[1]

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم، طبری اور ابن ہشام سے زیادہ سچے ہیں لیکن انھوں نے بھی اپنی عقیدتی مصلحت کے تحت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی گفتگو نقل نہیں کی۔ البتہ اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ رسول خداؐ

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۂ بدر، ج ۳، ص ۱۴۰۲۔۱۴۰۳، حدیث ۸۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۲۶۶۔

نے ان سے منہ موڑ لیا تھا۔ مسلم کی یہ روش بھی حدیث میں خیانت کے زمرے میں آتی ہے البتہ اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شیخین نے کوئی اچھی باتیں نہیں کی تھیں۔ اگر ان کی باتیں اچھی ہوتیں تو رسول خداؐ ان سے منہ نہ موڑتے۔

اس تزویراتی انداز سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شیخین نے ضرور ایسی کوئی بات کہی ہوگی جو ان کے مقام کے لائق نہیں تھی۔ اسی لیے محدثین و مؤرخین نے اسے نقل نہیں کیا اور اسے چھپانے کی کوشش کی لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہتا ہے اگرچہ کافرین کو ناگوار ہی گزرے۔

مؤرخین و محدثین کی کوششوں کے باوجود اصل بات منظرعام پر آ ہی گئی اور جس بات پر وہ پردہ ڈالنا چاہتے تھے خدا نے اسے آشکار کر دیا۔ چنانچہ واقدی نے کتاب مغازی اور مقریزی نے امتاع الاسماع میں لکھا ہے کہ جب رسول خداؐ نے نئی صورتحال پر مشورہ کیا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہا: "یا رسول اللہؐ! خدا کی قسم یہ قریش ہیں۔ وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ خدا کی قسم! جب سے قریش کو عزت ملی ہے تب سے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوئے۔ خدا کی قسم! جب سے قریش کافر بنے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کی قسم! قریش اپنی عزت کسی دوسرے کے حوالے نہیں کریں گے۔ وہ آپ سے جنگ کر کے رہیں گے۔ آپ بھی جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیں اور جنگ کا سارا سامان جمع کریں۔"

اب ہمیں معلوم ہوا کہ رسول خداؐ نے ان کی بات سن کر منہ کیوں پھیر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی یہ گفتگو رسولؐ کے صحابی کو زیب نہیں دیتی تھی اور نجانے انھیں قریش کی کس عزت کا اتنا خیال تھا جس کے لیے انھوں نے تین بار خدا کی قسم کھائی تھی؟ کیا وہ یہ سمجھتے تھے کہ رسول خداؐ قریش کو ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟

یہ ہے اسلام اور اس کے تمدن کے متعلق حضرت عمرؓ کی بصیرت۔

بخاری و مسلم نے ہمیشہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کیا اور جس بھی حدیث میں انھیں شیخین کی توہین کا کھٹکا ہوا انھوں نے حقیقت کو چھپایا اور شیخین کے مقام کو پست نہ ہونے دیا تھا۔ ان کی اسی روش کی وجہ سے ان کی کتابوں کو صحیحین کہا گیا ہے۔

تحریف حقائق میں مؤلفین کا کردار

محدثین و مؤرخین کے بعد مؤلفین کا دور آتا ہے۔ انھوں نے بھی "حسب توفیق" حقائق میں تحریف کی روش کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ وہ جھوٹ کی تمام حدیں پار کر گئے۔ اُن لوگوں نے مذہب اہلبیتؑ کو بدنام کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی

رہے ہیں اور انھوں نے اپنے ہم مشربوں کے دلوں میں جہالت کو خوب پختہ کیا اور انھیں حق کی معرفت سے دور رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے جھوٹے اور خودساختہ افسانے لکھ کر مذہب شیعہ کو ایک قابل نفرت مذہب کے طور پر عوام سے متعارف کرایا۔ میں یہ باتیں کسی مفروضے کے تحت نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں ایک عرصے تک خود اسی جہالت میں سرگرداں رہا ہوں۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدا نے مجھ پر کرم کیا اور میرے ظلمت کدہ دل کو نور آل محمدؐ سے منور کیا۔ اس کے بعد جو میں نے اپنے ماحول و معاشرے پر نگاہ کی تو مجھے پتا چلا کہ ہمارا ماحول بدترین جہالت میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں جب بھی اپنے کسی روشن فکر عالم اور سکالر سے مذہب شیعہ کے متعلق گفتگو کرتا تھا تو وہ شیعوں کے خلاف کذب و افترا پر مبنی باتیں کہتا تھا مثلاً وہ یہ کہتا تھا کہ بھائی کمال ہے آپ کو تو پتا ہی نہیں ہے کہ شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حقیقی پیغمبر تو امام علیؑ تھے لیکن جبریلؑ کو مغالطہ ہوا تھا اور اس نے امام علیؑ کی بجائے محمد مصطفیٰؐ پر قرآن نازل کر دیا تھا۔

بعض اسکالر مجھ سے کہتے کہ چھوڑو یار۔ شیعہ تو خدا کی بجائے امام علیؑ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس سے بدتر جواب اس وقت ملتا جب میں کسی اسکالر سے پوچھتا کہ جناب عالی! آپ یہ بتائیں کہ آیا شیعہ مسلمان ہیں؟ اس کے جواب میں "خودساختہ جغرافیہ" یہ کہتے تھے کہ بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ شیعہ اور "شیوعیہ" (کمیونسٹوں) میں کیا فرق ہے۔

میں یہ بات علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شیعہ افکار و عقائد سے ناواقف ہے اور اس کے ذمے دار وہ مولفین ہیں جنھوں نے شیعوں کے خلاف جھوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان کا اول و آخر مقصد یہی ہے کہ شیعیت کو اتنا بدنام کر دیا جائے کہ کوئی بھی دیندار مسلمان اس کی طرف رجوع نہ کرے۔ شیعیت کے خلاف یہ جنگ آج سے نہیں، صدر اسلام سے جاری ہے اور ابھی اس کے خاتمے کے کوئی آثار بھی دکھائی نہیں دیتے۔

دور حاضر میں شیعیت کے خلاف لکھی جانے والی کتابیں لوگوں کے گھروں میں موجود ہیں۔ وہابی تو اس طرح کی کتابیں مفت تقسیم کر رہے ہیں۔ اگر ناشرین میں انصاف ہوتا تو وہ ایک شیعہ مخالف کتاب شائع کرتے اور پھر شیعوں کی جوابی کتاب بھی شائع کرتے۔ اس طرح سے مسلمان یکطرفہ پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوتے اور ایک توازن قائم رہتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ اسلامی بک شاپس پر چلے جائیں تو بصد مشکل آپ کو شیعہ مذہب کی ایک آدھ کتاب دکھائی دے گی جبکہ مسلک وہابیت کی سینکڑوں کتابیں سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ اس سے زیادہ بدبختی تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی کو شیعہ کتاب پڑھنے کے لیے دیں تو لوگ اسے پڑھنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ ان لوگوں کو یہ باور کرایا گیا ہے

کہ شیعہ کتابیں گمراہ کن ہوتی ہیں اور ان کا پڑھنا حرام ہے اور ان کا جلانا واجب ہے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کی مسجد کا امام مجھے کافر کہتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا کہ اس کے ساتھ تعلق نہ رکھو اور اس کی کتابیں مت پڑھو۔ خدارا کیا فکری آزادی اسی کا نام ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ فکری غلامی اور بدترین جہالت ہے۔

شیعیت کے خلاف لکھی جانے والی چند کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ شیخ محمد خضری مصری کی محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیہ

۲۔ صاحب تفسیر المنار رشید رضا کی السنۃ والشیعۃ

۳۔ قصیمی کی الصراع بین الوثنیۃ والاسلام (بت پرستی اور اسلام کی جنگ)

۴۔ احمد امین کی فجر الاسلام اور ضحی الاسلام

۵۔ موسیٰ جاراللہ کی الوشیعۃ فی نقد الشیعۃ

۶۔ محب الدین خطیب کی الخطوط العریضہ

۷۔ احسان الٰہی ظہیر کی الشیعۃ والسنۃ اور الشیعۃ والقرآن اور الشیعۃ و اہل البیت اور الشیعۃ والتشیع

۸۔ ابن تیمیہ کی منہاج السنہ

۹۔ فضل بن روزبہان کی ابطال الباطل

۱۰۔ ڈاکٹر ناصر قفاری کی اصول مذہب الشیعۃ

۱۱۔ عبداللہ محمد غریب کی وجاء دور المجوس

۱۲۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ

۱۳۔ محمد ثابت مصری کی جولۃ فی ربوع الشرق الادنی

اس کے علاوہ بھی دسیوں کتابیں شیعیت کی رد میں لکھی گئی ہیں۔ علمائے شیعہ نے ان کتابوں کے مسکت جواب لکھے ہیں۔ میں نے دونوں قسم کی کتابوں کو پڑھا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علمائے شیعہ نے دلیل و برہان سے اپنے مذہب کی حقانیت کا دفاع کیا ہے اور انھوں نے کتب اہلسنت سے اپنے مذہب کو ثابت کرنے کی روش اپنائی ہے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب پر خوہ مخواہ کیچڑ اچھالنے سے گریز کیا ہے۔

اس کے برعکس شیعہ مخالف کتابوں کے مؤلفین کی کوشش رہی ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے شیعوں کو بدنام کریں خواہ اس کے لیے انھیں جھوٹ کا سہارا بھی کیوں نہ لینا پڑے۔

ہمارے اس تجزیے کے لیے ہمارے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔ ہم عنقریب اس کے چند نمونے بھی پیش کریں گے۔

شیعوں کی طرف سے جوابی کتابیں

آیئے اب ان کتابوں کا تذکرہ کریں جن میں مخالفین کی تہمتوں کا جواب دیا گیا ہے اور شیعہ مذہب کی حقانیت کا دفاع کیا گیا ہے

(۱) الشافی فی الامامۃ

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی اس کتاب کی چار جلدیں ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ امامت کا تعلق اصول دین سے ہے اور امامت ایک اجتماعی اور دینی ضرورت ہے اور امام علیؑ منصوص پیغمبرؐ کی بنا پر آنحضرتؐ کے خلیفہ برحق ہیں اور جس نے بھی ان کی مخالفت کی ہے تو اس نے حق و صداقت کی مخالفت کی ہے۔ امامت کے متعلق مخالفین کے جتنے بھی اعتراضات تھے یا ممکن ہوسکتے تھے اُن سب کا سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے جواب دیا ہے اور ان کے تمام جوابات منطق عقل اور حدیث کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔[1]

(۲) نہج الحق و کشف الصدق

علامہ حلی نے اس کتاب میں حسب ذیل موضوعات پر بحث کی ہے۔

۱۔ علم و ادراک ۲۔ فکر ۳۔ صفات باری تعالیٰ ۴۔ نبوت
۵۔ امامت ۶۔ قیامت ۷۔ اصول فقہ ۸۔ فقہ سے مربوط مسائل

اس کتاب کو پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کتاب کا مؤلف ایک عظیم محقق ہے۔ وہ اپنی رائے میں متعصب نہیں ہے اور اس نے کتاب و سنت کو اپنے نظریے کے پیچھے چلانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے عقائد کو قرآن و سنت کے تابع رکھ کر بحث کی ہے۔

فضل بن روزبہان اشعری نے علامہ حلی کی اس کتاب کی تردید میں ابطال الباطل و اهمال کشف الباطل لکھی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں علامہ حلی کی روش کا تتبع نہیں کیا بلکہ بہت سے مقامات پر دشنام طرازی سے کام لیا۔ اس کے باوجود اس کی کتاب کو کچھ نہ کچھ علمی کتاب کہا جاسکتا ہے اسی لیے بہت سے شیعہ علماء نے اُس کے رد میں کتابیں لکھی تھیں۔

۱۔ الشافی ج ۱، ص ۱۹ محقق کتاب کے مقدمہ سے انتخاب۔

(۳) احقاق الحق

یہ کتاب شہید ثالث سید نور اللہ حسین شوستری کی لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں ابن روزبہان کی ابطال الباطل کا جواب دیا گیا ہے۔ آیت اللہ شہاب الدین مرعشی نجفی نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا ہے اور حاشیہ سمیت اس وقت اس کتاب کی بیس جلدیں ہیں۔

مؤلف کتاب نے بہترین دلائل پیش کئے ہیں اور کتب اہلسنت سے احادیث و روایات کی تخریج کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ کتاب تمام مسلمانوں کے لیے ایک تحفہ ہے کیونکہ فرد واحد نے اتنا بڑا کام کیا ہے جس کے لیے ایک پوری جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) دلائل الصدق

تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب علامہ شیخ محمد حسن مظفر کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں علامہ موصوف نے ابن روزبہان کی کتاب ابطال الباطل کے دلائل کی کاٹ کی ہے نیز انھوں نے ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنہ کا بھی رد لکھا ہے۔ واضح رہے کہ ابن تیمیہ نے یہ کتاب علامہ حلی کی منہاج الکرامہ کی رد میں لکھی تھی۔ علامہ مظفر نے ابن تیمیہ کی کتاب کی مکمل تردید نہیں کی ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اگر منہاج السنہ کا مؤلف بدزبان اور دشمن محمدؐ و آل محمدؐ نہ ہوتا تو اس کی کتاب پر مکمل بحث کی جاسکتی تھی لیکن چونکہ ابن تیمیہ آل محمدؐ کا بدترین گستاخ ہے اور اس کی تحریر بھی اس لائق نہیں ہے کہ اس کے جواب میں سر کھپایا جائے۔[۱]

(۵) الغدیر

گیارہ جلدوں پر مشتمل یہ عظیم کتاب علامہ عبدالحسین امینی کی تالیف ہے۔ یہ عظیم انسائیکلوپیڈیا تحقیق کی ان تھک شبانہ روز کاوشوں کا ثمر ہے۔ انھوں نے ہر طرح کے مستند دلائل سے مذہب اہلبیتؑ کا اثبات کیا ہے اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انھوں نے اہلسنت کی 94,000 کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے ضمنی طور پر اہلسنت کی حسب ذیل کتابوں کی بھی تردید کی ہے کیونکہ ان کتابوں میں مذہب شیعہ پر تنقید کی گئی ہے۔

۱۔ العقد الفرید	۲۔ الفرق بین الفرق	۳۔ الملل والنحل
۴۔ منہاج السنہ	۵۔ البدایہ والنہایہ	۶۔ المحصر
۷۔ السنۃ والشیعۃ	۸۔ الصراع	۹۔ فجر الاسلام
۱۰۔ ظہر الاسلام	۱۱۔ ضحی الاسلام	۱۲۔ عقیدۃ الشیعہ

۱۔ دلائل الصدق ج ۱، ص ۳۔

علامہ امینی نے مذکورہ بالا کتابوں کے تمام الزامات کے بڑے ٹھوس جوابات دیئے ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ کتاب میں کوئی تعصب اور ناحق جدل کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ کتاب کا طرز بیان شستہ اور محققانہ ہے۔

(۶) عبقات الانوار

اس کتاب کو مذہب اہلبیتؑ کے اثبات کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں مذہب اہلبیتؑ کا دفاع کیا گیا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پورا نام عبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے عظیم عالم دین سید حامد حسین بن سید محمد قلی کی تالیف لطیف ہے۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں نے اصل کتاب کا مطالعہ نہیں کیا البتہ میں نے علی حسینی میلانی کی لکھی ہوئی کتاب "خلاصہ عبقات الانوار" کا مطالعہ کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شیعہ عقائد کے رد میں تحفہ اثنا عشریہ لکھی تھی۔ جناب حامد موسوی کی کتاب عبقات الانوار اسی تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب دس ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں شیعہ علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے حسب ذیل کتابیں سرفہرست ہیں:

۱۔ احمد بن عبدالنبی نیشاپوری کی السیف المسلول علی من عارض دین الرسول۔
۲۔ سید دلدار علی نقی لکھنوی کی چار کتابیں۔
۳۔ میر دامد کشمیری کی النزھۃ الاثنا عشریہ
۴۔ سید محمد قلی کی الانوار الاثنا عشریۃ المحمدیۃ۔
۵۔ شیخ سبحان علی خان ہندی کی الوجیز فی الاصول
۶۔ سید محمد بن سید کی الامامۃ۔

سید مذکور نے فارسی زبان میں بھی ایک کتاب البوارق الالٰہیۃ لکھی تھی۔

علاوہ بریں بہت سے شیعہ علماء نے عبدالعزیز دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کا رد لکھا ہے۔ ۳۰ جلدوں پر مشتمل آقائے بزرگ تہرانی کی کتاب الذریعہ الی تصانیف الشیعہ اور ۵۰ جلدوں پر مشتمل علامہ سید محسن امین کی اعیان الشیعہ میں ان کتابوں اور اُن کے مؤلفین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ کے رد میں مفصل ترین کتاب عبقات الانوار ہے۔ اس کتاب کے مؤلف کا طرز تحریر اُن کی علمیت اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اُن کی تحریر اُن کے علمی تبحر اور مختلف اقوال سے اُن کی مکمل واقفیت کی دلیل ہے۔ انھوں نے مضبوط دلائل سے مخالفین کے تمام راستوں کو بند کیا ہے اور اُن کے تمام بہانوں کو ختم کیا ہے اور اُن کے تمام شبہات کا رد کیا ہے اور اگر انھوں نے مخالف کی کسی

دلیل کی تردید کی ہے تو انتہائی احسن انداز اور عملی طریقے سے کی ہے۔

عبقات کے عظیم القدر مؤلف نے دلائل نبوی، استدلال حیدری اور جوابات رضوی کو مدنظر رکھ کر کتب اہلسنت اور اُن کے بزرگوں کے اقوال سے ہی معترض کے جواب دیئے ہیں اور تحفہ اثنا عشریہ کے شبہات کا مدلل جواب دیا ہے۔[1]

علامہ سید میر حامد حسین اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنے خاندان کی لائبریری سے استفادہ کیا تھا۔ اُن کے بزرگوں کی لائبریری میں مختلف مذاہب کی تیس ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ اُن میں سے کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ قلمی نسخے تھے۔

مخالفین کو آج تک عبقات الانوار کا جواب لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

تحفہ اثنا عشریہ کے رد میں کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے رد میں سب سے پہلے سید دلدار علی لکھنوی کی الصوارم الالٰہیۃ اور صارم الاسلام منظر عام پر آئی تھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ایک شاگرد رشید الدین دہلوی نے اس کے جواب میں الشوکۃ العمریہ نامی کتاب لکھی تھی۔ پھر الشوکۃ العمریہ کے رد میں علامہ باقر علی کی الحملۃ الحیدریہ چھپی تھی۔ اس کے بعد جناب مرزا محمد کشمیری کی نزہۃ اثنا عشریہ کے جواب میں ایک سنی عالم نے رجوم الشیاطین لکھی تھی۔ رجوم الشیاطین کے جواب میں سید جعفر موسوی نے معین الصادقین فی رد رجوم الشیاطین لکھی۔ صاحب عبقات کے والد سید محمد قلی نے تحفہ کی تردید میں الاجناد الاثنا عشریۃ المحمدیۃ لکھی۔ پھر رشید الدین دہلوی نے سید محمد قلی کے رد میں ایک اور کتاب لکھی۔ اس کے بعد سید محمد قلی نے جواب الجواب کے طور پر الاجوبۃ الفاخرۃ فی الرد علی الاشاعرہ نامی کتاب لکھی۔

سید محمد قلی کے بعد اُن کے عظیم القدر فرزند سید حامد حسین نے عبقات الانوار لکھی اور آج تک کسی سنی عالم سے اس کتاب کا جواب نہیں بن سکا ہے اور یہ اُن کی عاجزی کا کھلا ثبوت ہے۔

(۷) معالم المدرستین

تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب محقق دوران علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی تالیف ہے۔ علامہ صاحب نے اس کتاب میں غیر جانبداری سے مکتب اہلبیتؑ اور مکتب خلفاء کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔[2]

(۸) المراجعات

یہ کتاب شیخ ازہر سلیم بشری اور علامہ سید عبدالحسین شرف الدین کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

۱۔ محقق کی کتاب کے دیباچہ سے اقتباس۔

۲۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مکتب [illegible] خلافت [illegible]

یہ کتاب نادر اور علمی مناظروں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں طرفین کی جانب سے مذہبی رواداری جھلکتی ہے۔ علامہ سید شرف الدین نے اس کے علاوہ بھی مذہب اہلبیتؑ کے اثبات کے لیے کتابیں لکھی تھیں جن میں النص والاجتہاد، الفصول المہمۃ فی تالیف الامامۃ، الکلمۃ الغراء فی تفضیل الزہراؑ اور ابو ہریرہ سرفہرست ہیں۔

شیعہ علماء نے مخالفین کی کتابوں کی تردید میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) اجوبۃ مسائل جار اللہ از عبدالحسین شرف الدین
(۲) مع الخطیب فی خطوطہ العریضۃ از لطف اللہ صافی
(۳) شبہات حول الشیعۃ
(۴) کذبوا علی الشیعۃ

سنی علماء اور روشن فکر افراد شیعہ ہو رہے ہیں

بہت سے سنی علماء اور اسکالرز کو خدا نے توفیق عنایت کی۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسلاف کی زنجیروں سے آزاد کیا اور مذہب شیعہ کے علوم و معارف سے آگہی حاصل کی تو انھیں اپنے آبائی مذہب اور مذہب اہلبیتؑ میں دن رات کا فرق دکھائی دیا۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں ان کے سامنے سے گمراہی کے سیاہ بادل چھٹ گئے اور انھیں آسمان حقیقت دکھائی دیا تو انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر آل محمدؐ کے دامن سے وابستگی اختیار کر لی۔

اللہ کی یہ عنایت ماضی و حال میں ہزاروں خوش نصیب افراد کے شامل حال رہی ہے اور مذہب اہلبیتؑ قبول کرنے والے خوش نصیبوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم سب کے نام لکھنے سے قاصر ہیں۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند شخصیات کے نام لکھتے ہیں۔

﴿۱﴾ **محدث جلیل القدر ابو النضر محمد بن مسعود بن عیاش**، جو عیاشی کے نام سے معروف ہیں۔ پہلے انھیں ایک عظیم سنی عالم شمار کیا جاتا تھا۔ بعد میں انھوں نے مذہب شیعہ قبول کیا تھا۔ تفسیر عیاشی ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ انھیں علمائے شیعہ میں اہم مقام حاصل ہے۔

﴿۲﴾ **شیخ محمد مرعی ابن انطاکی**، جو جامع ازہر کے فارغ التحصیل اور حلب کے قاضی القضاۃ تھے۔ پورے حلب اور ملک شام میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خدا نے انھیں مذہب اہلبیتؑ کی ہدایت بخشی اور وہ شیعہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے لماذا اخترت مذہب الشیعہ (میں شیعہ

کیوں ہوا) لکھی اور مذہب شیعہ کی حقانیت کے دلائل دیے۔ ان کی وجہ سے جامعہ ازہر کے [illegible] شیعہ ہو گئے۔

﴿۳﴾ شیخ سلیم البشری۔ آپ الاسلام کے مستند اور موقر عالم دین تھے۔ آپ دو مرتبہ جامع ازہر کے وائس چانسلر رہے۔ آپ نے شیعہ سنی اختلافات کو سمجھنے کے لیے سید شرف الدین کو خطوط لکھے اور سید مرحوم نے آپ کے علمی خطوط کا خیر مقدم کیا اور تحقیقی جوابات لکھ کر بھیجے۔ آج وہی خطوط المراجعات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

سید شرف الدین کے مدلل جوابات سے شیخ سلیم البشری نے مذہب شیعہ قبول کیا تھا۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں ہی غیر متعصب ہونے کا اعلان کیا تھا اور لکھا تھا کہ میں صرف ایک گمشدہ حقیقت کو تلاش کرنے کا خواہشمند ہوں۔ اگر حق ظاہر ہو گیا تو ہم حق کی پیروی کریں گے اور حق اس لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور اگر حق واضح نہ ہو سکا تو ہم دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔[1]

دونوں عظیم القدر علماء کے خطوط ان کی اعلیٰ شخصیت اور ان کے علمی مقام کے غماز ہیں۔

ان خطوط کے آخر میں شیخ سلیم البشری نے مذہب شیعہ کی حقانیت کا یہ کہہ کر اعلان کیا:

"ڈھکی چھپی باتیں ظاہر ہو گئی ہیں، حقیقت سامنے آ گئی ہے اور چشم بینا کے لیے صبح روشن ہو چکی ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں اپنے دین کی ہدایت دی اور اپنے راستے پر عمل کی توفیق بخشی۔ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اہلبیتؑ پر درود و سلام ہو۔"[2]

﴿۴﴾ شیخ محمود ابوریہ۔ آپ مصر کے عظیم دانشور اور مؤلف تھے۔ آپ کا میدان علم الحدیث تھا۔ آپ نے نہایت ہی علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن میں اضواء علی السنۃ المحمدیۃ اور ابو ہریرۃ شیخ المضیرہ مشہور ہیں۔

﴿۵﴾ احمد حسین یعقوب۔ آپ اردن کے مشہور ماہر قانون ہیں۔ آپ نے تحقیق کے بعد مذہب شیعہ قبول کیا ہے۔ آپ نے النظام السیاسی فی الاسلام، نظریۃ عدالۃ الصحابۃ[3] اور الخطط السیاسیۃ لتوحید الامۃ المحمدیۃ جیسی کتابیں لکھی ہیں۔

﴿۶﴾ ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی آپ تیونس کے مذہبی اسکالر ہیں۔ آپ نے ثم اھتدیت[4]

۱۔ المراجعات ص ۵۶۔ ۲۔ المراجعات ص ۴۲۳۔

المراجعات کے اردو میں متعدد ترجمے چھپ چکے ہیں جن میں سے مذہب اہلبیتؑ در مناظرہ مصر کافی مشہور ہیں۔

۳۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ عدالت صحابہ کا نظریہ؟ کے نام سے چھپ چکا ہے۔

۴۔ مجمع علمی اسلامی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ تبصرہ کے نام سے اور اسلامک سینٹری نے THEN I WAS GUIDED کے نام سے انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔

لا تکون مع الصادقین الشیعة هم اهل السنة ، فاسئلوا اهل الذکر ، وزیارة یوم الخمیس اور کل الحلول عند آل الرسول جیسی کتابیں تالیف کی ہیں۔

﴿۷﴾ سید ادریس حسینی. آپ مراکش کے مشہور صحافی ہیں۔ آپ نے لقد شیعنی الحسین (مجھے حسینؑ نے شیعہ بنایا)، الخلافة المغتصبة (غصب شدہ خلافت) اور هکذا عرفت الشیعة (میں نے شیعوں کو ایسے پہچانا) جیسی کتابیں لکھی ہیں۔

﴿۸﴾ صائب عبدالحمید. آپ نے منهج الانتماء المذهبی تالیف کی ہے۔

﴿۹﴾ سعید ایوب. آپ کی کتاب عقیدة المسیح الدجال کے دیباچہ میں لکھا ہے:

تحقیق کے وقت میں نے اپنی روش پر غور کیا کہ میں حقائق کی جستجو کس انداز سے کر رہا ہوں۔ میں نے علمی طریقے استعمال کیے تاکہ حقائق واضح ہو سکیں۔ میں نے دیکھا کہ حق پوش اساتذہ نے حق کو مخفی رکھا ہے۔ میں نے تعصب، انانیت اور گمراہی کے پردوں کو چاک چاک کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تحقیق کے لیے میرے پاس وسائل موجود تھے۔[۲]

﴿۱۰﴾ صالح الوردانی. آپ کا تعلق سرزمین مصر سے ہے۔ آپ نے مصر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور اخوان المسلمین، حرکة الجهاد، حزب التکفیر جیسی سیاسی جماعتوں سے وابستہ رہے اور کئی دفعہ جیل بھی کاٹی۔ پھر انھوں نے غیر جانبداری سے از سر نو تحقیق کی تو خدا نے انھیں راہ حق کی ہدایت فرمائی اور وہ شیعہ ہو گئے۔ اعلان تشیع کے بعد انھوں نے جو کتابیں لکھیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) الخدعة[۳]
(۲) الشیعة فی مصر (مصر میں شیعہ)
(۳) حرکة اهل البیت (حرکت اہلبیتؑ)
(۴) السیف والسیاسة (شمشیر اور سیاست)
(۵) دفاع عن الرسولؐ (دفاع پیغمبرؐ)
(۶) التقارب والعاهد (نزدیکیاں اور دوریاں)
(۷) عقائد السنه و عقائد الشیعة (سنی شیعہ عقائد کا تقابلی جائزہ)
(۸) رحلتی من السنة الی الشیعة (سنیت سے شیعیت کی طرف میرا سفر)
(۹) اهل السنة شعب الله المختار (اہلسنت خدا کا چنا ہوا گروہ)

﴿۱۱﴾ محمد عبد الحفیظ. آپ مصر کے مشہور دانشور ہیں اور آپ نے لماذا انا جعفری

۱۔ مجمع علمی اسلامی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ علم نواں کے نام سے شائع کیا ہے۔

۲۔ عقیدة المسیح الدجال ص ۹۔

۳۔ مجمع علمی اسلامی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ فریب کے نام سے شائع کیا ہے۔

(میں جعفری کیوں ہوں) نامی کتاب تالیف کی ہے۔

﴿۱۲﴾ استاد سید عبدالمنعم محمد حسن. آپ کا تعلق سرزمین سوڈان سے ہے۔ آپ نے بنور فاطمۃ اهتديت (مجھے نور فاطمہؑ سے ہدایت ملی) کے عنوان سے کتاب لکھی ہے۔

﴿۱۳﴾ شیخ عبدالله ناصر. آپ کا تعلق کینیا سے ہے۔ آپ کینیا میں وہابیت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ جب آپ نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا تو مذہب شیعہ قبول کرلیا۔ اعلان تشیع کے بعد آپ نے الشیعة والقرآن، الشیعة والحدیث، الشیعة والصحابة، الشیعة والفقه اور الشیعة والامامة جیسی کتابیں لکھی ہیں۔

﴿۱۴﴾ سید علی بدری. آپ مشہور خطیب اور اعلیٰ درجے کے مناظر ہیں۔ آپ نے شیعہ ہونے کے بعد بہت سے ممالک کے دورے کئے اور مذہب شیعہ کی صداقت پر تقاریر کیں اور مخالفین سے مناظرے کئے۔ آپ نے احسن المواهب فی حقائق المذاهب لکھی ہے۔

﴿۱۵﴾ سید یاسین معروف البدری. آپ کا تعلق ملک شام سے ہے۔ آپ نے یا لیت قومی یعلمون (کاش کہ میری قوم جان لیتی) نامی کتاب تالیف کی ہے۔

جدید مؤلفین کی تحریفات کے چند نمونے

جدید مؤلفین نے خیانت کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ان کی خیانت کے نمونوں کو پیش کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ ان مؤلفین کو چونکہ شیعہ مذہب سے پرخاش ہے اس لیے انھوں نے شیعہ مذہب کے رد میں جو کتابیں تحریر کی ہیں ان میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ شیعیت کی تردید کے لیے انھوں نے اپنی ہی کتابوں کے حوالے دیے ہیں گویا ان کی کتابوں پر صداقت کی مہر لگی ہوئی ہے حالانکہ مناظرے کے لیے فریق مخالف کی مسلمہ کتابوں کا حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے۔

شیخ مظفر لکھتے ہیں: "معلوم ہونا چاہیے کہ استدلال کے لیے فریق مخالف کی مستند کتابوں کا حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ حلی اور ہمارے دوسرے علماء نے اہلسنت کی مستند کتابوں سے ہی استدلال کیا ہے۔ انھوں نے کسی بھی مقام پر شیعہ کتابوں کا حوالہ نہیں دیا۔ جبکہ اہلسنت نے شیعوں کے خلاف جب بھی کوئی کتاب لکھی تو اس اصول کی پاسداری نہیں کی۔" [1]

شیعہ مخالفین جب شیعوں کے رد میں کچھ لکھتے ہیں تو ان کی نظر میں شیعہ عقائد کا ایک اجمالی سا

۱۔ دلائل الصدق ج ۱ مقدمہ ص ۳۔

خاکہ ہوتا ہے۔ وہ جزئیات سے ناواقف ہوتے ہیں اسی لیے وہ مذہبی جزئیات پر منطقی بحث کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں جبکہ یہ روش انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ چنانچہ ایک ایسے مؤلف کے نظریات ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر ناصر غفاری اپنی کتاب اصول مذہب الشیعہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''کچھ عقائد ایسے ہیں جن کے صرف بیان سے ہی اس مذہب کی حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ باطل مذہب کا تصور ہی اُس کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ اگر صحیح تصور قائم ہو جائے تو اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔''

اگر ہر شخص کو یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ دوسرے انسان کے مذہب کا تصور قائم کرے اور پھر اس کو یہ اجازت دیدی جائے کہ وہ جیسا چاہے اُس کے نظریات کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے تو یقیناً یہ روش قابل مذمت ہے اور سچ یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ہمیشہ دوسرے مذاہب کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔

اگر اس منطق کو مان لیا جائے تو یورپ میں رہنے والے ہر عیسائی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کے متعلق جو چاہے بیان کرے کیونکہ اُس نے بھی مستشرقین کے غلط بیانات پڑھ کر اسلام کے متعلق ایک تصور قائم کر رکھا ہے جبکہ شیعہ مذہب اس طرح کی خیانت کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ ہماری نظر میں یہ روش استدلال کے لیے زہر قاتل ہے لیکن یہ ایک سچ ہے کہ ہمارے مخالفین کی منطق یہی ہے اور اسی منطق کے سہارے انھوں نے حقائق میں تحریف کی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ وہ تحریف پر شرمندہ ہوتے لیکن افسوس ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم اس طرح کی تحریفات کے چند نمونے ڈاکٹر ناصر عبداللہ غفاری کی کتاب اصول مذہب الشیعہ، احسان الٰہی ظہیر کی کتاب الشیعہ واھل البیت، ابن جبہان کی کتاب تبدید الظلام و تنبیہ النیام الی خطر التشیع علی المسلمین والاسلام اور احمد امین کی کتاب ضحی الاسلام سے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

﴿۱﴾ ڈاکٹر ناصر عبداللہ غفاری کی تحریفات

ڈاکٹر ناصر عبداللہ غفاری نے محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی کے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے جو رسالہ لکھا اُس میں وہ رقمطراز ہیں۔

۱۔ شیعہ پیغمبر اسلامؐ کی سنت کے دشمن ہیں اسی لیے شیعوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو لفظ اہل سنت سے موسوم کرنا پسند نہیں کیا جبکہ اہل سنت بحمد للہ رسول خداؐ کی سنت کے پیروکار ہیں۔[۱]

۱۔ ج ۱، ص ۳۰۷۔

پھر موصوف نے یہ لکھا ہے کہ اگرچہ شیعہ کتابوں کے متون اور اُن کی روایات کے مطالعے سے ہادی الفکر میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ شیعہ بھی سنت کے قائل ہیں لیکن وہ درپردہ حدیث کے منکر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی اکثر روایات اور باتیں سنت کی مختلف جہت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مسلمان جس سنت سے آشنا ہیں شیعہ اُس کے سراسر منکر ہیں چاہے اُس کا تعلق فہم سنت سے ہو یا اُس کی تطبیق سے ہو خواہ اسانید و متون سے ہو۔۔۔[1]

موصوف کا یہ قول سراسر جھوٹ ہے کہ شیعہ سنت کے دشمن ہیں اور موصوف کے پاس اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ شیعوں کے ہاں جو ذخیرہ حدیث پایا جاتا ہے وہ سنیوں کے ذخیرہ احادیث سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اگر آپ صرف کافی کا ہی مطالعہ کریں تو آپ کو اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کافی کی روایات صحاح ستہ کی مجموعی روایات سے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ شیعوں نے سنت کے عنوان پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ مجلسی نے بحار الانوار لکھی جس کی ایک سو دس جلدیں ہیں۔ کیا اہلسنت میں بھی حدیث کی اتنی ضخیم کتاب موجود ہے؟

اگر شیعہ خدانخواستہ سنت کے دشمن ہوتے تو وہ سنت کی اتنی ضخیم کتابیں کیوں لکھتے؟!

موصوف سے التماس ہے کہ وہ ہمیں سمجھائیں کہ سنت سے اُن کی مراد کیا ہے؟

اگر سنت سے صحاح ستہ کی روایات مراد ہیں تو وہ اہلسنت کے لیے حجت ہو سکتی ہیں شیعوں کے لیے نہیں۔ موصوف کی یہ بات بھی غلط ہے کہ شیعوں کی اکثر روایات سنت کی مختلف جہت کی ترجمانی کرتی ہیں چاہے اُس کا تعلق فہم سنت سے ہو، اُس کی تطبیق سے ہو یا اسانید و متون سے ہو۔ موصوف کو شاید یہ معلوم نہیں کہ حدیث کے متن، سند، فہم و تطبیق کے متعلق بھی شیعوں کی وہی رائے ہے جو اہلسنت کی ہے۔ شیعوں اور سنیوں کے اصول و ضوابط میں کوئی اختلاف نہیں ہے لہٰذا شیعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور اُس کے تقاضوں کی پابندی کرتے ہیں لیکن اہلسنت اپنے آپ کو ہی سنت رسولؐ کا پیروکار سمجھتے ہیں جو کہ سراسر ناانصافی ہے۔

ڈاکٹر غلامی بتائیں کہ کیا وہ اور اُن کے ہم مذہب دین کا محور ہیں اور باقی مذاہب کا قیاس اپنے اوپر کرتے ہیں؟ آخر اُن کو یہ اختیار کس نے دیا ہے؟ اور دنیا کی کون سی عدالت اس طرح کا فیصلہ کر سکتی ہے؟

۲۔ موصوف نے حقائق کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ انھوں نے قدم قدم پر تحریف سے کام لیا ہے۔ کہیں روایت کے متن کو ادھورا پیش کیا ہے جس سے مطلب بدل جاتا ہے۔

۱۔ ج ۱، ص ۳۰۷۔

اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ میں نے کوشش کی ہے کہ اکثر مقامات پر ایک ایک لفظ نقل کروں تاکہ غیر جانبداری کا اصول قائم رہے اور میں نے نقل قول کے لیے پوری عبارت کو نقل کرنا ضروری سمجھا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ علمی روش اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مخالف کے کلام کو مکمل نقل کیا جائے۔

ڈاکٹر ناصر عبداللہ غفاری سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آپ نے اپنی بات کی خود لاج بھی رکھی ہے؟ ان کی خیانت کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی جلد دوم کے صفحہ ۵۵۲ پر ابن بابویہ سے حدیث نقل کی کہ ابو بصیر کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ کیا اہل ایمان قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔

روایت کا اتنا حصہ لکھ کر انھوں نے کہا کہ رویت خداوندی کے عقیدے کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی تائید حاصل ہے۔

آیئے دیکھیں پوری روایت کیا ہے۔ اس روایت کو موصوف نے شیخ صدوق کی کتاب التوحید کے صفحہ ۱۱۷ سے نقل کیا ہے۔ روایت نقل کرنے میں موصوف نے خیانت کی ہے اور اس کا صرف ایک ٹکڑا نقل کیا ہے جس کی وجہ سے روایت کا مفہوم بدل گیا ہے۔ ہم پوری روایت نقل کرتے ہیں اور اس کا فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ روایت حسب ذیل ہے۔

ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اہل ایمان قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے؟

امام نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے تو قیامت سے قبل بھی اللہ کو دیکھ رکھا ہے۔

میں نے کہا: وہ کب؟

امام نے فرمایا: جب خدا نے روز الست ان سے میثاق لیا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ کیوں نہیں۔ یہ کہہ کر آپ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا:

اہل ایمان قیامت سے قبل اسے دنیا میں بھی دیکھتے ہیں۔ کیا تم اس وقت خدا کو نہیں دیکھ رہے؟

ابو بصیر نے کہا کہ میں آپ پر قربان جاؤں۔ کیا میں اس حدیث کو آپ کی نسبت سے بیان کر سکتا ہوں؟

امام نے فرمایا نہیں۔ اگر تم اسے بیان کرو گے تو ممکن ہے کہ کوئی اس کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے اور کہے کہ یہ تشبیہ ہے۔ اس طرح وہ اس کا انکار کر کے کافر ہو جائے جبکہ چشم دل سے دیکھنا اور ہے اور حاسہ چشم سے دیکھنا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ تشبیہ دینے والوں اور الحاد کرنے والوں کی گفتگو سے بہت بلند ہے۔

قارئین کرام! یہ ہے کتاب التوحید کی پوری روایت۔ جبکہ ڈاکٹر غفاری نے اپنے مقصد کے حصے کو نقل کیا اور باقی حصے کو چھوڑ دیا ہے۔ کیا اسی کو علمی دیانت کہتے ہیں؟

اگر موصوف میں علمی دیانت ہوتی تو وہ اس روایت کو بھی نقل کرتے

ایک خارجی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا:

ابو جعفر! آپ کس کی عبادت کرتے ہیں؟

امام نے فرمایا: میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔

خارجی نے کہا: کیا آپ نے اللہ کو دیکھا ہے؟

امام نے فرمایا ہاں۔ لیکن آنکھیں اپنی بینائی سے اسے نہیں دیکھ سکتیں۔ دل حقائق ایمان سے اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس سے اس کی شناخت اور حواس سے اس کا ادراک ممکن نہیں۔ اس کی شناخت اس کے آثار سے ہوتی ہے۔ اس کی شناخت دلائل کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں ظلم نہیں کرتا۔ بس وہی اللہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔[1]

۳۔ ڈاکٹر غفاری نے خدا کے لیے کیفیت کے اثبات کے لیے یہ روایت نقل کی ہے:

بحار الانوار میں مرقوم ہے کہ "سائل" نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا قیامت کے دن خدا کا دیدار ہوگا؟

امام نے فرمایا: سبحان اللہ! اللہ ان باتوں سے پاک ہے۔ آنکھیں تو بس وہی کچھ دیکھتی ہیں جن کا رنگ ہو اور کیفیت ہو جبکہ اللہ تو رنگ اور کیفیت کا خالق ہے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر غفاری لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام جعفر صادقؑ سے اس روایت کو تراشا ہے اُن کی ذاتی کیفیت کے متعلق یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس طرح سے ذات حق کے وجود کی نفی کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ سیدھی سی بات ہے کہ جس میں مطلقاً کیفیت نہ ہو اُس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔[2]

موصوف نے یہ عجیب قاعدہ بنایا ہے کہ جہاں مطلقاً کیفیت نہ ہو وہاں وجود بھی نہیں ہوتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موصوف کے پاس اتنی عقل ہی نہیں کہ وہ امام کے کلام کو سمجھ سکے اور اس میں اس کا چنداں قصور بھی نہیں کیونکہ جو عقل کعب الاحبار اور وہب بن منبہ کی روایات کی رسیا ہو اُس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کلام امام کو سمجھ سکے۔

ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ لفظ "مطلقاً" سے موصوف کی کیا مراد ہے؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں

۱۔ شیخ صدوق، احتجاج ج ۱، ص ۱۲۶۔۱۲۷۔ ۲۔ اصول مذہب الشیعہ ج ۲، ص ۵۵۱۔

کہ خدا مقولہ "کیف" کی کسی بھی کیفیت کا حامل نہیں ہے؟ اگر موصوف کی یہی مراد ہے تو واقعی اللہ تعالیٰ مقولات کیف کے دائرے سے باہر ہے، جہت اور مکان اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے اور جو اس بات کا قائل ہو کہ اللہ تعالیٰ "کیف" کی معروف صفات سے متصف ہے وہ کافر ہے اس لیے کہ کیفیات سے متصف ہونا مادہ کی صفت ہے۔ چونکہ کیفیت جسمانیت اور محدودیت کا ایک لازمہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نہ محدود ہے اور نہ مادہ ہے۔ ڈاکٹر غفاری نے بھی یہیں غلطی کھائی ہے اور انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیفیت رکھتا ہے۔ اُن کا یہ خیال اُن کی حسی فکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ صرف اسی چیز کا ادراک کر سکتے ہیں جو اُن کے حواس میں سما سکے۔ اسی لیے وہ بے کیف ذات کے تصور سے عاری اور اُس کے وجود سے انکاری ہیں۔

اگر ڈاکٹر غفاری کا مقصود وہ کیف ہے جو کیف کے مشہور مقولات کے دائرے سے باہر ہو تو پھر اسے کیف کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس صورت میں اُن کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ پھر انھوں نے اپنے خیال کی تائید اور شیعی روایت میں تضاد کو ثابت کرنے کے لیے روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: یہ بات کافی کی اس روایت سے تضاد رکھتی ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: "یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کیفیت ضرور رکھتا ہے مگر وہ ایسی کیفیت رکھتا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی اُس کا مستحق نہیں اور اُس کی کیفیت میں کوئی اُس کا شریک نہیں اور مخلوقات میں سے کوئی بھی اُس کی کیفیت کا نہ احاطہ کر سکتا ہے اور نہ اسے جان سکتا ہے۔[1]

قارئین جب مکمل روایت پڑھیں گے تو ڈاکٹر غفاری کا دعویٰ غلط ثابت ہو جائے گا

سائل کہتا ہے کہ اگر آپ نے اُس کے وجود کو ثابت کیا تو آپ نے اسے محدود قرار دیا امام علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اسے محدود نہیں کیا بلکہ میں نے اُس کا اثبات کیا ہے کیونکہ نفی و اثبات کے درمیان اور کوئی مرتبہ نہیں ہے۔

سائل نے پوچھا تو کیا وہ انیت و ماہیت رکھتا ہے؟

امام نے فرمایا ہاں۔ کوئی بھی چیز انیت و ماہیت کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔

سائل نے پوچھا کہ کیا خدا کیفیت بھی رکھتا ہے؟

امام نے فرمایا نہیں۔ کیونکہ کیفیت "جہت" توصیف اور احاطہ کی متقاضی ہے (یعنی جہت جس سے صفات مخلوقات کی توصیف کی جاتی ہے اور انسان اُس کا احاطہ کر سکتا ہے)۔

خدا کو تعطیل و تشبیہ کی جہت سے خارج ماننا ضروری ہے کیونکہ جو بھی اُس کی نفی کرتا ہے وہ خدا

---

[1] اصول مذہب الشیعہ

کا انکار کرتا ہے اور اُس کی ربوبیت کو باطل قرار دیتا ہے اور جو اُس کی دوسروں سے تشبیہ دیتا ہے وہ مخلوقات و مصنوعات جو کہ مستحق ربوبیت نہیں ہیں اُن کی صفات کا اُس ذات حق کے لیے اثبات کرتا ہے۔ اُس کے لیے ایسی کیفیت کا اثبات کرنا چاہیے کہ اُس کا غیر اُس کا مستحق نہ ہو اور اُس کیفیت میں اُس کا شریک نہ ہو۔ کوئی اُس کا احاطہ نہ کر سکے اور اُس کو نہ جان سکے۔[1]

قارئین کرام! اس روایت کو غور سے پڑھیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مؤلف کا یہ قول باطل ہے کہ "جو مطلقاً کیفیت نہ رکھتا ہو اُس کا تو وجود ہی نہیں ہوتا" اور مؤلف کے قول اور روایت کے الفاظ میں بڑا فرق ہے کیونکہ روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب سائل نے امام سے پوچھا کہ کیا خدا کیفیت رکھتا ہے؟ تو امام نے فرمایا کہ نہیں۔

حدیث کے ان الفاظ سے آپ نے اس قاعدے کی تردید کی جسے مؤلف ادھوری روایت سے ثابت کرنے کے درپے ہے۔ امام نے اس کیفیت کی نفی کی ہے جس کا تعلق موضوع کے عوارض سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا اس سے پاک ہے۔ نیز آپ نے فرمایا:

"کیفیت توصیف و احاطہ چاہتی ہے اور یہ بات خدا کے شایان شان نہیں ہے۔ البتہ امام نے حدیث کے آخر میں جس کیفیت کا اثبات کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ ایسی کیفیت کہ غیر اللہ جس کا مستحق نہ ہو اور اُس کیفیت میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہ ہو۔"

اگر اسے کیفیت کہا بھی جائے تو یہ کیفیت مجازی ہے کیونکہ ذات حق کی توصیف کے لیے الفاظ مطالب کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ اگر یہ کیفیت ہے تو صرف لفظی اشتراک کی بنیاد پر ہے لہٰذا لفظ مشترک ہے لیکن مفہوم مختلف ہیں۔ اس روایت کو شیخ صدوق نے بھی اسی سند اور اسی متن کے ساتھ نقل کیا ہے اور لکھا ہے "لیکن ذات کو ثابت کرنا چاہیے اور اُس کا اثبات ایسی کیفیت سے کیا جائے کہ دوسرے اُس کے مستحق نہ ہوں" کوئی اُس میں شریک نہ ہو اور کوئی اُس کا احاطہ نہ کر سکے اور کوئی اُس کی حقیقت کو جان نہ سکے۔[2]

۱۔ الشافی فی شرح الکافی ج ۳، ص ۶۳۔ ۲۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۱۴۷۔

علامہ شیخ محمد مظفر کی کتاب عقائد امامیہ (کتب تشیع مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی) میں ہے کہ "لوگ جن الفاظ سے مخلوقات کی تعریف کرتے ہیں خدا کی توصیف نہیں کر سکتے۔ وہ جسم نہیں ہے جو جگہ گھیرے نہ اس کی کوئی شکل و صورت ہے۔ وہ نہ جوہر ہے (کہ اس میں ابعاد ثلاثہ یعنی لمبائی، چوڑائی، گہرائی اور وقت پائے جائیں) اور نہ عرض ہے (کہ اس پر نوع بنوع کیفیتیں طاری ہوں) یعنی اس کے متعلق حرکت، سکون، بھاری پن، ہلکے پن، چال، ٹھہراؤ اور زمان و مکان کا خیال نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی طرف اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنا مثل، مقابل، مانند، بیٹا، ساتھی اور ساجھی نہیں رکھتا۔ کوئی اس جیسا نہیں ہے۔ (رضوانی)

حدیث کے یہ الفاظ ہر قسم کے اشتباہ کو دور کرتے ہیں اور نفی کیفیت کے مقصد کو بیان کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیفیت کا اثبات عین تشبیہ ہے اور نفی کیفیت کا مقصد صفات کمالیہ کا اثبات ہے جو کہ اُس کی عین ذات ہیں۔

﴿۲﴾ احسان الٰہی ظہیر کی تحریفات

احسان الٰہی ظہیر کو دوسرے مولفین کی بہ نسبت شیعوں سے زیادہ عداوت تھی۔ اُس نے تشیع کے رد میں جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے حسب ذیل کتابیں میری لائبریری میں موجود ہیں:

(۱) الشیعۃ والسنۃ (۲) الشیعۃ و اھل البیت

(۳) الشیعۃ والقرآن (۴) الشیعۃ والتشیع

اُس نے اپنی تمام توانائیاں سچ کو جھوٹ اور تنویر کو تاریکی ثابت کرنے میں صرف کر دی تھیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس میں خوش اخلاقی، صداقت اور دیانت کی کمی تھی۔ اُس نے شیعوں پر ایسی ایسی تہمتیں لگائی ہیں کہ الامان الحفیظ۔

میں ہر صاحب فکر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اُس کی کتابیں پڑھے اور دیکھے کہ اُس کا طرز تحریر کیسا تھا؟ وہ تہمتیں لگانے میں کتنا بیباک اور کس قدر تزویر کار تھا اور پھر اُس کی کتابوں کا شیعہ کتابوں سے موازنہ کرے۔ میں یہاں اُس کی کتابوں میں سے صرف چند اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں کیونکہ میں یہاں اُس کی تفصیلی تردید کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اُس نے حقائق میں جو تحریفات کی ہیں اُن کو نقل کرنے سے پہلے میں اُس کی طرز نگارش اور اسلوب و روش کے متعلق تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ ظہیر کا طرز نگارش انتہائی نفرت انگیز ہے۔ وہ جان بوجھ کر شیعہ عقائد کو غلط انداز میں پیش کرنے کا عادی تھا اور اُس کا اول و آخر مقصد یہی ہوتا تھا کہ قاری اور شیعہ عقائد کے درمیان پردہ ڈال دیا جائے جبکہ یہ انداز علمی تنقید سے بہت دور ہے۔ اگر اُس میں دیانت کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ شیعہ عقائد اور اُن کے دلائل بیان کرتا۔ پھر اُن پر تنقید کرتا اور اپنے عقائد کا اثبات کرتا۔

اُس کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔ وہ اپنی کتاب الشیعۃ والسنۃ کے صفحہ ۶۳ پر "بداء" کے زیر عنوان لکھتا ہے: "یہودیوں اور عبداللہ بن سبا کے ذریعے سے جن افکار کی ترویج ہوئی اُن میں مسئلہ بداء بھی شامل ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ خدا پر "بداء" طاری ہوتا ہے جبکہ بداء کا معنی فراموشی اور جہالت ہے۔ اللہ اُن کی ان باتوں سے منزہ ہے۔"

پھر اُس نے شیعہ کتابوں سے بداء کی روایات نقل کی ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ وہ بداء کا وہ مفہوم بیان کرتا جس کے شیعہ قائل ہیں۔ پھر وہ اُن دلائل کا تذکرہ کرتا جسے شیعہ اثبات بداء کے لیے پیش کرتے ہیں۔ شیعہ بداء کا اثبات قرآن کریم کی آیات اور بخاری و مسلم کی روایات سے کرتے ہیں اور اس مسئلے کو علمائے الہیات اور عقل کی تائید بھی حاصل ہے لیکن ظہیر نے اپنی طرف سے بداء کے معنی بیان کرکے اس کی بنیاد پر شیعی روایات کا مفہوم بیان کیا ہے۔

تقیہ کے متعلق بھی ظہیر کی روش یہی ہے۔ اُس نے اپنی کتاب الشیعۃ والسنۃ کے صفحہ ۱۵۳ پر الشیعۃ والکذب کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ "گویا شیعہ اور جھوٹ دونوں مترادف ہیں۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس دن سے شیعہ مذہب کی تاسیس ہوئی ہے اسی دن سے جھوٹ اُن کی اساس میں شامل رہا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا ہی جھوٹ سے ہوئی ہے۔"

پھر اُس نے یہ دلیل بیان کی کہ تشیع کا تعلق جھوٹ کی نسل سے ہے اسی لیے انھوں نے جھوٹ کو تقدس کا جامہ پہنانے کے لیے اُس کا نام "تقیہ" رکھا ہے۔

قارئین کرام! بتایئے کیا علمی مناقشہ کا انداز یہی ہوتا ہے کہ انسان کسی علم کے بغیر دوسروں کی توہین کرے اور اُن کے عقائد کا مذاق اڑائے۔ اُس نے کس دلیل کی بنیاد پر تقیہ کو جھوٹ کہا ہے؟ جبکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے ارشاد باری ہے: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً مومنوں کو چاہیے کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ جو کوئی ایسا کرے گا اُس سے خدا کا کچھ تعلق نہیں۔ ہاں! اگر تم اُن سے تقیہ کرو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ (سورۂ آل عمران آیت ۲۸) اور مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ۔ جو کوئی ایمان لانے کے بعد خدا کا انکار کرے مگر وہ اس سے مستثنیٰ ہے جو مجبور ہوکر ایسا کرے اور اُس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ (سورۂ نحل آیت ۱۰۶)

تقیہ ایمان کو چھپانے اور اُس کے متضاد کے اظہار کا نام ہے۔ تقیہ اُس وقت جائز ہے جب انسان کو اپنی جان، مال اور عزت کے لٹنے کا خوف ہو۔ تقیہ کے جواز کے لیے علمائے مسلمین میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ شریعت کا یہ فیصلہ ہے کہ مجبوری کے تحت کیے جانے والے افعال کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ بعض اوقات تو تقیہ واجب ہو جاتا ہے اور جب اُس کا نقصان دوسرے مسلمانوں کو پہنچتا ہو یا دین و رسالت کے تحفظ کے لیے اُس کی ضرورت ہو تو تقیہ واجب ہو جاتا ہے۔

مومن آلِ فرعون کی بھی یہی روش تھی جس کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اضطرار کی حالت میں حرام چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور اُن (حرام کردہ اشیاء) میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اُس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۳ ترجمہ: مولانا مودودی)۔[1]

لیکن ان حقائق کے باوجود احسان الٰہی ظہیر کا مقصد دروغ گوئی ہے۔ وہ تقیہ کا معنی جھوٹ کرتا ہے۔ گویا یہ معنی مسلم ہیں۔ جب اُس نے قارئین کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ تقیہ کے معنی جھوٹ ہے تو پھر اُس نے تقیہ کے متعلق شیعہ احادیث نقل کیں جس سے اُس کتاب کے قارئین نے یہ تاثر لیا کہ شیعہ مذہب میں تقیہ جائز ہے بالفاظ دیگر شیعیت میں جھوٹ جائز ہے۔

میں یہاں تقیہ کا اثبات کرنا نہیں چاہتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کا تعلق اہل بحث و استدلال سے نہیں تھا۔ وہ ایک بھی مضبوط دلیل ایسی پیش نہیں کر سکا جس کا رد ضروری ہو۔ ہمیں یہاں مسئلے کی تائید و تردید مطلوب نہیں ہے۔ صرف اُس کے طرز نگارش کو بتانا مقصود ہے۔

۲۔ اپنے عقیدے کی بنیاد پر دوسروں کے عقائد کی توہین کرنا ایک غیر منطقی فعل ہے اور یہی کچھ ظہیر اور دوسرے شیعہ مخالفین کی روش ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن سے اختلاف کرنے والا واجب القتل، گمراہ اور بدعتی ہے اور اُن کی نماز، روزہ اور زکات کے طریقے سے جس نے بھی اختلاف کیا انھوں نے فوراً اُس پر بے دین اور بدعتی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ لوگ کب سے دین کا محور اور امت کے اکابر بنے ہیں۔ آخر وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اسلام کے تمام مسائل اُن کی ذات کے گرد گردش کریں۔ انھوں نے اس قاعدے کو کیوں فراموش کر دیا ہے کہ "ہم دلیل کے ساتھ ہیں دلیل جدھر لے جائے ہم اُدھر جائیں گے۔"

ظہیر اور اُس کے ہم قبیلہ اہل قلم کی یہ روش علمی مباحثے کے خلاف ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ فریقین کو یکساں قرار دیا جائے۔ خدا نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ تعلیم دی ہے کہ انھوں نے کفار و مشرکین سے کس طرح مباحثہ کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

۱۔ مولانا مودودی ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔ "اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت میں ہو مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے۔ (حرجم)

ہم اور تم یا تو ہدایت پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں۔ (سورۂ سبا: آیت ۲۴)

اس اخلاقی انداز کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ پیغمبر کریمؐ یہ نہیں فرماتے کہ میں حق پر ہوں اور تم گمراہ ہو بلکہ فرماتے ہیں کہ یا تو ہم یا تم حق پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔

یہ ہے قرآن مجید کی روش۔ اس نے سب کو بحث کی آزادی عطا کی ہے اور فرمایا ہے:

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ (اے رسولؐ) آپ کہہ دیں کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱)

رسول اسلامؐ کا طریقہ تھا کہ آپ مخالفین کی باتوں کو توجہ سے سنتے تھے اور بڑی شفقت سے ان کا جواب دیتے تھے۔ قرآن مجید میں پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے انبیائے کرامؑ کی تبلیغ کے نمونے موجود ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود اور حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی داستانوں سے ہمیں تبلیغ کے اصول کا پتا چلتا ہے۔ خدا نے کافروں کے دلائل کو بھی قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے اور جن آیات میں کافروں کے دلائل مذکور ہیں وہ بھی اتنی ہی مقدس ہیں جتنی باقی آیات مقدس ہیں اور فقہ جعفری کے مطابق انسان وضو کے بغیر ان آیات کو چھو نہیں سکتا۔

قرآن کریم کی روش ملاحظہ فرمائیں اور پھر احسان الٰہی ظہیر وغیرہ کی روش دیکھیں تو آپ کو ان میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دے گا مگر اس متضاد روش کے باوجود ظہیر یہ فخر کرتا ہے کہ وہ اور اس کے بھائی دن رات قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔[1]

اگر کوئی شخص قرآن کی تلاوت کرے لیکن قرآن میں تدبر نہ کرے اور قرآنی بصیرت سے اپنے خانۂ دل کو منور نہ کرے تو اس تلاوت کا کیا فائدہ ہے؟

حضرت امیرالمومنینؑ نے بے بصیرت قاریوں کے متعلق کیا ہی خوب فرمایا تھا:

كَمْ مِنْ قَارِئٍ يَلْعَنُهُ الْقُرْآنُ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ قرآن کے کتنے ہی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جن پر قرآن لعنت کرتا ہے۔

ظہیر نے اپنی کتاب الشیعۃ واھل البیت کے صفحہ ۳۸ پر نہج البلاغہ سے امام علیؑ کے مکتوب کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام علیؑ خلافت کے لیے نص کی بجائے شوریٰ کو اساس قرار دیتے تھے اور آپ مہاجرین و انصار کے اجتماع کو رضائے الٰہی کا مظہر سمجھتے تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ مہاجرین و انصار کی شوریٰ کے بغیر امامت کا انعقاد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نظریہ شیعی نظریہ امامت سے متصادم ہے۔

ظہیر نے اپنے مقصد کے اثبات کے لیے نہج البلاغہ سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

---

[1] الشیعۃ والقرآن ص ۷۔

اِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَّسَمُّوْهُ اِمَامًا کَانَ ذٰلِکَ رِضًا لِلّٰهِ ، فَاِنْ خَرَجَ مِنْهُمْ خَارِجٌ بِطَعْنٍ اَوْ بِدْعَةٍ رَدُّوْهُ اِلٰی مَا خَرَجَ مِنْهُ ، فَاِنْ اَبٰی قَاتَلُوْهُ عَلٰی اتِّبَاعِهِ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَوَلّٰاهُ اللّٰهُ مَا تَوَلّٰی یعنی شوریٰ کا حق صرف جاجرین اور انصار کو ہے۔ وہ اگر کسی پر اتفاق کرلیں اور اسے خلیفہ سمجھ لیں تو اسی میں اللہ کی رضا اور خوشنودی سمجھی جائے گی۔ اب جو کوئی اس کی شخصیت پر اعتراض یا نیا نظریہ اختیار کرتا ہوا الگ ہوجائے تو اسے وہ سب اسی طرف واپس لائیں گے جدھر سے وہ منحرف ہوا ہے اور اگر انکار کرے تو اس سے لڑیں کیونکہ وہ مومنوں کے طریقے سے ہٹ کر دوسری راہ پر ہولیا ہے۔ اور جدھر وہ پھر گیا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسے ادھر ہی پھیر دے گا۔

جب میں نے نہج البلاغہ اٹھا کر دیکھی تو مجھے حیرت ہوئی کہ ظہیر نے عبارت نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔ اُس نے امیرالمومنینؑ کے مکتوب سے اپنے مقصد کی بات نکال کر لکھ دی ہے اور خط کے ابتدائی اور آخری حصے کو چھوڑ دیا ہے۔

احسان الٰہی ظہیر نے مکتوب کے سیاق وسباق کو بھی چھوڑ کر حقیقت میں تحریف کی ہے۔

ذیل میں ہم امام علیؑ کا خط نقل کرتے ہیں جو آپ نے معاویہ کو لکھا تھا۔ معاویہ چونکہ شوریٰ کی بنیاد پر خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو صحیح سمجھتا تھا اس لیے آپ نے اُس سے کہا کہ اگر بالفرض تم میری خلافت کے لیے نص کے منکر ہو تو کم از کم مہاجرین وانصار کے شوریٰ کا ہی بھرم رکھ لو اور خلفائے ثلاثہ بھی تو شوریٰ کے منتخب کردہ تھے۔ اگر تم اُن کی خلافت کو جائز سمجھتے ہو تو کیا وجہ ہے کہ میری خلافت سے منحرف ہو؟ مباحثے کی زبان میں اس طرح کے جواب کو جواب الزام[1] کہا جاتا ہے۔ امام کا خط یہ ہے جو مکتوبات نہج البلاغہ میں سے چھٹا مکتوب ہے۔

اِنَّهٗ بَایَعَنِی الْقَوْمُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا اَبَا بَکْرٍ وَّ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ عَلٰی مَا بَایَعُوْهُمْ عَلَیْهِ ، فَلَمْ یَکُنْ لِلشَّاهِدِ اَنْ یَّخْتَارَ وَلَا لِلْغَائِبِ اَنْ یَّرُدَّ ، وَاِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ ، فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَّسَمُّوْهُ اِمَامًا کَانَ ذٰلِکَ لِلّٰهِ رِضًی فَاِنْ خَرَجَ مِنْ اَمْرِهِمْ خَارِجٌ بِطَعْنٍ اَوْ بِدْعَةٍ رَدُّوْهُ اِلٰی مَا خَرَجَ مِنْهُ فَاِنْ اَبٰی قَاتَلُوْهُ عَلٰی اتِّبَاعِهِ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَوَلّٰاهُ اللّٰهُ مَا تَوَلّٰی وَلَعَمْرِیْ یَا مُعَاوِیَةُ لَئِنْ نَظَرْتَ بِعَقْلِکَ دُوْنَ هَوَاکَ لَتَجِدَنِّیْ اَبْرَاَ النَّاسِ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ ، وَلَتَعْلَمَنَّ اَنِّیْ کُنْتُ فِیْ عُزْلَةٍ عَنْهُ ، اِلَّا اَنْ تَتَجَنّٰی ، فَتَجْنِیْ مَا بَدَا لَکَ وَالسَّلَامُ۔ جن لوگوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، انھوں نے میرے ہاتھ پر اسی اصول کے مطابق بیعت کی جس اصول پر وہ ان کی بیعت کرچکے تھے اور

۱۔ فقہ میں بھی قاعدہ الزام کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ فقہاء کے نزدیک اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ کسی فقہ کے ماننے والے پر اس کی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ دوسری فقہ کے ماننے والوں پر وہ فقہ لاگو نہیں ہوتی۔ (رضوانی)

اسی کی بنا پر جو حاضر ہے اسے پھر نظر ثانی کا حق نہیں اور جو بروقت موجود نہ ہو اسے رد کرنے کا اختیار نہیں اور شوریٰ کا حق صرف مہاجرین و انصار کو ہے۔ وہ اگر کسی پر ایکا کرلیں اور اسے خلیفہ سمجھ لیں تو اسی میں اللہ کی رضا اور خوشنودی سمجھی جائے گی۔ اب جو کوئی اس کی شخصیت پر اعتراض یا نیا نظریہ اختیار کرتا ہوا الگ ہو جائے تو اسے وہ سب اسی طرف واپس لائیں گے جدھر سے وہ منحرف ہوا ہے اور اگر انکار کریں تو اس سے لڑیں کیونکہ وہ مومنوں کے طریقے سے ہٹ کر دوسری راہ پر ہولیا ہے اور جدھر وہ پھر گیا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسے اُدھر ہی پھیر دے گا۔

اے معاویہ! میری جان کی قسم! اگر تم اپنی نفسانی خواہشوں سے دور ہو کر عقل سے دیکھو تو سب لوگوں سے زیادہ مجھے عثمانؓ کے خون سے بری پاؤ گے مگر یہ کہ تم بہتان باندھ کر کھلی ہوئی چیزوں پر پردہ ڈالنے لگو۔ والسلام۔[1] (ترجمہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ)

۱۔ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ نے اس خط کو نقل کرنے کے بعد یہ خوبصورت بحث کی ہے۔

جب امیر المومنینؑ کے ہاتھ پر تمام اہل مدینہ نے بالاتفاق بیعت کرلی تو معاویہ نے اپنے اقتدار کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے بیعت سے انکار کر دیا اور آپ کی خلافت کی صحت کو محل نظر قرار دینے کے لیے یہ عذر تراشا کہ یہ عمومی انتخاب سے قرار نہیں پائی لہٰذا اس انتخاب کو مسترد کر کے دوبارہ انتخاب ہونا چاہیے۔ حالانکہ جس خلافت سے اصول انتخاب کی بناء پڑی وہ ایک ناگہانی صورتحال کا نتیجہ تھی جس میں عام افراد کی رائے دہندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے عمومی اختیار کا نتیجہ کہا جاسکے۔ البتہ عوام پر اس کی پابندی عائد کر کے اسے "فیصلہ جمہوریہ" سے تعبیر کرلیا گیا۔ جس سے یہ اصول قرار پا گیا کہ جسے اکابر مدینہ منتخب کرلیں وہ تمام دنیائے اسلام کا نمائندہ متصور ہوگا اور کسی کو اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ ہوگی خواہ وہ انتخاب کے موقع پر موجود ہو یا نہ ہو۔ بہرصورت اس اصول کے قرار پا جانے کے بعد معاویہ کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ دوبارہ انتخاب کی تحریک یا بیعت سے انکار کرے جبکہ وہ عملی طور پر ان خلافتوں کو صحیح تسلیم کر چکا تھا کہ جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کے اہل حل و عقد نے طے کی تھیں۔ چنانچہ جب اس نے اس انتخاب کو غلط قرار دیتے ہوئے بیعت سے انکار کیا تو امیر المومنینؑ نے اصول انتخاب کو اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس پر حجت تمام کی اور یہ وہی طرز کلام ہے جسے فَرْضُ الْبَاطِلِ مَعَ الْخَصْمِ حَتّٰی تَلْزَمَهُ الْحُجَّةُ (حریف کے سامنے اس کے غلط مسلمات کو پیش کر کے اس پر حجت قائم کرنا) سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ کسی مرحلے پر امیر المومنینؑ نے خلافت کی حجت کا معیار شوریٰ اور رائے عامہ کو نہیں سمجھا ورنہ جن خلافتوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مہاجرین و انصار کے اتفاق رائے سے قرار پائی ہیں آپ اس رائے عامہ کو سند و حجت سمجھتے ہوئے ان کو صحیح و درست سمجھتے مگر آپ کا دور اول ہی میں بیعت سے انکار کر دینا کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اس کی دلیل ہے کہ آپ ان ساختہ اصولوں کو خلافت کا معیار نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ ہر دور میں اپنے استحقاق خلافت کو پیش کرتے رہے کہ جو رسول اللہؐ سے قولاً و عملاً ثابت تھا مگر معاویہ کے مقابلے میں اسے پیش کرنا سوال و جواب کے دروازے کھول دینا تھا اس لئے اسی کے مسلمات و معتقدات سے اسے قائل کرنا چاہا ہے تاکہ اس کے لیے تاویلات کے الجھاوے ڈالنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے ورنہ وہ تو یہ چاہتا ہی تھا کہ کسی طرح بات بڑھتی جائے تاکہ کسی موڑ پر اس کے متزلزل اقتدار کو سہارا مل جائے۔ (مترجم)

اس خط کے ذریعے سے آپ نے معاویہ پر حجت قائم کی کہ جب تم شوریٰ کی اساس پر خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو صحیح اور جائز کہتے ہو تو پھر میری خلافت کا انکار کیوں کرتے ہو؟ اور جس شوریٰ کو تم رضائے الٰہی کا مظہر سمجھتے ہو اسی شوریٰ نے بھی تو میری بیعت کی ہے لہٰذا تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں یا تو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا انکار کرو یا پھر مجھے بھی خلیفہ تسلیم کرو۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

اگر احسان الٰہی ظہیر امیرالمومنینؑ کے پورے خط کو نقل کرتا تو اس کا مقصد پورا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس نے خیانت کرتے ہوئے درمیان میں سے ایک اقتباس نقل کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ دھوکا دے سکے کہ امام علیؑ بھی شوریٰ کے قائل تھے۔

۳۔ احسان الٰہی ظہیر نے تفسیر منسوب بہ امام حسن عسکریؑ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ امام حسن عسکریؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص آل محمدؐ یا رسول خداؐ کے صالح اصحاب میں سے کسی سے دشمنی رکھے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسا عذاب دے گا کہ اگر اس عذاب کو تمام مخلوق پر بھی تقسیم کیا جائے تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔[1]

اس کے بعد موصوف نے لکھا کہ امام حسن عسکریؑ کے جد امجد علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے جو کہ شیعوں کے آٹھویں امام ہیں پوچھا گیا کہ آپ رسول خداؐ کی ان احادیث کے متعلق کیا کہتے ہیں اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمِ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ. میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پالو گے اور دَعُوْا لِیْ اَصْحَابِیْ میرے اصحاب سے تعرض نہ کرنا۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[2]

مذکورہ دو روایات نقل کرنے سے اس کا مقصد یہ ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ تمام صحابہ کو عادل مانتے تھے لہٰذا کسی شیعہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صحابی پر تحقیق اور تنقید کرے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ ائمہ اہلبیتؑ کی تعلیمات کی مخالفت کرتا ہے۔

آیئے اب اس روایت کا مطالعہ کریں تاکہ احسان الٰہی ظہیر کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا جا سکے۔ ظہیر نے مذکورہ اقتباس عیون اخبار الرضاؑ سے نقل کیا ہے۔ اب ہم عیون اخبار الرضاؑ سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں پھر فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں

"راوی کا بیان ہے کہ میرے والد نے کہا کہ میں نے امام علی رضاؑ سے پوچھا کہ آپ حدیث رسولؐ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ اور دَعُوْا لِیْ اَصْحَابِیْ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں تو امام نے فرمایا کہ یہ

---

[1] احسان الٰہی ظہیر، الشیعۃ و اھل البیت ص ۳۰۔

حدیث صحیح ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اکرمؐ کے بعد دین میں کوئی رد و بدل نہیں کیا تھا۔

امام سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ لوگوں نے دین میں رد و بدل کیا تھا؟

آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ خود ہی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میرے اصحاب میں سے کچھ افراد ایسے ہوں گے جنھیں قیامت کے دن میرے حوض سے اس طرح ہٹا دیا جائے گا جیسا کہ ناشناسا اونٹوں کو پانی سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اُس وقت میں کہوں گا کہ پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں۔ یہ میرے اصحاب ہیں۔ اُس وقت مجھ سے یہ کہا جائے گا کہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا۔ اس وقت انھیں بائیں پہلو میں لے جایا جائے گا یعنی انھیں اصحاب الشمال کی صف میں کھڑا کر دیا جائے گا۔ اس وقت میں کہوں گا کہ خدا کی رحمت سے وہ دور ہو جائیں جو میرے بعد بدل گئے تھے۔ تو کیا رسول خداؐ یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے کہیں گے جنھوں نے کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا ہوگا۔"[1]

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں کہ احسان الٰہی ظہیر نے کس طرح سے پوری حدیث کے مفہوم کو بدلنے کی کوشش کی ہے!!

امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ اس حدیث کو السنہ کے محدثین و حفاظ نے بیان کیا ہے۔ امام کے بیان کی تصدیق کے لیے ہم بخاری و مسلم کی چند روایات کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

بخاری نے اس حدیث کو سورۂ مائدہ کی تفسیر جلد ۶، صفحہ ۶۶ اور ۱۲۲ پر باب یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ اور تفسیر سورۂ انبیاء میں نقل کیا ہے۔

ترمذی نے حدیث حوض کو صفات روز قیامت کے ابواب باب ما جاء فی شان الحشر جلد ۴ صفحہ ۶۱۵ حدیث ۲۴۲۳ اور تفسیر سورۂ انبیاء جلد ۵ صفحہ ۳۲۱۔۳۲۲ حدیث ۳۱۶۷ میں نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میری امت کے کچھ افراد کو لایا جائے گا۔ انھیں بائیں سمت لے جایا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ پروردگار! یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا۔ اُس وقت میں بھی وہی کہوں گا جو خدا کے صالح بندے (عیسیٰؑ بن مریمؑ) نے کہا تھا: وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ جب تک میں اُن میں رہا میں اُن پر گواہ رہا اور جب تو نے مجھے اپنی طرف بلا لیا تو تو خود ہی اُن کا نگران ہے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۱۱۷) اُس وقت مجھ سے کہا جائے گا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ لوگ

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ ج ۲، ص ۸۷، حدیث ۳۳۔

الٹے پاؤں پھر گئے تھے۔

اس کے علاوہ بخاری، ابن ماجہ اور مسند احمد بن حنبل میں بھی یہ روایت ان الفاظ سے مرقوم ہے۔[1]

میرے کچھ صحابی میرے حوض کے کنارے پر آئیں گے۔ جیسے ہی میں انھیں پہچانوں گا انھیں مجھ سے دور کر دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں۔ اس وقت مجھ سے کہا جائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ انھوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ سے وارد ہے۔[2]

"کچھ لوگ میرے حوض پر لائے جائیں گے۔ میں جیسے ہی انھیں دیکھوں گا تو انھیں مجھ سے دور کر دیا جائے گا۔ میں کہوں گا خدایا! یہ میرے اصحاب ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو علم نہیں ہے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا تھا۔"

یہ حدیث صحیح بخاری میں ان الفاظ سے بھی مرقوم ہے۔[3]

میں تم سے پہلے حوض کوثر پر وارد ہوں گا اور جو بھی میرے پاس میرے حوض کا پانی پیے گا وہ پیاسا نہ رہے گا۔ میرے پاس ایک گروہ ایسا آئے گا جنھیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا تھا۔ میں کہوں گا کہ ہلاک ہو جائیں، ہلاک ہو جائیں وہ لوگ جو میرے بعد بدل گئے تھے۔

میں حدیث حوض پر تفصیلی بحث کر کے موضوع سے خارج نہیں ہونا چاہتا ورنہ میں اس حدیث کو تفصیل سے بیان کرتا۔ میں یہاں احسان الٰہی ظہیر کی روح کو مخاطب کر کے پوچھتا ہوں کہ اگرچہ احادیث شیعہ کی تحریف کے لیے تمہارے ہاتھ لمبے تھے لیکن تم اپنی کتب صحاح کی احادیث میں تحریف کرنے سے قاصر رہے۔

۴۔ احسان الٰہی ظہیر نے اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۲۲ پر نہج البلاغہ سے امام علی علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کیا ہے اور اسے نقل کرنے میں دیانت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ لوگوں نے جب امام علیؑ کی بطور خلیفہ بیعت کرنا چاہی تو انھوں نے فرمایا: ذَرُونِی، وَالْتَمِسُوا

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الحوض ج ۸، ص ۱۲۶۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الخطبة یوم النحر ج ۲، ص ۱۰۲۶، حدیث ۳۰۵۷۔

۲۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل، باب اثبات حوض نبینا ج ۴، ص ۱۸۰۰، حدیث ۳۰۔

۳۔ صحیح بخاری ج ۸، ص ۱۲۵۰۔

غَيْرِيْ فَلَسْنَا تُكْرِهُكُمْ وَلَعَلِّيْ اَسْمَعُكُمْ وَاَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَلَّيْتُمُوْهُ اَمْرَكُمْ ، وَاَنَا لَكُمْ وَزِيْرًا خَيْرٌ لَكُمْ مِنِّيْ اَمِيْرًا مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) میرے سوا کسی اور کو اختیار کر لو۔ پھر جیسے تم ہو ویسا میں ہوں اور ہوسکتا ہے کہ تم جسے اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا امیر ہونے سے تمہارے لیے وزیر ہونا بہتر ہے۔

جب میں نے احسان الٰہی ظہیر کے اس حوالے کے لیے نہج البلاغہ کی طرف رجوع کیا تو وہاں معاملہ بالکل ہی الگ تھا۔ موصوف اتنے بڑے "دیانتدار" ہیں کہ انھوں نے امام کے خطبے سے ابتدائی کلمات لیے اور درمیان کا حصہ چھوڑ کر پھر آخری کلمات نقل کیے۔ ممکن ہے کہ ہمسفر کے ہاں اس خیانت کو ہی تحقیق کہا جاتا ہو!!

ذیل میں ہم حضرت کا پورا خطبہ نقل کرتے ہیں۔ اس خطبے کا پس منظر یہ ہے کہ جب لوگوں نے قتل عثمانؓ کے بعد آپ کی بیعت کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا دَعُوْنِيْ وَالْتَمِسُوْا غَيْرِيْ فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَهُ وُجُوْهٌ وَّاَلْوَانٌ لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُوْلُ وَاِنَّ الْآفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ وَاعْلَمُوْا اَنِّيْ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ وَلَمْ اُصْغِ اِلٰى قَوْلِ الْقَائِلِ وَعَتْبِ الْعَاتِبِ وَاِنْ تَرَكْتُمُوْنِيْ فَاَنَا كَاَحَدِكُمْ وَلَعَلِّيْ اَسْمَعُكُمْ وَاَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَلَّيْتُمُوْهُ اَمْرَكُمْ وَاَنَا لَكُمْ وَزِيْرًا خَيْرٌ لَكُمْ مِنِّيْ اَمِيْرًا مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) میرے سوا کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں۔ جسے نہ دل برداشت کر سکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ افق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور راستا پہچاننے میں نہیں آتا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں، تو تمھیں اس راستے پر لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہیں دھروں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا میں ہوں اور ہوسکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا (تمہارے دنیوی مفاد کے لیے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔[1]

قارئین کرام! آپ نے احسان الٰہی ظہیر کی "دیانت" ملاحظہ فرمائی۔ اس نے خطبے کے متن کو درمیان سے حذف کر دیا ہے جس سے مطلب مختلف ہوگیا۔

کیا ظہیر صاحب بتا سکتے ہیں کہ اس علمی خیانت کو کیا نام دینا چاہیے؟! کیا وہ یہ بتانا پسند کریں گے کہ ہمسفرؒ پر جھوٹ باندھنے والا کون ہے؟!

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۹۰۔

جھوٹ صرف یہ نہیں کہ انسان کسی کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو اُس نے نہ کہی ہو۔ جھوٹ یہ بھی ہے کہ کسی کی بات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔

سبحان اللہ! امیرالمومنینؑ دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ بیعت پر قائم نہ رہیں گے، آپ کو چھوڑ دیں گے اور کبھی جمل، کبھی صفین اور کبھی نہروان کے میدان میں مدمقابل ہوں گے اور ہزاروں بہانے تراشیں گے۔ اسی لیے آپ نے اُن پر حجت تمام کی اور اپنی حکومت کی پالیسی اُن کے سامنے رکھی۔ آپ کی یہ روش حقیقت پر مبنی تھی اور حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ یعنی اُن کی اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے۔ (سورۂ مومنون آیت ۷۰)

امام علیؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بحرف سچ ثابت ہوا اور لوگوں نے آپ کی بیعت کر کے توڑ دی تھی۔

۵۔ ظہیر نے قدم قدم پر فریب سے کام لیا ہے۔ اگر ہم اُس کی تمام غلط بیانیوں کو نقل کریں تو کتاب کا حجم بڑھ جائے گا اس لیے ہم بطور اختصار صرف یہی تبصرہ کرنا چاہتے ہیں کہ احسان الٰہی ظہیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وہ اپنے آپ سے بھی سچ نہیں بولتا تھا۔ اُس نے جتنی تحریفات کی ہیں وہ اہلبیتؑ کی دشمنی میں آکر کی ہیں ورنہ کوئی بھی صاحب شعور انسان اس قدر انحراف اور تحریف کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔

اُس نے اپنی کتاب الشیعۃ و اھل البیت کے صفحہ ۶۷ پر لکھا ہے: طبری نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ امام علیؑ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو قبول کر لیا تھا اور اُن کی امامت کا اقرار کیا تھا اور انھیں اپنا امیر مان کر اُن کی بیعت کی تھی۔

وہ یہ کہتا ہے کہ اسامہؓ بن زیدؓ نے جنگ کے لیے مدینہ سے روانگی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ رسول اکرمؐ کی وفات ہوگئی۔ جب اسامہؓ نے آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سنی تو وہ مدینہ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گرد جمع تھے۔ وہ امام علیؑ کی تلاش میں گئے اور اُن سے پوچھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟

امام علیؑ نے فرمایا: جو کچھ دیکھ رہے ہو وہی کچھ ہے۔

اسامہؓ نے کہا کہ کیا آپ نے ابوبکرؓ کی بیعت کی ہے؟

امام علیؑ نے کہا: ہاں۔

ظہیر نے اس واقعے کو احتجاج طبری سے نقل کیا ہے۔ اب آیئے احتجاج طبری سے مکمل روایت نقل کریں تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ احسان الٰہی ظہیر نے کتنا سچ لکھا ہے؟

امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ آپ اسامہؓ بن زیدؓ کو خط لکھیں کہ وہ واپس آجائیں۔ اُن کی واپسی سے ہماری گمشدہ آبرو لوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے اسامہؓ کو اس مضمون کا خط لکھا:

خلیفہ رسولؐ ابوبکر کی طرف سے اسامہ بن زید کے نام۔

امابعد! جب تمھیں میرا خط ملے تو تم اپنے ساتھیوں سمیت واپس آجاؤ۔ مسلمانوں نے مجھ پر اجماع کیا ہے اور انھوں نے مجھے اپنا ولی امر مقرر کیا ہے لہٰذا نافرمانی نہ کرنا ورنہ اسے حکم عدولی سمجھا جائے گا اور تمہارے لیے اس کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔ والسلام

اسامہؓ نے اس خط کے جواب میں لکھا:

جنگ شام کے لیے رسول خداؐ کے نمائندے اسامہ بن زید کی طرف سے۔

امابعد! واضح ہو کہ مجھے تمہارا خط مل گیا ہے۔ اس خط کے ابتدائی اور آخری حصے میں تناقض ہے۔ تم نے خط کی ابتدا میں اپنے آپ کو رسول خداؐ کا خلیفہ لکھا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے تم پر اجماع کیا ہے اور اپنا حکمران مقرر کیا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تم کو نہ تو قبول کیا ہے اور نہ ہم تمہاری حکومت سے راضی ہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ حق حقدار کو لوٹا دو کیونکہ وہ تم سے بڑھ کر اس کا حقدار ہے۔ مجھے وہ سب اچھی طرح سے یاد ہے جو کچھ رسول خداؐ نے غدیر کے دن علیؑ کے متعلق کہا تھا۔ ابھی اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ وہ واقعہ ہمارے ذہن سے محو ہوجائے۔ لہٰذا تم اپنی حیثیت کو پہچانو اور نافرمانی مت کرو کیونکہ اس میں خدا اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی ہے۔ تمہارے اس اقدام سے اُس کی نافرمانی ہو رہی ہے جسے رسول خداؐ نے تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اعلان غدیر کے تھوڑے عرصے بعد رسول خداؐ کی وفات ہوئی ہے۔ رسول خداؐ نے تمھیں میری قیادت میں روانہ ہونے کا حکم دیا تھا لیکن تم اور تمہارے ساتھی واپس چلے گئے اور تم نے واپس جاکر آنحضرتؐ کے حکم کی نافرمانی کی ہے اور بلا اجازت مدینہ میں رہائش اختیار کرلی ہے۔

جب حضرت ابوبکر نے اسامہؓ بن زیدؓ کا خط پڑھا تو انھوں نے خلافت کا عہدہ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے اُن سے کہا کہ ایسا نہ کریں۔ یہ بار ہمن خلافت خدا نے آپ کو پہنایا ہے۔ آپ اسے نہ اتاریں ورنہ آپ کو پشیمانی ہوگی۔ آپ اسامہؓ کو مسلسل خطوط لکھ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں اور اپنے فلاں فلاں دوستوں سے کہیں کہ وہ بھی اسامہؓ کو واپس آنے کا مشورہ دیں اور اسے لکھیں کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالے اور اس حکومت کو تسلیم کرلے جسے باقی مسلمان تسلیم کرچکے ہیں۔ پھر حضرت ابوبکر اور چند منافقین نے اسامہؓ کو خطوط لکھے کہ ہم نے جس امر پر اجتماع کیا ہے تم بھی

اُس پر راضی ہو جاؤ اور مسلمانوں کو کسی فتنے میں نہ ڈالو۔ یہ لوگ کفر چھوڑ کر تازہ مسلمان بنے ہیں۔

جب یہ خطوط اسامہؓ کو ملے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ آگئے اور انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے گرد لوگوں کا اجتماع دیکھا تو وہ امام علیؑ کی تلاش میں نکل پڑے۔ جب امام علیؑ سے ملے تو اُن سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟

امام علیؑ نے فرمایا جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ وہی کچھ ہے۔

اسامہؓ نے کہا: کیا آپ نے اُس کی بیعت کی ہے؟

امام علیؑ نے فرمایا ہاں۔ اے اسامہ!

اسامہؓ نے کہا: آپ نے برضا و رغبت بیعت کی ہے یا آپ سے جبراً بیعت لی گئی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی سے بیعت نہیں کی۔ مجھ سے جبراً بیعت لی گئی ہے۔

پھر اسامہؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور بولے۔ اے خلیفۂ مسلمین! آپ پر سلام ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اے امیر! تم پر بھی سلام ہو۔[1]

یہ ہے وہ روایت جس کے صرف ایک حصے کو احسان الٰہی ظہیر نے نقل کیا ہے۔ اُس کی اس خیانت پر ہم کوئی اور تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ مناسب حال دو آیات لکھ رہے ہیں۔

(الف) اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَكَفٰى بِهٖ اِثْمًا مُّبِيْنًا ○ دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ باندھتے ہیں اور یہی کھلم کھلا گناہ اُن کے لیے کافی ہے۔ (سورۂ نساء، آیت ۵۰)

(ب) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ پھر اُن لوگوں کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے اُن پر لعنت کی اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا۔ یہ لوگ ہمارے کلمات کو اُن کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور جن باتوں کی اُن کو نصیحت کی گئی تھی اُن کا بھی ایک حصہ فراموش کر بیٹھے اور چند آدمیوں کے سوا تم اُن کی خیانتوں کی خبر پاتے رہتے ہو۔ پس اُن کو معاف کر دو اور اُن سے درگزر کرو کہ خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۳)

﴿۳﴾ ابن جبہان کی تحریفات

میں نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کتابیں پڑھی ہیں، ابن جبہان سے زیادہ اہلبیتؑ کا دشمن کسی کو نہیں پایا۔ اُس نے شاید قسم کھائی ہوئی ہے کہ وہ آل محمدؐ اور اُن کے شیعوں کو ضرور بدنام کرے گا

۱۔ احتجاج طبرسی ج ۱، ص ۲۲۴۔۲۲۵۔

حالانکہ وہ بالکل بھکو قسم کا انسان ہے۔ اُس کا بحث و مناظرے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اُس کا دامن بحث اور مناظرے کے لیے درکار شرائط سے بالکل خالی لیکن کفر کے فتووں اور فسق و فجور کا علم لگانے سے بھرا ہوا ہے۔

آج تک جس نے بھی اُس کی کتاب تبدید الظلام و تنبیہ النیام الی خطر التشیع علی المسلمین والاسلام پڑھی ہے وہ میری اس رائے سے ضرور اتفاق کرے گا بلکہ اُس کی کتاب کا ہر قاری یہ کہے گا کہ میں نے تبصرے کے لیے نہایت ہی نرم الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُس کا مقصد شیعہ اور سنی بھائیوں کو لڑانا اور مسلمانوں کے درمیان انتشار پیدا کرنا ہے۔ اُس کا مقصد بس یہی ہے کہ مسلمان مزید انتشار کا شکار اور کمزور ہوں۔ اُس کے لیے مناسب تو یہ تھا کہ وہ اپنی رسوائے زمانہ کتاب کا انتساب "اسرائیل" کے نام کرتا۔

اُس کی کتاب اس لائق ہی نہیں کہ اُس پر کسی قسم کی تنقید کی جائے کیونکہ اُس میں ایک بھی دلیل ایسی نہیں جس کی تردید کی ضرورت ہو۔ اُس کی کتاب جھوٹ کا پلندہ ہے اور اُس نے آل محمدؐ اور اُن کے شیعوں پر تہمتیں دھری ہیں۔

آل محمدؐ کی شان میں خداوند عالم نے جتنی آیات نازل کی ہیں یا رسول اکرمؐ نے آل محمدؐ کی جتنی عظمت بیان فرمائی ہے اُس نے اُن سب آیات و احادیث کا انکار کیا ہے۔

فضائل اہلبیتؑ کی احادیث کی تضعیف کے لیے اُس کی روش ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ اُس نے مناقب اہلبیتؑ کی چند احادیث نقل کر کے یوں تبصرہ کیا ہے

"ہم اُن کا جواب دے چکے ہیں۔ ہم اُن احادیث سے متوسل ہونے والے مسخ شدہ لوگوں کی تردید کرتے ہیں۔"[1]

ابن جبہان نے اپنی کتاب میں حسب ذیل دو احادیث لکھی ہیں:

(الف) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ بَابِ حِطَّةَ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا تم لوگوں کے درمیان میرے اہلبیتؑ کی مثال باب حطہ کی سی ہے۔ جو اس میں داخل ہوا وہ خدا کی امان میں آگیا۔

(ب) مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ تَمَسَّكَ بِهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتی نوح کی سی ہے۔ جو اس کشتی کا مسافر ہوگا وہ نجات پائے گا اور جو اس سے جدا رہے گا وہ غرق ہو جائے گا۔

۱۔ تبدید الظلام ص ۹۰۔

مذکورہ احادیث لکھ کر ابن جبہان کہتا ہے کہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب سے نجات کا دارومدار اہلبیتؑ سے وابستگی پر منحصر ہے اور اُن سے دوری گمراہی کا سبب ہے لیکن یہ بات ازروئے قرآن باطل ہے کیونکہ قرآن کے مطابق ایمان اور عمل صالح نجات کی شرط ہے۔ قرآن میں ایک بھی ایسی آیت نہیں ہے جو ہمارے اس قول کی تردید کرتی ہو۔[1]

اس کے جواب میں ہم پہلی گزارش تو یہ کرتے ہیں کہ ابن جبہان کے ان جملوں کا اس حدیث سے کیا ربط ہے؟ علاوہ ازیں یہ ایک مشہور قاعدہ ہے کہ ایک چیز کا اثبات دوسری چیز کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتا۔ ایمان اور عمل صالح نجات کی ایک شرط ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی شرط موجود نہیں ہے۔

۲۔ قرآن سے ابن جبہان کے اس قول کی تردید ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد اقدس ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی جو کچھ رسول تمھیں دیں وہ لے لو اور جس سے تمھیں منع کریں اُس سے رک جاؤ۔ (سورۂ حشر آیت ۷)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم بھی دیا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ یعنی ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں صاحبان امر ہیں اُن کی اطاعت کرو۔ (سورۂ نساء آیت ۵۹)

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں فعل امر کا اطلاق ہوا ہے جو کہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لیں اور اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کریں۔ اسی طرح سے ہم پر یہ بھی واجب ہے کہ ہم اہل ایمان کے راستے کی پیروی کریں جیسا کہ سورۂ نساء میں ارشاد الٰہی ہے

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا یعنی جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلے حالانکہ اُس پر سیدھا راستا واضح ہو چکا ہو تو ہم اُس کو اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ (آیت ۱۱۵)

قرآن نے تو واضح کر دیا ہے کہ مومنین کے راستے کو چھوڑنے سے انسان دوزخ کا حقدار بن جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن جبہان نے قرآن کریم کی طرف رجوع ہی نہیں کیا۔ اگر اُس نے قرآن پڑھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ باب حطہ بنی اسرائیل کی بخشش کا دروازہ تھا جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

۱۔ تبدید الظلام ص ۱۱۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی بستی کے دروازے میں سجدہ کر کے داخل ہونا اور حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے جانا۔ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۵۸)

ممکن ہے کہ ابن جبہان نے ان آیات کو پڑھا ہو لیکن آل محمدؐ کی دشمنی نے اسے انکار پر مجبور کر دیا ہو۔ ہم اس کی خاطر طبع کے لیے قرآن کریم کی یہ آیت نقل کرتے ہیں قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى یعنی آپ کہہ دیں کہ میں تم سے کچھ اجر رسالت نہیں مانگتا بجز یہ کہ میرے قریبی رشتے داروں سے مودت رکھو۔ (سورۂ شوریٰ آیت ۲۳)

مودت آل محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغ رسالت کی اجرت قرار دیا ہے۔

ابن جبہان کی آل محمدؐ سے عداوت دیکھئے کہ اس نے یہ تک لکھ دیا کہ آخر ہم اہلبیتؑ کی پیروی کیوں کریں؟ کیا رسول اکرمؐ نے انھیں کسی ایسے علم کی تعلیم دی تھی جس کی تعلیم دوسرے مسلمانوں کو نہیں دی تھی؟ اور رسول اکرمؐ کے متعلق اس طرح کا گمان کرنا رسول اکرمؐ پر تہمت دھرنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے کوتاہی کی تھی اور پیغام رسالت کو چھپایا تھا حالانکہ دین کامل ہو چکا ہے تو پھر ہمیں اہلبیتؑ کی پیروی کی کیا ضرورت ہے؟

قارئین کرام! آپ نے دیکھا کہ یہ شخص کتنا غلط استدلال کرتا ہے۔ اگر چند مخصوص افراد کو تبلیغ دین کرنا رسالت کی کوتاہی ہے تو پھر رسول اکرمؐ کا فرض بنتا تھا کہ وہ دنیا کے ہر انسان کو فرداً فرداً تبلیغ کرتے یا پھر کم از کم اپنے زمانے کے تمام انسانوں کو تبلیغ کرتے لیکن آج تک کسی عقلمند شخص نے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا اور ویسے بھی یہ کام دائرۂ تبلیغ سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلبیتؑ کو امت کا رہبر بنانا تھا اس لیے اس نے اہلبیتؑ کو ایسی صفات سے متصف فرمایا جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ علاوہ ازیں دنیا کے تمام انسان عقل و شعور میں برابر نہیں ہوتے اور ایمانی درجات میں بھی لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ رسول خداؐ نے تبلیغ سب لوگوں کو کی تھی لیکن اہلبیتؑ نے سب سے پہلے آپ کے فرمان پر لبیک کہی تھی۔ اسی طرح سے اہلبیتؑ نے جہاد کا حق ادا کیا تھا اور وہ تقویٰ میں دوسروں سے بدرجہا ممتاز تھے۔ ان کی انہی صفات کی وجہ سے خدا نے انھیں طہارت کاملہ سے نوازا اور اُن کی شان میں آیت تطہیر نازل فرمائی۔

سوال یہ ہے کہ ابن جبہان کو آل محمدؐ سے اس قدر کینہ اور عداوت کیوں ہے؟ اگر دین کے کامل ہونے کا مقصد یہی ہے کہ اب ہمیں اہلبیتؑ کی ضرورت نہیں رہی تو ہم جبہان سے پوچھتے ہیں کہ جب دین کامل ہے تو پھر مسلمانوں کو صحابہ اور سلف صالحین کی پیروی کی کیا ضرورت ہے؟!

جہان کا طرز استدلال ملاحظہ فرمائیں۔ اُس نے حدیث ثقلین کو نقل کیا ہے۔ پھر اُس نے اپنی دشمنی کا اظہار ان جملوں سے کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث تحریف شدہ ہے۔ اصل حدیث میں وَعِتْرَتِیْ کے بجائے وَ سُنَّتِیْ کے الفاظ ہیں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ حدیث میں تحریف نہیں ہوئی تب بھی عترت سے کون لوگ مراد ہیں؟ [1]

جہان انہی الفاظ کو بنیاد بنا کر حدیث ثقلین کا انکار کر دیتا ہے۔ حدیث ثقلین کی تفصیلی بحث ابتدائی صفحات میں گزر چکی ہے اور ہم یہاں اُس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے۔

علماء کے ہاں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ایک قضیہ اپنے موضوع کو ثابت نہیں کرتا۔ اس مقام پر اجمال قضیہ کا اثبات کیا گیا ہے یعنی اس حدیث میں کتاب خدا اور اہلبیتؑ سے وابستگی کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ اب اہلبیت کون ہیں اس کی تفصیل آنحضرتؐ کی دوسری احادیث میں موجود ہے لہٰذا یہ کہنے کی کیا تک ہے کہ اہلبیت کون ہیں؟!! جہان کو چاہیے کہ وہ یہ سوال رسول اکرمؐ سے کرے کہ آپ نے اہلبیت سے وابستگی کا حکم تو دیا ہے بھلا یہ تو بتائیں کہ اہلبیت کون ہیں؟

۳۔ جہان نے رسول خداؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے یَا عَلِیُّ! لَا یُحِبُّکَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا یُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِقٌ اے علیؑ! مومن کے سوا تجھ سے کوئی محبت نہ رکھے گا اور منافق کے علاوہ تجھ سے کوئی بغض نہ رکھے گا۔

حدیث نقل کرنے کے بعد جہان لکھتا ہے کہ یہ حدیث جعلی ہے اور اس کی کوئی اساس نہیں ہے کیونکہ صرف خدا اور پیغمبرؐ کی محبت کو ہی ایمان کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے اور خدا اور پیغمبرؐ کے بغض کو ہی منافقت کا پیمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ نہ تو کسی کی محبت ایمان کا معیار ہے اور نہ ہی کسی کا بغض منافقت کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں خدا و رسولؐ کی محبت کے نتیجے میں صالحین کی محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا حضرت علیؑ کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جہان نے خدا کے ساتھ رسول اکرمؐ کو شامل کرنے کا خواہ مخواہ تکلف کیا ہے۔ اسے تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ خدا کی محبت کے نتیجے میں رسولؐ اور صالحین کی محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا رسولؐ کی محبت کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے؟ جب خدا اور رسولؐ کی محبت کے نتیجے میں صالحین کی محبت خود بخود پیدا ہوتی ہے تو اُس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ صالحین کی محبت کے نتیجے میں خدا و رسولؐ کی محبت خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حدیث صحیح ہے۔ اس حدیث میں منافق کی پہچان بتائی گئی ہے۔

۱۔ تبدید الظلام ص ۳۰۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ کوئی بھی شخص کلمہ پڑھ کر یہ اعلان نہیں کرسکتا کہ اسے خدا و رسولؐ سے عداوت ہے کیونکہ اگر کوئی اس طرح کا اعلان کرتا ہے تو وہ منافق کی بجائے کافر کہلائے گا۔ ایک منافق خدا و رسولؐ سے دشمنی کے اعلان کی بجائے اسلام کی کسی معتبر شخصیت سے اپنی دشمنی کا اعلان کرسکتا ہے۔ امام علیؑ جماعت صالحین کے افضل ترین فرد ہیں لہٰذا جو بھی ان سے عداوت رکھتا ہے وہ دراصل خدا و رسولؐ سے عداوت کرتا ہے۔ اس حدیث میں منافق کی پہچان کا بہترین معیار بتایا گیا ہے۔

اگر خدا و رسولؐ کے علاوہ کسی کی دوستی اور دشمنی ایمان کا معیار نہیں ہے تو پھر شیعوں کا جرم کیا ہے؟ انھیں چند صحابہ سے اختلاف کی بنیاد پر کافر کیوں کہا جا رہا ہے؟ آخر اس کی بھی تو وضاحت کریں۔ ! ! اگر خدا و رسولؐ کے علاوہ کسی کی دوستی دشمنی معیار ایمان نہیں ہے تو آپ حضرات صحابہ اور سلف صالح کے ساتھ ساتھ بنی امیہ و بنی عباس کی محبت میں اتنے دیوانے کیوں بنے ہوئے ہیں اور ان کے دفاع کے درپے کیوں ہیں؟!

سوال یہ ہے کہ آپ جب اپنے ممدوح افراد کا دفاع کرتے ہیں تو آپ کو ثواب کی امید ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر امید ثواب نہیں ہے تو پھر آپ کی تمام کوشش بیکار اور رائیگاں ہے اور آپ اُن کے دفاع کے لیے خواہ مخواہ وقت برباد کر رہے ہیں۔

۴۔ جہان نے پیغمبر اسلامؐ کی حدیث اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا نقل کر کے لکھا ہے کہ حدیث کے الفاظ خود حدیث کے بے وقعت ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ جو لوگ اسے حدیث پیغمبرؐ مانتے ہیں اس حدیث کے الفاظ سے خود اُن کی بے وقعتی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ لفظ مدینہ اور لفظ علم میں سخت تنافر پایا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ میں اور تلفظ میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر پیغمبرؐ نے اس مفہوم کو ظاہر کرنا ہی تھا تو آپ اس طرح کے الفاظ ارشاد فرماتے اَنَا بَحْرُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ شَاطِئُہٗ میں علم کا سمندر ہوں اور علی اس کا کنارا ہے۔ سوال یہ ہے کہ رسول خداؐ نے علم کو ایک شہر میں محدود کیوں کیا اور اس کی چابی علیؑ کے ہاتھوں میں کیوں دی؟ رسول خداؐ نے شہر علم کو آزاد قرار کیوں نہ دیا کہ ہر شخص جب چاہے اس میں داخل ہوجائے آخر علیؑ کو دروازہ بنانے میں کیا حکمت کارفرما تھی؟

قارئین کرام! آپ نے اس شخص کا طرز استدلال ملاحظہ فرمایا۔ خدا جانے وہ کس تنافر کی بات کر رہا ہے جبکہ حدیث علم کی تعریف میں وارد نہیں ہے۔ اس حدیث کے ذریعے سے رسول اسلامؐ نے اپنا اور علیؑ کا تعلق واضح کیا ہے۔ اس کے لیے شہر کی مثال حسین ترین مثال ہے کیونکہ شہر میں داخل ہونے کے لیے دروازے سے گزرنا ضروری ہے۔ جہان کے اس سوال کا جہاں تک تعلق ہے کہ پیغمبرؐ

حقیقت گمشدہ

نے شہر علم کو ایک آزاد شہر کیوں قرار نہیں دیا اور علیؑ کو اس کا دروازہ کیوں بتایا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے سوال کرو۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۴۳)

جہان نے اپنی تحریر سے اپنے ناصبی اور دشمن آل محمدؐ ہونے کا عملی ثبوت دیا ہے اور اس نے اپنی تحریر سے یہ واضح کیا ہے کہ اسے رسول خداؐ اور اُن کی آل سے عداوت ہے۔ اس نے اپنے مضحکہ خیز استدلال سے اپنے تئیں مناقب آل محمدؐ کی تردید کی ہے اور اس کے برعکس اپنے بزرگوں کی فضیلت کے اثبات کے لیے سند و متن کے لحاظ سے ضعیف احادیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

ہم علمائے اہلسنت سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا آپ اس جیسے شخص کو مذہب اہلسنت کا عالم مانتے ہیں اور اسے یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ آپ کا اور آپ کی آراء کا دفاع کرے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو پھر اہلسنت پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیے اور اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو آپ نے آج تک اُس کی مذمت کیوں نہیں کی اور اُس کی کتاب پر پابندی کیوں نہیں لگائی؟ اس وقت اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن میرے ہاتھ میں ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں اس کے کئی اور ایڈیشن بھی شائع ہوں لہٰذا آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ اس کتاب پر پابندی عائد کرائیں۔

ہمیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ کتاب کے سرورق پر تحریر ہے "یہ کتاب ادارہ تحقیق علمی، افتاء، دعوت و ارشاد کی اجازت سے شائع ہوئی ہے۔" سبحان اللہ! یہ نام اس کتاب کے بالکل متضاد ہے۔ جن لوگوں نے آج تک اس کتاب کی تحقیق نہیں کی انھوں نے باقی کون سے علمی کارنامے سرانجام دیے ہوں گے؟ اگر انھوں نے اس کتاب کو پڑھا ہے اور پھر اس کی اشاعت کی اجازت دی ہے تو ادارہ تحقیق علمی بھی جہالت، حماقت، نادانی اور تحریف حقائق میں اُس کے ساتھ برابر کا شریک ہے کیونکہ کسی چیز کا اقرار اُس کی تصدیق کے مترادف ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ دعوت و ارشاد کے کس ادارے کی اجازت سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ شاید دعوت سے اختلاف و انتشار کی دعوت مراد ہے اور "ارشاد" سے اُس کے رسوا کن تناقض کی رہنمائی مراد ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہابیت کب تک اس طرح کے تضاد میں زندگی بسر کرتی رہے گی؟

ڈاکٹر ترابی نے منطقی اور سائنسی دلائل سے لکھی گئی حدیث شمس کو ضعیف قرار دیا تھا تو اس بیچارے کے خلاف تلواریں نیام سے باہر نکل آئی تھیں اور اُس پر کفر کے فتوے لگائے گئے تھے جبکہ جہان نے بیسیوں صحیح اور متواتر احادیث کو ضعیف کہا ہے تو کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ آخر اس رویے کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟ اور کیا آپ کی نظر میں اہلبیتؑ کا مقام (نعوذ باللہ) مکھی کے

برابر بھی نہیں ہے؟ یقیناً رسول خداؐ نے سچ فرمایا کہ "اے علیؑ! مومن کے علاوہ کوئی تجھ سے محبت نہیں رکھے گا اور منافق کے علاوہ کوئی تجھ سے بغض نہیں رکھے گا۔"[1]

شیعوں کے خلاف جہان کی کذب بیانی کے نمونے

۱۔ جہان نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۹۴ پر لکھا ہے: "علاوہ ازیں شیعوں کی اذان ہماری اذان کے خلاف ہے۔ اُن کی نماز ہماری نماز کے خلاف ہے۔ اُن کا روزہ ہمارے روزے کے خلاف ہے۔ ضمناً یہ لوگ نہ تو زکات کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی مستحق زکات کو قبول کرتے ہیں۔

۲۔ صفحہ ۳۹۵ پر لکھا ہے "اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ صغیرہ گناہ کریں یا کبیرہ اُن سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی لیکن اُن کے علاوہ باقی لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ نیز یہ لوگ اپنی ناموس دوسروں کو عاریۃً دینے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں اور غیبت امام کا بہانہ بنا کر حدود الٰہی اور نماز جمعہ کو ساقط قرار دیتے ہیں اور امت محمدیہ کو امت ملعونہ کہتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ رسول کریمؐ کے صحابہ اور آپ کی ازواج پر لعنت کرنا عظیم ثواب ہے اور یہ تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔"

۱۔ پانچویں صدی کا شیعہ اسماعیلی فلسفی اور فارسی شاعر ناصر خسرو اپنے مخالف علماء کو چیلنج کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اگر تم ان سوالات میں الجھنا نہیں چاہتے،
تو الجھو، اور ہم سے دور ہو جاؤ، چونکہ ہم الجھنا چاہتے ہیں۔
اگر تم ہمیں ان مسائل پر للکارو گے،
تو ہم تمہارے حملوں کے خلاف منطق سے دفاع کریں گے۔
ہم روشن دماغوں سے مباحثہ کے میدان گرم کرتے ہیں
آسمان جیسے بلند اور انھیں سونے سے سنوارتے ہیں۔
ہم جنگجو ہیں، قرآن اور شریعت کی فوج کے،
ہم مستقل مزاج اور ثابت قدم علیؑ کے شیعہ ہیں۔
بیکار لوگ سمجھتے ہیں کہ شرعیتی نہیں ہے،
کوئی تعجب نہیں کہ تم سمجھتے ہو کہ ہم کافر ہیں۔
ایک میں اور تم ہزاروں، اگرچہ تم ایک لاکھ ہو
سانپوں اور خونخواروں کی تعداد ہم تعداد میں زیادہ نہیں،
فوج میں ایک آدمی کے لیے پانچ سو سواریاں نہیں ہوتیں
بجز ہے کہ ہم تمہیں فوج ہی نہ سمجھیں (دیوان ۳۳ ۳۱ ۳۲)

MAJD PUBLISHING The Ruby of Badakhshan کی کتاب Alice C. Hunsberger
کے اردو ترجمہ ناصر خسرو بدخشاں کی ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۷ (رضوانی)

۳۔ صفحہ ۲۲۲ پر لکھا ہے شاید ہمارے قارئین کو یقین نہ آئے گا کہ یہ لوگ والدین سے احسان کے تحت اپنی ماں سے نکاح کرنا حلال سمجھتے ہیں اور اس طرح خدا کا تقرب تلاش کرتے ہیں۔

۴۔ ایک اور جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ جب شیعہ تجھ سے مصافحہ کرتا ہے تو فوراً دوسرے ہاتھ سے تیری جیب کاٹتا ہے۔

۵۔ صفحہ ۲۸ پر لکھا ہے شیعوں کے ہاں جو عاشور کو پیدا ہوتا ہے وہ سید کہلاتا ہے اور جس کا حمل ایام عاشور میں منعقد ہوا ہو وہ بھی سید کہلاتا ہے خواہ حمل حرام طریقے سے ہی ٹھہرا ہو۔

اس بدبخت نے یہاں تک بے حیائی نہیں کی۔ اُس نے فرزند رسولؐ حضرت امام جعفر صادقؑ کے خلاف بھی دریدہ دہنی کی ہے۔ امام جعفر صادقؑ وہ عظیم شخصیت ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ انھیں معصوم کہتا ہے اور جو لوگ انھیں معصوم نہیں مانتے وہ بھی انھیں عظیم عالم اور محدث ماننے پر مجبور ہیں اور مذاہب اربعہ کے ائمہ نے بھی اُن کی فضیلت کا اقرار کیا تھا۔

تاریخ میں مجھے کسی ایسے شخص کا سراغ نہیں ملا جس نے امام صادقؑ کے خلاف بدزبانی کی ہو بلکہ امام کے کسی سخت ترین دشمن نے بھی اُن کے خلاف زبان درازی نہیں کی مگر ابن جہان صفحہ ۲۰۶ پر لکھتا ہے کہ جعفر (ع) کا یہ قول مَنْ اَرَادَ الدُّنْیَا لَا یَنْصَحُکَ وَمَنْ اَرَادَ الْآخِرَۃَ لَا یُصَاحِبُکَ جو دنیا کا طالب ہوگا وہ تجھے نصیحت نہیں کرے گا اور جو آخرت کا طالب ہوگا وہ تیری صحبت اختیار نہیں کرے گا (یہاں پہنچ کر ابن جہان نے امام جعفر صادقؑ کے متعلق ایک توہین آمیز جملہ لکھا ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا گیا)۔ اگر اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کا جملہ صحیح ہے تو پھر یہ جملہ کہ لوگ اپنے ائمہ کے دین کے تابع ہوتے ہیں زیادہ صحیح ہے اور تم لوگ نقل بمطابق اصل (جعفر) ہو کیونکہ تم اقرار کرتے ہو کہ وہ تمہارے عقائد کے مؤسس تھے۔

قارئین کرام! ملاحظہ فرمائیں کہ اس ناصبی کو اہلبیت رسولؐ سے کتنی عداوت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابن جہان کی یہ روش کوئی نئی روش نہیں ہے۔ اس سے قبل محمد بن عبدالوہاب جو کہ وہابیت کا مؤسس تھا وہ بھی اس طرح کی غلیظ زبان استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اُس نے اپنے مقالے فی الرد علی الرافضۃ کے صفحہ ۲۳ پر یہ بہتان تراشی کی ہے۔

''شیعہ نکاح متعہ کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ اسے ۷۰ دائمی نکاح سے بھی افضل تصور کرتے ہیں۔ اُن کے بڑے شیخ علی بن عالی نے یہ اجازت دی تھی کہ ایک رات میں بارہ آدمی ایک عورت سے متعہ کر سکتے ہیں۔ اگر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو قرعہ اندازی کی جائے گی جس کے نام کا قرعہ نکلے اسی کو بچے کا باپ سمجھا جائے گا۔''

۶۔ ابن جہبان نے اپنی کتاب کے ص ۴۳ پر لکھا ہے " یہودی مسخ ہوئے تو خدا نے انھیں بندر اور خنزیر بنا دیا تھا۔ منقول ہے کہ اس طرح کا حادثہ مدینہ منورہ اور دوسرے شہروں میں شیعوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہے بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ مرتے وقت شیعوں کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم ابن جہبان کی تنقید کا یہ انداز کسی افسانے سے ملتا جلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ الف لیلہ اور قمر الزمان و شہرزاد جیسے افسانوں کی دنیا میں رہتا ہے۔

﴿۴﴾ احمد امین کی تحریفات

احمد امین مصری نے اپنی کتاب ضحی الاسلام میں شیعوں کے خلاف جو بہتان تراشی کی ہے ہم اس سے درگزر کرتے ہیں کیونکہ اس نے شیعوں کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اس کی اس نے معذرت کی تھی۔ علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاء اپنی کتاب اصل الشیعۃ واصولہا کے صفحہ ۱۴۰ پر تحریر فرماتے ہیں: ۱۳۴۹ھ میں جبکہ احمد امین کی کتابیں چھپ چکی تھیں اور علمائے نجف کے مطالعے میں آ چکی تھیں وہ تیس اساتذہ اور طلبا کے ایک گروپ کے ساتھ عتبات عالیہ کی زیارت کے لیے نجف آئے تھے۔ احمد امین اپنے ساتھیوں سمیت ماہ رمضان المبارک کی ایک رات ہمارے پاس آئے اور ہماری مجلس میں شریک ہوئے۔ ہم نے اسے اس کے لگائے ہوئے الزامات پر پیار بھرے انداز سے سرزنش کی تھی۔ اس کے جواب میں اس نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں کیونکہ میری اطلاعات ناقص تھیں اور میرے پاس کتابیں بہت کم تھیں۔

ہم نے اس سے کہا تھا کہ آپ کا یہ عذر صحیح نہیں ہے کیونکہ جب کوئی شخص کسی موضوع پر کتاب لکھنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ موضوع کی کتابیں جمع کرے اور مکمل تحقیق کرے۔ اگر کسی کے پاس وسائل تحقیق نہ ہوں تو اسے کتاب لکھنے کا حق نہیں ہے۔

ہم نے اس سے کہا تھا کہ آپ ہماری مثال ہی لے لیں۔ اس وقت ہمارے کتب خانے میں پندرہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ان میں بیشتر کتابیں اہلسنت کی لکھی ہوئی ہیں۔ آپ دیکھیں کہ ہم نے تو نجف جیسے پسماندہ شہر میں اتنی کتابیں جمع کر لی ہیں جبکہ آپ تو قاہرہ جیسے علمی شہر میں رہتے ہیں لیکن وہاں کے کتب خانوں کی حالت یہ ہے کہ وہاں شیعہ کتابیں بہت ہی کم دکھائی دیتی ہیں اور اگر کسی کتب خانے میں شیعہ کتابیں موجود بھی ہیں تو وہ ایسی کتابیں ہیں جو قابل ذکر نہیں ہیں۔ جی ہاں۔ ان لوگوں کے پاس شیعی معلومات تو موجود نہیں ہیں مگر یہ لوگ لکھتے شیعوں کے متعلق ہیں۔

مذاہب اربعہ کا دقیق مطالعہ

سقیفہ کی کارروائی کے نتیجے میں اہلبیتؑ کے ہاتھ سے خلافت کا نکل جانا ایک ایسا المیہ تھا جس کے ہر شعبہ زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس کارروائی نے تاریخ، علم حدیث اور دیگر علوم پر بھی برے اثرات مرتب کئے۔ ان اثرات کو اسلامی فقہ میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ فقہ کے مختلف رجحان بھی اسی کارروائی کی وجہ سے منظر عام پر آئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر فقہ کے ماننے والوں نے اپنی اپنی فقہ کو مقدس جانا اور اس کے مقابلے میں دوسری فقہ کی توہین کی یہاں تک کہ ایک فقہ کے ماننے والوں نے دوسری فقہ کے لوگوں پر کفر کے فتوے لگائے۔ اس مسئلے میں جہاں لوگوں کی حساسیت کارفرما تھی وہاں حکومتوں نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہر حکومت نے دین کو بازیچہ اطفال بنا دیا تھا اور جس بھی فقیہ نے حکومت کی تائید کی حکومت نے اسے "امام مسلمین" کا لقب دیا اور لوگوں کو اُس کی تقلید کا حکم دیا۔ کئی کشمکشوں اور سینکڑوں مجتہدوں کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ ائمہ اربعہ کی صرف چار فقہ ہی اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے بعد اب کسی مجتہد کو اجتہاد کا حق نہیں ہے۔ یہ ۶۴۵ھ کی بات ہے۔ اس سال عوام کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان چار ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کریں۔[1]

کچھ علماء نے اس فیصلے کو جائز قرار دے کر اس کا دفاع کیا تھا لیکن کچھ علماء نے اسے ناجائز اور انسانی آزادی کے خلاف قرار دیا تھا۔ چنانچہ ابن قیم نے اعلام الموقعین کے ایک طویل باب میں مضبوط دلائل کے ساتھ اُن علماء کا رد کیا ہے جنھوں نے مذاہب اربعہ کی پیروی کرنے اور اجتہاد کا باب بند کرنے کو صحیح قرار دیا تھا۔ ابن قیم کے مطابق باب اجتہاد کو بند کرنا ناعاقبت اندیشی ہے نیز یہ دین اور عقل سلیم کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے۔

ابن قیم کی رائے نقارخانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی اور کسی نے اس پر توجہ دینا مناسب

۱۔ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ ۶۶۵ھ میں مصر اور شام پر حکمران خاندان غلاماں کے سلطان ظاہر بیبرس بندقداری نے ایک فرمان کے ذریعے تقلید کو ان چار ائمہ فقہ تک محدود کر دیا تھا۔ (رضوانی)

نہ سمجھ کیونکہ حکام کی رائے یہی تھی کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینا چاہیے۔ چنانچہ وہی ہوا جو حکام چاہتے تھے۔

استاد عبدالمتعال صعیدی لکھتے ہیں: "میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ ریاستی طاقت اور لالچ کے ذریعے بند کرایا گیا ہے۔ اگر مذاہب اربعہ کی طرح دیگر اجتہادات کو بھی سرکاری سرپرستی حاصل ہو جاتی تو آج اُن کے اجتہاد کو بھی عمومی پذیرائی حاصل ہوتی اور مسلمان مذاہب اربعہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے۔ ہم پر چار مذاہب کی پابندی مسلط کی گئی ہے حالانکہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے احکام دین میں اجتہاد کریں لیکن حکومتی جبر کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور اس حکم کے لیے مسلمانوں سے کوئی مشورہ تک نہیں لیا گیا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وہ اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔[1]

ہر انصاف پسند محقق جب بھی مذاہب اربعہ کی تاریخ پڑھتا ہے تو وہ اس تلخ حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کو فقہ اربعہ کی پابندی پر مجبور کرے اور کسی کے پاس کیا اختیار ہے کہ وہ علماء کو اجتہاد سے روکے اور کسی کے پاس کیا اختیار ہے کہ وہ اسلامی فقہ کو صرف چار فقہوں میں محدود کرے جبکہ ائمہ اربعہ کے بعد خدا نے اس امت میں ایسے ایسے علماء پیدا کیے جو اُن مجتہدین سے کئی گنا زیادہ علم رکھتے تھے۔ ان مذاہب کے بانیوں کے علاوہ مسلمانوں میں اور بھی صاحبان مذاہب علماء گزرے ہیں مگر اُن کی فقہ کے دبستانوں پر حکومت کے ایک فیصلے کی وجہ سے خط تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔ ان علمائے مذاہب میں سے چند ایک کی ہم یہاں نشاندہی کرتے ہیں۔

(۱) سفیان ثوری

آپ کی ولادت ۹۵ھ میں ہوئی تھی۔ آپ ایک فقہی دبستان کے بانی تھے لیکن آپ کا مذہب زیادہ عرصے تک اس لیے برقرار نہ رہ سکا کہ حکومت اُس کی مخالفت کرتی تھی۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ آپ امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے۔ آپ کا شمار اُن فقہاء میں ہوتا تھا جن سے تحصیل علم کے لیے اگر دور دراز کا سفر بھی کرنا پڑے تو جائز تھا۔ بیس ہزار افراد نے آپ سے روایات نقل کی تھیں۔

ایک مرحلے پر منصور عباسی نے سفیان ثوری کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جیسے ہی اُن کو منصور کے ارادے کا علم ہوا وہ اپنا شہر چھوڑ گئے اور دوسرے شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۶۱ھ تک یعنی اپنی وفات کے وقت تک وہ روپوش رہے۔ اُن کا مذہب چوتھی صدی تک قائم رہا پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اس کا نام تاریخ کے اوراق تک محدود ہو کر رہ گیا۔

۱۔ میزان الاجتہاد ص ۱۴۔

(۲) سفیان بن عُیینہ

یہ بھی بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے امام جعفر صادقؒ، زہری، ابن دینار اور دوسرے علماء سے کسب فیض کیا تھا۔ اُن کے متعلق امام شافعی نے یہ کہا تھا کہ میں نے سفیان بن عیینہ کی طرح سے کسی میں فتویٰ کا ملکہ نہیں دیکھا۔ اُن کا فقہی وابستگان بھی چوتھی صدی تک جاری رہا۔

(۳) اوزاعی

یہ بھی اپنے دور کے جید عالم تھے۔ اُن کے مذہب کو شام میں کافی پذیرائی حاصل تھی اور اہل شام ایک عرصے تک اُن کے مذہب پر عمل پیرا رہے۔ سرکاری ادارے اُن کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ وہ حکومت کے حامی تھے۔ حکام انھیں محور دین کی حیثیت سے یاد کرتے تھے۔

جب بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے بھی اُن کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی تھی منصور عباسی یہ جانتا تھا کہ اوزاعی آل محمدؐ سے منحرف ہیں اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ روابط استوار کرے لیکن جب محمد بن حسان شافعی دمشق کا قاضی بنا تو اُس نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اوزاعی کی تقلید چھوڑ کر شافعی کی تقلید کریں۔ اُس کی کوششوں سے ۳۰۲ھ تک اہل شام نے شافعی فقہ اختیار کرلی اور اوزاعی کی فقہ کو خیرباد کہہ دیا۔

مذکورہ بالا افراد کے علاوہ ابن جریر طبری، داؤد بن علی ظاہری، لیث بن سعد، اعمش اور شعبی جیسے کئی مجتہد پیدا ہوئے۔

سوال یہ ہے کہ جب امت میں سینکڑوں مجتہد گزرے ہیں تو پھر ان چار مذاہب کی تخصیص آخر کس لیے ہے؟! کیا مذاہب اربعہ کے بانی اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے؟! اور کیا عوام نے اُن پر اتفاق کرلیا تھا اور انھیں اپنا امام مان لیا تھا؟!

حقیقت یہ ہے کہ ان دو امور میں سے کوئی بھی امر یہاں موجود نہیں تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان سے بڑے عالم موجود تھے اور ویسے بھی کسی کے اعلم ہونے کا فیصلہ عقل نہیں کرسکتی اور "اعلم" کا انتخاب انتہائی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ ائمہ کی شہرت کسی علمی غیر جانبداری کی بنیاد پر قائم نہیں تھی۔

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ مذاہب اربعہ مسلمانوں پر مسلط کیے گئے تھے اور کوئی بھی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ مسلمانوں نے اپنی رضامندی سے ان مذاہب کو اپنایا ہو۔ یہ حکومتوں کا جبر تھا کہ مسلمانوں کو مذاہب اربعہ کی پابندی کرنا پڑی تھی۔ پھر جب یہ مذاہب رائج ہوگئے تو لوگوں نے افراط و تفریط سے کام لیا اور کچھ متعصب افراد نے اپنے امام کی فقہ کو برتر قرار دیا اور دوسروں کی توہین کی اور انھیں غلط قرار دیا۔ ان اختلافات کی وجہ سے فسادات ہوئے جن میں ہزاروں مسلمان کھیت رہے۔

متعصب افراد نے ایک دوسرے کو دین سے خارج قرار دیا اور ان مذاہب کے پیروکاروں میں شدید دشمنی دیکھنے میں آئی۔ چنانچہ دمشق کے حنفی المذہب قاضی محمد بن مسیٰ متوفی ۵۰۶ھ نے یہ کہا تھا کہ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں فقہ شافعی کے پیروؤں سے جزیہ وصول کرتا۔

ابو حامد طوسی متوفی ۵۶۷ھ نے کہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو میں فقہ حنبلی کے پیروؤں سے جزیہ وصول کروں (جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت کافر شہریوں سے وصول کرتی ہے)۔

چنانچہ حنفیوں اور حنبلیوں میں نیز حنبلیوں اور شافعیوں میں کئی بار فسادات پھوٹ پڑے۔ حنفی خطباء حنبلیوں اور شافعیوں پر منبر سے لعنت بھیجتے تھے۔ حنبلیوں نے "مرو" شہر میں شافعیوں کی ایک مسجد جلا دی تھی اور ایک مرتبہ نیشاپور میں حنفیوں اور شافعیوں میں ایسا تصادم ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے کی مساجد اور مدارس کو جلا دیا تھا۔ پہلی بار شافعیوں کا زیادہ نقصان ہوا تھا لیکن شافعیوں نے چند دنوں بعد حنفیوں سے حساب برابر کر دیا تھا۔ یہ ۵۵۴ھ کی بات ہے۔ اسی طرح کے خونریز فسادات شافعیوں اور حنبلیوں کے درمیان بھی ہوئے تھے یہاں تک کہ ۶۱۷ھ میں حکومت کو مجبور ہو کر مداخلت کرنا پڑی اور پوری ریاستی قوت سے فسادات کو کچل دیا گیا تھا۔[1]

حنبلیوں نے ایک مرتبہ بغداد کے امن کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ حنبلی ملاؤں نے اپنے پیروؤں کو ترغیب دی کہ وہ شافعیوں پر حملے کریں چنانچہ حنبلی، مساجد میں پناہ گزین لوگوں پر بھی حملے کرتے تھے اور انھیں نقصان پہنچاتے تھے۔[2] ابن تیمیہ کی غلط روش کی وجہ سے لوگ حنبلیوں کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ دمشق اور دیگر شہروں میں یہ اعلان کیا گیا کہ جو بھی ابن تیمیہ کے دین پر ہو وہ واجب القتل ہے اور اس کا مال لوٹنا حلال ہے۔ ادھر تصویر کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کیجئے۔ شیخ ابن حامد حنبلی نے کہا کہ "جو حنبلی نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔"[3] موصوف اپنے فرقے کے علاوہ باقی تمام مسلمانوں کو کافر کہتے تھے اور اس کے ردعمل میں شیخ ابوبکر مطربی جو کہ مساجد بغداد کے واعظ تھے حنبلیوں کو کافر کہا کرتے تھے۔[4]

مذاہب اربعہ کے پیروکاروں میں اتنا حسد پایا جاتا تھا کہ توبہ ہی بھلی! ان کے تعصب کی انتہا یہ تھی کہ انھوں نے مخالف فقہ کے علماء اور فقہاء کو زہر دے کر ہلاک کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کی واضح مثال فقیہ ابو منصور کی موت ہے جسے متعصب حنبلیوں نے زہر دے کر ۵۶۷ھ میں قتل کیا تھا۔

ابن جوزی لکھتے ہیں کہ کچھ حنبلیوں نے ایک عورت کو زہریلی مٹھائی کا تھال دے کر ابو منصور کے پاس بھیجا۔ وہ زہریلی مٹھائی لے کر ان کے پاس گئی اور بولی کہ میں آپ کی ہم مسلک ہوں اور میں

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۲، ص ۷۵۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۹۰۔

۲۔ تاریخ کامل ج ۸، ص ۳۸۸۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۳۷۵۔ ۴۔ شذرات الذہب ج ۳، ص ۳۵۳

نے یہ مٹھائی اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے۔ آپ اسے تناول فرمائیں۔ چنانچہ ابو منصور، اُن کی بیوی، اُن کے ایک جوان بیٹے اور ایک چھوٹے بچے نے وہ مٹھائی کھائی جس سے وہ سب کے سب مر گئے۔[1]

اس کے علاوہ بھی بہت سے علماء کو تعصب کے گھاٹ اتارا گیا۔

ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک کے پیروؤں نے اپنے اپنے امام سے اندھی عقیدت کا ثبوت دیا اور اُن کی فضیلت میں جھوٹی احادیث تک بنائیں اور اُن کے متعلق ایسے ایسے فضائل تراشے کہ وہ دیومالائی شخصیات دکھائی دینے لگیں۔ بنانے والوں نے یہاں تک بنایا کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''آدمؑ کو مجھ پر فخر ہے اور مجھے اپنی امت کے ایک فرد نعمان پر فخر ہے۔''

ایک اور حدیث یہ بنائی گئی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ''انبیاء مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میں ابو حنیفہؒ پر فخر کرتا ہوں۔ جس نے اُس سے محبت کی اُس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے اُس سے عداوت رکھی اُس نے مجھ سے عداوت رکھی۔[2]

ابو حنیفہ کے مقلدین نے جوشِ عقیدت میں یہ روایت وضع کی ''اللہ تعالیٰ نے ابو حنیفہ کو شریعت و کرامت کے ساتھ مخصوص کیا تھا۔ اُن کی منجملہ کرامات میں سے ایک کرامت یہ بھی ہے کہ حضرت خضرؑ روزانہ صبح اُن کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ وہ پورے پانچ سال تک امام ابو حنیفہ سے احکام دین کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر امام ابو حنیفہ کی وفات ہوگئی۔ حضرت خضرؑ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا خدایا! اگر تیرے ہاں میری کوئی قدر و منزلت ہے تو ابو حنیفہ کو اجازت عطا فرما کہ وہ اپنی قبر میں سے مجھے تعلیم دیں تاکہ میں اُن سے احکام شریعت سیکھ کر لوگوں کو صحیح تعلیم دوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضرؑ کی دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ پورے پچیس سال تک حضرت خضرؑ ابو حنیفہ کی قبر پر آتے تھے اور ابو حنیفہ قبر میں سے انھیں تعلیم دیتے تھے۔'' مؤلف لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ کی شان میں یہ روایت ہندوستان کی حنفی مساجد و مدارس میں بیان کی جاتی ہے۔[3]

جب حنفی حضرات نے امام ابو حنیفہ کے لیے اس طرح کی روایات تراشیں تو مالکی کیوں پیچھے رہتے۔ انھوں نے بھی یہ روایت اختراع کی کہ امام مالک کی ران پر قلم قدرت سے یہ جملہ لکھا ہوا تھا: مالک حجۃ اللہ فی الارض مالک زمین پر خدا کی حجت ہیں۔ امام مالک اپنے مردہ پیروؤں کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ وہ نکیرین کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ اُن کے پیروؤں کا محاسبہ کریں۔[4] عقیدت مندوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امام مالک کی کتاب ''مؤطا'' کو پانی میں ڈالا گیا تو وہ تر نہ ہوئی۔

۱۔ طبقات الشافعیہ ج ۲، ص ۱۸۲، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت۔

۲و۳۔ ابو الفرج علی بن جوزی، الباطوت فی الواحد ص ۲۸۔ ۴۔ عدوی، مشارق الانوار ص ۸۸۔

حنبل کہتے ہیں کہ "احمد بن حنبل ہمارے امام ہیں۔ جو انھیں امام نہ مانے وہ بدعتی ہے" اور یہ کہ "رسول خداؐ کے بعد اسلام کے لیے جتنی تکلیفیں احمد بن حنبل نے اٹھائی ہیں اتنی کسی اور نے نہیں اٹھائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی نہیں۔ خدا امام حنبل کی زیارت کے لیے اُن کی قبر پر حاضر ہوتا ہے۔"

ابن جوزی اپنی کتاب مناقب احمد کے صفحہ ۴۵۴ پر لکھتے ہیں ابوبکر بن مکارم بن ابی یعلیٰ حربی جو کہ ایک نیک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ ایک سال ماہ رمضان سے چند دن قبل سخت بارشیں ہوئیں۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حسب عادت امام حنبل کی قبر پر گیا ہوں اور بارشوں نے امام صاحب کی قبر کا نشان مٹا دیا ہے اور اُن کی قبر زمین کے برابر ہو چکی ہے البتہ چند پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ بارشوں نے امام صاحب کی قبر کا زیادہ حصہ خراب کر دیا ہے۔ اتنے میں امام صاحب کی قبر سے آواز آئی کہ بارشوں کی وجہ سے میری قبر خراب نہیں ہوئی۔ میری قبر حق سبحانہ کی ہیبت سے ٹوٹ گئی ہے کیونکہ حق تعالیٰ میری زیارت کو آتا ہے۔ میں نے خدا سے عرض کیا کہ آپ ہر سال میری قبر کی زیارت کے لیے کیوں آتے ہیں؟ خدا نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے میرا کلام یاد کیا تھا۔ تیری بدولت میرے کلام کو فروغ ملا اور محرابوں میں پڑھا جا رہا ہے۔

جب میں نے امام صاحب سے یہ بات سنی تو میں اُن کی قبر پر گر پڑا، قبر کو چوما اور گویا ہوا: میرے آقا! یہ بتائیں کہ باقی قبریں تو مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں لیکن آپ کی قبر کیوں باقی ہے؟

امام صاحب نے قبر میں سے فرمایا: یہ رسول خداؐ کی کرامت ہے کیونکہ رسول خداؐ کے چند بال میرے بدن پر موجود ہیں۔ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ماہ رمضان میں آکر میری قبر کی زیارت کرے۔ انھوں نے آخری جملہ دو مرتبہ دہرایا۔

پیر خود نہیں اُڑتے مرید اُڑاتے ہیں

ضرب المثل ہے کہ "پیر خود نہیں اڑتے انھیں مرید اڑایا کرتے ہیں" ائمہ اربعہ کو بھی اُن کے پیروؤں نے اڑایا ہے اور ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے امام کے لیے کرامات گھڑی ہیں اور اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے ایک عقیدت مند شاعر نے اُن کی تعریف میں کہا ہے:

هٰذَا مَذْهَبُ النُّعْمَانِ نُوْرُ الْمَذَاهِبِ — كَهٰذَا الْقَمَرُ الْوَضَّاحُ نُوْرُ الْكَوَاكِبِ

مَذَاهِبُ اَهْلِ الْفِقْهِ عِنْدِیْ تَقَلَّصَتْ — وَاَيْنَ هُبِ الرَّوَاسِیْ نَسْجُ الْعَنَاكِبِ

مذہب نعمان بہترین مذہب ہے۔ وہ چاند کی طرح سے روشن ہے جو کہ بہترین ستارہ ہے۔

میری نظر میں دوسرے مذاہب چھوٹے ہو چکے ہیں۔ بھلا پہاڑ کجا اور تار عنکبوت کجا؟

امام شافعی کے ایک پیرو نے اُن کی مدح میں کہا ہے:

مَثَلُ الشَّافِعِيِّ فِي الْعُلَمَاءِ ۔۔۔ مَثَلُ الْبَدْرِ فِي نُجُومِ السَّمَاءِ

قُلْ لِمَنْ قَاسَهُ بِنُعْمَانَ جَهْلًا ۔۔۔ أَيُقَاسُ إِيضَاءُ بِالظَّلْمَاءِ؟

امام شافعی کا علماء میں وہی مقام ہے جو بدر کامل کا ستاروں میں ہے۔ جو اپنی جہالت کی وجہ سے شافعی کا نعمان سے تقابل کرتا ہے اُس سے کہہ دو کیا اندھیرا اجالا برابر ہے؟

امام مالک کے ایک عقیدت مند شاعر نے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

إِذَا ذَكَرُوا كُتُبَ الْعُلُومِ فَحَيِّ ۔۔۔ هَلْ بِكُتُبِ الْمُوَطَّا مِنْ تَصَانِيفِ مَالِكِ

فَشُدَّ بِهِ كَفَّ الصِّيَانَةِ تَهْتَدِي ۔۔۔ فَمَنْ حَادَ عَنْهُ هَالِكٌ فِي الْهَوَالِكِ

جب بھی لوگ علمی کتابوں کا تذکرہ کریں تو تو اپنا رخ امام مالک کی کتاب مؤطا کی طرف کر۔ جو بھی اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لے گا وہ ہدایت پا جائے گا اور جو اس کتاب سے روگردانی کرے گا وہ گمراہ ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

امام احمد بن حنبل کے ایک پیرو نے انھیں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

سَيَرْتُ شَرَائِعَ الْعُلَمَاءِ طَرًّا ۔۔۔ فَلَمْ أَرَ كَاعْتِقَادِ الْحَنْبَلِي

فَكُنْ مِنْ أَهْلِهِ سِرًّا وَجَهْرًا ۔۔۔ تَكُنْ أَبَدًا عَلَى النَّهْجِ السَّوِي

میں نے تمام علماء کی فقہ کا مطالعہ کیا لیکن حنبلی عقیدے جیسا کوئی عقیدہ نہیں پایا۔ کھلے اور چھپے دونوں حال میں احمد بن حنبل کے پیرو بن جاؤ۔ تم ہمیشہ راہ راست پر رہو گے۔

ایک اور حنبلی شاعر نے اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے

أَنَا حَنْبَلِيٌّ مَا حَيِيتُ وَإِنْ أَمُتْ ۔۔۔ فَوَصِيَّتِي لِلنَّاسِ أَنْ يَتَحَنْبَلُوا

میں جب تک زندہ ہوں حنبلی رہوں گا۔ پس اگر مر جاؤں تو لوگوں کو میری وصیت ہے کہ وہ بھی حنبلی بنیں۔

ہر گروہ نے لوگوں کو اپنی اپنی فقہ کی دعوت دی اور اپنے امام کے فضائل میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔ انہوں نے اپنے علاوہ ہر دوسرے مذہب سے شدید نفرت کا اظہار کیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ اعلان کیا گیا کہ "جو بھی حنفی مذہب اختیار کرے گا اسے خلعت دی جائے گی اور جو شافعی مذہب اختیار کرے گا اس پر تعزیر نافذ کی جائے گی۔[1]

۱۔ الدین الخالص ج ۳، ص ۲۵۵۔

ابو سعید متوفی ۵۶۲ھ حنفی تھے۔ جب انھوں نے شافعی فقہ کو اختیار کیا تو انھیں بہت زیادہ آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ یہی حال سمعانی کا ہوا۔ انھوں نے جب حنفی مذہب کو خیرباد کہا اور شافعی ہوگئے تو انھیں بھی بہت زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

احناف اور شوافع میں کئی بار خونریز فسادات ہوئے۔ خراسان سے لے کر عراق تک دونوں مذہب کے پیروؤں میں آتش بغض کے شعلے بلند تھے۔ شہر مرو بھی فرقہ واریت کی زد میں تھا۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو اذیت پہنچاتا رہتا تھا۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر اہل رائے کو اصحاب حدیث سے پناہ لینا اور سلاطین سے فریاد کرنا پڑی۔[1] مذکورہ حوادث تو فرقہ واریت کا ایک نمونہ تھے ورنہ ائمہ اربعہ کے پیروؤں کی باہمی لڑائیوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔

مذہبی تعصب تو اس قدر پھیل گیا تھا کہ لوگ اپنا مذہب چھپانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ چنانچہ حنبلی عالم ابوبکر محمد بن عبدالباقی متوفی ۵۳۵ھ نے مذہب چھپانے کی کچھ اس طرح سے ترغیب دی تھی ؎

اِحْفَظْ لِسَانَکَ لَا تَبُحْ بِثَلَاثَةٍ ۔۔۔ سِنٍّ وَّ مَالٍ مَا اسْتَطَعْتَ وَ مَذْهَبٍ
فَعَلَى الثَّلَاثَةِ تَبْتَلِيْ بِثَلَاثَةٍ ۔۔۔ بِمُكَفِّرٍ وَ بِحَاسِدٍ وَّ مُكَذِّبٍ

جہاں تک ہوسکے اپنی زبان پر قابو رکھ اور تین باتیں کسی کو نہ بتا۔ عمر، دولت اور مذہب۔ ان تین چیزوں کے بتانے پر تجھے تین قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ تکفیر کرنے والے سے، حسد کرنے والے سے اور جھٹلانے والے سے۔[2]

زمخشری کی یہ ابیات اُس وقت موجود مذہبی تعصب پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہیں ؎

اِذَا سَاَلُوْا عَنْ مَذْهَبِيْ لَمْ اَبُحْ بِهٖ ۔۔۔ وَاَكْتُمُ كِتْمَانَهٗ لِيْ اَسْلَمُ
فَاِنْ حَنَفِيًّا قُلْتُ قَالُوْا بِاَنَّنِيْ ۔۔۔ اَبِيْحُ الطِّلَا وَهُوَ الشَّرَابُ الْمُحَرَّمُ
وَاِنْ شَافِعِيًّا قُلْتُ قَالُوْا بِاَنَّنِيْ ۔۔۔ اَبِيْحُ نِكَاحَ الْبِنْتِ وَالْبِنْتُ تُحَرَّمُ
وَاِنْ مَالِكِيًّا قُلْتُ قَالُوْا بِاَنَّنِيْ ۔۔۔ اَبِيْحُ لَهُمْ اَكْلَ الْكِلَابِ وَهُمْ هُمُ
وَاِنْ قُلْتُ مِنْ اَهْلِ الْحَدِيْثِ وَحِزْبِهٖ ۔۔۔ يَقُوْلُوْنَ لَيْسَ لَيْسَ يَدْرِيْ وَيَفْهَمُ

اگر لوگ مجھ سے میرا مذہب پوچھنا بھی چاہیں تو میں اسے چھپاؤں گا کیونکہ مذہب چھپانے میں سلامتی مضمر ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں حنفی ہوں تو وہ کہیں گے کہ میں "طلا" کو حلال سمجھتا ہوں جبکہ

۱۔ طبقات الشافعیہ ج ۴، ص ۲۳، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت۔

۲۔ مقصد یہ ہے کہ اگر تم نے اپنا مذہب ظاہر کیا تو لوگ تمھیں کافر کہیں گے اگر تم نے مال و دولت کی خبر دی تو تمھیں حاسدوں سے سابقہ پڑے گا اور اگر تم نے اپنی صحیح عمر بتائی تو تمھیں تکذیب کرنے والوں سے سابقہ پڑے گا۔

ملا کا تعلق شراب سے ہے اور شراب حرام ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو شافعی کہوں تو وہ کہیں گے کہ میں اپنی بیٹی سے نکاح کو حلال سمجھتا ہوں جبکہ بیٹی سے نکاح کرنا حرام ہے اور اگر میں کہوں کہ میں مالکی ہوں تو لوگ کہیں گے کہ میں کتا کھانا حلال جانتا ہوں[1] اور اگر میں کہوں کہ میں اہل حدیث میں سے ہوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ تو بکرا ہے، اس کی شکل گھاس چرنے کی ہے۔[2]

مذاہب اربعہ کے بانیوں کے بارے میں

ائمہ اربعہ کے متعلق تاریخی اور حقیقی معروضات پیش کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ ان کے حالات یا تو ان کے طرفداروں نے یا پھر ان کے مخالفوں نے بیان کئے ہیں۔ طرفداروں نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں جبکہ مخالفین نے ان کی سخت توہین کی ہے اس لیے بے لاگ بحث کافی دشوار کام ہے۔ احمد امین لکھتے ہیں کہ مذہبی اور فقہی تعصب نے ہر فرقے کے پیروؤں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے ائمہ کے متعلق دیومالائی داستانیں تخلیق کریں۔ چنانچہ ان ائمہ کے پیروؤں نے جھوٹی احادیث بنائیں اور انھیں نبی اکرمؐ سے منسوب کر دیا۔ مثلاً یہ روایت ملاحظہ فرمائیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے خزانے اہل عراق میں رکھے ہیں۔"

ایک اور حدیث یہ تراشی گئی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اس امت میں نعمان بن ثابت پیدا ہوگا۔ اس کی کنیت ابو حنیفہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں میری سنت کو از سر نو زندہ کرے گا۔"

احناف نے تو یہاں تک مبالغہ کیا کہ تورات میں امام ابو حنیفہ کی بشارت دی گئی تھی۔

امام شافعی اور امام مالک کے پیرو بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن طرفداروں کی مبالغہ آرائی مسئلہ کا حل نہیں ہے اس لیے ہر امام کے متعلق صحیح تاریخی معلومات جمع کرنا انتہائی مشکل ہے۔ ہر آنے والی نسل نے اپنے اپنے امام کے لیے نت نئے فضائل تراشے ہیں۔[3] صرف امام ابو حنیفہ کے فضائل میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں

۱۔ عقود المرجان في مناقب ابي حنيفه النعمان از ابو جعفر طحاوی

۱۔ عربی کتاب میں یہ شعر چھپنے سے رہ گیا ہے۔ جب تک اسے شامل نہ کیا جائے مذاہب اربعہ کی تعداد پوری نہیں ہوتی ۔

وان سئلت فلست قائلها بانني فضل خلوني نجلس صنجم

اگر میں کہتا ہوں کہ میں حنبلی ہوں تو لوگ یہ کہیں گے کہ یہ تو غیر حنفی شخص ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف اجسام میں حلول کرتا ہے اور یہ قابل نفرت انسان ہے۔ یہ خدا کے لیے جسم و جسمانیت کا قائل ہے۔ (مترجم فارسی)

۲۔ زمخشری، کشاف ج ۱۔ ۳۔ الامام الصادق والمذاهب الاربعه ج ۱ ص ۲۸۵۔

۲۔ مناقب ابوحنیفہ از خوارزمی
۳۔ الیمان فی مناقب النعمان از شیخ محی الدین عبدالقادر بن ابی الوفا
۴۔ شقائق النعمان فی مناقب النعمان از زمخشری

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے پیروؤں نے ان کے متعلق انتہائی غلو سے کام لیا ہے اور اس طرح کی کتابیں لکھ کر باقی ائمہ مذاہب کی تحقیر کی ہے۔ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو پھر ان کتابوں کی کیا ضرورت تھی۔ ہر فقہ کے مقلدین نے اپنے اپنے امام کے فضائل میں اتنی کتابیں لکھی ہیں جتنی خلفائے راشدین پر بھی نہیں لکھی گئیں! ہر فقہ کے بانی کے متعلق دو قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ غلو اور بناوٹی فضائل پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا نظریہ مخالفین کی زبانی منقول ہے۔ ہم یہاں کوشش کریں گے کہ دونوں نظریات کے بین بین رہ کر ان کی زندگی اور علمی کارناموں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں۔

امام ابوحنیفہ

اُن کا نام نامی نعمان بن ثابت ہے۔ وہ عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔

حجاج بن یوسف کے دور میں وہ کوفہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس وقت کوفہ عراق کا علمی شہر تھا۔ اُس زمانے میں مختلف نظریات میں بڑی شدت پائی جاتی تھی اور اصول عقائد کی بحثیں عروج پر تھیں۔ کوفہ کی مناظرانہ فضا کا امام ابوحنیفہ پر بھی اثر پڑا تھا۔ انھوں نے علم کلام کے مباحث میں دل کھول کر حصہ لیا تھا اور خوب مناظرے کیے تھے۔ پھر اُن کی طبیعت بحث مباحثہ سے اچاٹ ہوگئی اور وہ علم کلام چھوڑ کر فقہ کی طرف مائل ہوگئے اور حماد بن ابی سلیمان متوفی ۱۲۰ھ کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے۔ وہ اُن کے ذہین ترین شاگرد ثابت ہوئے۔ وہیں سے اُن کی شہرت کا چاند چمکا اور انھیں فقہی دنیا میں شہرت نصیب ہوئی۔

حماد بن ابی سلیمان کے علاوہ انھوں نے مکہ میں عطاء بن رباح اور مدینہ میں نافع مولیٰ ابن عمر اور دیگر علماء سے بھی کسب فیض کیا۔ انھوں نے حماد بن ابی سلیمان سے زیادہ استفادہ کیا تھا اور مذکورہ علماء کے علاوہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی احادیث نقل کی تھیں۔

فقہ حنفی

امام ابوحنیفہ کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی فقہ پر کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ اُن کی تمام تر فقہ

کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اُس میں ان ائمہ کی تاریخ کے متعلق سخت اشتباہ پایا جاتا ہے مثلاً ابو یوسف نے کتاب الخراج میں امام ابو حنیفہ کی رائے نقل کی پھر اپنی ذاتی رائے بھی لکھی اور اختلاف کا سبب بھی بیان کیا۔ ابو یوسف نے اپنی کتاب کے بعض مقامات پر امام ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کے نظریات لکھے، پھر امام ابو حنیفہ کی بجائے ابن ابی لیلیٰ کی تائید کی۔

محمد بن حسن شیبانی نے اپنی کتابوں میں اپنے استاد امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف کے نظریات لکھے، پھر اُن کے مقابلے میں اپنا نظریہ بیان کیا اور اُن کی پرزور مخالفت کی بلکہ انھوں نے اپنی بحث کے دوران کچھ اس طرح کے الفاظ لکھے "اگر معاملہ ایسا ہوتا جیسا کہ ابو حنیفہ اور ابو یوسف سمجھتے ہیں تو پھر اس مسئلے کی نوعیت یوں نہ ہوتی۔"

لہٰذا جن آراء سے امام ابو حنیفہ دستبردار ہوئے تھے اسے مذہب کا حصہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی نے امام ابو حنیفہ کی بعض آراء سے انحراف کیا تھا اور اس کا سبب اہل حجاز کی بیان کردہ احادیث تھیں۔ یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حنفی مذہب کو فروغ دینے والے ائمہ بذات خود امام ابو حنیفہ کے پیروکار نہیں تھے۔[1]

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب اُن کے شاگردوں کے ذریعے سے پھیلا اور اس کے پھیلانے میں ابو یوسف کے منصب قضاوت کا بڑا دخل ہے۔

حنفی مذہب کو کسی فرد واحد کی بجائے فقہاء کے ایک گروہ نے تشکیل دیا تھا اور اُن میں سے ہر فقیہ اپنی ذات میں آزاد تھا لہٰذا حنفی مذہب کو صرف امام ابو حنیفہ کا بیان کردہ مذہب سمجھنا غلط ہے۔ حنفی حضرات خواہ مخواہ تمام مسائل کو امام ابو حنیفہ کے اجتہاد کا نتیجہ قرار دینے پر مصر ہیں اور ان کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ پر اعتراضات

اگر ہم امام ابو حنیفہ کے مداحوں سے قطع نظر اُن کے متعلق لوگوں کی آراء کا جائزہ لیں تو ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امام صاحب کے بہت سے ہمعصر عادل علماء نے اُن کی شدید مذمت کی تھی۔ انھوں نے امام صاحب کو زندیق، دین سے خارج، راہ حق سے منحرف، فاسد العقیدہ، مخالف کتاب وسنت، بے دین اور بے ایمان تک کہا تھا۔[2]

ایک دن سفیان ثوری، شریک، حسن بن صالح اور ابن ابی لیلیٰ اکٹھے ہوئے اور انھوں نے

۱۔ شیخ محمد خضری، تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۷۲۔ ۲۔ استاد ابو زہرہ، ابو حنیفہ ص ۵۔

ایک شخص کو بھیج کر امام ابو حنیفہ کو اپنے پاس بلایا۔ جب امام صاحب آئے تو انھوں نے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اس شخص کا کیا حکم ہے جو اپنے باپ کو قتل کر ڈالے، اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرے اور اپنے باپ کے کاسہ سر میں شراب پیئے؟

امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ وہ مومن ہے۔

ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ آپ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

سفیان ثوری نے کہا کہ آج کے بعد میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔[1]

ابراہیم بن بشار کہتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے کہا "میں نے ابو حنیفہ سے بڑھ کر کسی کو خدا کے خلاف جسارت کرنے والا نہیں دیکھا۔"

سفیان بن عیینہ سے ہی منقول ہے کہ "ابو حنیفہ نے حدیث پیغمبرؐ کے لیے ضرب المثل کہی اور وہ احادیث کی توجیہ اپنے علم کے مطابق کرتے تھے۔[2]

ابو یوسف سے پوچھا گیا کہ کیا ابو حنیفہ "مرجئی" تھے؟

انھوں نے کہا: ہاں۔

پھر اُن سے پوچھا گیا کہ کیا ابو حنیفہ "جہمی" تھے؟

انھوں نے کہا: ہاں۔

پھر اُن سے پوچھا گیا کہ اُن کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

انھوں نے کہا: ابو حنیفہ کی حیثیت ایک استاد کی سی ہے۔ ہم اُن کی ہر اچھی بات کو قبول کرتے ہیں اور ہر غلط بات کو رد کرتے ہیں۔[3]

آپ نے دیکھا کہ امام ابو حنیفہ کے متعلق اُن کے قریب ترین شاگرد اور اُن کے مذہب کے ناشر کیا رائے رکھتے تھے۔ دوسروں سے بھلا کیا امید کی جا سکتی ہے؟!

ولید بن مسلم کا بیان ہے کہ مالک بن انس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے شہر میں بھی ابو حنیفہ کا نام لیا جاتا ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ انھوں نے کہا پھر تمہارے شہر میں زندگی بے معنی ہے۔[4]

اوزاعی کہتے ہیں کہ ہمیں ابو حنیفہ پر یہ اعتراض نہیں ہے کہ وہ اپنا نظریہ کیوں پیش کرتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص صاحب نظر ہے۔ ہمیں اُن سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ جب اُن کے سامنے حدیث پاک پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کے خلاف اپنی رائے دیتے ہیں۔[5]

۱۔ استاد ابو زہرہ، ابو حنیفہ ص ۵۔ ۲۔ خطیب ج ۱۳، ص ۳۰۵، ۳۱۳۔ ۳۔ ابن عبد البر، الانتقاء ص ۱۴۸۔

۴۔ خطیب ج ۱۳، ص ۳۲۱۔ ۵۔ ابن قتیبہ، تاویل مختلف الحدیث ص ۵۲۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو رد کرنے والوں میں محمد بن اسماعیل بخاری شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب الضعفاء والمتروکون [1] میں لکھا ہے کہ نعیم بن حماد نے یحیٰی بن سعید سے، انھوں نے معاذ بن معاذ سے نقل کیا ہے کہ ہم نے سفیان ثوری سے سنا کہ "ابو حنیفہ سے دو مرتبہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کریں۔" نعیم فزاری کا بیان ہے کہ میں سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے ابو حنیفہ کے انتقال کی خبر دی تو ابن عیینہ نے کہا: "انھوں نے اسلام کے ہر رکن کو منہدم کر دیا تھا۔ آج تک اُن سے زیادہ برا شخص اسلام کی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا۔" یہ تھی امام بخاری کی رائے ابو حنیفہ کے متعلق۔[2]

ابن جارود نے بھی اپنی کتاب الضعفاء والمتروکون میں لکھا ہے کہ "ابو حنیفہ کی اکثر احادیث خیالی ہیں۔"

وکیع بن جراح کے مطابق امام ابو حنیفہ نے دو سو احادیث پیغمبرؐ کے خلاف عمل کیا تھا۔

ابن مبارک سے کہا گیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ابو حنیفہ کے قول پر عمل کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ لوگوں کی ہر بات سچی بھی تو نہیں ہوتی۔ جب ہم نے اُن کی تلاش کے لیے سفر کیا تو ہم ان سے آشنا نہیں تھے۔ پھر ہم نے انھیں اچھی طرح پہچان لیا۔[3]

یہ بات بالکل غیر جانبدارانہ رائے ہے۔ ان آراء میں کوئی ناروا بات نہیں کہی گئی اور نہ الزام لگایا گیا ہے۔ ان آراء میں معقول حدود کا لحاظ رکھا گیا ہے اور امام ابو حنیفہ پر علمی اشکال کیے گئے ہیں۔

ہم نے امام ابو حنیفہ کے پیروؤں کی مبالغہ آمیز آراء اور اُن کے مخالفین کی تند و تیز آراء دونوں کو نقل نہیں کیا بلکہ علماء کی آراء پر اکتفا کیا ہے۔ یہ آراء اُن کی شخصیت کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق علماء کی یہ آراء ہوں وہ امام کیسے بن گئے تھے جبکہ اس وقت فقہ اور تفسیر و حدیث میں اُن سے بڑے پائے کے علماء موجود تھے؟ بات یہ ہے کہ سیاست کی نیرنگی سے انھیں "امام امت" کا رتبہ ملا تھا اور سیاست کیا گل نہیں کھلاتی؟

امام ابو حنیفہ اور امام جعفر صادق علیہ السلام

امام ابو حنیفہ فن مناظرہ میں بہت طاق تھے۔ منصور عباسی چونکہ امام جعفر صادقؑ سے خائف رہتا تھا اور جانتا تھا کہ مکہ، مدینہ، کوفہ اور قم کے علمی حلقوں میں امام صادقؑ کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے

۱۔ اس کتاب میں بخاری نے اُن افراد کا تعارف کرایا ہے جو روایت حدیث میں ضعیف سمجھے جاتے تھے اور جن کی روایات ترک کر دی جاتی تھیں۔

۲۔ ابن عبدالبر، الانتقاء ص ۱۵۰۔

اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے امام کو علمی گفتگو میں پسپائی ہو اور وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں اس بدبختی کی وجہ سے اُس نے امام جعفر صادقؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ جب امام نے اُس کی دعوت قبول کر لی تو منصور نے امام ابوحنیفہ کو بلا کر کہا کہ جعفر بن محمد (ع) کوفہ آرہے ہیں۔ تم اُن سے مجلس عام میں پوچھنے کے لیے ایسے سوالات تیار کرو جن کا وہ جواب نہ دے سکیں۔

ابوحنیفہ کا بیان ہے کہ میں نے فقہ میں جعفر بن محمد (ع) سے زیادہ کسی کو صاحب علم نہیں پایا۔ منصور نے مجھے بلا کر کہا کہ جعفر صادق (ع) آرہے ہیں۔ تم اُن سے پوچھنے کے لیے مشکل سوالات تیار کرو چنانچہ میں نے چالیس سوالات تیار کیے۔ پھر منصور نے مجھے پیغام بھیجا کہ تم "حیرہ" آجاؤ۔ میں حیرہ گیا۔ منصور کا دربار لگا ہوا تھا اور جعفر صادق (ع) بھی وہاں موجود تھے۔ جب میری نظر اُن پر پڑی تو منصور کی ہیبت سے زیادہ میرے دل میں اُن کی ہیبت بیٹھ گئی۔ میں نے منصور کو سلام کیا۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اُس نے جعفر صادق (ع) سے کہا کہ یہ ابوحنیفہ ہیں۔

جعفر صادق (ع) نے کہا کہ ہاں! یہ ہمارے پاس آیا تھا۔ پھر منصور نے مجھ سے کہا: ابوحنیفہ! تم اپنے سوالات ابوعبداللہ (ع) کے سامنے پیش کرو۔ میں نے اُن سے یکے بعد دیگرے سوال کیے۔ انھوں نے میرے ہر سوال کا تسلی سے جواب دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اس کے متعلق تم لوگوں کی یہ رائے ہے اور اہل مدینہ کی یہ رائے ہے اور ہم یہ کہتے ہیں۔ کبھی اُن کے خیالات ہمارے خیالات کے موافق اور کبھی مخالف ہوتے تھے۔ میں نے اُن سے پورے چالیس سوال کیے۔ انھوں نے سب کے جواب دیے۔ اس کے بعد امام ابوحنیفہ نے کہا: کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ "اعلم" وہ ہوتا ہے جسے لوگوں کے اختلافات کا سب سے زیادہ علم ہو۔[1]

امام جعفر صادقؑ ہمیشہ ابوحنیفہ کو قیاس کرنے سے منع کرتے تھے اور قیاس کرنے کی وجہ سے سخت تنقید کرتے تھے۔ آپ نے ابوحنیفہ سے فرمایا تھا: میں نے سنا ہے کہ تم دین کے مسائل میں اپنی رائے سے قیاس کرتے ہو۔ ایسا نہ کیا کرو کیونکہ سب سے پہلے جس نے قیاس کیا تھا وہ ابلیس تھا۔[2]

۱۔ موفق، مناقب ابوحنیفہ ج ۱، ص ۱۷۸۔ ابی، نکت کوفۃ الحفاظ ج ۱، ص ۱۶۲۔

۲۔ شعرانی، طبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۶۳۔

ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ نے ابوحنیفہ سے کہا تھا "خدا سے ڈرو اور اپنی رائے سے قیاس مت کرو۔ کل ہم اور تمہارے مخالفین خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہم کہیں گے کہ خدا و رسولؐ نے یوں کہا۔ تم اور تمہارے ساتھی کہیں گے کہ ہماری رائے یہ تھی اور ہم نے ایسا قیاس کیا۔ پھر خدا ہمارے اور تمہارے ساتھ جو چاہے گا سلوک کرے گا۔"

(ہاشم معروف حسنی، تاریخ فقہ جعفری مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ نے ابو حنیفہ سے کہا: "یہ بتاؤ اگر کوئی شخص حالت احرام میں ہرن کے اوپر والے چار دانت توڑ دے تو اس کا کیا کفارہ ہے؟"

ابو حنیفہ نے کہا: فرزند رسولؐ! مجھے معلوم نہیں۔

امام نے فرمایا ثابت ہوا کہ تم غلط دعویٰ کرتے ہو۔ تمھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہرن کے اوپر والے حصے میں چار دانت ہوتے ہی نہیں۔ اس کے صرف دو دانت ہوتے ہیں۔[1]

ابو نعیم لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو حنیفہ، عبداللہ بن ابی شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ کے ہمراہ امام صادقؑ کے پاس گئے۔ آپ نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ شخص کون ہے؟

اُس نے کہا کہ یہ شخص دین میں بصیرت اور گہری نظر رکھتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ شاید یہ شخص امور دین میں اپنی رائے سے قیاس کرتا ہے؟

اُس نے کہا: ہاں۔

امام جعفر صادقؑ نے ابو حنیفہ سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟

اُس نے کہا کہ میرا نام نعمان ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ چہرے مہرے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔ پھر آپ نے اُن سے کچھ سوالات پوچھے۔ ہر سوال کے جواب میں امام ابو حنیفہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو امام نے خود سوالات کے جواب دیے۔ پھر فرمایا: "میرے والد نے میرے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ یعنی سب سے پہلے امور دین میں ابلیس نے قیاس کیا تھا۔ جب خدا نے اسے حضرت آدمؑ کے سجدہ کا حکم دیا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے پیدا کیا لہٰذا جو بھی شخص دین میں اپنی رائے سے قیاس کرے تو خدا قیامت کے دن اسے ابلیس کے ساتھ محشور کرے گا کیونکہ وہ قیاس میں ابلیس کا پیروکار ہے۔

فخر الدین رازی لکھتے ہیں: عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ ابو حنیفہ قیاس پر زیادہ انحصار کرتے تھے اور اُن کے مخالفین بھی قیاس کی وجہ سے اُن پر زیادہ تنقید کرتے تھے مگر قیاس کے اثبات میں نہ تو انھوں نے ایک ورق لکھا تھا اور نہ ہی اُن کے کسی شاگرد نے ایک صفحہ لکھا تھا۔ اس کے حجت ہونے کی تو بحث ہی علیحدہ ہے۔ اس مسئلے پر سب سے پہلے امام شافعی نے بحث کی تھی اور اُس کی دلیل پیش کی تھی۔[2]

جب لوگوں نے قیاس کو دلیل شرعی کے عنوان سے مصدر شریعت تسلیم کرلیا تو امام جعفر صادقؑ

۱۔ وفیات الاعیان ج ۱، ص ۳۲۸۔ شذرات الذہب ج ۱، ص ۲۳۰۔

۲۔ عبدالحلیم جندی، الامام الصادق حاشیہ ص ۱۸۰۔

نے اس کی مخالفت کی اور آپ نے احکام شریعت کے استنباط کے لیے لوگوں کو صحیح راستے کی رہنمائی کی۔ آپ کے مکتب سے ہزاروں علماء اور مجتہدین پیدا ہوئے جن میں سے ایک امام ابوحنیفہ بھی تھے۔ انھوں نے دو سال تک امام کے علمی مکتب سے فیض حاصل کیا تھا اور وہ خود فرمایا کرتے تھے۔ لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ (اگر میری زندگی میں دو سال شامل نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا)۔

وہ جب بھی امام جعفر صادقؑ کو مخاطب کرتے تو کہتے

"دختر پیغمبرؐ کے فرزند! میں آپ پر قربان جاؤں۔"[1]

عبدالحلیم جندی امام ابوحنیفہ کی شاگردی کے متعلق لکھتے ہیں:

اگر امام مالک یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ امام شافعی کے بڑے استاد ہیں اور اگر امام شافعی یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ امام احمد بن حنبل کے بڑے استاد ہیں تو پھر امام جعفر صادقؑ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ آپ مذاہب اربعہ کے تمام بانیوں کے استاد ہیں۔ اگرچہ فقہ کے چاروں دبستان آپ کے ممنون ہیں پھر بھی آپ کو اُن پر فخر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خدا نے یہ شرف عطا کیا تھا کہ آپ تمام لوگوں کے لیے اپنے جد امجد حضرت رسول مقبولؐ کے علم کے مبلغ تھے اور آپ مقام امامت پر فائز تھے۔ امام جعفر صادقؑ کو فقہ کے ائمہ اربعہ پر فخر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ ائمہ اربعہ یہ فخر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے آپ سے کسب فیض کیا تھا۔[2]

یہ حقیقت ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی شاگردی قابل افتخار شرف ہے۔ آپ عالم اہلبیتؑ اور معدن حکمت تھے۔ آپ کے دشمن بھی آپ کی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے۔ منصور عباسی یہ کہا کرتا تھا کہ جعفر صادق (ع) وہ ہڈی ہیں جو میرے گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ اعلم اہل زمان ہیں اور اُن کا تعلق اُس گروہ سے ہے جو دنیا کی بجائے آخرت کا طلبگار ہے لیکن امام جعفر صادقؑ کی فضیلت کا اعتراف کرنا ہی کافی نہیں، اُن کی اتباع کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے اور حضرت رسول خداؐ نے حدیث ثقلین میں اُن کی اطاعت کے واجب ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے آپ کی اتباع کے بجائے قیاس کر کے فتوے دیئے تھے۔ انھوں نے اپنی اس روش کے ذریعے احادیث رسولؐ کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے سترہ احادیث کے سوا باقی سب احادیث کو رد کر دیا تھا۔

ہم اس بحث کو امام جعفر صادقؑ اور امام ابوحنیفہ کے درمیان ہونے والے ایک مناظرہ پر ختم کرتے ہیں۔ ایک دن امام ابوحنیفہ امام جعفر صادقؑ کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟

۱۔ عبدالحلیم جندی، الامام الصادق حاشیہ ص ۱۲۲۔ ۲۔ عبدالحلیم جندی، الامام الصادق حاشیہ ص ۱۲۳۔

(امام جعفر صادقؑ اور امام ابو حنیفہ کی گفتگو کو ہم مکالمے کی صورت میں لکھ رہے ہیں)۔

ابو حنیفہ: میں ابو حنیفہ ہوں۔

امام: مفتی اہل عراق؟

ابو حنیفہ: جی۔

امام: کس چیز سے فتویٰ دیتے ہو؟

ابو حنیفہ: کتاب خدا سے۔

امام: کیا تم کتاب خدا میں ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کو جانتے ہو؟

ابو حنیفہ: جی۔

امام: اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ آیت ... وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ○ میں وہ کون سی جگہ مراد ہے جہاں مسافر دن رات سفر کریں تو محفوظ رہتے ہیں؟

ابو حنیفہ: اس سے مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر مراد ہے۔

امام نے مجمع کی طرف دیکھا اور فرمایا: تمہیں خدا کی قسم! یہ بتاؤ کہ جب تم مدینہ سے مکہ کا سفر کرتے ہو تو کیا تمہیں چور ڈاکوؤں کا دھڑکا نہیں ہوتا؟ حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا کہ خدا کی قسم! ہمیں دھڑکا لگا رہتا ہے اور اس راستے میں کئی کاروان لٹ چکے ہیں۔

امام نے ابو حنیفہ سے فرمایا تم پر افسوس! اللہ صرف سچ کہتا ہے۔

ابو حنیفہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انھوں نے پسپائی اختیار کی اور کہا کہ میں قرآن کریم سے کماحقہ آشنائی نہیں رکھتا۔ میں صاحب قیاس ہوں۔

امام: اچھا اگر تم قیاس سے مسائل حل کرتے ہو تو پھر قیاس کر کے مجھے بتاؤ کہ خدا کے نزدیک قتل بڑا جرم ہے یا زنا؟

ابو حنیفہ: قتل۔

امام: پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ شریعت میں قتل کے لیے دو اور زنا کے لیے چار گواہ مقرر کیے گئے ہیں۔ کیا مجرم نے جرم کے لیے زیادہ اور بڑے جرم کے لیے کم گواہ مقرر کرنا قیاس کے مطابق ہے؟

ابو حنیفہ: نہیں۔

امام: اچھا یہ بتاؤ کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟

ابو حنیفہ: نماز۔

امام: پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ زن حائض پر رمضان کے روزوں کی قضا فرض کی گئی ہے لیکن

ان ایام کی نمازیں معاف ہیں جبکہ قیاس کا تو یہ تقاضا ہے کہ بڑی عبادت کی قضا ہونی چاہیے اور چھوٹی عبادت کی قضا نہیں ہونی چاہیے۔

ابو حنیفہ: اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم۔

امام: اچھا اسے بھی رہنے دو۔ یہ بتاؤ کہ پیشاب زیادہ نجس ہے یا منی؟

ابو حنیفہ: پیشاب۔

امام: قیاس کا تو یہ تقاضا ہے کہ جو چیز زیادہ نجس ہے اُس کے اخراج پر غسل ہونا چاہیے اور جو کم نجس ہے اُس پر صرف وضو ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے منی کے اخراج پر غسل اور پیشاب کے اخراج پر وضو کو واجب کیا ہے۔ آخر کیوں؟ [1]

ابو حنیفہ: مجھے نہیں معلوم۔ میں صرف صاحب رائے ہوں۔

امام: اچھا یہ بتاؤ کہ ایک آقا تھا اور ایک اُس کا غلام تھا۔ آقا اور غلام نے ایک ہی رات شادی کی اور ایک ہی رات میں اپنی اپنی بیویوں سے مباشرت کی اور اُن کی بیویاں ایک ہی رات میں حاملہ ہوئیں۔ پھر آقا اور غلام دونوں سفر پر چلے گئے۔ اُن دونوں کی بیویاں ایک ہی کمرے میں تھیں اور دونوں سے بچے پیدا ہوئے۔ اچانک یہ ہوا کہ دونوں عورتیں گھر میں موجود تھیں کہ گھر کی چھت گر پڑی اور دونوں عورتیں مر گئیں لیکن اتفاق سے بچے بچ گئے۔ اب یہ بتاؤ کہ اُن میں سے مالک کون ہوگا اور

---

[1] تاریخ فقہ و تدوین حدیث کی کتابوں میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکثر صورتوں میں امام ابو حنیفہ کی رائے بہت سے صحابہ سے مختلف ہوتی تھی کیونکہ ان احکام کے بارے میں اُن صحابہ کی رائے نقلی اصولوں کے مطابق نہیں تھی۔ یہ سب گزبڑ اوزی نتیجہ تھا اس بات کا کہ احادیث نبوی قبول کرنے میں نقلی سے کام لیا گیا اور اپنے اجتہاد اور قیاس کو ترجیح دی گئی۔ جن مسائل میں علت مشترک نظر آئی یا جن باتوں کا مقصد اور فائدہ یکساں معلوم ہوا ان کے بارے میں ایک ہی طرح کا حکم دیا گیا۔ اس اصول کی بنیاد اس بات پر تھی کہ شارع مقدس نے ملتے جلتے مسائل میں ایک ہی طرح کا حکم دیا ہے اور جن مسائل میں کوئی مشابہت اور مماثلت موجود نہیں تھی وہاں حکم بھی مختلف دیا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ بعض موقعوں پر ملتے جلتے مسائل میں بھی حکم مختلف ہے اور بعض مواقع پر کوئی مماثلت نہ ہونے کے باوجود مختلف مسائل میں یکساں حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائے اسلام میں بعض فقہاء نے قیاس سے منع کیا تھا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ قیاس کے نتیجے میں کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرا دیا جائے۔

فقہائے کرام نے "ایک جیسے افعال" میں "حکم مختلف ہونے" کی مثال پر تھوڑے مال کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا اور کثیر مال غصب کرنے پر ہاتھ نہ کاٹنے کا فتویٰ دیا ہے اور "مختلف افعال" مثلاً انسان کو قتل کرنے، رمضان کا روزہ توڑنے اور اپنی بیوی سے ظہار کرنے پر "ایک جیسے کفارے" کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ اول الذکر میں قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ "حکم ایک ہوتا" اور موخر الذکر میں تینوں افعال کا "حکم مختلف ہوتا"۔ علامہ ہاشم معروف حسنی، تاریخ فقہ جعفری ص ۱۴۰۔ (رضوانی)

مملوک کون ہوگا اور وارث کون ہوگا اور مورث کون ہوگا۔ آقا کون ہوگا اور غلام کون ہوگا؟

ابو حنیفہ کافی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر شرمندگی سے بولے کہ میں صاحب رائے نہیں ہوں میں صرف حدود و تعزیرات کا عالم ہوں۔

امام اچھا تو یہ بتاؤ کہ اگر کوئی نابینا کسی بینا کی آنکھیں ضائع کر دے یا ہتھ کٹا کسی شخص کے ہاتھ کو کاٹ دے تو اُس کا قصاص کس طرح لیا جائے گا؟

ابو حنیفہ نے کہا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

امام نے فرمایا کہ میں نے تم سے یہ سوال اس لئے پوچھے ہیں تاکہ کل کلاں کوئی یہ نہ کہے کہ ابو حنیفہ جعفر بن محمد (ع) کے پاس گئے تھے اور انھوں نے اُن سے کوئی سوال نہ پوچھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی سوال نہ پوچھتا۔ اب اگر تم اہل قیاس ہو تو جاؤ قیاس کرو۔[1]

ابو حنیفہ نہیں۔ میں آج کے بعد خدا کے دین میں اپنی رائے سے قیاس نہیں کروں گا۔

امام تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ حب ریاست تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کو اُس نے نہیں چھوڑا تھا۔

امام مالک بن انس

ایک قول کے مطابق ابو عبداللہ مالک بن انس بن مالک اصبحی ۹۳ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے تھے اور ایک قول کے مطابق ۱۷۹ھ میں مدینہ میں فوت ہوئے تھے۔ امام مالک کے دور میں علم حدیث عروج پر تھا اور طالب علم دور دراز کا سفر کر کے اپنی علمی پیاس بجھانے مدینہ آتے تھے۔ اُس وقت مدینہ میں حدیث کے بہت سے کتب موجود تھے جبکہ کوفہ اہل رائے کا مرکز تھا اور اس مکتب کی قیادت ابو حنیفہ کر رہے تھے۔ اس وجہ سے دونوں مکاتب فکر میں کافی اختلافات پائے جاتے تھے۔

۱۔ علامہ اقبال نے ۱۴ر اپریل ۱۹۳۶ء کو ایک خط کے ذریعے علامہ سید سلیمان ندوی سے پوچھا تھا:

"امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدہ شہادت ہے یا جزو قانون ہے۔ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض مقدمات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان بچہ جو فقہ اسلامی کے رو سے ولد الحلال ہے ایک قاعدہ شہادت کی رو سے ولد الحرام قرار دیا جاتا ہے۔"

سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کو جواب میں لکھا تھا:

اس کی اساس ایک تو حضرت عائشہؓ کا قول ہے جو دراصل طبی ہے۔ دوسرے طبی تجربہ ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اکثر مدت حمل چار برس ہے۔ (جاوید) (کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ ۲۷۵ مرتبہ سید مظفر حسین برنی) رضوانی

ان مکاتب کے بالمقابل امام جعفر صادقؑ کا مخصوص کتب تھا اور مدرسہ اہلبیتؑ ہر وقت علماء و فقہاء و محدثین سے بھرا رہتا تھا۔ لوگ دور دور و نزدیک سے مدرسہ اہلبیتؑ پہنچتے تھے اور ائمہ اہلبیتؑ سے ملاقات کے لیے وقت شماری کیا کرتے تھے۔ باقی ائمہ کی بہ نسبت امام جعفر صادقؑ کا دور فروغ علم کے لیے زیادہ اچھا ثابت ہوا کیونکہ اُس وقت بنی امیہ اور بنی عباس چپقلشوں میں الجھے ہوئے تھے اور امام پر حکومت کی طرف سے کوئی قدغن عائد نہیں تھی۔

امام مالک نے بھی کچھ عرصے تک اس کتب سے استفادہ کیا تھا اور احادیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی لیے امام جعفر صادقؑ کو امام مالک کا عظیم استاد کہا جاسکتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے علاوہ امام مالک نے عبداللہ بن زبیر کے فرزند عامر، زید بن اسلم، سعید مقبری، ابو حازم، صفوان بن سلیم کے علاوہ دوسرے اہل علم سے بھی استفادہ کیا تھا۔ ان علماء کے علاوہ امام مالک وہب بن ہرمز، نافع مولیٰ ابن عمر ابن شہاب زہری، ربیعۃ الرائے اور ابو الزناد سے بھی کسب فیض کر چکے تھے۔

امام مالک کو علم حدیث میں کافی شہرت نصیب ہوئی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ اصحاب حدیث (قیاس کے مقابلے میں حدیث سے فتویٰ دینے والے علماء) کی رہبری کے منصب پر فائز ہوئے لیکن دست سیاست نے اہل رائے کے کتب کی سرپرستی کی اور اصحاب حدیث حکومتی عتاب میں آگئے۔ اس عتاب کے ساتھ امام مالک حکومت کی نظر میں ناپسندیدہ شخصیت قرار پائے اور انھیں حدیث بیان کرنے سے روک دیا گیا۔

ایک بار انھوں نے حکومت کی مرضی کے خلاف فتویٰ دیا تو انھیں سزا میں کوڑے مارے گئے۔ یہ واقعہ ۱۴۶ھ میں جعفر بن سلیمان کی مدینہ کی گورنری کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اُس نے امام مالک کے برہنہ جسم پر اتنے کوڑے برسائے تھے کہ اُن کے شانے ہل گئے تھے۔

ابراہیم بن حماد راوی ہیں کہ مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے جب مالک اٹھتے تھے تو اپنے ایک ہاتھ کو بلند کرنے کے لیے دوسرے ہاتھ کا سہارا لیتے تھے۔ پھر زمانے نے ایک اور کروٹ لی تو وہی مالک حکومت کے مقرب بن گئے۔ حکومتی اداروں میں اُن کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ حکام اُن کی ہیبت سے لرزتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ آخر حکومتی عتاب اچانک مہربانی میں کیسے بدل گیا؟ کیا جس فتوے کی وجہ سے حکومت اُن سے ناراض ہوئی تھی انھوں نے وہ فتویٰ واپس لے لیا تھا؟ یا پھر حکومت نے اپنی رائے چھوڑ کر اُن کے فتوے کی پیروی کر لی تھی؟ یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟ یہ وہ مشکل ترین سوال ہے جو امام مالک کی سوانح کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ آخر ایسا کون سا انقلاب آگیا تھا کہ حکومت کی طرف سے کوڑے کھانے والا ملتی حکومت کا دوست بن گیا اور منصور عباسی سے

اُس کے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ جب امام مالک اور منصور میں موافقت ہوئی تو منصور نے امام مالک سے کہا: "خدا کی قسم! آپ سب سے بڑے عالم اور نادر روزگار شخصیت ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے اقوال کو قرآن کی طرح سے لکھوا کر تمام ممالک میں بھیج دوں گا اور لوگوں کو آپ کے اقوال پر عمل کرنے کا پابند کر دوں گا۔"

امام مالک کے مذہب کے فروغ پانے کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ حکومت اُن سے راضی تھی۔ ورنہ یہاں کسی دانائی اور نادانی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ حکومت میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جس طرح کی تبلیغ و دعوت کو پسند کرے اُس کی سرپرستی کرے اور اسے عوام پر مسلط کرے۔ حکومت کی اسی قوت نافذہ کو دیکھ کر امام مالک کے استاد ربیعۃ الرائے نے کہا تھا: "کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ حکومت کا ایک مثقال علم کے پورے ذخیرے سے بہتر ہے۔"[1]

جب امام مالک اور منصور میں مصالحت ہو گئی تو امام مالک نے کہا:

میں نے منصور کو کتاب خدا، سنت رسولؐ اور سابقین کی تاریخ کا سب سے بڑا عالم پایا ہے۔

سبحان اللہ! نجانے امام مالک کو منصور میں کون سا علم دکھائی دیا تھا کہ انھوں نے اسے کتاب وسنت کا سب سے بڑا عالم قرار دیا!!

یہ کہہ کر امام مالک نے بادشاہ وقت کا قرب حاصل کرنا چاہا تھا۔ اس کے باوجود مؤلفین یہ کہنے پر کیوں مصر ہیں کہ امام مالک حکومت سے دور رہتے تھے؟

تاریخ یہ گواہی نہیں دیتی کہ امام مالک نے کبھی بھی منصور کے مقابلے پر "جرأت رندانہ" سے کام لیا ہو یا اُس کے کسی فرمان کو چیلنج کیا ہو۔ اس کے برعکس عبداللہ بن مرزوق نے منصور کو کھری کھری سنائی تھیں۔ تاریخ میں ہے کہ جس سال منصور حج کے لیے گیا اُسی سال عبداللہ بن مرزوق بھی حج پر گئے ہوئے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا کہ منصور کے گرد اُس کے خوشامدیوں کا حلقہ ہے اور وہ اُس حلقے میں رہ کر طواف کر رہا ہے۔ عبداللہ حق گوئی سے باز نہ رہ سکے۔ انھوں نے منصور سے کہا کہ تمھیں خانہ خدا اور مخلوق خدا میں اس طرح جدائی ڈالنے کا حق کس نے دیا ہے؟ منصور نے اُن کی طرف دیکھا اور انھیں پہچان کر کہا: عبداللہ بن مرزوق! تجھے یہ جرأت کس نے دی ہے۔ تجھے کس نے اس طرح کی گستاخی پر ابھارا ہے؟ عبداللہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟ کیا تم میرے نفع و نقصان کے مالک ہو؟ خدا کی قسم! میں نہ تو تمھارے کسی ضرر سے ڈرتا ہوں اور نہ تم سے کسی فائدے کی امید رکھتا

۱۔ ابو اسحاق، طبقات الفقہاء، ص ۵۳۔

ہوں۔ وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

منصور نے کہا تو نے اپنے خون کو حلال کر دیا ہے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

عبداللہ نے کہا اگر قضا و قدر کا یہی فیصلہ ہے کہ تم مجھے نقصان پہنچاؤ تو جو کچھ تم سے ہو سکے، کر گزرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری منفعت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا سے جو فوائد مجھے ملنے ہیں اگر تم انھیں قطع کر سکتے ہو تو قطع کر دو۔ خدایا! سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی ہر چیز کا مالک ہے۔

منصور نے حکم دیا کہ عبداللہ کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا جائے۔ چنانچہ حکومتی اہلکاروں نے انھیں گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد انھیں رہا کر دیا۔[1]

امام مالک نے اس نکتے کو اچھی طرح سے جان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے امام صادقؑ سے دوری اختیار کر لی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ امام صادقؑ اور حکومت کے درمیان پورے قطب کا فاصلہ ہے اور ایک سے قربت دوسرے سے دوری کی علامت ہے لہٰذا انھوں نے حکومت کی قربت کو ترجیح دی اور امام جعفر صادقؑ سے تعلقات ختم کر دیے۔

ہمارا خیال ہے کہ اُس وقت عرب اہلبیتؑ کی خاطر حکومت کے خلاف قیام کرنے کے خواہشمند تھے۔ عباسی حکومت کو ایک عرب عالم کی ضرورت تھی جو انھیں کرسی اقتدار پر برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کر سکے چنانچہ حکومت نے اس کام کے لیے امام مالک کا انتخاب کیا اور غیر عرب لوگوں کو حکومت سے نزدیک رکھنے کے لیے امام ابو حنیفہ کی سرپرستی کی گئی۔ چنانچہ حکومت نے یہ پروپیگنڈا کرایا کہ اس وقت تمام اسلامی علوم کے وارث امام مالک ہیں۔ بنی عباس کے لیے ایسا کرنا اشد ضروری تھا کیونکہ انھوں نے بنی امیہ کے خلاف یہ کہہ کر لوگوں کو بغاوت پر ابھارا تھا کہ یہ لوگ خدا کے دین سے دور ہو چکے ہیں۔ عباسی حکومت نے امام مالک کی خوب سرپرستی کی اور انھیں وہ اختیارات دیے جو آج تک کسی عالم کو کسی بھی حکومت نے نہیں دیے تھے۔

خلیفہ کی طرف سے امام مالک کو یہ خط ملا

"آپ مکہ، مدینہ اور حجاز میں ہمارے مقرر کردہ حکام کی جو بھی ناانصافی دیکھیں ہمیں مطلع کریں۔ ہم اُن کو اُن کے جرم کے مطابق سزا دیں گے۔"

اس سرکاری فرمان کے بعد امام مالک کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ حکومتی ارکان اُن سے بھی اسی طرح ڈرتے تھے جیسے وہ منصور سے ڈرتے تھے۔

شافعی اس بیت کو اس طرح سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں مکہ سے مدینہ آیا تھا تو والی مکہ

۱۔ ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ ج ۲، ص ۱۳۷۔

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ آج تمام مذاہب کو امام جعفر صادقؑ کے مذہب پر مقدم رکھا جا رہا ہے بلکہ سوڈان کی طرح کئی اسلامی ممالک ایسے بھی ہیں کہ وہاں کے معاشرے کے پڑھے لکھے افراد کو امام جعفر صادقؑ کے مذہب سے واقفیت تک نہیں ہے؟

یونیورسٹی کے زمانے میں ہمارے پروفیسر ہمیں فقہ مالکی پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ طالب علموں نے اُن سے کہا کہ آپ صرف فقہ مالکی کیوں پڑھاتے ہیں؟ آپ چاروں فقہ کا درس کیوں نہیں دیتے؟

پروفیسر صاحب نے جواب دیا تھا کہ میں مالکی ہوں اور تمام اہل سوڈان مالکی ہیں۔ اگر تمہارے درمیان کوئی مالکی نہیں ہے تو میں اسے اُس کی فقہ پڑھانے پر تیار ہوں۔

میں نے کہا جناب! میں مالکی نہیں ہوں۔ کیا آپ مجھے میری فقہ پڑھائیں گے؟

پروفیسر صاحب نے کہا: کیوں نہیں! کیا آپ شافعی ہیں؟

میں نے عرض کیا نہیں۔ پروفیسر صاحب بولے کیا آپ حنفی ہیں؟

میں نے عرض کیا نہیں۔ وہ بولے تو کیا آپ حنبلی ہیں؟

میں نے عرض کیا نہیں۔

یہ سن کر اُن پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ کہنے لگے آپ کس امام کی تقلید کرتے ہیں؟

میں نے کہا کہ میں فرزند رسولؐ امام جعفر صادق علیہ السلام کی تقلید کرتا ہوں۔

پروفیسر صاحب کہنے لگے کہ جعفر کون تھے؟

میں نے کہا کہ وہ اہلبیت رسولؐ کے فرد تھے۔ وہ مالک اور ابو حنیفہ کے استاد تھے اور ان کی فقہ کو فقہ جعفری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں نے تو آج تک اس مذہب کا نام نہیں سنا۔

میں نے کہا: جناب ہم شیعہ ہیں۔

پروفیسر صاحب نے کہا میں شیعوں سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ یہ کہہ اور کلاس سے نکل گئے۔

اصول فطرت ہے کہ جس کے پاس ذرائع ابلاغ اور اقتدار دونوں چیزیں ہوں وہ شہرت کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ ممکن ہے امام مالک خود اس مقام کے خواہشمند نہ ہوں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان سے زیادہ لائق افراد بھی موجود ہیں۔

حکومت اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انھیں مرجع عام و خاص بنانا چاہتی تھی۔ منصور نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ ایک کتاب لکھیں۔ حکومت لوگوں کو اس کی پیروی پر مجبور کرے گی۔ امام مالک نے اس وقت اس پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا۔

نے مجھے والی مدینہ کے نام خط دیا تھا جس میں لکھا تھا کہ حامل رقعہ ہذا کو مالک کے پاس لے جاؤ۔
جب حاکم مدینہ نے مکہ کے حاکم کا خط پڑھا تو کہا: "جوان! اگر میں مدینہ سے براہ پا مکہ کا سفر کروں تو یہ میرے لیے آسان ہے لیکن مالک کی ڈیوڑھی پر جانا میرے لیے انتہائی مشکل ہے۔ میں کسی بھی جگہ اپنے آپ کو چھوٹا محسوس نہیں کرتا لیکن جب مالک کے گھر جاتا ہوں تو مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا ہے۔"[1]

منصور کے بعد جب مہدی خلیفہ بنا تو اُس نے امام مالک کے احترام میں مزید اضافہ کیا۔ مہدی ہمیشہ اُن کو تحفے تحائف بھیجتا تھا اور اُن پر خاص نوازشات کرتا تھا اور لوگوں کے سامنے اُن کی علمیت کے گن گاتا تھا۔ مہدی کے بعد ہارون برسراقتدار آیا تو اس نے بھی امام مالک کی قدر و عزت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس طرح سے لوگوں کے دلوں میں امام مالک کی ہیبت کا سکہ بیٹھ گیا۔

جی ہاں! حکومت ایسی چیز ہے کہ نامور افراد کو گمنام اور گمنام افراد کو بام عروج پر پہنچا دیتی ہے اور مثل مشہور ہے کہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔" جب خلفاء امام مالک کا احترام کرتے تھے تو اُن کا مذہب ترقی کیوں نہ کرتا۔

ہماری ہزاروں جانیں امام جعفر صادق علیہ السلام پر قربان۔ حکومت جانتی تھی کہ امام جعفر صادق علیہ السلام حق پر ہیں اور حق اُن کے ساتھ ہے۔ خلفائے بنی عباس یہ بھی جانتے تھے کہ امامت صرف انہی کو زیب دیتی ہے۔ اس حقیقت کا اقرار امام مالک نے بھی یہ کہہ کر کیا تھا: کسی آنکھ نے آج تک ایسے شخص کو نہیں دیکھا اور کسی کان نے ایسے شخص کی گفتگو نہیں سنی اور کسی دل میں آج تک ایسے شخص کے متعلق تصور تک پیدا نہیں ہوا جو فضیلت، علم، عبادت اور تقویٰ میں جعفر صادقؑ سے برتر و بہتر ہو۔[2]

امام کے اس علم و فضل کے باوجود آپ نے ہمیشہ اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کیا۔ آپ نے اپنے شیعوں کے قتل اور جلاوطنی کے مناظر دیکھے۔ وفات رسولؐ کے بعد سے لے کر آپ کے دور تک آل محمدؐ اور اُن کے شیعہ مصائب ہی جھیلتے رہے اور انھیں کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا تھا۔

کتاب الامام الصادق معلم الانسان کے مؤلف نے ایک خوبصورت سوال اٹھایا ہے اور وہی سوال میں بھی اپنے آپ سے کیا کرتا ہوں کہ "میرا سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمان سنی اور شیعہ دو گروہوں میں کیوں تقسیم ہوئے۔ میرا سوال اس سے زیادہ تعجب خیز ہے یعنی آج تک شیعہ جس ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے ہیں اس کے باوجود اُن میں اتنی قوت کہاں سے آگئی تھی کہ انھوں نے حکومتوں کو چیلنج کیا؟ جبکہ ریاستی سطح پر حق کے آثار مٹانے اور اسلام حقیقی کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں!؟"[3]

۱۔ معجم الادباء ج ۱۶، ص ۱۸۵۔ ۲۔ مناقب ابن شہر آشوب ج ۴، ص ۳۲۸۔
۳۔ الامام الصادق معلم الانسان ص ۵۲۔

منصور نے ان سے اصرار کیا کہ آپ کتاب لکھیں۔ آپ اس دور کے سب سے بڑے عالم ہیں۔[1] چنانچہ منصور کے اصرار پر انھوں نے "مؤطا" لکھی۔ جب مؤطا منظرعام پر آئی تو خلیفہ کی طرف سے ایام حج میں منادی کرائی گئی کہ مالک کے علاوہ کسی کو فتوی دینے کی اجازت نہیں ہے۔[2]

مذہب مالکی کے فروغ کے اسباب

بادشاہوں اور قاضیوں کی ملی بھگت سے مذہب مالکی کو فروغ نصیب ہوا۔ اندلس کے اموی سلطان نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مذہب مالکی کی پیروی کریں اور اس سرکاری حکم کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ کسی نے امام مالک سے سلطان اندلس کے متعلق سوال کیا۔ امام مالک نے سلطان اندلس کی تعریف کی اور کہا کہ وہ باکردار انسان ہے۔ سلطان اندلس کو جب امام مالک کے تاثرات کا علم ہوا تو وہ مالک سے بیحد خوش ہوا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مذہب مالکی کی پیروی کریں اور اوزاعی کے مذہب کو چھوڑ دیں۔

ایک پرانی ضرب المثل ہے الناس علی دین ملوکھم لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ اندلس میں بھی یہی کچھ ہوا "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے تحت لوگوں کو چار و ناچار فقہ مالکی کی پیروی کرنی پڑی۔

افریقہ میں مذہب مالکی کو قاضی سحنون کی وجہ سے پذیرائی ملی تھی۔

اس داستان کو مقریزی کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "جب معز بن بادیس نے افریقہ کا اقتدار حاصل کیا تو اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ باقی مذاہب کو چھوڑ کر مذہب مالکی کی پیروی کریں۔ اس فرماں کی وجہ سے لوگوں نے مالکی فقہ اختیار کی اور یہ سب کچھ سلطان کی رضامندی اور طلب دنیا کے لیے ہوا۔ اس دور میں قضاوت اور فتوی کا اختیار فقہ مالکی کے پیروؤں کے ہاتھ میں تھا اور اسی وجہ سے وہاں مالکی مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس مذہب کی ترویج کے پس منظر میں اس کے دلائل کی قوت اور روحانی اقدار کارفرما نہیں تھیں۔ یہ سب کچھ ریاست وحکومت کے دباؤ میں ہوا۔[3]

مراکش میں بنی تاشفین کے عہد میں فقہ مالکی کو عروج حاصل ہوا۔ جب علی بن یوسف بن تاشفین نے اقتدار حاصل کیا تو اس نے مالکی مذہب کو رواج دیا۔ ابن تاشفین علماء وفقہاء کا بڑا قدردان تھا لیکن اس قدردانی کے لیے مذہب مالکی کی پیروی بنیادی شرط تھی۔

جب لوگوں نے فقہ مالکی کے پیروؤں کی اس عزت افزائی دیکھی تو انھوں نے ایک دوسرے

۱۔ زرقانی، شرح مؤطا ج ۱، ص ۵۔ ۲۔ وفیات الاعیان ج ۳، ص ۱۳۵۔

۳۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۱۹۶۔

سے بڑھ چڑھ کر اس مذہب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اُس زمانے میں امام مالک کی کتابوں کو بڑی پذیرائی نصیب ہوئی اور فقہ مالکی خوب پھلا پھولا۔ لوگوں نے باقی مذاہب کو خیرباد کہہ دیا اور اُن کی جگہ فقہ مالکی نے سکہ رائج الوقت کا درجہ حاصل کر لیا۔ لوگوں نے فقہ مالکی کی طرف اتنی توجہ دی کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پس منظر میں چلی گئی۔

اس طرح سیاست مسلمانوں کے دین سے کھیلتی رہی اور لوگوں کے عقائد اور عبادات حکومتوں کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے اور حکام کی پسندیدہ فقہ کو لوگوں پر مسلط کیا جاتا رہا۔ مختلف علاقوں میں مذاہب کا عروج و زوال حکومتوں سے وابستہ رہا اور اس کے لیے کسی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھا گیا اور بعد میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی فقہ کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھ لیا گیا۔

ابن حزم لکھتے ہیں کہ دو مذاہب ریاستی قوت سے پھیلے ہیں۔ پہلے تو امام ابو حنیفہ کا مذہب ریاستی قوت کی وجہ سے پھیلا اور یہ قوت اسے اُس وقت ملی جب ابو یوسف منصب قضاوت پر فائز ہوئے وہ اپنے مذہب کے پیروؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو منصب قضاوت پر فائز نہیں کرتے تھے۔

دوسرے نمبر پر ہمارے ہاں اندلس میں مذہب مالکی بھی حکومت کے زور پر پھیلا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ سلطان اندلس کا مقرب خاص تھا اور اُس کے مشورے کے بغیر سلطان کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا اور یحییٰ بن یحییٰ مالکی تھا۔ اُس نے پورے اندلس میں مالکی المذہب افراد کو قاضی مقرر کرایا۔ مذہب مالکی کے علاوہ وہ کسی دوسری فقہ کے پیروکار کو یہ منصب نہیں دیتا تھا۔ لوگ فرزند دنیا ہیں جب انھوں نے اپنے حکام کو فقہ مالکی پر عمل کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے یہی مذہب اپنا لیا۔[1]

امام مالک پر چند اشکالات

ہم یہاں مالکی مذہب کے متعصب پیروؤں سے علیحدہ رہ کر اُن پر چند علمی اشکالات کرنا چاہتے ہیں اور ویسے ہمیں اس بات کا بھی اچھی طرح سے علم ہے کہ اُن کے ماننے والوں نے اُن کے لیے ایسے ایسے فضائل تراشے ہیں جن کا خود امام مالک نے تصور نہیں کیا ہوگا جبکہ پیروؤں کے اختراع کردہ فضائل اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں میزان بنا کر امام مالک کی شخصیت کو تولا جائے۔

اس طرح کے خودساختہ فضائل تو بہت زیادہ ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک فضیلت نقل کر کے اپنے موضوع پر آتے ہیں:

۱۔ ابن خلکان ج ۳، ص ۱۲۷۔

قیس کا بیان ہے کہ مجھے خواب میں حضرت رسول اکرمؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کہیں جا رہے ہیں۔ آپ کے پیچھے ابوبکرؓ چل رہے تھے اور عمرؓ کے پیچھے مالک چل رہے تھے اور مالک کے پیچھے صحابہؓ چل رہے تھے۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ یہ فضائل خودساختہ اور "ایجاد بندہ" ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ہم یہاں امام مالک کے ہمعصر علماء کی چند آراء کے تذکرے پر اکتفا کریں گے۔

امام شافعی کہتے ہیں کہ لیث امام مالک سے بڑے فقیہ ہیں لیکن اُن کے شاگردوں نے اُن کی حمایت نہیں کی تھی۔ سعید بن ایوب کہتے ہیں کہ جب بھی امام مالک اور لیث ایک جگہ جمع ہوتے تو مالک چپ رہتے تھے اور لیث اپنی مرضی سے جدھر سے چاہتے تھے مالک پر سنگ باری کرتے تھے۔[2]

علی بن مدائنی نے یحییٰ بن سعید سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں امام مالک کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا سفیان کی رائے؟ یحییٰ نے کہا کہ سفیان کی رائے کو فوقیت حاصل ہے۔ اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ پھر اُس نے کہا کہ سفیان ہر چیز میں امام مالک سے بہتر ہیں۔

یحییٰ بن معین کہتے تھے کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے سنا کہ سفیان ہر لحاظ سے مجھے مالک سے زیادہ محبوب ہے۔[3]

سفیان ثوری کا قول ہے کہ وہ (مالک) قوت حفظ سے عاری ہیں۔

ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ ابن ذئیب نے امام مالک کے متعلق سخت جملے کہے اور اُن کی بدگوئی کی جسے بیان کرنا مجھے ناپسند ہے۔[4]

امام مالک پر تنقید اور اُن کے مذہب پر اعتراض کرنے والوں میں ابراہیم بن سعد بھی شامل ہے جو کہ ایک عرصے تک اس مذہب کا مبلغ رہا تھا۔

اسی طرح سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ابن ابی یحییٰ، محمد بن اسحاق واقدی اور ابن ابی زناد نے بھی امام مالک پر تنقید کی ہے۔

سلمہ بن سلیمان نے ابن مبارک سے کہا کہ آپ نے ابوحنیفہ کی رائے پر تو حاشیہ لکھا لیکن مالک کی رائے پر کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ابن مبارک نے کہا کہ میں انھیں عالم نہیں سمجھتا۔[5]

ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن ادریس نے کہا کہ محمد بن اسحاق ہمارے پاس موجود تھے۔

۱۔ زواوی، مناقب مالک ص ۱۷۔۱۸ قاضی صعدون نے اندلس میں مالکی مذہب کو فروغ دیا تھا۔

۲۔ ابن حجر، الرحمۃ الغیثیہ ص ۸۴۔۸۵۔ ۳۔ تاریخ بغداد ج ۱۰، ص ۱۶۴۔

۴و۵۔ جامع فضائل العلم ج ۲، ص ۱۵۸۔

دوران گفتگو مالک کی ذات زیر بحث آئی۔ اُس نے کہا کہ تم مالک کا علم بیان کرو۔ یحییٰ بن اکثم نے مجھ سے کہا کہ تم نے مالک کو دیکھا ہے اور تم نے اُن کی گفتگو بھی سنی ہے اور تم محمد بن حسن کی صحبت میں بھی رہے ہو۔ تم بتاؤ کہ ان دونوں میں سے بڑا فقیہ کون تھا؟

میں نے کہا کہ محمد بن حسن، مالک سے بڑے فقیہ ہیں۔[1]

ابو محمد بن ابی حاتم نے کہا کہ ابو زرعہ نے یحییٰ بن بکیر سے سنا کہ لیث، مالک سے بڑے فقیہ تھے لیکن مقدر نے مالک کی یاوری کی تھی۔[2]

احمد بن حنبل کہتے تھے کہ ابن ابی ذئب، سعید بن مسیب کی شبیہ تھے۔ وہ مالک سے افضل تھے لیکن مالک کے لوگوں سے تعلقات بہت بہتر تھے۔[3]

مذکورہ اقوال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امام مالک کو اُن کے ہم عصر علماء پر کوئی برتری حاصل نہیں تھی جس کی وجہ سے انھیں فقہی مرجعیت حوالے کی جاتی لیکن سیاست کے اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں۔ سیاست کسی کی قابلیت کو تولا نہیں کرتی، اس کے اپنے معیار ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہی میزان پر لوگوں کا وزن کیا کرتی ہے۔ وہ اپنے طرفداروں کو ہمیشہ آگے لاتی ہے۔ سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ کسی ایسے شخص کی تقلید نہ کریں جو اُن کا سیاسی حریف ہو۔

امام شافعی

اُن کا نام و نسب یہ ہے۔ ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع مطلبی۔ آپ کی پیدائش امام ابو حنیفہ کی وفات کے دن ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اُن کے مقام پیدائش میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ غزہ میں پیدا ہوئے۔ بعض افراد کہتے ہیں کہ وہ عسقلان میں پیدا ہوئے۔ کچھ علماء مصر بتاتے ہیں۔ اُن کے متعلق ایک غیر مقبول قول یہ بھی ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔

آپ نے ۲۰۴ھ کو مصر میں وفات پائی۔ امام شافعی کی والدہ انھیں بچپن میں ہی مکہ لے آئی تھیں۔ مکہ میں ہی انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور کتب خانہ سے لکھائی پڑھائی شروع کی اور قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ پھر فصیح عربی سیکھنے کے لیے صحرانشین قبیلہ بنی ہذیل کے ہاں چلے گئے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ بیس برس تک بنی ہذیل میں رہے تھے لیکن البدایہ والنہایہ کے بیان کے برعکس معجم البلدان میں خود اُن کی زبانی یہ الفاظ مرقوم ہیں کہ میں نے اس قبیلے میں سترہ برس گزارے۔

۱۔ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۵۔ ۲۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۲۸۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۰۔

اس عرصے میں انھوں نے فصاحت و بلاغت سیکھی تھی لیکن حدیث و فقہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔
پھر امام شافعی نے اپنی عمر کے تیسرے عشرے میں فقہ کی طرف توجہ دی۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ وہ دس سال کے تھے کہ بنی ہذیل کے ہاں چلے گئے اور وہاں بیس سال رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تیسرے عشرے کے بجائے چوتھے عشرے میں یعنی تیس برس بعد فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔

حصول علم کے لیے امام شافعی نے مکہ، مدینہ، یمن اور بغداد کے سفر کئے۔ اُن کے پہلے استاد مسلم بن خالد مخزومی تھے جنھیں "زنجی" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ امام شافعی کا پہلا استاد علم حدیث میں ضعیف شمار کیا جاتا تھا۔ ابو داؤد، ابو حاتم، نسائی کے علاوہ بہت سے حفاظ حدیث نے اسے ضعیف کہا ہے۔[1]

پھر امام شافعی نے سعید بن سالم قداح کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا جو مرجئی تھا۔ پھر انھوں نے امام جعفر صادقؑ کے شاگرد سفیان بن عیینہ سے علم حاصل کیا۔ یہ سفیان ایک دبستان فقہ کے مؤسس تھے، انھوں نے کچھ عرصے تک امام مالک سے بھی درس حدیث لیا تھا۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ امام شافعی نے ۸۰ اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس بیان میں مبالغہ آرائی ہے۔ رازی نے لکھا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ امام شافعی نے ابو حنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن شیبانی سے علم حاصل کیا تھا لیکن رازی کا یہ بیان اُن کے مذہبی تعصب کا آئینہ دار ہے جبکہ امام شافعی خود اعتراف کرتے تھے کہ انھوں نے شیبانی سے علم حاصل کیا تھا۔

امام شافعی کے شاگردوں میں کچھ عراقی اور کچھ مصری تھے اور آگے چل کر انہی شاگردوں نے اس مذہب کی نشر و اشاعت کی تھی۔ عراقی شاگردوں میں خالد یمانی کلبی اور ابو ثور بغدادی سرفہرست ہیں مؤخر الذکر تو ایک مخصوص دبستان فقہ کے بانی تھے اور دوسری صدی تک لوگ اُن کی تقلید کرتے رہے تھے۔ انھوں نے ۲۴۰ھ میں وفات پائی تھی۔

ان کے علاوہ حسن بن محمد بن صباح زعفرانی، حسن بن علی کرابیسی، احمد بن عبدالعزیز بغدادی نے بھی مذہب شافعی کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

مذہب شافعی کی اشاعت میں سب سے زیادہ کردار عبدالرحمن احمد بن محمد اشعری نے ادا کیا تھا اور لوگ انھیں "شبیہ شافعی" کہا کرتے تھے۔ وہ سلطان وقت کے مقرب خاص تھے اور انھیں سلطان کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھایا اور مذہب شافعی کی

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱، ص ۱۲۸۔۱۳۰۔

اشاعت کی اور اپنے مذہب کا دفاع کیا۔ احمد بن حنبل بھی امام شافعی کے شاگرد تھے جبکہ حنابلہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ امام شافعی تو احمد سے روایات نقل کرتے تھے اور وہ احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔ حنابلہ کا یہ دعویٰ طبقات الحنابلہ میں مرقوم ہے۔

امام شافعی کے مصری شاگردوں نے اُن کی فقہ کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے یوسف بن یعقوب بویطی امام شافعی کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ وہ مذہب شافعی کے اہم مبلغ تھے۔ وہ غیر شافعی افراد پر بڑی شفقت کرتے تھے اور اُن کے سامنے شافعی کے فضائل بیان کرتے تھے۔ اُن کی مسلسل تبلیغات کی وجہ سے مذہب شافعی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس وقت کے مشہور حنفی عالم نے اُن سے حسد کیا تھا اور انھیں مصر سے جلاوطن کرایا تھا۔ انھوں نے زندان بغداد میں وفات پائی تھی۔

شافعی کے شاگردوں میں سے اسماعیل بن یحییٰ مزنی ابو ابراہیم نے بھی اپنے استاد کے مذہب کو پھیلانے میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے الجامع الکبیر، الجامع الصغیر اور المنثور نامی کتابیں لکھ کر شافعی مذہب کو پھیلایا تھا۔

امام شافعی کے شاگردوں اور دوستوں نے شافعیت کو پھیلانے میں زبردست خدمات سرانجام دی تھیں۔ عراق کے شافعیوں اور مصر کے شافعیوں میں قابل توجہ اختلافات ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام شافعی نے عراق میں اپنے کچھ فتاوی سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ یہ فتاوی "مذہب قدیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ امام شافعی کے عراقی شاگرد اسی مذہب قدیم کے پیروکار ہیں۔ مذہب قدیم کی کتابوں میں الامالی اور مجمع الکافی مشہور ہیں۔

امام شافعی نے مصر ہجرت کے وقت اپنے مذہب قدیم پر عمل کرنے کو حرام قرار دیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنے مذہب پر عمل کرنے کو اُس وقت حرام قرار دیا تھا جب لوگ اُس پر عمل کر چکے تھے۔ کیا امام شافعی نے اپنے فتوے سے اس لیے رجوع کیا تھا کہ وہ فتوے باطل تھے؟ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ بغداد میں تھے اُس وقت تک ان کا اجتہاد باطل تھا اور جب مصر پہنچے تو اُن کا اجتہاد کامل ہو گیا تھا؟

اب ہم تبصرہ کریں تو کیا کریں؟ کیا انھوں نے مصر میں جدید مذہب قائم کیا تھا وہ صحیح تھا؟ اور کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر وہ کچھ عرصہ مزید زندہ رہتے تو اپنی مصری آراء سے بھی دستبردار ہو جاتے؟

امام شافعی کسی بھی مسئلے پر ایک جواب نہیں دیتے تھے۔ جب ہم اُن کی کتاب الام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ ایک مسئلے کے متعلق دو دو رائے رکھتے تھے۔ امام شافعی کا یہ طرزِ عمل اُن کے عدم اطمینان کا مظہر ہے اور یہ روش اجتہاد کی دنیا میں نقص سے تعبیر کی جاتی ہے۔

بزار نے بھی اسی مطلب کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے شافعی عراق میں تالیف میں معروف رہتے تھے اور محمد شیبانی کے شاگردان کے نظریات پر اعتراضات اور ان کے اقوال کی تضعیف و تردید کر کے ان پر عرصہ حیات تنگ کرتے تھے۔ یہ بھی ایک المیہ تھا کہ اصحاب حدیث نے بھی شافعی کے اقوال کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ انھیں معتزلی کہتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ عراق میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے تو وہ عراق چھوڑ کر مصر چلے گئے۔ اس وقت مصر میں کوئی نامور فقیہ نہیں تھا۔ ان کے لیے میدان بالکل خالی تھا۔ چنانچہ انھیں مصر میں بڑی پذیرائی ملی۔[1]

جب امام شافعی مصر پہنچے تو ان کے لیے حالات سازگار تھے۔ مصر میں امام مالک کے پیرو رہتے تھے۔ امام شافعی بھی امام مالک کے شاگرد تھے اور ان کے مذہب کے حامی تصور کیے جاتے تھے اس لیے انھیں مصر میں خاطر خواہ عقیدت ملی اور یہ چیز ان کی کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ علاوہ بریں امام شافعی نے خلیفہ وقت کی فرمائش پر مصر کا سفر کیا تھا اس لیے ارباب حکومت نے بھی ان کی بڑی پذیرائی کی۔ مصر میں امام مالک کے پیروؤں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور وہ جدید مذہب کی ترویج میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ امام شافعی نے امام مالک کے نظریات کے رد میں کتاب لکھنا شروع کی۔

ربیع کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو یہ کہتے ہوئے سنا: "جب میں مصر آیا تو اس وقت تک میں یہ سمجھتا تھا کہ مالک نے صرف سولہ احادیث کو قبول نہیں کیا تھا لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اصل کو پکڑا ہے اور فرع کو چھوڑ دیا ہے یا پھر فرع کو پکڑا ہے اور اصل کو چھوڑ دیا ہے۔"

ساجی نے کتاب العلل میں ان لوگوں کے نام گنوائے ہیں جنھوں نے امام مالک پر تنقید کی تھی اور ان کے مذہب کی خامیاں گنوائی تھیں مثلاً عبدالعزیز بن ابی سلمی اور عبدالرحمن بن زید۔ پھر اس نے کہا کہ امام شافعی اور اصحاب ابو حنیفہ نے بھی امام مالک کے مقام امامت پر حسد کیا تھا اور ان پر اعتراض کیے تھے۔[2]

جب امام شافعی نے امام مالک پر تنقید کی تو امام مالک کے پیروکار ان کے مخالف بن کر ان کے قتل کے درپے ہو گئے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ مالکیوں نے امام شافعی کو لوہے کی ایک آہنی چابی ماری جس سے وہ وفات پا گئے۔[3]

پھر ابن حجر نے امام شافعی کی مدح میں ابو حیان کے اس قصیدے کو نقل کیا

۱۔ بزار، المناقب ج ۲، ص ۳۲۶۔ ۲۔ جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲ ص ۱۲۱۔

۳۔ توالی التاسیس ص ۱۸۵۔

وَلَمَّا اَتٰی مِصْرَ اَثْرٰی بِالَّذِیْ لَهٗ — اَتَاسَ طَوَوْا کَشْحًا عَلٰی بُغْضِهٖ طَوٰی
اَتٰی نَاقِدًا مَا حَصَّلُوْهُ وَعَادِمًا — لِمَا اَصَّلُوْا اِذْ کَانَ بُنْیَانُهُمْ وَهٰی
فَدَسُّوْا عَلَیْهِ عِنْدَمَا انْفَرَدُوْا بِهٖ — شَقِیًّا لَهُمْ قَدْ اَلْاَلَهُ لَهُ الْیَدَیٰ
فَشَقَّ بِمِفْتَاحِ الْحَدِیْدِ جَبِیْنَهٗ — فَرَاحَ قَتِیْلًا لَا بَوَاکٍ وَلَا نَعٰی

جب وہ مصر میں آئے تو ایک گروہ ان کے درپے آزار ہوگیا۔ اس نے ان کی دشمنی پر کمر کس لی تھی۔ وہ ان کے نظریات کا نقاد بن کر ان کی بے اساس عمارت کو ڈھانے آیا تھا۔ جب اس گروہ نے انھیں تنہا پایا تو اس نے ایک مجرم کو ان کے تعاقب میں بھیجا۔ خدا اس کے ہاتھ قطع کرے۔ اس نے آہنی کلید مار کر ان کی پیشانی پھاڑ دی اور یوں وہ اس عالم میں قتل ہوئے کہ ان پر نہ کوئی رونے والیاں تھیں اور نہ موت کی خبر سنانے والا تھا۔

یوں امام شافعی مالکیوں کے تعصب کی نذر ہوئے۔ امام شافعی کو اگرچہ مصر میں ہی قتل کیا گیا تھا لیکن مصر کی سرزمین سے ہی ان کا مذہب پھیلا۔ امام شافعی کے شاگردوں نے ان کے مذہب کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر شاگردوں کی محنتیں نہ ہوتیں تو شافعی مذہب بھی دوسرے مذاہب کی طرح تاریخ کے صفحات میں دفن ہو چکا ہوتا۔ شافعی مذہب شام میں بھی پھیلا اور اس نے اوزاعی مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ شام میں شافعی مذہب کی اشاعت کا سہرا محمد بن عثمان دمشقی کے سر ہے۔ جب وہ شام کے قاضی مقرر ہوئے تو انھوں نے شافعی مذہب کی ترویج کے لیے جدوجہد کی اور آخرکار ان کی کوششیں رنگ لائیں اور لوگوں نے اوزاعی مذہب کو چھوڑ کر شافعی مذہب کی پیروی شروع کر دی۔

ایوبیوں کے عہد میں شافعی مذہب کو زیادہ فروغ نصیب ہوا کیونکہ ایوبی سلاطین شافعی تھے۔ ایوبی سلاطین کی حکومت کے بعد مملوک (خاندان غلاماں) مصر میں برسراقتدار آئے تو انھوں نے بھی شافعی مذہب کی سرپرستی کی۔ اس خاندان کے تمام سلاطین شافعی مذہب کے پیرو تھے البتہ سیف الدین حنفی تھا مگر اس نے شافعی مذہب سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔

امراء و سلاطین کے ذریعے امام شافعی کا نام زندہ رہا۔ اگر اس مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو یہ مذہب صرف کتابوں میں ہی ملتا۔

امام شافعی پر اشکالات

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہر امام کو دو طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ کچھ ان کے کٹر حامی ہوتے تھے اور کٹر دشمن ہوتے تھے۔ اس لیے کسی بھی امام کے متعلق غیر جانبدارانہ آراء کی

تلاش کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی ہے کیونکہ ان ائمہ کے حامیوں کے بیان انتہائی مبالغہ آمیز ہیں۔ اگر ان کی باتیں سنی جائیں تو ان کا اصرار یہ ہے کہ ان کے امام جیسا کوئی شخص آج تک پیدا ہی نہیں ہوا اور ان کے امام میں تمام درجات کمال موجود تھے جبکہ ان ائمہ کے مخالفین نے ان کی مذمت میں احادیث تراش کر انھیں بدنام کیا اور ان کو انسانیت کے درجے سے نکال کر ابلیسیت کے دائرے میں پہنچا دیا۔

امام شافعی کے ایک دشمن کی روایت پڑھیں

احمد بن عبداللہ جویباری نے عبد بن حمدان سے اس نے انس سے اس نے رسول خداؐ سے روایت کی۔ آنحضرت نے فرمایا میری امت میں ادریس نامی شخص پیدا ہوگا۔ وہ میری امت کے لیے ابلیس سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ میری امت میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کا نام ابوحنیفہ ہوگا۔ وہ میری امت کے لیے چراغ راہ ہوگا۔[1]

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ روایت جعلی ہے اور جھوٹ پر مبنی ہے۔

اب امام شافعی کے ایک پیروکار کی بنائی ہوئی ایک گفتگو پڑھیں:

ابن عبدالبر نے اپنی سند سے سوید بن سعید سے نقل کیا۔ اس نے کہا کہ ہم سفیان بن عیینہ کے پاس مکہ میں تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے امام شافعی کی وفات کی خبر دی۔ سفیان نے کہا کہ اگر محمد بن ادریس کی وفات ہوئی ہے تو سن لو کہ وہ اس دور کے افضل ترین فرد تھے جو رحلت پا گئے ہیں۔[2]

یہ روایت بھی جھوٹی ہے کیونکہ سفیان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی تھی اور امام شافعی کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر سفیان، امام شافعی کی رحلت سے چھ برس قبل وفات پا گئے تھے۔

امام شافعی اور محبت آل محمدؐ

لوگوں نے امام شافعی پر بہت اعتراضات کیے تھے۔ کسی نے کہا کہ وہ معتزلی تھے، کسی نے کہا کہ وہ شیعہ تھے۔ کچھ نے کہا کہ وہ قلیل الروایت تھے اور انھوں نے کذابوں سے روایت کی تھی۔ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ کیا شافعی جھوٹ بولتے تھے؟ انھوں نے کہا کہ مجھے ان کی حدیث ناپسند ہے۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا۔ خطیب نے یحییٰ بن معین سے روایت کی ہے کہ شافعی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں امام شافعی کے خلاف اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے مگر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

ہم سردست ان کے ناقدین کے بیانات پر کسی قسم کا تبصرہ و تجزیہ نہیں کرنا چاہتے۔ جس چیز نے ہمیں ان کی طرف متوجہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ان پر تشیع کا الزام لگایا تھا اور اس

۱۔ سیوطی، اللآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۴۵۷۔ ۲۔ الانتقاء ص ۷۰۔

زمانے میں یہ ایک خطرناک الزام تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اولادِ علیؑ اور شیعانِ علیؑ کو پکڑ کر دیواروں میں زندہ چنوا دیا جاتا تھا اور انتہائی سفاکی سے قتل کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں حضرت علیؑ اور ان کے خاندان سے دشمنی کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ تاریخ میں اولادِ علیؑ پر کیا گزری ہے؟

اس کی تفصیل کے لیے ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین دیکھیں۔ (اور علامہ محمد جواد مغنیہ کی کتاب شیعہ اور حاکمان مطبوعہ مجمع علمی اسلامی دیکھیں)۔

اس زمانے میں لوگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک طرف اقلیت میں ایسے لوگ تھے جنھوں نے ورثۂ آل محمدؐ کو چھوڑنا پسند نہیں کیا اور اپنے عقیدے کی راہ میں ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جبکہ دوسری طرف اکثریت نے سلاطین سے حصولِ دنیا کے لیے اپنا دین و ایمان بیچ دیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا تھا: اَلنَّاسُ عَبِيْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّيْنُ لَعِقٌ عَلٰى اَلْسِنَتِهِمْ يَحُوْطُوْنَهُ مَادَرَّتْ مَعَايِشُهُمْ فَاِذَا مُحِّصُوْا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّيَّانُوْنَ لوگ دنیا پرست ہیں دین صرف ان کی زبانوں کی نوک پر ہے۔ جب تک ان کی دنیا درست چلتی رہے اس وقت تک وہ دین کی پاسداری کرتے ہیں اور جب ان پر کوئی آزمائش آپڑے تو پھر دیندار بہت کم ہوتے ہیں۔

اس پرفتن دور میں امام شافعی نے محبت آل محمدؐ کا برملا اظہار کیا تھا اور یہی اظہارِ محبت ان پر تشیع کی تہمت کا باعث بنی۔ سچ یہ ہے کہ شافعی شیعہ نہیں تھے۔ وہ احکامِ دین میں آل محمدؐ کی اطاعت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے البتہ وہ محبِ آل محمدؐ ضرور تھے۔ انھوں نے اپنی محبت کو کبھی چھپانے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ انھوں نے آل محمدؐ کی شان میں یہ اشعار کہے تھے:

يَا آلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ حُبُّكُمْ ۔۔۔ فَرْضٌ مِّنَ اللّٰهِ فِي الْقُرْآنِ اَنْزَلَهُ

يَكْفِيْكُمْ مِّنْ عَظِيْمِ الْقَدْرِ اَنَّكُمْ ۔۔۔ مَنْ لَّمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَاةَ لَهُ

اے خاندانِ پیغمبرؐ! آپ کی محبت فرض ہے جسے اللہ نے قرآن میں نازل کیا ہے۔ آپ کی عظمت اور افتخار کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے۔

امام شافعی کے ان اشعار کی بنیاد آیت مودت ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى آپ کہہ دیں کہ میں تم سے اس (تبلیغ نبوت) کا کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ بس یہی ہے کہ تم میرے قرابت داروں سے مودت رکھو۔ (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۳)

اس آیت میں بالصراحت آل محمدؐ کی محبت کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ بات انتہائی تعجب خیز تھی کہ اللہ نے تبلیغ رسالت کی اجرت محبت اہلبیتؑ کو کیسے قرار دیا؟ مجھے اس بات کا

جواب اس وقت ملا جب محبت آل محمدؐ کی وجہ سے میری آزمائش شروع ہوئی اور اس کے باوجود میں آل محمدؐ سے وابستہ رہا۔

امام شافعی کے ساتھ بھی کم و بیش یہی کچھ ہوا تھا۔ جب انھوں نے محبت اہلبیتؑ کا اعلان کیا تو لوگوں نے انھیں رافضی کہنا شروع کر دیا۔ امام شافعی نے اسے ان اشعار میں یوں بیان کیا ہے

قالوا ترفضت قلت: کلا ما الرفض دینی ولا اعتقادی
ولکن تولیت دون شک خیر امام و خیر هاد
ان کان حب الوصی رفضا فلیشهد الثقلان انی رافضی

لوگوں نے کہا کہ تم رافضی ہو گئے ہو۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ رفض نہ تو میرا دین ہے اور نہ اعتقاد لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے بہترین امام اور بہترین ہادی سے محبت کی ہے۔ اگر وصی (رسولؐ) کی محبت رفض ہے تو میں سب سے بڑا رافضی ہوں۔

جب شافعی نے آل محمدؐ سے محبت کا اظہار کیا تو ایک دشمن آل محمدؐ نے شافعی کی مذمت میں کہا

یموت الشافعی ولیس یدری علی ربه ام ربه الله [1]

جب شافعی مرے گا تب بھی اسے یہ علم نہ ہوگا کہ علی اس کا رب ہے یا اللہ اس کا رب ہے۔

آل محمدؐ اور علیان آل محمدؐ کی دشمنی سے مسموم فضا میں شافعی نے محبت آل محمدؐ کا اعلان کیا تھا اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنے عقیدے کا یوں برملا اظہار کیا:

یا راکبا قف بالمحصب من منی واهتف بساکن خیفها والنازل
سحرا اذا فاض الحجیج الی منی فیضا کمنسکب الفرات الفائض
ان کان رفضا حب آل محمد فلیشهد الثقلان انی رافض

اے سوار! منیٰ کے ریگزار میں ٹھہر کر مسجد خیف میں کھڑے اور بیٹھے ہوئے لوگوں تک میرا یہ پیغام پہنچا دے۔ تو صبح کو اس وقت اعلان کرنا جب حجاج منیٰ سے حرکت کر رہے ہوں اور یوں لگے جیسے فرات کی طوفانی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ان لوگوں کو بتا دینا کہ اگر آل محمدؐ کی محبت رفض ہے تو پھر جن و

---

[1] معروف تو یہ ہے کہ یہ شعر بھی امام شافعی کا ہے۔ انھوں نے اس کے ساتھ یہ دو شعر بھی کہے تھے

لو ان الناصبی نذی محلة لعمر الشمس طرا سجدا له
تحکمی فی فضل مولانا علی وذروع الشک فیه انا الله

اگر علی مرتضیٰ اپنا عظیم مقام ظاہر کر دیتے تو لوگ ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے۔ ہمارے مولا علیؑ کی فضیلت کے لیے یہی ایک بات کافی ہے کہ کچھ لوگوں کو ان کے اللہ ہونے کے متعلق شک ہوا۔ (مترجم فارسی)

اس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

امام شافعی نے حضرت علیؑ کے خلاف خروج کرنے والوں کے متعلق باغی ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اُن کے اس فتوے سے لوگوں نے اُن کے تشیع پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اُس دور کے حکمران اس متہم شخص کو برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن خدا نے اسے حکمرانوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ اگر امام شافعی کے تشیع کی تحقیق کی جائے تو اسے کسی بھی صورت میں حقیقی تشیع نہیں کہا جا سکتا البتہ آلِ محمدؐ کی دشمنی کے ماحول میں اسے تشیع کہا جا سکتا ہے۔ اُس وقت کا ماحول آلِ محمدؐ کی دشمنی سے بھرا ہوا تھا اسی لیے شافعی پر شیعیت کا الزام لگایا گیا۔ اگر اُس دور کے مسلمان فکری طور پر آزاد ہوتے اور سلاطین کے تابع نہ ہوتے تو اُس وقت بھی ہر مسلمان کے دل میں آلِ محمدؐ سے امام شافعی جتنی عقیدت ضرور ہوتی۔ آلِ محمدؐ سے دشمنی یا تو خوارج کر سکتے ہیں یا پھر حکمرانوں کے کاسہ لیس مسلمان کر سکتے ہیں (آلِ محمدؐ کے دشمن کو ناصبی کہا جاتا ہے)۔ شافعی آلِ محمدؐ سے محبت ضرور رکھتے تھے لیکن وہ شیعہ نہیں تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو انسانی اقدار و اصول سے پیار ہوگا اسے آلِ محمدؐ سے ضرور پیار ہوگا کیونکہ آلِ محمدؐ انسانی اقدار و اصول کا بلند ترین نمونہ تھے۔ آلِ محمدؐ سے دوستی کے لیے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ جسے بھی انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے محبت ہے وہ آلِ محمدؐ سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے لیے آپ "جارج جرداق" کی مثال کو پیش نظر رکھیں۔ وہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی تھے لیکن انھیں اعلیٰ انسانی اقدار سے پیار تھا۔ اسی لیے انھیں امام علیؑ سے محبت تھی اور وہ آپ کو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا بلند ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے امام علیؑ کی شخصیت پر پانچ جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی تھی جس میں انھوں نے امام علیؑ کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا تھا۔

سلیمان کتانی کو دیکھیے۔ انھوں نے الامام علی نبراسُ و عباس اور فاطمۃ وقرّۃ فی شملہ جیسی شاندار کتابیں لکھی تھیں حالانکہ وہ بھی عیسائی تھے۔

دنیا کا طویل ترین قصیدہ پانچ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ قصیدہ امام علیؑ کی مدح میں لکھا گیا اور اس قصیدے کا خالق عیسائی شاعر تھا۔ دوسرا طویل ترین قصیدہ تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اسے بھی ایک عیسائی شاعر نے امام علیؑ کی شان میں لکھا تھا۔ تیسرا قصیدہ جو کہ دو ہزار ابیات پر مشتمل ہے وہ بھی ایک عیسائی نے ہی امام علیؑ کی شان میں لکھا تھا۔ اتنے طویل قصائد لکھنے کی وجہ سے وہ نہ تو مسلمان بنے تھے اور نہ ہی شیعہ۔

شیعیت کے لیے آلِ محمدؐ سے صرف محبت کی نہیں بلکہ اُن کی پیروی کی ضرورت ہے اور شیعہ وہ ہے جو آلِ محمدؐ کو دین کا مصدر سمجھ کر دینی معارف اور احکام اُن سے حاصل کرے

کسی شاعر نے کیا ہی خوب کہا تھا:

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَهُ إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعُ

اگر تو اپنے دعویٰ محبت میں سچا ہوتا تو ضرور اُس کی اطاعت کرتا کیونکہ ہر محب اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے۔

امام احمد بن حنبل

احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال مروزی ۱۶۴ھ میں قول مشہور کے مطابق بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ضعیف ترین قول یہ بھی ہے کہ اُن کی پیدائش خراسان کے شہر "مرو" میں ہوئی تھی۔ وہ پیدائشی یتیم تھے اُن کی پرورش ان کی والدہ محترمہ نے کی تھی۔ جب اُن کی عمر پندرہ برس کی ہوئی تو انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا یعنی ۱۷۹ھ میں تعلیم شروع کی۔ انھوں نے پڑھائی کی ابتدا قرأت قرآن اور عربی ادبیات سے کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے علم حدیث کی تعلیم شروع کی۔ حدیث میں اُن کے پہلے استاد ہشام بن بشیر سلمی متوفی ۱۸۳ھ تھے۔ انھوں نے تین برس تک اُن سے استفادہ کیا تھا۔ پھر انھوں نے تلاش حدیث کے لیے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، یمن، شام اور عراق کے سفر کیے اور مختلف اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ ہمیں اُن کے تمام اساتذہ کے نام لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے البتہ اُن کے اساتذہ میں امام شافعی بھی شامل ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حنابلہ امام شافعی کو احمد بن حنبل کا استاد نہیں مانتے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شافعی، امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔

امام احمد بن حنبل کے شاگرد بہت زیادہ تھے۔ اُن میں احمد بن محمد بن ہانی المعروف بہ اثرم متوفی ۲۶۱ھ کے علاوہ ان کے بڑے فرزند صالح اور دوسرے فرزند عبداللہ متوفی ۲۹۰ھ سرفہرست ہیں۔ اُن کے دونوں بیٹوں نے اپنے والد سے حدیث روایت کی تھی۔

امام حنبل کے علمی آثار

امام حنبل نے فقہ کے عنوان پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی تھی جسے اُن کے مذہب کی اساس قرار دیا جاسکے۔ البتہ انھوں نے فقہی موضوعات پر چند کتابچے لکھے تھے مثلاً نماز کے علاوہ مناسک حج کے عنوان پر المناسک الکبیر اور المناسک الصغیر نامی کتابچے لکھے تھے۔ امام حنبل کے یہ

کتابچے احادیث پر مشتمل تھے۔ اگرچہ انھوں نے اُن کی تشریح بھی ساتھ لکھی تھی۔[1]

مشہور ہے کہ انھیں فرعی اور جزئی مسائل اور اجتہاد و رائے سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن انھوں نے عثمان بن سعید سے کہا جو کچھ ابوحنیفہ، اسحاق، سفیان، شافعی اور مالک نے لکھا ہے اس پر توجہ نہ کرو۔ تم اُس کی اصل تلاش کرو۔

"مسند احمد" اُن کی مشہور ترین تالیف ہے۔ اس میں چالیس ہزار احادیث ہیں۔ ان میں دس ہزار مکررات ہیں۔ احمد اپنی کتاب مسند کی توثیق کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے ایک حدیث کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا تم اسے میری کتاب مسند میں تلاش کرو۔ اگر یہ حدیث اُس میں نہ ہو تو پھر یہ حجت نہیں ہے۔ بہت سے حفاظ نے مسند احمد سے اختلاف کیا ہے اور اس کی کچھ روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حفاظ نے صراحت سے یہ اعلان کیا ہے کہ مسند میں جعلی روایات موجود ہیں۔

جعلی روایات کی نشاندہی کرنا سردست ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

امام حنبل کی آزمائش

امام حنبل کے دور میں "خلق قرآن"[2] کا مسئلہ اٹھا تھا جس کی وجہ سے اُن کے لیے بہت سی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں۔ اس مسئلے کا آغاز مامون رشید کے دور میں ہوا۔ مامون لوگوں سے خلق قرآن کا عقیدہ منوانا چاہتا تھا۔ مامون معتزلہ کی آراء سے متاثر تھا اور وہ خود بھی علم کلام کے مسائل سے گہری آگاہی رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے تمام حکام کے نام یہ فرمان جاری کیا تھا

"مسلمانوں کے خلیفہ پر واجب ہے کہ وہ دین کی حفاظت کرے اور رعایا میں عدل و انصاف کو فروغ دے اور حق کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے۔

امیرالمومنین (مامون) کو معلوم ہوا ہے کہ معاشرے کے جاہل افراد کی اکثریت اور کم نظر افراد جن کے پاس نہ تو کوئی ہدایت ہے اور نہ بصیرت اور نہ ہی خدا کی طرف سے انھیں نور و برہان ملا ہے اور ایسے لوگ ہر شہر اور ہر علاقے میں موجود ہیں۔ یہ لوگ خدا کی معرفت سے ناآشنا ہیں اور حقیقت دین، توحید اور خدا پر ایمان لانے کے حوالے سے گمراہی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ عقیدے کے واضح ترین مسائل اور خدا کی واجب الاتباع راہ سے بھٹکے ہیں۔ انھوں نے خدا کو اس طرح سے نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننا چاہیے تھا اور انھیں خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا اور اُس کی

۱۔ استاد ابوزہرہ، احمد بن حنبل ص ۱۹۸۔

۲۔ دیکھئے علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار" مطبوعہ مجمع علمی اسلامی۔

خلق کے درمیان فرق کو آج تک نہیں سمجھے۔ اس کی وجہ اُن کی رائے کا ضعیف ہونا اور اُن کی عقول کا ناقص ہونا ہے۔ اُن کے پاس فکر و تدبر کی قوت نہیں ہے۔ انھوں نے خدا اور اُس کے نازل کردہ قرآن کو ایک چیز سمجھ لیا ہے اور یہ عقیدہ بنالیا ہے خدا کی طرح سے قرآن بھی قدیم ہے اور اسے خدا نے پیدا نہیں کیا ہے...''[1]

اس حکومتی سرکلر کے اجراء سے خلق قرآن کا مسئلہ شروع ہوا۔ مامون کے دور میں امام حنبل ہر آزمائش سے محفوظ رہے تھے البتہ جب معتصم کا دور آیا تو اُن کی آزمائش شروع ہوئی۔ معتصم کا رویہ مامون کے رویے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جو شخص قرآن کو مخلوق نہ ماننے کا اعلان کرتا معتصم اسے سخت سزا دیتا اور اُس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتا تھا۔ چنانچہ اُس کے دور میں امام حنبل کی بھی باری آئی۔ معتصم کو بتایا گیا کہ احمد بن حنبل قرآن مجید کو مخلوق نہیں مانتے تو اُس نے قسم کھا کر کہا کہ میں اسے تلوار سے قتل نہیں کروں گا بلکہ اسے پے در پے کوڑے ماروں گا اور ایسے اندھیرے مکان میں رکھوں گا کہ وہ روشنی دیکھنے کے لیے ترس جائے گا۔

چنانچہ امام حنبل کو دربار میں بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا تم قرآن کو مخلوق مانتے ہو؟

امام حنبل نے نفی میں جواب دیا۔ معتزلی علماء نے تین دن تک اس موضوع پر امام حنبل سے مباحثہ کیا لیکن وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔

جب معتصم اُن سے مایوس ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ امام حنبل کو کوڑے مارے جائیں۔ معتصم کے حکم پر انھیں ۳۸ کوڑے مارے گئے۔ پھر معتصم نے انھیں رہا کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔

لوگوں نے اس واقعے کی وجہ سے امام حنبل کو کوہ استقامت کے لقب سے یاد کیا اور انھیں اپنا ''ہیرو'' مان لیا۔ یہاں کچھ دیر رکیے اور غیر جانبدار بن کر حالات کا تجزیہ کیجیے۔ پھر سوچیے کہ کیا صرف ۳۸ کوڑے کھانے سے امام حنبل کو ''تاریخی ہیرو'' قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ تاریخ ایسے بہت سے افراد کا ذکر کرتی ہے جنھوں نے اُن سے زیادہ مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔

یہاں یہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ معتصم نے ۳۸ کوڑوں پر اکتفا کر کے امام حنبل کو رہا کیوں کیا تھا؟ کیا امام حنبل معتصم کے سامنے جھک گئے تھے اور خلق قرآن کے نظریے کو مان گئے تھے یا پھر معتصم نے خلق قرآن کا عقیدہ چھوڑ کر اُن کا نظریہ قبول کر لیا تھا؟

بعض افراد نے اس کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ خلیفہ کے محل کے سامنے لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا تھا اور وہ ہجوم اتنے طیش میں تھا کہ اگر معتصم امام حنبل کو رہا نہ کرتا تو اُس کے محل پر ٹوٹ پڑتا۔

۱۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعۃ ج ۲، ص ۳۵۳۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امام حنبل کے طرفداروں کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ توجیہ بالکل غلط ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ معتصم انتہائی خودسر اور جاہ و جلال رکھنے والا خلیفہ تھا۔ اسے عوام کی ناراضگی کی اتنی فکر نہیں تھی کہ وہ چند ہزار کا مجمع دیکھ کر اپنا خیال بدل دیتا۔ اور پھر ہم یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ احتجاج کرنے والے لوگ کون تھے؟ کیا وہ امام حنبل کے پیروکار تھے؟ جبکہ اس آزمائش سے قبل امام حنبل اتنے معروف نہیں تھے لہٰذا اُن کے ہزاروں لاکھوں مقلدین کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ اگر بفرض محال ہم یہ مان لیں کہ احتجاج کرنے والے امام حنبل کے پیروکار تھے تب بھی وہ حکومت کے خلاف احتجاج نہیں کرسکتے تھے کیونکہ امام حنبل نے سلطان کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا تھا۔ ان حقائق کی موجودگی میں ہم یہ تسلیم نہیں کرسکتے کہ معتصم نے عوامی احتجاج سے خوفزدہ ہوکر انھیں رہا کیا ہوگا۔ اگر عقیدت کی بھول بھلیوں کو چھوڑ کر حقیقت کی وادیوں میں قدم رکھیں تو امام حنبل کی رہائی کی وجہ آپ کو یہ دکھائی دے گی کہ انھوں نے خلیفہ کے عقیدے کو تسلیم کرلیا تھا۔

آپ خواہ اسے تقیہ کا نام دیں یا اسے قلبی عقیدہ کہیں امام حنبل نے خلق قرآن کے عقیدے کو مان لیا تھا اسی لیے خلیفہ نے اُن کی رہائی کا حکم صادر کر دیا تھا۔

یہی بات جاحظ نے اصحاب حدیث سے کہی تھی۔ انھوں نے اپنے ایک رسالے میں اصحاب حدیث کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"تمہارا یہ ساتھی — احمد بن حنبل — کہتا تھا کہ دیار شرک کے علاوہ کہیں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اب جو اس نے خلق قرآن کے عقیدے کو مان لیا ہے تو کیا اُس نے تقیہ کیا ہے؟ اُس نے تو یہ تقیہ دار الاسلام میں کیا ہے۔ اگر اُس نے ایسا کیا ہے تو خود اپنی تکذیب کی ہے اور اگر اُس نے یہ اقرار دل کی گہرائیوں سے کیا ہے تو پھر وہ تم سے آزاد ہے اور تم اُس سے آزاد ہو۔ ویسے بھی اُس کے سر پر تلوار نہیں لٹک رہی تھی اور اُس نے بہت زیادہ کوڑے بھی نہیں کھائے تھے۔ اُس نے فقط تین کوڑے کھائے تھے اور وہ بھی مسلسل نہیں مارے گئے تھے۔ اور ان کوڑوں سے اُس کی حالت بھی غیر نہیں ہوئی تھی۔ اسے طوق و رسن بھی نہیں پہنائے گئے تھے اور اسے قتل کی دھمکی بھی نہیں دی گئی تھی۔ اُس نے تین دن تک مناظرہ کیا تھا اور نہایت رقیق جوابات دیے تھے۔ حکومت نے انتہائی بردباری کا جبکہ اُس نے اکھڑپن کا ثبوت دیا تھا۔"[1]

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں جاحظ کی اس تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے امام حنبل کی طرف سے خلق قرآن کے اقرار کی داستان کو یوں بیان کیا ہے

۱۔ مقدمہ کتاب احمد بن حنبل و محرقۃ ص ۱۴ بحوالہ حاشیہ تاریخ کامل ج ۳، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲۔

"معتصم نے خلق قرآن کے عقیدے کے متعلق احمد بن حنبل کا امتحان لیا تھا۔ احمد نے کہا جو کچھ احادیث کا علم میں نے حاصل کیا ہے اس سے آپ کے عقیدے کی تائید نہیں ہوتی۔"

معتصم نے علماء کو اس سے مناظرے کے لیے بلایا لیکن احمد نے خلق قرآن کے عقیدے کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر اسے چند کوڑے مارے گئے۔ اس وقت اسحاق بن ابراہیم نے کہا: امیرالمومنین! مجھے اجازت دیں میں اس سے مناظرہ کرتا ہوں۔ معتصم نے اجازت دے دی۔

اسحاق: اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے لوگوں سے علم حاصل کیا ہے یا فرشتے نے تمہیں تعلیم دی ہے؟

احمد: میں نے یہ علم لوگوں سے حاصل کیا ہے۔

اسحاق: یہ علم ایک ہی مرتبہ تمہیں ملا ہے یا آہستہ آہستہ؟

احمد: آہستہ آہستہ۔

اسحاق: کیا تم نے سارا علم حاصل کرلیا ہے اور اب تمہیں مزید علم کی ضرورت نہیں ہے؟

احمد: نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں بہت سے مسائل سے ناواقف ہوں۔

اسحاق: پھر تم ایک اور مسئلہ بھی یاد کرلو۔ امیرالمومنین تمہیں یہ مسئلہ یاد کرانا چاہتے ہیں۔

احمد: میں امیرالمومنین کے قول کا قائل ہوں۔

اسحاق: خلق قرآن کے متعلق؟

احمد: ہاں۔ خلق قرآن کے متعلق۔

اُس وقت اُس نے احمد پر گواہ مقرر کیے۔ خلیفہ نے اسے خلعت دی اور عزت سے گھر بھجوا دیا۔[1]

اتنی سی بات تھی جسے حنابلہ نے افسانہ بنا دیا ہے اور امام حنبل کو کوہ استقامت بنا کر پیش کیا ہے انھوں نے امام حنبل کی استقامت کی داستانیں تراشی ہیں اور اُن داستانوں سے امام حنبل کی امامت کا استدلال کیا ہے جبکہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔

گمنام ہیرو

امام حنبل نے تو چند کوڑے کھائے اور فوراً اپنے عقیدے سے دستبردار ہوگئے جبکہ تاریخ اسلام میں ایسے "ہیرو" بھی ہیں جنھیں استقامت کی چٹان کہا جاسکتا ہے لیکن عوام اُن کے نام سے واقف تک نہیں ہیں۔ ایسے ہی گمنام ہیرو احمد بن نصر خزاعی اور یوسف بن یحییٰ بویطی ہیں۔

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۴۷۶۔

(۱) احمد بن نصر خزاعی۔ آپ ایک مشہور عالم اور امام مالک کے شاگرد تھے۔ آپ کو ۲۳۱ھ میں قتل کیا گیا تھا۔ ابن معین اور محمد بن یوسف نے اُن سے احادیث نقل کی ہیں۔ واثق عباسی نے انھیں دربار میں طلب کیا اور پوچھا کہ قرآن کریم کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

انھوں نے کہا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ مخلوق نہیں۔ واثق نے بڑی کوشش کی کہ اُن سے خلق قرآن کے عقیدے کو تسلیم کرائے لیکن وہ نہیں مانے۔ پھر واثق نے اُن سے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ تم خدا کو جسم مانتے ہو اور قیامت کے دن خدا کی رؤیت کے قائل ہو؟

انھوں نے کہا ہاں۔ میں خدا کو جسم مانتا ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ قیامت کے دن خدا کا دیدار ہوگا۔ پھر انھوں نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے ایک حدیث بھی پیش کی۔

واثق نے کہا: "تو ہلاک ہو جائے۔ کیا کفر بک رہے ہو کہ خدا دیگر اجسام کی طرح قابل رؤیت ہے اور وہ محدود ہے۔ اگر خدا کو قابل رؤیت مان لیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اسے ایک جہت میں محدود ماننا پڑے گا اور مکان کو اُس کا محیط ماننا پڑے گا۔ تو نے خدا کی جو توصیف کی ہے اُس کی وجہ سے تو کافر ہو گیا ہے۔"

احمد خزاعی اپنے نظریے پر قائم رہے۔ واثق نے حکم دیا کہ اس کی تلوار صمصامہ لائی جائے۔ پھر واثق نے کہا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا اور اس کے قتل سے مجھے ثواب کی امید ہے۔ یہ کافر اُس خدا کی عبادت کرتا ہے جس کی عبادت ہم نہیں کرتے اور خدا کی جو صفات یہ بیان کرتا ہے ہم اپنے خدا کو اُس کی بیان کردہ صفات سے متصف نہیں سمجھتے۔ پھر اُس نے تلوار اٹھائی اور احمد کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا اور حکم دیا کہ اُس کے سر کو بغداد میں نصب کر دیا جائے۔ چنانچہ کچھ دن تک اُس کے سر کو بغداد کے مشرقی حصے میں اور پھر کچھ دن بعد مغربی حصے میں نصب کیا گیا۔

واثق نے ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھی جو اُس کے سر کے ساتھ آویزاں کی گئی تھی

"یہ احمد بن نصر بن مالک کا سر ہے۔ خدا کے بندے ہارون واثق نے اُس سے کہا تھا کہ وہ قرآن کو مخلوق تسلیم کرے اور خدا کے متعلق عدم تشبیہ کا عقیدہ رکھے لیکن اُس نے ہمارے فرمان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ خدا نے اسے جلد دوزخ میں بھیج دیا۔"[1]

(۲) یوسف بن یحییٰ بویطی۔ یہ امام شافعی کے شاگرد اور اُن کے حلقہ درس کو جاری رکھنے والے تھے۔ انھیں چالیس "رطل" آہنی زنجیر پہنا کر مصر سے بغداد لایا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا تم قرآن کو مخلوق مانتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ جب انھیں خلق قرآن کا عقیدہ اپنانے کے لیے

۱۔ طبقات الشافعیہ ج ۱، ص ۲۱۵ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت۔

دھمکیاں دی گئیں تو انھوں نے بڑی جرأت سے جواب دیا کہ خدا کی قسم! میں اس طوق و زنجیر میں رہ کر موت کا استقبال تو کرسکتا ہوں لیکن تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کرسکتا۔ جب میں زنجیر پہن کر مرجاؤں گا تو آنے والی نسلوں کو معلوم ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے موت کو گلے لگایا تھا لیکن اپنے عقیدے سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ اگر تم مجھے واثق کے پاس بھی لے جاؤ گے تب بھی میں حق کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ یوسف کو زندان میں ڈال دیا گیا یہاں تک کہ ۲۳۲ھ میں اُن کی وفات ہوئی۔

تاریخ میں کئی لوگ ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے امام حنبل سے بڑھ کر استقامت کا ثبوت دیا اور ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا لیکن مصائب سے اُن کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود صرف امام حنبل کو کوہ استقامت کہنا تاریخ کے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے جبکہ امام حنبل تو کم ہمت ثابت ہوئے تھے اور چند کوڑے کھانے کے بعد معتصم کے سامنے جھک گئے تھے اور حکومتی دباؤ کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔

امام حنبل متوکل کے عہد میں

جب متوکل عباسی خلیفہ بنا تو اُس نے مامون، معتصم اور واثق کے برعکس اصحاب حدیث کو اپنا مقرب بنایا اور معتزلیوں کی سرکوبی کی اور لوگوں کا خلق قرآن کے متعلق امتحان لیا۔ جس نے کہا کہ قرآن مخلوق ہے اُس نے اسے سخت سزا دی اور اس عقیدے کو ماننے والوں کو قتل کرادیا۔ یوں اصحاب حدیث ایک مرتبہ پھر غالب آگئے اور اُن کے عقیدے کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی اور انھیں کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس دور میں اصحاب حدیث نے کھل کر معتزلیوں سے انتقام لیا۔

احمد امین لکھتے ہیں: "متوکل نے عمومی عقائد کی پاسداری کا اعلان کیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اُس کو عوام کی تائید حاصل ہو۔ اسی لیے اُس نے خلق قرآن کے مسئلے کو چھوڑ دیا تھا اور قرآن کو غیر مخلوق کہنے والوں سے باز پرس کو موقوف کردیا تھا اور اُس نے محدثین کی مدد کی تھی۔"[1]

متوکل کے دور میں امام حنبل کو دربار کی قربت حاصل ہوئی تھی کیونکہ تنہا وہ اس مسئلے میں محفوظ رہے تھے اور اُن کی جان بچی تھی جبکہ بہت سے نامور افراد اس معرکے میں قتل کر دیے گئے تھے۔ متوکل نے حکام کو ہدایت کی تھی کہ وہ احمد بن حنبل کا احترام کریں۔ متوکل نے امام حنبل کے لیے چار ہزار درہم مشاہرہ مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُن پر اور بھی نوازشات کی گئی تھیں۔[2]

۱۔ عصر الاسلام ج ۳، ص ۸۔

۲۔ تاریخ ابن کثیر ج ۱۰، ص ۳۳۹۔

متوکل کے برسراقتدار آنے سے امام حنبل کا ستارہ عروج پر آگیا۔ لوگ اُن کی عزت اور احسان مملکت اُن سے مشورے کرنے لگے۔ ان نوازشات کے جواب میں امام حنبل نے متوکل کی خلافت کو آئینی قرار دیا اور متوکل کی اطاعت کا فتویٰ جاری کیا۔

ہمیں امام حنبل کے فتوے پر کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ وہ حاکم کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں مومن اور فاسق کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ انھوں اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے:

ائمہ اور امیرالمومنین کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ مومن ہوں یا فاسق۔ جو شخص منصب خلافت پر متمکن جائے اور لوگ اُس کی خلافت کو قبول کرلیں اور اُس کی تائید کریں یا یہ کہ کوئی تلوار کے زور پر لوگوں پر مسلط ہو جائے اور اپنے آپ کو امیرالمومنین کہلانے لگے تو اُس کی اطاعت واجب ہے اور مومن یا فاسق امراء کی معیت میں جہاد کرنا قیامت تک صحیح ہے۔ ائمہ کو ہی حدود کے اجراء کا حق ہے۔ کسی کو بھی اُن کی مخالفت کی اجازت نہیں۔ صدقات و زکات کی وصولی بھی اُن سے وابستہ ہے۔ خواہ وہ مومن ہوں یا فاسق۔ نماز جمعہ حکام اور ائمہ کے پیچھے پڑھنی چاہیے اور جو اپنی نماز کا اعادہ کرے تو اُس نے بدعت کی ہے اور احادیث کو چھوڑ دیا ہے اور سنت کی مخالفت کی ہے۔ جس امام کو مسلمان تسلیم کر چکے ہوں خواہ خوشی سے یا تلوار کے زور سے یا اُس کے جبر و قہر کو دیکھ کے اُس کے خلاف جو بھی قیام کرے وہ باغی ہے۔ ایسا شخص احادیث رسولؐ کا مخالف ہے اور اگر اس حالت میں مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔[1]

استاد ابوزہرہ اسی کتاب کے صفحہ ۵۲۲ پر لکھتے ہیں:

دوسرے فقہاء کی طرح امام حنبل اُس شخص کی امامت (خلافت) کو درست سمجھتے تھے جو اقتدار نشین ہوا ہو اور بہتر انداز میں حکومت کی ہو اور لوگوں نے اُس کی حکومت کو تسلیم کرلیا ہو۔

امام حنبل دوسرے فقہاء کے ساتھ ساتھ یہ نظریہ رکھتے ہیں دوسرے فقہاء کا فتویٰ تو یہیں تک محدود ہے مگر امام حنبل اُن سے دو قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا فتویٰ یہ ہے کہ ہر برسراقتدار شخص کی اطاعت فرض ہے خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو تاکہ ملک میں افراتفری پیدا نہ ہو۔

امام حنبل کے اس فتوے کی وجہ سے وہابی اور سلفی امام حسین علیہ السلام کو باغی تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یزید نے آپ کو شہید کرکے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ غلطی امام حسینؑ کی تھی کہ انھوں نے اپنے زمانے کے امام (خلیفہ) کے خلاف خروج کیا تھا۔

یہ بات میں حسد سے نہیں کہہ رہا بلکہ ایک شخص کے ساتھ میری بحث ہوئی تو اُس نے پوری

۱۔ استاد ابوزہرہ، تاریخ المذاہب الاسلامیہ ج ۲، ص ۵۲۲۔

قوت سے یزید کا دفاع کیا اور کہنے لگا کہ حسینؑ بن علیؑ نے اپنے امام کے خلاف خروج کیا تھا اسی لیے اُن کا قتل جائز ہوگیا تھا۔[1] (نعوذ باللہ)

بزرگوں اور پرکھوں کی اندھی تقلید انسان کو دوزخ میں پہنچا دیتی ہے۔ امام حسینؑ جیسی عظیم شخصیت کہاں اور امام حنبل کا فتویٰ کہاں؟ حنبل کے بیٹے احمد کے فتوے کو مان کر رسول خداؐ کے بیٹے کے خلاف زبان درازی کرنا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر ہم اپنے خودساختہ ائمہ کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرتے تو ہماری ذہنی حالت بہتر ہوسکتی تھی اور ہم حق کے قریب پہنچ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (سورۂ ہود ۱۱۳)

یعنی ظالموں کی طرف جھکاؤ نہ رکھو ورنہ دوزخ کی آگ تمھیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا. (سورۂ کہف ۲۸)

یعنی ہم نے جس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواہشات کا اتباع کیا اور اپنے معاملات میں افراط سے کام لیا اُس کی بات نہ مانو۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (سورۂ قلم ۸)

یعنی (حق کو) جھٹلانے والوں کی بات نہ مانو۔

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (سورۂ شعراء ۱۵۱)

یعنی حد سے بڑھ جانے والوں کی بات نہ مانو۔

چونکہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان لوگوں نے کتاب خدا کو پس پشت ڈال کر بنی امیہ اور بنی عباس کے وظیفہ خوار راویوں کی جھوٹی روایات کو سر آنکھوں پر رکھا ہوا ہے۔ یہ روایات صرف حکام کی حکومت کو سہارا دینے اور اہل حق کو دبانے کی خاطر گھڑی گئی تھیں۔ اس کے برعکس آں محمدؐ نے ان جعلی روایات کو رد کیا تھا اور ان کے مقابلے میں اسلام اور قرآن کی روح کے مطابق صحیح روایات کو پیش کیا تھا۔

۱۔ شیخ محمد خضری اپنی کتاب تاریخ امم الاسلامیہ کے صفحہ ۱۵۲ پر لکھتے ہیں۔

بِنَ الْحُسَيْنِ اَعْطَاهُ عَطَاءً عَظِيْمًا فِيْ خُرُوْجِهٖ هٰذَا الَّذِيْ جَرَّ لِاُمَّتِهٖ وَبَالَ الْفُرْقَةِ وَالْاِخْتِلَافِ وَلَمْ يَرْفَعْ هٰذَا الَّذِيْ اَلْقَيْنَاهُ اِلٰى بُؤْسِنَا هٰذَا "بلاشبہ حسین (ع) نے (یزید کے خلاف) خروج کرکے بہت بڑی فضلی کی تھی۔ انہوں نے دعوت امت کی بنیادوں کو ہلا دیا جس سے امت ایسے اختلاف و افتراق کے جنجال میں پھنس گئی کہ آج تک نکل نہیں سکی۔

ہر ایک یزید کی گردن میں ڈالنے کے لئے — ابھی بچے ہوئے سنت کے ہار باقی ہیں
ہمارا ان سے کبھی فیصلہ نہیں ہوگا — یزید مر گیا کچھ رشتے دار باقی ہیں

(رضوانی)

امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"جو ظالم کی بقا پر راضی ہے وہ خدا کی معصیت پر راضی ہے۔"

(آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ مَنْ اَرْضٰی سُلْطَانًا جَائِرًا بِسَخَطِ اللّٰهِ خَرَجَ مِنْ دِیْنِ اللّٰهِ۔ جو آدمی ظالم حکمران کو راضی کرنے کے لئے خدا کو ناراض کرے وہ دین خدا سے نکل جاتا ہے)

صادق آل محمدؐ کی یہ حدیث عقل کے عین مطابق ہے کیونکہ جو شخص ظالم کی اطاعت پر راضی ہے اور اس کے خلاف قیام کو حرام سمجھتا ہے وہ اس بات پر راضی ہے کہ خدا کی معصیت ہوتی رہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ ○ ... الظّٰلِمُوْنَ ○ ... الْفٰسِقُوْنَ ○

حکم خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر... ظالم... فاسق ہیں۔ (سورۂ مائدہ آیت ۴۴۔۴۵۔۴۷)

نبی اکرمؐ سے ایسی بہت سی احادیث منقول ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کی گئی ہے۔ جب امام حسین علیہ السلام نے یزید کے خلاف قیام کیا تھا تو آپ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا تھا:

"لوگو! رسول خداؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی کسی ایسے ظالم سلطان کو دیکھے جو حرام خدا کو حلال سمجھتا ہو اور خدا سے کئے ہوئے عہد کو توڑ رہا ہو اور سنت رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہو اور مخلوق خدا سے اس کا رویہ دشمنی پر مبنی ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے ہاتھ اور زبان سے اس کی مخالفت نہ کرے تو خدا اسے ظالم کے ساتھ دوزخ میں جگہ دے گا۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کر رکھی ہے اور رحمان کی اطاعت کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ کھلم کھلا فساد کر رہے ہیں۔ انھوں نے خدا کی حدود کو معطل کر رکھا ہے۔ بیت المال میں ناجائز تصرف کر رہے ہیں۔ یہ حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال کر رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت میں اُن کے خلاف قیام کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔"[1]

ہم اُن لوگوں کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں جنھوں نے ائمہ اہلبیتؑ کو چھوڑ کر خود ساختہ ائمہ کی امامت کو سینے سے لگا رکھا ہے جبکہ اُن کی اطاعت کا خدا نے حکم نہیں دیا اور یہ لوگ قیامت کے دن کہیں گے۔ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ○ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا ○ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تھی۔ انھوں نے ہمیں راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ اے ہمارے پروردگار! انھیں دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔ (سورۂ احزاب آیت ۶۷۔۶۸)

بنی امیہ کے حکام نے سب سے بڑا ظلم یہ ڈھایا تھا کہ اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے

۱۔ تاریخ طبری ج ۵، ص ۴۰۳۔۴۰۱ سنہ ۶۱ھ کے واقعات۔

جھوٹی احادیث بنوائیں اور امام حنبل نے بھی ان روایات کی بنیاد پر انجانی ظالمانہ فتویٰ دیا تھا۔ امام حنبل نے یہ فتویٰ دے کر ظلم کے خلاف جدوجہد کے راستوں کو بند کر دیا اور امت کو مجبور کیا کہ وہ حکام کے ظلم کو برداشت کرے اور انقلاب اسلامی کے لیے ہرگز جدوجہد نہ کرے۔ آج کا دور علم و آگہی کا دور ہے۔ شعور کے اس روشن دور میں اس طرح کے فرسودہ فتووں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آج ہمارے کچھ کم سواد اور سادہ لوح جوان کمیونسٹ یا دیگر غیر اسلامی تحریکوں سے وابستہ ہوئے ہیں تو اُن کے اس گناہ کی ذمے داری اس طرح کے مفتیوں کے سر ہے۔

فقہ امام حنبل

امام حنبل کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ فقیہ نہیں محدث تھے۔ اُن کے پیروؤں نے اُن کی مختلف آراء کو جمع کر کے ایک فقہ مرتب کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں فقہ حنبلی میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ اس فقہ میں بعض ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن سے فقہی مقصود واضح نہیں ہوتا مثلاً وہ فرماتے ہیں لَایَنْبَغِیْ (ایسا کرنا مناسب نہیں)۔ ان الفاظ سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز حرام ہے یا مکروہ۔ بعض جگہ وہ فرماتے ہیں یُعْجِبُنِیْ (یہ بات مجھے پسند ہے) یا یہ کہ لَا یُعْجِبُنِیْ (یہ بات مجھے پسند نہیں)۔ کہیں کہتے ہیں اَکْرَہُ (مجھے یہ بات بری لگتی ہے) اور کہیں کہتے ہیں لَا اُحِبُّ (میں اس بات کو پسند نہیں کرتا)۔

الغرض اس طرح کے مبہم الفاظ سے فتوے کی نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ امام حنبل نے اپنی زندگی میں کبھی بھی فقیہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور وہ پوری زندگی فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے رہے۔

خطیب نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ "میں احمد بن حنبل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے اُن سے حلال و حرام کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ خدا تمہاری بخشش کرے، کسی اور سے جا کر پوچھ لو۔ سائل نے کہا کہ میں تو آپ سے اس کا جواب سننا چاہتا ہوں۔ احمد نے کہا خدا تمہاری بخشش کرے، دوسروں سے جا کر پوچھو۔ تم "ابو ثور" جیسے فقہاء سے اس کا جواب حاصل کرو۔"[1]

احمد کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بزم فقہاء کا فرد خیال نہیں کرتے تھے۔

مروزی لکھتے ہیں کہ میں نے احمد سے سنا کہ میں حدیث کے متعلق مطمئن ہوں اور جہاں تک مسائل کا تعلق ہے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔[2]

خطیب نے اپنی سند سے ایک شخص سے روایت کی ہے کہ احمد بن حرب (زاہد نیشاپوری) مکہ سے واپس آئے۔ احمد بن حنبل نے مجھ سے پوچھا کہ یہ خراسانی کون ہے؟ میں نے کہا کہ یہ ایک زاہد

۱۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۶۔ ۲۔ مناقب احمد بن حنبل ص ۱۷۵۔

ہے اور زہد کے متعلق فلاں فلاں بات کہتا ہے۔ احمد نے کہا کہ ایسے لوگوں کو فتوے کے میدان میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔[1]

محترم قاری! یہ تو تھا امام حنبل کا نظریہ۔ انھوں نے کبھی فتوے کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اور وہ فتویٰ دینے کو زہد کے تقاضوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن سے ایک فقہی مذہب کو منسوب کرنا کہاں کا انصاف ہے اور امور عبادت میں اُن کی تقلید کا کیا جواز ہے؟

ابوبکر اثرم کا بیان ہے کہ میں نے ابتدا میں فقہ اور فقہی اختلافات کو حفظ کیا تھا۔ پھر جب میں نے امام حنبل کی شاگردی اختیار کی تو میں نے اُن تمام چیزوں کو خیرباد کہہ دیا۔

امام حنبل کہا کرتے تھے کہ خبردار امام کے بغیر کسی مسئلے پر فتویٰ نہ دینا۔[2]

بالفاظ دیگر امام حنبل واضح طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک تمہارے پاس حدیث نہ ہو اُس وقت تک فتویٰ دینے کی جرأت نہ کرو۔ فتویٰ اُس وقت دینا جب تمھیں حدیث کی تائید حاصل ہو۔ ضمناً ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ امام حنبل کے نزدیک اقوال صحابہ میں سے بہترین قول منتخب کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کر سکتے ہیں۔ امام حنبل نے یہ بات عبدالرحمٰن میرفی سے اُس وقت کہی تھی جب اُس نے اُن سے اقوال صحابہ میں سے کسی کے قول کو ترجیح دینے کے متعلق سوال کیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اقوال صحابہ میں سے بہتر قول کا انتخاب نہ کر سکتا ہو وہ اجتہاد کرنے کے قابل نہیں ہے۔

امام حنبل فقہی مذہب کے بانی نہیں تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اُن کے متعصب پیروکار بھی اُن کے فقہی مذہب کے متعلق اختلاف کا شکار ہیں۔ تو کیا وہ حنفی یا شافعی تھے؟ مثلاً ابوالحسن اشعری کے متعلق کسی کو معلوم نہیں ہے کہ جب انھوں معتزلی مذہب چھوڑ کر حنبلی ہونے کا اعلان کیا تھا تو وہ فقہ حنبلی کے مطابق عبادت کرتے تھے یا کسی اور فقہ کے مطابق؟! یہی حال قاضی باقلانی کا تھا جو مالکی تھے اور یہی حال عبداللہ انصاری ہروی حنفی (۴۸۱ھ) کا تھا جس نے کہا تھا

اَنَا حَنْبَلِیٌّ مَا حَیِیْتُ وَاِنْ اَمُتْ فَوَصِیَّتِیْ لِلنَّاسِ اَنْ یَّتَحَنْبَلُوْا

(میں جب تک زندہ ہوں حنبلی رہوں گا۔ پس اگر مر جاؤں تو لوگوں کو میری وصیت ہے کہ وہ بھی حنبلی بنیں)۔

مذکورہ افراد اگرچہ سخت قسم کے حنبلی تھے لیکن فقہ میں وہ ابن مبارک کے مقلد تھے۔ امام حنبل کے دوسرے طرفداروں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ امام حنبل کے عقیدت مند صرف اُن کے عقائد

۱۔ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۹۔ ۲۔ استاد ابوزہرہ، احمد بن حنبل ص ۱۹۶۔

میں اُن کے ہمواتے لیکن فقہ میں اُن کی پیروی نہیں کرتے تھے۔

امام حنبل نے اپنے رسائل میں رائے، قیاس اور استحسان سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ قیاس کے قائل جہمی، قدری اور رافضی کے ہم ردیف ہیں جبکہ موجودہ فقہ حنبلی کا المیہ یہ ہے کہ اس میں قیاس بھی شامل ہے جس کے خود امام حنبل شدید مخالف تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جب احمد بن محمد بن ہارون (ابوبکر خلال) متوفی ۳۱۱ھ نے فقہ حنبلی کو مدون کیا تو انھوں نے اس کی تدوین میں خیانت کی تھی۔ نرم الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں مسائل نقل کرنے میں اشتباہ ہوا تھا اور اشتباہ کے امکانات اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ وہ امام حنبل کے زمانے میں نہیں تھے۔ انھوں نے امام حنبل سے منسوب مسائل کو جمع کیا تھا اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے امام حنبل کے جو اقوال نقل کیے ہیں اُن میں شدید اختلاف ہے اور انسان یہ ماننے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام مسائل امام حنبل کے ہیں۔

استاد ابو زہرہ لکھتے ہیں کہ "احمد بن حنبل سے جو فقہ منقول ہے اُس کے مسائل میں سخت تضاد پایا جاتا ہے اور انسانی عقل بڑی مشکل سے ان کو احمد بن حنبل کے اقوال ماننے پر تیار ہوتی ہے۔ آپ حنبلیوں کی کسی بھی کتاب کو اٹھالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اُن میں لکھی ہوئی روایات میں کھلا تضاد ہے اور ایک ہی مسئلے کے متعلق اثبات و نفی کا فرق پایا جاتا ہے۔"[1]

امام حنبل کے دور میں حنبلی فقہ کا کہیں وجود نہیں تھا اور اس وقت جو فقہ حنبلی ہے یہ اُن کے پیروؤں نے اُن کی آراء کو جمع کرکے اُن سے منسوب کردی ہے۔

بغداد میں تو فقہ حنبلی کے رائج کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت شیعہ تھی اور بغداد سے باہر امام حنبل کی شہرت نہیں تھی۔ البتہ سترہویں صدی عیسوی میں مصر میں فقہ حنبلی کے کچھ پیروکار تھے۔ فقہ حنبلی کو اُس وقت فروغ ملا جب موفق الدین عبداللہ بن محمد بن عبدالملک قدامی متوفی ۶۲۰ھ قاضی بنا۔ اُس نے حنبلی فقہاء کی سرپرستی کی جبکہ دوسرے علاقوں میں حنبلی مذہب موجود نہیں تھا۔

مقدمہ ابن خلدون میں اُس کی یہ توجیہ پیش کی گئی ہے "احمد بن حنبل کے مقلدین انتہائی کم ہیں کیونکہ اُن کا مذہب اجتہاد سے دور ہے۔"

حنبلیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے جتھی ہتھکنڈے استعمال کیے تھے۔ انھوں نے بغداد میں افراتفری پیدا کی، لوگوں کو مارا پیٹا اور گالیاں دیں یہاں تک کہ شہر کا نظم و نسق درہم برہم ہوگیا۔

۱۔ استاد ابو زہرہ، احمد بن حنبل ص ۲۹۸۔

اُس زمانے میں عباسی خلیفہ "راضی باللہ" کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا۔ جس میں خلیفہ نے اُن کی سرگرمیوں کی مذمت کی تھی اور اُن کے عقیدے کو عقیدہ تشبیہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔

اس سرکاری اعلامیہ میں یہ بھی لکھا تھا۔

"تم لوگوں نے یہ دعوے بھی کئے ہیں کہ تمہارے بدصورت اور منحوس چہرے رب العالمین کے چہرے کی طرح ہیں اور تمہاری پلید ہیئت خداوند عالم کی مانند ہے اور تم یہ عقیدہ بھی رکھتے ہو کہ خداوند عالم ہاتھ پاؤں اور انگلیاں رکھتا ہے اور اُس نے سونے کے جوتے پہن رکھے ہیں... تم یہ عقیدہ بھی رکھتے ہو کہ خداوند عالم آسمان کی طرف صعود کرتا ہے اور زمین کی طرف نزول کرتا ہے۔ خداوند عالم اس سے مکمل پاک ہے جو کچھ ظالم اور گمراہ لوگ اُس کے متعلق بیان کرتے ہیں۔"[1]

یہ ہے حنبلی مذہب کا حقیقی چہرہ۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں اس کے پیرو اقلیت میں رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حنبلی اللہ تعالیٰ کے متعلق مخصوص عقائد رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کے قائل ہیں اور وہ خدا کو اُن صفات سے متصف کرتے ہیں جو اُس کے شایان شان نہیں ہیں۔ اسی لیے یہ مذہب مسلمانوں میں مقبول نہیں ہوا یہاں تک کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا زمانہ آیا اور اسی کے ذریعے سے اس مذہب کو فروغ ملا۔ وہابیت کا بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی حنبلی نظریات کا پیرو تھا۔ آل سعود کی حکومت نے اس مذہب کو ابتدا میں تلوار کے زور پر[2] اور بعد میں پیٹرو ریال کے ذریعے فروغ دینے کی کوششیں کیں اور اُس کی یہ کوششیں ہنوز جاری ہیں۔ ریالوں کی چمک نے بہت سے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کیا اور لوگوں نے حنبلی مذہب اختیار کرلیا جبکہ اس کے لیے اُن کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مذہب حنبلی کی بنیاد اگر "پیٹرو ریال" پر نہیں ہے تو انہیں چاہیے کہ پہلے وہ تین

۱۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعہ ج ۲، ص ۵۰۹۔

۲۔ رف اسلان اپنی کتاب No god but God میں An Awakening in the East کے ذیل میں لکھتا ہے۔
"محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کے سیاسی اور دینی اشتراک عمل نے جب حقیقت کا روپ دھارا تو ایک نئی داستان نے جنم لیا۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب محمد بن عبدالوہاب اور اُس کے دینی پیروکاروں نے جزیرۃ العرب میں توڑ پھوڑ شروع کی تھی۔ وہ مقبرے گرا رہے تھے، مقدس درختوں کو کاٹ رہے تھے اور ان مسلمانوں کو قتل کررہے تھے جو وہابی عقائد کو بلا چون و چرا قبول نہیں کرتے تھے۔ وہابیوں نے واضح طور پر اپنی تحریک کا رشتہ اولین مسلم شدت پسند خوارج کے ساتھ جوڑا اور اپنے متشدد بزرگوں کی طرح اپنے دل کی بھڑاس اُن عناصر کے خلاف نکالی جن کو وہ مسلمانوں کی ناکامیوں کا ذمے دار ٹھہراتے تھے۔ حجاز کو زیر نگیں لانے کے بعد وہ اپنا پیغام صوفی اور شیعہ کافروں تک پہنچانے کے لئے شمال کی طرف بڑھے۔ ۱۸۰۱ء میں عاشور کے مقدس دن وہابیوں نے کربلا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور دو ہزار شیعہ زائرین کو جو عزاداری میں مصروف تھے قتل کر دیا۔ غصے سے بے قابو وہابیوں نے علی (ع)، حسین (ع) اور ائمہ کے مزارات میں توڑ پھوڑ کی۔ انھوں نے خاص طور پر دختر رسول فاطمہ (ع) کے مزار کو ویران کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔ (رضوانی)

باتیں ثابت کریں۔

۱۔ امام احمد بن حنبل کو فقیہ ثابت کریں۔

۲۔ فقہ حنبلی کو امام حنبل کی مرتب کردہ فقہ ثابت کریں۔

۳۔ قرآن و حدیث سے یہ ثابت کریں کہ امام حنبل کے مذہب کی پیروی واجب ہے۔

اگر یہ سب ثابت نہ ہو سکے تو پھر یقین کیجئے کہ فقہ حنبلی کی پیروی اوہام پرستی کے مترادف ہے اور اوہام کبھی بھی حق کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔

ہم تاریخ میں جب امام حنبل کے کٹر طرفداروں کے بیانات پڑھتے ہیں تو وہ اپنی تمام تر عقیدت کے باوجود انھیں فقیہ نہیں کہتے۔ آپ ابن قتیبہ کو ہی لے لیں۔ وہ امام حنبل کا زبردست طرفدار تھا لیکن اُس نے امام حنبل کا نام فقہاء کی فہرست میں نہیں لکھا۔ اگر وہ فقیہ تھے تو اُس نے اُن کا حق ضائع کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب الانتقاء میں فقہاء کے نام شمار کئے ہیں لیکن انھوں نے بھی فقہاء کی فہرست میں اُن کا نام نہیں لکھا۔ ابن جریر طبری مشہور محدث اور مفسر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب اختلاف الفقہاء میں امام حنبل کو فقہاء کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ لطف یہ ہے کہ طبری سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنی کتاب میں احمد بن حنبل کا ذکر کیوں نہیں کیا تو طبری نے کہا کہ وہ فقیہ ہوتے تو میں ضرور اُن کا ذکر کرتا۔ جب وہ فقیہ ہی نہیں تھے تو ان کا نام فقہاء کی فہرست میں کیسے لکھ سکتا تھا؟ امام حنبل فقیہ کی بجائے محدث تھے۔ میں نے اُن کے ایسے شاگرد نہیں دیکھے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ طبری کے اس جواب پر حنبلیوں کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ احمد بن حنبل فقیہ ہوں یا نہ ہوں لیکن تم ضرور رافضی ہو۔

حنبلیوں نے طبری سے خدا کے عرش نشین ہونے کی حدیث کے بارے میں پوچھا تو طبری نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

سُبْحَانَ مَنْ لَيْسَ لَهُ أَنِيسُ
وَلَا لَهُ فِي عَرْشِهِ جَلِيسُ

پاک ہے وہ ذات جس کا کوئی ہمدم نہیں اور اُس کے عرش میں کوئی اُس کا ہم نشین نہیں۔

حنبلیوں نے لوگوں کو طبری کی صحبت میں بیٹھنے سے منع کیا اور اپنی دواتیں لے کر اُس پر ٹوٹ پڑے۔ طبری جان بچا کر گھر بھاگے اور گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ حنبلیوں نے اُن کے دروازے پر اتنے پتھر مارے کہ پتھروں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔[1]

۱۔ احمد امین، ضحی الاسلام ج ۲، ص ۲۲۵۔

حنبلیوں کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریات میں سخت متعصب تھے اور اُن کے ہاں اصولوں کی پاسداری کی روایت نہیں تھی۔ وہ دھونس اور دھمکی سے اُس مذہب کو تسلیم کرانا چاہتے تھے جو غیر مقبول تھا اور جسے علماء کی اکثریت نے مسترد کر دیا تھا۔

استاد ابو زہرہ لکھتے ہیں:

بیشتر سابقین نے مثلاً طبری نے نیز ابن قتیبہ نے بھی جو زمانی اعتبار سے احمد بن حنبل کے قریب تھے انھیں فقہاء میں شمار نہیں کیا ہے۔

نتیجہ بحث

اہلسنت کے فقہی مذاہب کی اس طویل تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذکورہ مذاہب کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں تھا۔ سیاست کے اپنے مخصوص تقاضے تھے کہ فقہ کو مذاہب اربعہ میں محصور کر دیا گیا۔ سیاست کھل کر دین سے جنگ نہیں کر سکتی تھی لہٰذا سلاطین نے علماء کو اپنا مقرب بنایا اور تقرب کے لیے بس ایک شرط رکھی کہ ان کا کوئی فتویٰ حکومت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ سلطان ہر چیز سے بلند ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں دبستان مذاہب میں سے چار فقہوں کا انتخاب کیا گیا کیونکہ یہ فقہیں حنوملوکانہ اور رضائے سلطانی کو تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ ان مذاہب کے بانیوں کے شاگردوں کو منصب قضاوت پر فائز کیا گیا اور تمام دینی امور کی باگ ڈور انھیں سونپ دی گئی۔ جب شاگرد قاضی بنے تو انھوں نے اپنے اساتذہ کے مذاہب کا کھل کر پرچار کیا۔

احمد امین لکھتے ہیں:

حکومتوں نے مذاہب اہلسنت کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر کسی مضبوط حکومت نے کسی مذہب کی تائید کی تو لوگوں نے بھی حکومت کی دیکھا دیکھی اُس مذہب کی پیروی کی اور جب تک وہ حکومت قائم رہی اُس وقت تک وہ مذہب بھی مضبوط رہا۔[1] اس کے باوجود کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس کے پاس اپنے مذہب کی پیروی کے لیے شرعی دلیل موجود ہے؟!

اگر مذاہب اربعہ کی پیروی کے وجوب کی کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو کیا خدا اور اس کا رسولؐ اس مسئلے سے غافل تھے اور کیا رسول اسلامؐ نے اپنی امت کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دین اور احکام شریعت کس سے حاصل کریں؟! یہ بات عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ وہ لوگوں کو احکام اسلام کے سرچشمے سے آگاہ نہ کرے۔

۱۔ احمد امین، ظہر الاسلام ج ۳، ص ۹۲۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا پورا پورا انتظام کیا تھا اور اپنے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ قرآن و عترت کی پیروی کریں۔ قرآن خدا کا لاریب کلام ہے اور عترت رسولؐ وارث قرآن اور معدن حکمت ہے۔ رسول اللہؐ کی عترت پاک کے ائمہ طاغوتی حکمرانوں کے شدید مخالف تھے لہٰذا انھوں نے ان کا حق غصب کیا اور پوری ریاستی قوت اس بات پر لگادی کہ لوگ آل محمدؐ سے وابستہ نہ ہونے پائیں۔ عوام کی اکثریت تو نادان اور ناسمجھ ہوتی ہے۔ عوام تو ہر نعرہ لگانے والے کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ نور علم سے ان کا راستا روشن نہیں ہوتا اور ان کے پاس کوئی مضبوط تکیہ گاہ نہیں ہوتی۔

لیکن مکتب تشیع نے کبھی کسی حکومت کا سہارا نہیں لیا۔ مکتب تشیع نے رسول خداؐ کے اس فرمان پر انحصار کیا ہے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ فَاِنَّ اللَّطِیْفَ الْخَبِیْرَ اَنْبَاَنِیْ اَنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت میرے اہلبیت۔ علیم و خبیر خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں میرے پاس حوض پر وارد ہونے سے پہلے ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔

شیعوں نے عترت رسولؐ کے دامن کو تھاما اور ان سے اپنا عقیدہ حاصل کیا۔ انھوں کسی بھی مسئلے میں اہلبیتؑ کی مخالفت نہیں کی اور آل محمدؐ کے نظریے کے مقابلے میں کبھی بھی اپنا نظریہ پیش نہیں کیا۔ دوسری طرف آل محمدؐ سے انھیں اتنا علم ملا کہ انھیں کسی دوسرے کے فتوے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

آل محمدؐ کی حدیث ان کے نانا رسول خداؐ کی حدیث ہے اور ان کے نانا رسول خداؐ کی حدیث جبریلؑ کی حدیث ہے اور جبریلؑ کی حدیث، خداوند عزوجل کا فرمان ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا

اِذَا شِئْتَ اَنْ تَحْیٰی لِنَفْسِکَ مُلْحِبًا	یُنَجِّیْکَ یَوْمَ النَّفْخِ مِنْ لَّھَبِ النَّارِ
فَدَعْ عَنْکَ قَوْلَ الشَّافِعِیِّ وَ مَالِکٍ	وَ اَحْمَدَ وَالْمَرْوِیَّ عَنْ کَعْبِ الْاَحْبَارِ
وَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُھُمْ وَ حَدِیْثُھُمْ	رَوٰی جَدُّنَا عَنْ جَبْرَئِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ

اگر تو ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو تجھے قیامت کے دن دوزخ کے شعلوں سے بچا سکے تو پھر شافعی، مالک، احمد اور کعب الاحبار کی روایات کو چھوڑ دے اور ان لوگوں سے محبت استوار کر جن کا قول و حدیث کچھ یوں ہے۔ "ہمارے نانا نے جبریلؑ سے اور جبریلؑ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے۔"[1]

۱۔ امام جعفر صادقؑ یہ نہیں فرماتے تھے کہ "میں اجتہاد کرتا ہوں یا میری رائے یہ ہے" بلکہ فرماتے تھے "اللہ نے فرمایا ہے" اور "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے" البتہ امام ابوحنیفہ کہتے تھے کہ "میں نے اجتہاد کیا ہے" یا "میری ذاتی رائے یہ ہے۔"
(مقدمہ مرآۃ العقول ج ۱، ص ۶۸، ۶۷، فصل تطور اجتہاد)۔ رضوانی

شیعہ فقہ کی طرف اشارہ

جو کچھ شاعر نے کہا ہے شیعوں نے اپنے بارہویں امام حضرت حجتؑ کے دور تک اس پر عمل کیا۔ جب مشیت الٰہی کے تحت بارہویں امام کی غیبت ہونے لگی تو انھوں نے اپنے شیعوں کو احکام فقہ کے حصول کے لیے لائحہ عمل دیتے ہوئے فرمایا تھا: فَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِيْنِهٖ مُخَالِفًا لِهَوَاهُ مُطِيْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِّ اَنْ يُقَلِّدُوْهُ جو فقیہ اپنے نفس کی پر قابو رکھنے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنی خواہشات کی مخالفت کرنے والا اور اپنے مولا کے فرمان کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کو چاہیے کہ اُس کی تقلید کریں۔[1]

امام علیہ السلام کے اس فرمان مبارک کے ساتھ ہی شیعوں کے لیے اجتہاد اور تحقیق کے دروازے کھل گئے۔ اس فرمان مبارک کے بعد شیعوں نے جس فقیہ کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے برتر پایا احکام فقہ اور جدید مسائل میں اُس کی تقلید کی۔

فقہاء نے اس مسئلے کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے مثلاً کتاب المسائل الاسلامیہ میں ہے:

(مسئلہ ۱) اصول عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ اصول دین میں بربنائے دلیل عقیدہ رکھے۔ اصول دین میں کسی کے قول کو دلیل کے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے البتہ احکام اور فروع دین میں انسان یا تو خود مجتہد ہو کہ شرعی دلائل سے احکام کا استنباط کرسکتا ہو یا پھر اسے مقلد ہونا چاہیے یعنی مجتہد جامع الشرائط کے فتوے پر عمل کرنا چاہیے۔ جو شخص نہ مجتہد ہو اور نہ عامی ہو اگر وہ احتیاط پر عمل کرنے اور تکلیف شرعی کے تعین میں اتنا قابل ہو کہ اسے یقین آجائے کہ اُس نے اپنی شرعی تکلیف کو صحیح طور پر انجام دیا ہے تو اسے احتیاط پر عمل کرنا چاہیے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ چند مجتہدین نے کسی فعل کے حرام ہونے کا اور چند مجتہدین نے اُس کے مباح ہونے کا فتویٰ دیا ہو تو اس صورت میں احتیاط یہ ہے کہ اس فعل کو ترک کر دیا جائے۔

جو شخص نہ تو مجتہد ہو اور نہ ہی محتاط ہو اُس کو چاہیے کہ شرعی احکام میں کسی مجتہد کی تقلید کرے اور اُس کے فتوے پر عمل کرے۔

(مسئلہ ۴) اعلم کی تقلید کے وجوب کی بنا پر اگر اعلم کی مکمل شناخت نہ ہو سکے تو پھر کسی ایسے مجتہد کی تقلید کرے جس کے اعلم ہونے کا احتمال زیادہ ہو اور اگر کسی کے متعلق یہ احتمال ضعیف ہو کہ وہ دوسروں سے اعلم ہے اور دوسرے مجتہدین اُس سے اعلم نہیں ہیں تو پھر اسی کی تقلید کرنی چاہیے اور اگر اُس کی نظر میں سب کا علم مساوی ہو تو پھر اُن میں سے کسی کی بھی تقلید کرسکتا ہے اور اگر علم میں سب برابر ہوں اور

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۲۷، ص ۱۳۱۔ یہاں مؤلف کو تسامح ہوا ہے۔ یہ حدیث امام حسن عسکریؑ سے منقول ہے۔

فتوی میں ایک عالم ممتاز ہو تو پھر بنا بر احتیاط اسی کی تقلید کرنی چاہیے۔

(مسئلہ ۵) مجتہد کا فتوی معلوم کرنے کے چار طریقے ہیں:

۱۔ انسان خود مجتہد کی زبان سے سنے۔

۲۔ دو عادل افراد مجتہد کا فتوی نقل کریں۔

۳۔ کسی ایسے شخص سے فتوی سنے جس پر انسان کو اطمینان ہو۔

۴۔ مجتہد کی توضیح المسائل (منہاج الصالحین وغیرہ) میں اس کا فتوی پڑھے لیکن شرط یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو کہ یہ رسالہ عملیہ اسی مجتہد کا لکھا ہوا ہے۔

چنانچہ ان اسباب کی وجہ سے شیعی فقہ نے بڑی ترقی کی ہے۔ اسی وجہ سے مدارس اور علمی حوزہ جات بنے اور فقہاء و مجتہدین نیز ہزاروں علمی شخصیات منظر عام پر آئیں۔

علمائے شیعہ کے فقہی کتب خانوں کو دیکھیں تو لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ جائیں گے۔ ہم یہاں چند فقہی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ علمائے شیعہ نے فقہ پر اتنی زیادہ کتابیں لکھی ہیں کہ اُن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ بطور تبرک ہم چند کتب فقہ کے نام لکھ رہے ہیں

۱۔	وسائل الشیعہ	از شیخ حر عاملی	۳۰ جلدیں
۲۔	مستدرک الوسائل	از نوری طبرسی	۱۸ جلدیں
	کتب فقہ استدلالی:		
۱۔	جواہر الکلام	از محمد حسن نجفی	۴۳ جلدیں
۲۔	الحدائق الناضرہ	از شیخ یوسف بحرانی	۲۵ جلدیں
۳۔	مستمسک بالعروۃ الوثقی	از سید محسن الحکیم طباطبائی	۱۴ جلدیں
۴۔	الموسوعۃ الفقہیۃ		۱۱۰ جلدیں

ان کتب میں فقہ کے تمام ابواب ہیں مثلاً فقہ قرآن، فقہ حقوق، فقہ حکومت اسلامی، فقہ انتظامی، فقہ سیاسی، فقہ اقتصادی اور فقہ سماجی

۵۔	فقہ الصادق	۲۶ جلدیں
۶۔	سلسلۃ الینابیع الفقہیہ	۳۰ جلدیں

یوحنا کا مذاہب اربعہ کے علماء سے مناظرہ

اس باب کا اختتام ہم ایک بے نظیر مناظرے پر کرتے ہیں۔ یہ مناظرہ ایک نومسلم شیعہ عیسائی

یوحنا اور مذاہب اربعہ کے علماء کے درمیان ہوا تھا۔ اس مناظرے کے حکیمانہ دلائل سے ہر انصاف پسند قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ حق کہاں ہے۔

اس مناظرے کو ہم عبداللہ بن حسن کی کتاب مناظرات فی الامامۃ سے نقل کر رہے ہیں۔[1]

یوحنا بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے بزرگ صحابہ کے باہمی اختلافات کے متعلق سنا تو مجھے بے حد تعجب ہوا کہ مسلمان جن کا نام نبی اکرمؐ کے ساتھ ساتھ لیتے ہیں آخر انہیں اختلاف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور میرے لیے مسائل مبہم ہو گئے۔ قریب تھا کہ میں اپنے دین میں ہی شک کرنے لگتا میں نے بغداد کا رخ کیا کہ یہ شہر مسلمانوں کا دارالحکومت ہے اور یہاں تمام مذاہب کے علماء رہتے ہیں۔ میں کیوں نہ ان سے ملاقات کر کے علمائے مسلمین کے اختلافات کی تحقیق کروں اور پھر حق کو تلاش کر کے اس کی پیروی کروں۔ چنانچہ میں نے رخت سفر باندھا اور بغداد آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے مذاہب اربعہ کے علماء سے ملاقات کی اور میں نے ان سے کہا:[2]

محترم علمائے دین! میں پہلے اہل کتاب میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان کیا اور مجھے دین اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اور میں مسلمان ہو گیا۔ اب میں معارف اسلام سیکھنے اور حدیث شریف پڑھنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ میری دینی بصیرت میں اضافہ ہو۔ ان میں سے لمبا جو بوڑھا عالم بیٹھا تھا اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا پھر وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔

"یوحنا! اسلام کے چار مذہب ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کا انتخاب کر لو اور پھر اس مذہب کے اصول و فروع کا مطالعہ کرو۔

میں نے کہا: محترم علمائے دین! ان چاروں مذاہب میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں سے حق ایک کے ساتھ ہے۔ آپ حضرات مجھے اس مذہب حق کی نشاندہی کریں جس پر آپ کے پیغمبرؐ نے عمل کیا ہو۔

حنفی عالم نے کہا کہ ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کا راستہ ان چار مذاہب ہی میں محصور ہے۔ ان مذاہب سے آنحضرتؐ کا راستہ الگ نہیں تھا۔ اب ہم چاروں مذاہب سب کے سب اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک فقہی مذہب باطل ہو دوسرا صحیح ہو اور مجموعی طور پر ان مذاہب میں سے مذہب حنفی ہی سنت رسولؐ سے زیادہ قریب ہے۔

۱۔ مناظرات فی الامامۃ ص ۳۱۸ ۔ ۳۲۹۔

۲۔ اس دور میں حکومت کی طرف سے مذاہب کے لیے ایک وسیع پیمانے پر ادارہ قائم کیا گیا تھا جہاں مذاہب اربعہ کے علماء آ کر بیٹھتے تھے اور عوام کو بھی ان سے ملنے کی مکمل اجازت تھی۔

اس مذہب کو عقل اور عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ یہ مذہب نہ صرف عوام میں مقبول ہے بلکہ یہ سلاطین میں بھی یکساں مقبول ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اگر نجات کے طالب ہو تو پھر حنفی مذہب اختیار کرو۔

یونس بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی حنفی عالم کی گفتگو ختم ہوئی وہاں موجود شافعی عالم نے حنفی عالم کو ڈانٹ کر کہا۔ خاموش رہو۔ منہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے۔ تم کیا اور ترجیح مجتہدین کیا؟

تم پر وائے ہو! تمہیں کیا معلوم کہ ابو حنیفہ نے کیا کچھ کہا تھا؟ تمہیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے قیاس سے کتنے مسائل کا استخراج کیا تھا؟ مگر تم لوگ اتنے بے توفیق ہو کہ انھیں صاحب رائے کہتے ہو۔ تمہارے امام نے نص کے مقابلے پر اجتہاد کیا تھا اور دین خدا میں استحسان پیدا کر کے اسے بازیچۂ اطفال بنایا تھا۔ وہ خود استحسان کے اصولوں کے اسیر تھے۔ چنانچہ ان خودساختہ اصولوں کی وجہ سے انھوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ اگر کوئی ہندوستانی مرد اپنے وکیل کے ذریعے ایک رومی عورت سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد برسوں تک ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں اور پھر کچھ برس بعد شوہر اپنی بیوی سے ملے تو دیکھے کہ وہ کئی بچوں کی ماں ہے نیز حاملہ بھی ہے تو اپنی بیوی سے پوچھے کہ جب ہمارا نکاح ہوا تھا اس وقت تو تو باکرہ تھی اور نکاح کے بعد میں نے تجھے چھوا بھی نہیں پھر یہ بچے کس طرح پیدا ہوئے اور تو حاملہ کیسے ہو گئی؟

اور جواب میں بیوی کہے کہ یہ سب تیرے ہی بچے ہیں۔ مرد یہ جواب سن کر حنفی قاضی کے پاس جائے اور اس سے بیوی کی شکایت کرے تو قاضی یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ بچے تیرے ہی صلبی بچے ہیں اور ظاہر و باطن میں یہ تجھ سے ملحق ہیں اور تم ان کی میراث پاؤ گے اور بچے تمہاری میراث پائیں گے۔

اس کے جواب میں شوہر کہے کہ حضور! کچھ تو خیال کریں۔ نکاح کے بعد میں نے بیوی کا منہ آج دیکھا ہے۔ آخر یہ بچے میرے کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب میں حنفی قاضی کہے گا کہ تمہارے ملنے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ امکان موجود ہے کہ تم پر جنابت طاری ہوئی ہو یا تم نے اپنے ہاتھ سے منی خارج کی ہو اور وہ کسی کاغذ یا کپڑے کے ٹکڑے پر گری ہو اور وہ ٹکڑا پرواز کر کے ہندوستان سے روم پہنچا ہو اور اس عورت کے رحم میں چلا گیا اور وہ اس کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہو۔[1]

پھر شافعی عالم نے کہا حنفی میاں! کیا فقہ حنفی کا یہ فتویٰ کتاب و سنت کے مطابق ہے؟

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴، ص ۱۳۰۔

حنفی عالم نے کہا کہ آخر اس فتوے میں قباحت ہی کیا ہے۔ بچے اپنے ہندی باپ سے ملحق کیے جائیں گے کیونکہ جس گھر اور بستر پر وہ بچے پیدا ہوئے ہیں وہ گھر اور بستر ہندی شوہر کا تھا اور گھر اور بستر پر پیدا ہونے والا بچہ گھر اور بستر کے مالک کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے۔ بچوں کو عقد کی وجہ سے باپ سے ملحق کیا جائے گا۔ مقاربت اس میں شرط نہیں ہے۔[1] حضرت رسول اکرمؐ کی مشہور حدیث ہے اَلْوَلَدُ لِصَاحِبِ الْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ (بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور زانی کے لیے کنکر پتھر ہیں) تمہارے امام شافعی نے یہ غلطی کی تھی۔ انھوں نے اس صریح حدیث نبوی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور بستر کے لیے میاں بیوی کے ملاپ کو شرط قرار دیا تھا۔ اس میں اگر غلطی ہے تو فقہ شافعی کی ہے۔ فقہ حنفی کا یہ فتویٰ حدیث کے عین مطابق ہے۔ پھر شافعی عالم نے کہا: ابو حنیفہ نے یہ کہا تھا کہ اگر ایک عورت کا نکاح ہو جائے اور رخصتی بھی عمل میں آجائے پھر اس عورت کا کوئی عاشق آئے اور فقہ حنفی کے قاضی کے پاس جا کر یہ دعویٰ کرے کہ جناب عالی! اس عورت کی رخصتی سے پہلے اس سے میرا نکاح ہوا تھا اور اپنے دعویٰ پر وہ دو فاسق گواہ بھی پیش کر دے جو قاضی کے سامنے جھوٹی گواہی دیں تو قاضی عورت اور اس کے موجودہ شوہر کے درمیان جدائی ڈال دے گا اور عورت کو اس کے عاشق کے سپرد کر دے گا۔ اس فیصلے سے عورت اپنے موجودہ شوہر کے لیے ظاہری اور باطنی طور پر حرام ہو جائے گی اور اپنے عاشق کے لیے ظاہری و باطنی طور پر حلال ہو جائے گی اور یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جب قاضی یہ بھی جانتا ہو کہ گواہ جھوٹے ہیں اور رشوت لے کر گواہی دے رہے ہیں۔

یہ کہہ کر شافعی عالم حاضرین کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ لوگو! کیا ایسے مذہب کے بانی کو اصول اسلام کا عالم کہا جا سکتا ہے؟!

حنفی نے کہا کہ آپ تو خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔ حق میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قاضی کا فیصلہ ظاہری اور باطنی طور پر نافذ العمل ہے۔ یہ مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

شافعی عالم نے کہا کہ لوگو! غضب ہو گیا۔ قاضی کا فیصلہ ظاہر و باطن میں نافذ ہے تو آخر کیوں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ دو۔ (سورۂ مائدہ آیت ۴۹) اللہ نے اس طرح کے ظالمانہ فیصلوں کا حکم نازل نہیں فرمایا۔

اس کے بعد شافعی عالم نے کہا کہ کیا آپ نے ابو حنیفہ کی یہ ستم رانی نہیں دیکھی کہ انھوں نے کہا تھا اگر ایک شخص گھر سے چلا جائے اور طویل عرصے تک پلٹ کر نہ آئے اور ایک دوسرا شخص اس کے گھر آکر اس کی بیوی کو اطلاع دے کہ تمہارا شوہر مر گیا ہے تم عدت میں بیٹھ جاؤ۔

۱۔ شافعی کی کتاب الام ج ۵، ص ۲۲۔۲۱۹۔

عورت عدت وفات میں بیٹھی۔ عدت گزرنے کے بعد عورت نے دوسرا نکاح کر لیا اور اس شوہر سے کئی بچے پیدا ہوئے۔ پھر پہلا شوہر زندہ سلامت واپس آجائے تو دوسرا نکاح فسخ ہو جائے گا اور عورت پہلے شوہر کے پاس لوٹ جائے گی اور دوسرے شوہر سے ہونے والے بچے پہلے شوہر کی اولاد تسلیم کیے جائیں گے اور وہ پہلے شوہر سے میراث بھی پائیں گے۔[1]

یہ کہنے کے بعد شافعی عالم نے انصاف طلب نگاہوں سے حاضرین کو مخاطب کیا اور کہا کہ لوگو! خدا کے لیے بتاؤ کیا کوئی باہوش شخص اس بات کو مان سکتا ہے؟!

حنفی عالم نے کہا کہ تم خواہ مخواہ ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ آخر اس فتوے میں کیا قباحت ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: اَلْوَلَدُ لِصَاحِبِ الْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ عورت بھی تو شوہر کے لیے بمنزلہ بستر ہے مگر شافعی نے صاف سیدھی حدیث کو مقاربت سے مشروط کیا تھا جو کہ سراسر غلط ہے۔

پھر شافعی عالم نے حنفی عالم سے کہا کہ کچھ تو حیا کرو۔ تمہارے امام ابو حنیفہ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی شادی شدہ عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کے حصول کے لیے قاضی کے پاس جا کر یہ دعویٰ کرے کہ اس عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دی ہے مگر یہ اب بھی اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی ہے۔ پھر وہ دو جھوٹے گواہ بھی پیش کر دے جو یہ گواہی دیں کہ واقعی اس کے شوہر نے ہمارے روبرو اسے طلاق دی تھی اس صورت میں حنفی قاضی کو چاہیے کہ وہ عورت کو اس کے شوہر سے جدا کر دے کیونکہ اب عورت اپنے شوہر پر حرام ہو چکی ہے اور جھوٹے دعویدار اور جھوٹے گواہوں میں سے اگر کوئی اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو وہ نکاح کر سکتا ہے۔[2] ابو حنیفہ کہتے تھے کہ قاضی کا یہ فیصلہ ظاہر و باطن میں نافذ العمل ہوگا۔

پھر شافعی عالم نے حنفی عالم پر ایک اور حملہ کیا اور بولا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ تمہارے امام صاحب کیا کہتے تھے؟ اگر نہیں جانتے تو لو سنو۔ تمہارے امام صاحب نے کہا تھا کہ اگر چار آدمی کسی شخص کے متعلق یہ گواہی دیں کہ ہم نے اسے زنا کرتے ہوئے دیکھا اور وہ شخص قاضی کے سامنے گواہوں کے بیان کی تصدیق کرے تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی اور اگر وہ انکار کرے تو اس پر حد جاری ہو گی۔[3]

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۱۹۔

۲۔ یہ فتویٰ تاریخ بغداد کی ج ۱۳ ص ۳۷۳ پر بھی مرقوم ہے۔ حارث بن عمیر کا بیان ہے کہ میں نے ابو حنیفہ سے سنا کہ اگر دو گواہ قاضی کے پاس گواہی دیں کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور عدالت میں موجود ہر شخص کو علم ہو کہ گواہی جھوٹ پر مبنی ہے تو قاضی کو چاہیے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دے۔ پھر اگر ان دو گواہوں میں سے کوئی اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

۳۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۲۹۔

اس کے بعد شافعی عالم نے چیخ چیخ کر کہا کہ لوگو! آؤ اور یہ مسئلہ بھی سنو۔ اے اہل بصیرت! اس سے عبرت حاصل کرو۔

پھر اس نے کہا کہ ابو حنیفہ کہتے تھے

اگر کوئی شخص کسی لڑکے سے لواطت کرے اور اسے ناقص بنا دے تو اس پر کوئی حد جاری نہیں کی جائے گی البتہ تعزیر نافذ ہوگی[1] جبکہ رسول مقبولؐ کی حدیث ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَ الْمَفْعُوْلَ اگر کوئی شخص قوم لوط کا عمل کرے تو فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دو[2]

پھر شافعی عالم نے کہا کہ میں تم کو ابو حنیفہ کے کون کون سے فتوے بتاؤں؟ ابو حنیفہ کہتے تھے اگر کوئی شخص کسی سے جبراً گندم چھین لے پھر اسے ہضم کر اس کا آٹا بنا لے تو آٹا بن جانے کی وجہ سے وہ شخص گندم کا مالک بن جائے گا اور اگر گندم کا اصلی مالک اس سے آٹا خریدے تو اس کا شرعی فرض ہے کہ گندم کی پیمائی کی قیمت اسے دے۔ غاصب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اصل مالک کو آٹا دے اگر وہ اس کو آٹا نہ دینا چاہے تو اسے اس کا اختیار حاصل ہے اور اگر اس وقت مالک اور غاصب میں جھگڑا ہو جائے اور اس جھگڑے میں گندم کا مالک قتل ہو جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا اور اگر غاصب قتل ہو جائے تو گندم کے اصل مالک کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔[3]

پھر شافعی عالم نے کہا کہ اے لوگو! سنو۔ ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اگر کوئی چور ایک آدمی کے ہزار دینار چوری کرے پھر دوسرے آدمی کے بھی ہزار دینار چوری کرے اور پھر چوری کی رقم کو ضائع کر دے تو وہ اس رقم کا شرعی مالک متصور ہوگا البتہ وہ اتنی رقم کے لیے مقروض سمجھا جائے گا۔

پھر شافعی عالم نے کہا ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اگر متقی اور باشعور مسلمان کسی پاگل کافر کو قتل کر دے تو اس کے قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ○ اللہ کافروں کو مومنین پر ہرگز تسلط نہیں دے گا۔ (سورۂ نساء، آیت ۱۴۱)

امام ابو حنیفہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی کنیز، ماں یا بہن کو خریدے تو وہ ان کا مالک بن جائے گا اور اگر وہ ان سے ہم بستری کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی اگرچہ اس نے جان بوجھ کر ہی ایسا کیا ہو۔[4]

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۴۱۔

۲۔ مستدرک حاکم ج ۴، ص ۳۵۵۔ کنز العمال ج ۵، ص ۳۳۰، حدیث ۱۳۱۲۹۔

۳۔ الفتاوی الخیریہ ج ۲، ص ۱۵۰۔ ۴۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۴۳۔

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنی ماں یا بہن سے نکاح کرے اور جانتے بوجھتے ماں یا بہن سے ہم بستر ہو تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی کیونکہ عقد ایک طرح کا شبہ ہے (اور جہاں شبہ آجائے وہاں حد ختم ہو جاتی ہے)۔[1]

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اگر ایک شخص پر غسل جنابت فرض ہو اور وہ شراب سے بھرے ہوئے حوض کے کنارے جا کر سو جائے اور نیند کی حالت میں کروٹ لیتے ہوئے اس شراب کے حوض میں گر جائے تو جیسے ہی وہ حوض سے باہر نکلے گا جنابت سے پاک ہوگا۔

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ وضو[2] اور غسل[3] میں نیت واجب نہیں ہے جبکہ حدیث صحیح میں یہ کلمات منقول ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔[4]

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ سورۂ فاتحہ میں بسملہ پڑھنا فرض نہیں ہے۔[5]

ابو حنیفہ نماز میں بسملہ شریف کو حذف کر دیتے تھے جبکہ خلفاء نے تدوین قرآن کے وقت ہر سورت کے آغاز میں بسملہ کو لکھا تھا۔

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اگر مُردہ کتے کی کھال کو رنگا جائے تو وہ پاک ہو جائے گی۔ پھر اس کھال سے پانی پینا جائز ہے اور اسے نماز میں پہننا بھی حلال ہے۔[6]

ابو حنیفہ کا یہ فتویٰ نص کے صریح خلاف ہے کیونکہ نص میں کتے کو نجس العین کہا گیا ہے اور اس نص کا تقاضا ہے کہ اس کی کھال کو حرام سمجھا جائے۔

پھر شافعی عالم نے حنفی عالم سے کہا تم اپنی فقہ کی کیا بات کرتے ہو؟ جبکہ تمہاری فقہ میں تو یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ ایک مسلمان نماز کے لیے شراب سے وضو کر سکتا ہے اور اسے یہ اختیار ہے کہ ابتدا میں اپنے پاؤں دھوئے اور آخر میں اپنے دونوں ہاتھ دھوئے[7] اور وہ مُردہ کتے کی دباغت شدہ کھال پہن سکتا ہے[8] اور خشک شدہ نجاست پر سجدہ کر سکتا ہے اور اللّٰہ اکبر کے الفاظ کہنے کی بجائے اردو، فارسی وغیرہ میں اس کا ترجمہ کر سکتا ہے مثلاً "خدا بڑا ہے" یا "خدا بزرگ است" کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح سے عبرانی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کرنا صحیح ہے۔[9]

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۴۳۔ ۲۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۶۳۔
۳۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۱۸۱۔
۴۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۲۵۔ حلیۃ الاولیاء، ج ۹، ص ۳۳۲۔ سنن کبریٰ بیہقی ج ۱، ص ۴۱۔
۵۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۲۴۲۔ ۶۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۳۶۔
۷۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۶۸۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ص ۳۷۔
۸۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۲۶۔ ۹۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۲۳۰۔

سورۂ حمد پڑھنے کے بعد قرآن کی مختصر ترین آیت کا اردو میں ترجمہ کرسکتا ہے یعنی مُدْهَامَّتٰنِ (سورۂ رحمٰن، آیت ۶۴) کی بجائے "دو سبز پتے" کہہ سکتا ہے۔ پھر وہ رکوع میں جائے اور رکوع سے سر سیدھا کئے بغیر سجدے میں چلا جائے اور دونوں سجدوں کے درمیان ذرا سا سر اٹھائے۔ نہ سلام سے پہلے اپنے پیٹ کی ہوا خارج کرے تو اس کی نماز صحیح ہے لیکن اگر کوئی شخص جھوں کر پیٹ کی ہوا خارج کرے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔[1]

شافعی عالم نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جی ہاں مذہب حنفی میں یہ سب جائز ہے۔ اے اہل بصیرت! عبرت حاصل کرو۔ لوگو! خدارا بتاؤ کیا اس طرح سے ہمیں عبادت زیب دیتی ہے؟ اور کیا کسی پیغمبر کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنی امت کو اس طرح کی عبادت کرنے کا حکم دے۔ یقیناً یہ سب خدا و رسولؐ پر جھوٹ ہے۔

حنفی عالم جو کہ کافی دیر سے شافعی عالم کی گفتگو سن رہا تھا آخرکار غصہ ہو کر بولا "بس بس، بہت ہوگئی۔ خدا تیرے منہ کے ٹکڑے کرے۔ تو امام ابو حنیفہ پر اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہے۔ آخر تیری بساط ہی کیا ہے۔ تیرا مذہب کیا اور مذہب ابو حنیفہ کیا؟ تیرا مذہب تو مجوس سے ملتا جلتا ہے۔ اب میں تجھے تیرے اپنے ہی گلشن کی سیر کراتا ہوں۔ تیرے مذہب میں جائز ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بہن یا بیٹی سے جو کہ زنا سے پیدا ہوئی نکاح کرنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ اگر دو عورتیں زنا کی وجہ سے ایک دوسرے کی بہنیں ہوں تو وہ دونوں بہنیں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں آسکتی ہیں۔

علاوہ بریں زنا سے پیدا ہونے والا شخص اگر اپنی ماں سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے لیے حلال ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی شخص کی پھوپھی یا خالہ زنا سے پیدا ہوئی ہو تو بھی انسان اس سے نکاح کرسکتا ہے۔[2] جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیوں اور تمہاری خالائیں تم پر حرام کی گئی ہیں۔ (سورۂ نساء، آیت ۲۳) یہ وہ حقیقی صفات ہیں جو شریعت بدلنے سے نہیں بدلتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ بیان نوع کے لیے کسی لفظ کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو بھی اس کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عورت فلاں مرد کی بہن ہے یا بیٹی ہے مگر یہ زنا سے پیدا ہوئی ہے تو مقید زنا سے وہ بہن بیٹی کے حکم سے خارج نہیں ہو جاتی۔ وہ بدستور بہن اور بیٹی ہی رہتی ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ اس کی نسبی بہن ہے۔ اس طرح کی مقید وضاحت نوع کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے لیے امت کا اجماع ہے کہ جس پر بھی ماں، بہن اور بیٹی جیسے الفاظ کا اطلاق ہو وہ مرد پر

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱، ص ۳۰۷۔ ۲۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۳۶۔

حرام ہوتی ہے۔ اس طرح کے الفاظ اگر مجازی بھی ہوں تو بھی حرمت کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ تمہارے لیے تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں حرام کی گئی ہیں۔ لفظ اُمَّهٰت میں انسان کی حقیقی ماں بھی شامل ہے اور باپ کی ماں یعنی دادی بھی شامل ہے اور ماں کی ماں یعنی نانی بھی شامل ہے۔

اسی طرح سے بنات میں انسان کی حقیقی بیٹیاں نیز بیٹے کی بیٹیاں اور بیٹی کی بیٹیاں یعنی پوتیاں اور نواسیاں بھی شامل ہیں لیکن مذہب شافعی میں حرام سے پیدا ہونے والی بہن بیٹیاں حرام نہیں ہیں۔ لوگو! دیکھو کیا یہ مذہب مجوسیوں کے مذہب سے مشابہ نہیں؟!

اے شافعی! تم نے بہت زبان درازی کی ہے۔ سنو تمہارا امام وہ ہے جو شطرنج کھیلنا حلال سمجھتا ہے[1] جبکہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے "بت پرست کے علاوہ شطرنج سے کوئی محبت نہیں رکھے گا۔"

نیز امام شافعی رقص اور ساز کو حلال سمجھتے تھے۔ تیرے مذہب پر خدا کی مار! اس مذہب کے تحت انسان اپنی ماں بہن سے نکاح کرسکتا ہے اور شطرنج کھیل سکتا ہے اور بربط و رباب بجا سکتا ہے۔ کیا تیرے مذہب کے یہ فتوے خدا و رسولؐ کے خلاف جسارت نہیں۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس مذہب کو صرف وہی قبول کرسکتا ہے جس کا دل اندھا ہو۔"

یوحنا بیان کرتے ہیں کہ اس محفل میں مذاہب اربعہ کے پیروکاروں نے ایک دوسرے کی خوب خبر لی۔ درکھل کر ایک دوسرے کے عیوب بیان کئے اور یہ مباحثہ صرف حنفی اور شافعی تک محدود نہ رہا۔ مالکی اور حنبلی بھی آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔

حنبلی نے کہا کہ مالک نے بہت سی ایسی بدعات اختراع کی تھیں کہ ان جیسی بدعات کی وجہ سے اللہ نے کئی امتوں کو ہلاک کیا تھا۔ مالک نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ لڑکے اور غلام سے لواطت جائز ہے جبکہ رسول اکرمؐ کی صحیح حدیث ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ نے فرمایا تھا مَنْ لَاطَ بِغُلَامٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ جو شخص کسی لڑکے سے لواطت کرے تو فاعل مفعول دونوں کو قتل کر دو۔[2]

میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک مالکی نے دوسرے مالکی کے خلاف قاضی کے پاس نالش کی کہ جناب! میں نے اس سے ایک غلام خریدا ہے لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ لواطت نہیں کرنے دیتا۔

قاضی بھی مالکی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ غلام کے لیے عیب ہے اور اس غلام کو سابقہ مالک کو واپس کر دو اور وہ تمہیں رقم لوٹانے کا پابند ہے۔

۱۔ شافعی، کتاب الام ج ۶، ص ۲۰۸۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵، ص ۵۶۲۔

۲۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵، ص ۱۳۰۔

مالکی! کیا ایسا مذہب رکھ کر خدا کے حضور تمہیں شرمندگی نہیں ہوتی۔ پھر طرہ یہ کہ تم یہ دعویٰ بھی کرتے ہو کہ میرا مذہب تمہارے مذہب سے بہتر ہے۔ تمہارے امام صاحب تو کتے کے گوشت کو بھی حلال جانتے تھے۔ تمہارے مذہب پر خدا کی مار!!

مالکی نے چیخ کر کہا: اے تجسیم کے قائل۔ خاموش ہو جا۔ تم لوگ خدا کو جسم سے متصف سمجھتے ہو۔ تم لوگ حلول کا عقیدہ رکھتے ہو اور کہتے ہو کہ خدا بعض افراد میں حلول کرتا رہتا ہے۔ اے فاسق! تمہارا مذہب تو باعث ننگ ہے۔ امام احمد کہتے تھے کہ خدا جسم رکھتا ہے اور تخت پر بیٹھتا ہے اور اس کا جسم تخت سے چار انگلیوں کے برابر باہر لٹکا رہتا ہے اور خدا ہر شب جمعہ آسمان سے اتر کر زمین پر آتا ہے۔ اس وقت وہ بے ریش نوجوان کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کے بال گھنگریالے ہوتے ہیں۔ وہ مساجد کی چھتوں پر جاتا ہے۔ خدا کے جوتے کا تسمہ مروارید کا ہے اور اس کے گدھے کے لمبے لمبے بال ہیں۔[1]

یوحنا کا بیان ہے کہ اس کے بعد مذاہب اربعہ کے علماء نے مل کر ایک دوسرے کے عیوب بیان کئے اور ایک دوسرے کو سرعام اتنا برا بھلا کہا کہ وہاں پر موجود تمام افراد ان سے نفرت کرنے لگ گئے۔ عوام نے ان کی مذمت کی۔ اس وقت میں نے ان سے کہا: خدا کے واسطے پرسکون ہو جائیں۔ مجھے آپ کے عقائد سے سخت نفرت ہو چکی ہے۔ اگر اسی کا نام اسلام ہے تو پھر یہ ہماری بدبختی ہے۔ میں آپ صاحبان کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس موضوع کو ختم کریں اور چلے جائیں کیونکہ اب عوام کی نظروں میں آپ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔

یوحنا کہتا ہے کہ اس وقت وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے اور پورا ایک ہفتہ خاموش رہے۔ وہ پہلے تو اپنے گھروں سے ہی نہیں نکلتے تھے اور اگر نکلتے تھے تو عوام ان کی مذمت کرتے تھے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے باہمی تلخیاں فراموش کر دیں اور پہلے کی طرح سے آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور روزانہ "مستنصریہ" میں اکٹھے ہونے لگے۔

جب مذکورہ علماء کی آپس میں خوب گاڑھی چھننے لگی تو ایک دن میں ان کے پاس گیا اور میں نے بہت سے مسائل کے متعلق ان سے تبادلہ خیال کیا۔ اس دوران میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کسی شیعہ عالم کو یہاں بلالیں اور اس سے مناظرہ کریں۔

علماء نے کہا: یوحنا! رافضی ایک چھوٹا سا فرقہ ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو مسلمان کہلانا ہی پسند نہیں کرتا۔ ان کی تعداد انتہائی کم ہے جبکہ ان کے مخالف زیادہ ہیں اسی لیے وہ اپنی جان بچانے میں لگے

۱۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعہ ج ۲، ص ۵۰۹۔ آسمان دنیا پر خدا کے نزول کی روایات حسب ذیل کتابوں میں بھی موجود ہیں صحیح بخاری باب التہجد باللیل۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۱۳۰ اور ۳۳۶۔ ترمذی ج ۱، ص ۱۲۲۔

رہتے ہیں اور اپنے آپ کو منظرِعام پر لانا پسند نہیں کرتے۔ جب وہ اتنے خوفزدہ ہیں تو پھر وہ اپنے مذہب کو ثابت کرنے کے لیے مناظرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ روافض انتہائی کم ہیں اور ان کے مخالفین بہت زیادہ ہیں۔

یوحنا نے کہا آپ حضرات اس کی مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے تو ان کی مدح کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قلیت کی تعریف اور اکثریت کی مذمت کی ہے جیسا کہ ان آیات میں آیا ہے۔

۱۔ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ اور میرے بندوں میں شکرگزار تھوڑے ہیں۔ (سورۂ سبا ۱۳)

۲۔ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ اُن پر بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔ (سورۂ ہود، ۴۰)

۳۔ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ آپ ان کی اکثریت کو شکرگزار نہیں پائیں گے۔ (سورۂ اعراف ۱۷)

۴۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ. لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (سورۂ بقرہ ۲۴۳)

۵۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۂ انعام ۳۷)

۶۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ. لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ (سورۂ رعد ۱)

۷۔ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ. اگر آپ نے زمین پر رہنے والی اکثریت کی اطاعت کی تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ (سورۂ انعام ۱۱۶)

الغرض قرآن کریم میں اس طرح کی بہت سی آیات موجود ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اقلیت ہونا عیب نہیں ہے اور اکثریت میں ہونا کوئی فضیلت نہیں ہے۔

علماء نے کہا یوحنا! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم لوگ تو ان کی تلاش میں ہیں اور ہم انھیں اس لیے تلاش کر رہے ہیں کہ وہ ہمارے ہاتھ لگیں تو انھیں قتل کر دیں کیونکہ ہم انھیں کافر سمجھتے ہیں اور ان کے خون کو حلال سمجھتے ہیں۔ ہمارے کچھ علماء کا یہ فتویٰ ہے کہ ان کا مال لوٹنا حلال ہے اور ان کی عورتوں کو کنیز بنانا جائز ہے۔

یوحنا نے کہا اللہ اکبر! آپ نے تو بہت بڑی بات کہی ہے آخر آپ کو ان سے اتنی دشمنی کیوں ہے؟ کیا شیعہ توحید و نبوت کے منکر ہیں؟

انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔

یوحنا نے کہا کیا وہ قبلہ اسلام کی بجائے کسی دوسرے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔

یوحنا نے کہا کیا وہ نماز، روزہ، حج، زکات یا جہاد کے منکر ہیں؟

انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، زکات

دیتے ہیں اور جہاد میں بھی شامل ہوتے ہیں۔

یوحنا نے کہا تو کیا وہ قیامت، حشر نشر، صراط، میزان اور شفاعت کے منکر ہیں؟

انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ وہ ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

یوحنا نے کہا تو کیا وہ زنا، لواطت، شراب خوری، سود، جنگ و رباب کو جائز سمجھتے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ وہ ان تمام برائیوں کو حرام سمجھتے ہیں اور ان سے پرہیز کرتے ہیں۔

پھر یوحنا نے کہا اے علمائے اسلام! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ وہ لوگ کلمہ شہادتین پڑھتے ہیں اور قبلے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ ماہ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، قیامت اور حساب کے بھی قائل ہیں تو پھر ان کی جان، مال اور ناموس مباح کیوں ہے؟

حضرت رسول اکرمؐ نے تو فرمایا تھا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فَاِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَنِسَاءَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ وَ حِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ میں خدا کی طرف سے مامور ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہوں جب تک وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گواہی نہ دیں اور جب وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہہ دیں تو میری طرف سے ان کا خون، ان کا مال اور اُن کی ناموس محفوظ ہیں لیکن برقراری حق کا معاملہ مستثنیٰ ہے۔ ان کا حساب خدا کے ذمے ہے۔[1]

علماء نے جواب دیا کہ یوحنا! بات یہ ہے کہ انھوں نے دین میں کچھ بدعات رائج کی ہیں جن میں سے ایک بدعت یہ ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ رسول خداؐ کے بعد تمام لوگوں سے افضل ہیں اور وہ انھیں خلفائے ثلاثہ سے بھی افضل مانتے ہیں جبکہ صدر اسلام کے مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہوا تھا کہ قبیلہ تیم کے بزرگ حضرت ابوبکرؓ تمام خلفاء سے افضل ہیں۔

یوحنا نے کہا کہ اچھا آپ حضرات یہ بتائیں کہ اگر کوئی شخص حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکرؓ سے افضل مانے تو کیا وہ کافر بن جائے گا؟

علماء نے کہا جی ہاں! کیونکہ وہ اجماع کا مخالف ہے۔

یوحنا نے کہا اچھا آپ یہ فرمائیں کہ آپ کی نظر میں آپ کے محدث حافظ ابوبکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ کی کیا منزلت ہے؟

علماء نے کہا کہ وہ ثقہ تھے اور ان کی روایت صحیح اور مقبول ہے۔

یوحنا نے کہا کہ اسی ثقہ عالم نے اپنی کتاب المناقب میں رسول خداؐ سے یہ روایت نقل کی ہے

---

[1] صحیح مسلم ج ۱، ص ۵۱۔۵۳۔

کہ آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ خَیْرُ الْبَشَرِ وَمَنْ اَبٰی فَقَدْ کَفَرَ (علیؑ تمام لوگوں سے افضل ہیں اور جو اس بات کا انکار کرے وہ کافر ہے) تمام لوگوں میں کیا حضرت ابوبکر شامل نہیں ہیں؟

انھوں نے اپنی کتاب میں صحابی رسولؐ حضرت حذیفہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت علیؑ سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد میں ہی پوری امت سے بہتر ہوں اور اس مسئلے میں منافق کے سوا اور کوئی شک نہیں کرسکتا۔ اسی کتاب میں حضرت سلمان فارسیؓ سے منقول ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ خَیْرُ مَنْ اَخْلُفُهٗ بَعْدِیْ جن لوگوں کو میں اپنے بعد چھوڑ کر جارہا ہوں اُن میں علیؑ بن ابی طالب سب سے افضل ہے۔ اسی کتاب میں انس بن مالک سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اَخِیْ وَوَزِیْرِیْ وَ خَیْرُ مَنْ اَخْلُفُهٗ بَعْدِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ، میرا بھائی، میرا وزیر علیؑ بن ابی طالبؑ ہے اور جن لوگوں کو اپنے بعد چھوڑ کر جارہا ہوں علیؑ اُن میں افضل ہے۔

احمد بن حنبل آپ حضرات کے ایک امام تھے۔ انھوں نے اپنی مسند میں یہ حدیث لکھی ہے کہ رسول کریمؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؑ سے یہ فرمایا تھا: اَمَا تَرْضِیْنَ اَنِّیْ زَوَّجْتُکِ اَقْدَمَهُمْ سِلْمًا وَاَکْثَرَهُمْ عِلْمًا وَاَعْظَمَهُمْ حِلْمًا. بیٹی! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں نے تمہاری شادی اُس سے کی ہے جو میری امت میں سب سے پہلے مجھ پر ایمان لایا اور جو علم میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور بردباری میں سب سے عظیم ہے۔[1]

احمد بن حنبل نے مسند میں حدیث طیر کے ضمن میں لکھا ہے کہ نبی کریمؐ کے لیے ایک بھنا ہوا پرندہ تحفے میں لایا گیا۔ آپ نے دعا مانگی خدایا! جو تجھے میری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو اسے یہاں بھیج تاکہ وہ میرے ساتھ گوشت کھائے۔

رسول اکرمؐ کی دعا ختم ہوئی تو حضرت علیؑ دعا کا ثمر بن کر رسول خداؐ کے پاس آئے۔[2]

اس حدیث کو نسائی اور ترمذی نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔[3]

۱۔ مسند احمد ج ۵، ص ۲۵۔ طبرانی، معجم الکبیر ج ۴۰، ص ۲۲۹۔۲۳۰، حدیث ۵۲۸۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۰۲۔ کنز العمال ج ۱۱، ص ۶۰۵، حدیث ۳۲۹۴۳۔

۲۔ طبرانی، معجم الکبیر ج ۱، ص ۲۲۶، حدیث ۶۳۰۔ تاریخ بغداد ج ۹، ص ۳۶۹۔ کنز العمال ج ۱۳، ص ۱۶۷، حدیث ۳۶۵۰۷
یہ حدیث اتنی مشہور و معروف ہے کہ امام حاکم نیشاپوری حنفی ۵ جلدیں نے اس حدیث پر ایک کتاب فضل الطیر لکھی تھی۔ اس حدیث کے کچھ مصادر کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔

۳۔ صحیح ترمذی ج ۵، ح ۳۷۲۱۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۲۱۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۳۰۔ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح ج ۳، ص ۱۷۲۱، حدیث ۶۰۸۵۔ امام نسائی، خصائص امیرالمومنین ص ۳۳، حدیث ۱۲۔

اور اس میں شک نہیں کہ نسائی اور ترمذی آپ کے مشہور محدث تھے۔

اخطب خوارزم آپ کے مذہب کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "المناقب" میں معاذ بن جبل سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا یَا عَلِیُّ اَخْصَمُکَ فِی النُّبُوَّۃِ وَلَا نُبُوَّۃَ بَعْدِیْ وَتَخْصِمُ النَّاسَ بِسَبْعٍ فَلَا یُحَاجُّکَ اَحَدٌ مِنْ قُرَیْشٍ: اَنْتَ اَوَّلُھُمْ اِیْمَانًا بِاللّٰہِ، وَاَوْفَاھُمْ بِاَمْرِ اللّٰہِ وَبِعَھْدِہٖ، وَاَقْسَمُھُمْ بِالسَّوِیَّۃِ، وَاَعْدَلُھُمْ بِالرَّعِیَّۃِ، وَاَبْصَرُھُمْ بِالْقَضِیَّۃِ، وَاَعْظَمُھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عِنْدَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فِی الْمَنْزِلَۃِ اے علیؑ! میں نبوت کی وجہ سے برتر ہوں۔ میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ تمھیں سات امتیازات حاصل ہیں جن کی وجہ سے تم لوگوں سے برتر ہو۔ قریش میں ان جیسے امتیازات میں کوئی تمہارا شریک نہیں ہے۔[1]

۱۔ اللہ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے تم ہو۔
۲۔ اللہ کے حکم اور عہد کو سب سے بڑھ کر پورا کرنے والے تم ہو۔
۳۔ لوگوں کو برابری کی بنیاد پر حق دینے والے تم ہو۔
۴۔ رعیت کے ساتھ سب سے زیادہ عدل کرنے والے تم ہو۔
۵۔ مسائل کو سب سے زیادہ جاننے والے تم ہو۔
۶۔ معاملات میں سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والے تم ہو۔
۷۔ قیامت میں اللہ کے ہاں سب سے زیادہ مرتبہ رکھنے والے تم ہو۔

کتاب کفایۃ الطالب کے مؤلف بھی تو آپ کے ہم مسلک تھے۔ اس حدیث کے متعلق انھوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث بہترین اور بلند پایہ ہے۔

اس حدیث کو حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں بھی نقل کیا ہے۔[2]

اس کے بعد یوحنا نے کہا علمائے اسلام! یہ احادیث صحیح ہیں اور ان احادیث کو آپ کے مذہب کے مشہور ائمہ نے نقل کیا ہے اور ان تمام احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد حضرت علیؑ امت کے باقی لوگوں سے افضل تھے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ بیچارے شیعوں کا جرم کیا ہے؟! اور اگر تفضیل علیؑ جرم ہے تو یہ جرم شیعوں نے نہیں کیا۔ یہ جرم تو آپ کے علماء نے بھی کیا ہے۔ اگر وہ اس طرح کی احادیث نہ لکھتے تو شیعہ حضرت علیؑ کی تفضیل کا عقیدہ بھی نہ رکھتے۔

علماء نے کہا یوحنا! بات یہ ہے کہ ہمارے ائمہ حدیث نے بالکل صحیح احادیث لکھی ہیں لیکن یہ

۱۔ مناقب خوارزمی ص ۱۱۰، حدیث ۱۸۔ فرائد السمطین ج ۱، ص ۲۲۳، حدیث ۱۷۳۔

۲۔ کفایۃ الطالب ص ۳۷۰۔ حلیۃ الاولیاء ج ۱، ص ۶۵۔۶۴۔

احادیث محتاج تاویل ہیں اور دوسری احادیث سے معارض ہیں۔

یوحنا نے کہا سبحان اللہ! ان روایات میں تو تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ حافظ ابن مردویہ نے رسول خداؐ کی یہ حدیث لکھی ہے عَلِیٌّ خَیْرُ الْبَشَرِ (علی تمام انسانوں سے افضل ہیں) اور اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ افضل بشر ہیں تو پھر وہ حضرت ابوبکرؓ سے بھی افضل ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ حضرات یہ اعلان کر دیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو ہم بشر نہیں مانتے۔

اگر بفرض محال ہم یہ کہیں کہ ان احادیث سے تفضیل علیؑ ثابت نہیں ہوتی تو آپ حضرات مجھے یہ بتائیں کہ صحابہ میں سے سب سے زیادہ جہاد میں کس نے حصہ لیا تھا؟

اس کے جواب میں تمام علماء نے کہا کہ حضرت علیؑ نے سب سے زیادہ جہاد میں حصہ لیا تھا۔

یوحنا نے کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر سنو۔ خدا فرماتا ہے وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دی ہے اور اجر عظیم عطا کیا ہے۔ (سورۂ نساء: آیت ۹۵)

علماء نے کہا کہ بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ بھی تو مجاہد تھے لہٰذا اس آیت سے حضرت علیؑ کی اُن سے برتری ثابت نہیں ہوتی۔

یوحنا نے کہا کہ ایک وہ ہے جس نے جہاد میں کم حصہ لیا ہے اور ایک وہ ہے جس نے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جہاد میں کم حصہ لینے والا زیادہ حصہ لینے والے کے مقابلے میں گھر میں بیٹھنے والے کے برابر ہے اور اگر جہاد میں بالفرض دونوں مساوی بھی ہو جائیں تب بھی آپ یہ بتائیں کہ اُن میں سے افضلیت کا معیار کس چیز کو قرار دیا جائے گا؟

علماء نے کہا کہ اگر دو افراد جہاد میں مساوی ہوں تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اُن میں سے ذاتی اور اکتسابی کمالات و فضائل میں کون برتر ہے۔ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ علم و زہد اور شجاعت و شہامت اور جود و کرم میں کون زیادہ ہے اور جو ان صفات میں زیادہ ہوگا وہ افضل قرار پائے گا۔

یوحنا نے کہا اگر آپ کے پاس فضیلت کا یہی معیار ہے تو حضرت علیؑ ان تمام صفات میں دوسروں سے کہیں برتر تھے۔ اگر خاندانی عظمت معیار ہے تو حضرت علیؑ حضرت رسول خداؐ کے ابن عم اور داماد تھے نیز آنحضرتؐ کے دو فرزندوں حسنؑ و حسینؑ کے والد ماجد تھے۔ اور اگر معیار فضیلت علم ہے تو حضرت علیؑ ہی سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔[1]

۱۔ ابن جریر طبری نے اس حدیث کو "مسند علی" میں نقل کیا ہے علاوہ ازیں یہ حدیث حسب ذیل کتابوں میں بھی مرقوم ہے۔ تہذیب الآثار ص ۱۰۵، حدیث ۱۳۴۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۲۶۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۱۴۔ طبرانی، معجم الکبیر ج ۱۱،

عقل کا فیصلہ ہے کہ شہر میں داخل ہونے کے لیے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے لہٰذا اگر کسی نے رسول مقبولؐ کے علم سے استفادہ کرنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے دروازے سے داخل ہو اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنے علم کا دروازہ حضرت علیؑ کو ہی مقرر کیا تھا۔

حضرت علیؑ کی افضلیت نبی اکرمؐ کے اس فرمان سے بھی ثابت ہوتی ہے آپ نے فرمایا تھا اَلْقَضَائُکُمْ عَلِیٌّ (تم سب میں سے بڑے قاضی حضرت علیؑ ہیں)۔[1]

یہی وجہ ہے کہ تمام معاملات حضرت علیؑ کی طرف آج تک پلٹائے جاتے ہیں۔ تمام گروہ آپ کی ذات تک ہی پہنچتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رسول خداؐ کے بعد تمام فضائل کا منبع تھے۔ آپ نے سب سے پہلے فضائل کا سفر کیا تھا اور آپ نے سب سے پہلے فضائل پائے تھے۔ جسے بھی کوئی نہ کوئی فضیلت ملی ہے وہ آپ ہی کے دم قدم سے اسے نصیب ہوئی ہے۔ آپ تمام لوگوں کے لیے نمونے کا درجہ رکھتے تھے۔

آپ حضرت یہ جانتے ہیں کہ تمام علوم میں سے افضل علم معرفت الٰہی ہے اور معرفت الٰہی کے متعلق پوری دنیا آپ کے خرمن کی خوشہ چین ہے۔

معتزلہ علم کلام کے ماہر تھے۔ انھوں نے الٰہیات کے مسائل واصل بن عطاء سے حاصل کیے تھے اور واصل بن عطاء ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ کا شاگرد تھا۔[2]

ابو ہاشم عبداللہ نے الٰہیات کے مسائل اپنے والد جناب محمد بن حنفیہ سے حاصل کیے تھے اور جناب محمد بن حنفیہ نے یہ مسائل اپنے والد گرامی قدر حضرت علیؑ سے حاصل کیے تھے اشعریوں کا سلسلہ ابوالحسن اشعری پر منتہی ہوتا ہے اور وہ ابوعلی جبائی کے شاگرد تھے اور وہ واصل بن عطاء کے شاگرد تھے۔[3]

امامیہ اور زیدیہ کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ دونوں مذاہب حضرت علیؑ کی ذات والا صفات پر منتہی ہوتے ہیں اور جہاں تک علم فقہ کا تعلق ہے تو اس علم کے مؤسس بھی حضرت علیؑ تھے۔ اسلام کے ہر فقیہ نے ان سے اپنا انتساب کیا ہے۔

ص ۶۵۔۶۶، حدیث ۳۲۹۷۷، ۳۲۹۷۸۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۳۔ یہ حدیث اتنی مسند اور مشہور ہے کہ حافظ مغربی نے اس پر پوری کتاب لکھی اور اس کا نام المناقب العلی بصحۃ حدیث باب مدینۃ العلم علیؑ رکھا۔

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۳۳۵۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۳۔ مناقب خوارزمی ص ۸۱، ح ۶۶۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵، ص ۱۱۳۔

۲۔ جناب محمد بن حنفیہ امام علیؑ کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ کا نام خولہ حنفیہ تھا۔ ان کا لقب محمد اکبر اور کنیت ابو القاسم تھی۔ ان کی وفات ۸۱ھ یا ۹۹ھ میں ہوئی تھی۔ کیسانیہ ان کی امامت کے قائل تھے۔ تنقیح المقال مامقانی ج ۳، ص ۲۱۲۔ (واضح رہے کہ علامہ عسکری کی تحقیق کے مطابق کیسانیہ ایک کاغذی فرقہ ہے۔ تاریخ میں یہ فرقہ کبھی موجود ہی نہیں رہا)۔

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۵۔

امام مالک نے فقہ کا علم ربیعۃ الرائے سے لیا تھا اور انھوں نے یہ علم عکرمہ سے لیا تھا اور عکرمہ نے یہ علم ابن عباسؓ سے لیا تھا اور ابن عباسؓ حضرت علیؑ کے شاگرد تھے۔ امام ابو حنیفہ نے علم فقہ امام صادقؑ سے لیا تھا اور امام شافعی امام مالک کے شاگرد تھے اور امام حنبل امام شافعی کے شاگرد تھے۔ الغرض تمام فقہاء کے سورث اعلیٰ حضرت علی علیہ السلام تھے۔[1]

مذاہب اربعہ کے علاوہ شیعوں کے دینی مرجع بھی تو آپ ہیں اور ابن عباسؓ جیسے صاحب بصیرت انسان کے استاد بھی آپ ہی تھے۔ حضرت عمرؓ نے تو کئی بار اعلان کیا تھا کہ علیؑ کی موجودگی میں کسی کو مسجد میں بیٹھ کر فتویٰ دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ نے کئی بار یہ کہا تھا کہ خدا مجھے کسی مشکل مسئلے کے لیے زندہ نہ رکھے جب بیان کرنے کے لیے علیؑ موجود نہ ہوں۔[2] نیز حضرت عمرؓ نے کئی بار کہا تھا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ یعنی اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔[3]

ترمذی نے اپنی صحیح میں اور بغوی نے حضرت ابوبکرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: "جو فضل آدمؑ کو اس کے علم میں، نوحؑ کو اس کی فہم میں، یحییٰؑ بن زکریاؑ کو ان کے زہد میں، ابراہیمؑ کو ان کے حلم میں، موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں اور عیسیٰؑ کو ان کی عبادت میں دیکھنا چاہے تو وہ علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیکھ لے۔"[4]

بیہقی نے اس حدیث کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے: "جو آدمؑ کو اس کے علم میں، نوحؑ کو اس کے تقویٰ میں، ابراہیمؑ کو ان کے علم میں، موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں اور عیسیٰؑ کو ان کی عبادت میں دیکھنا چاہے تو وہ علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیکھے۔[5]

حضرت علیؑ نے ہی شرابی کی حد بیان کی تھی۔[6]

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۱۷۔ ۱۸۔

۲۔ مناقب خوارزمی ص ۹۶۔ ۹۷، ح ۹۷۔ ۹۸۔ فرائد السمطین ج ۱، ص ۳۳۳۔ ۳۳۵، ح ۲۶۶۔ ۲۶۷۔

۳۔ فیض القدیر ج ۴، ص ۳۵۷۔ فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ ج ۲، ص ۳۰۹۔ عبدالرحمن الشرقاوی، علی امام المتقین ج ۱، ص ۱۰۱۔ مناقب ابن شہر آشوب ج ۲، ص ۳۶۱۔

۴۔ البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۳۵۹۔ کفایۃ الطالب ص ۱۲۱۔

۵۔ کنز العمال ص ۳۲۹۔ الریاض النضرۃ ج ۲، ص ۲۱۸۔ کفایۃ الطالب ص ۱۲۲۔ الغدیر ج ۳، ص ۳۵۳۔

۶۔ موطا امام مالک ج ۲، ص ۸۳۲، ح ۲۔ مستدرک ج ۴، ص ۳۷۵۔ فضائل الخمسہ ج ۲، ص ۳۱۰۔

آپ نے ہی اس عورت کا فیصلہ کیا تھا جس کو نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ ہوا تھا۔[1]
آپ نے ہی آٹھ روٹیوں اور آٹھ درہموں کا فیصلہ کیا تھا۔[2]
آپ نے ہی دوسر والے بچے کا فیصلہ کیا تھا۔[3]
آپ نے ہی باغیوں کے احکام بیان کئے تھے۔[4]
آپ نے ہی حاملہ زانیہ کے متعلق فیصلہ صادر کیا تھا۔[5]
آپ نے ہی ایک بچے کی دعویدار دو عورتوں کے درمیان فیصلہ دیا تھا کہ اس کے دو ٹکڑے کرتے ہیں اور ہر عورت کو آدھا آدھا دے دیتے ہیں۔ جو اُن میں سے حقیقی ماں تھی وہ تڑپ اٹھی اور اس نے کہا کہ مولا! بچے کو قتل نہ کریں بچہ میرا نہیں اس عورت کا ہے۔ حضرت علیؑ نے بچے کو، اٹھایا اور عورت کے سپرد کر دیا اور فرمایا جو حقیقی ماں تھی اسے بچے کا درد محسوس ہوا اور وہ اپنے حصے سے دستبردار ہو گئی۔[6]

علوم میں سے ایک علم تفسیر بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ بہت بڑے مفسر تھے لیکن یہی ابن عباسؓ حضرت علیؑ کے شاگرد تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ تمہارے اور حضرت علیؑ کے علم کا تناسب

۱۔ ایک عورت کو حضرت عثمانؓ کے پاس لایا گیا جس نے نکاح کے چھ ماہ بعد بچے کو جنم دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اُس پر حد جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اس پر کوئی حد واجب نہیں کیونکہ چھ ماہ کا زندہ سلامت بچہ پیدا ہو سکتا ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا یعنی اُس کی حمل اور دودھ چھانے کی مدت تیس ماہ ہے۔ (سورۂ احقاف آیت ۱۵) پھر آپ نے فرمایا کہ دو سال یعنی چوبیس ماہ تو دودھ پینے کی مدت ہے۔ اگر تیس میں سے چوبیس نکال دیئے جائیں تو باقی چھ بچ جاتے ہیں اور یہ چھ ماہ مدت حمل قرار پاتی ہے۔ (الاستیعاب ج ۳، ص ۱۱۰۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۹۔ تفسیر قرطبی ج ۱۶، ص ۱۹۰ در ضمن آیت وحملہ وفصالہ ثلاثون شہرا)

۲۔ الاستیعاب ج ۳، ص ۱۱۰۵۔ فضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ ج ۲، ص ۳۰۲۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۳۔ صواعق محرقہ ص ۷۷۔

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۹، ص ۳۳۱۔ کتاب الامام ج ۴، ص ۲۳۳۔

۴۔ باب المدینۃ شاگرد کہتے تھے کہ ہم نے باغیوں کے احکام حضرت علیؑ سے حاصل کئے تھے۔

۵۔ ایک عورت کو حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا جس کا ابھی نکاح نہیں ہوا تھا مگر وہ حاملہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت علیؑ نے مخالفت کی اور فرمایا کہ تم عورت کو سزا دینے کے مجاز ہو لیکن اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اُس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُس عورت کو جانے دیا۔ حضرت عمرؓ نے بے ساختہ کہا: لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔ الریاض النضرۃ ج ۲، ص ۱۹۴۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۱۔ مطالب السؤول ص ۱۳۔ مناقب خوارزمی ص ۴۸۔ الاربعین از فخر الدین رازی ص ۳۶۹۔ الغدیر ج ۶، ص ۱۱۰۔

۶۔ کنز العمال ج ۳، ص ۱۷۹۔ بحار الانوار ج ۴۰، ص ۲۵۷۔

کیا ہے؟ ابن عباسؓ نے کہا: میرے علم کی حیثیت ایک قطرے کی ہے جبکہ حضرت علیؑ کا علم پورے سمندر کے برابر ہے۔[1]

ایک اسلامی علم کا نام "علم طریقت و حقیقت" ہے اور صوفیہ اپنا انحاق حضرت علیؑ سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ابوبکر شبلی، سری سقطی، بایزید بسطامی، معروف کرخی اور دوسرے صوفیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا سلسلہ حضرت علیؑ سے ملتا ہے۔ ہر پیر کامل اپنے مرید کو خرقہ پہناتا ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ خرقہ کا تعلق حضرت علیؑ سے ہے۔ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو فقر کا خرقہ پہنایا تھا جو جبریل امینؑ لائے تھے۔[2]

"علم نحو" عربی زبان کے اعراب کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ علم حضرت علیؑ کا سکھایا ہوا ہے۔ آپ نے ابوالاسود دوئلی کو اس کے اصول و قواعد لکھوائے تھے۔ آپ نے علم نحو کے لیے ایسے اصول بیان فرمائے تھے جنھیں معجزاتی کہا جاسکتا ہے کیونکہ عام انسانی ذہن اس طرح کے استنباط سے قاصر ہے۔

بتایئے کیا اتنے بڑے عالم کا موازنہ اس سے کیا جاسکتا ہے جسے لفظ اَبّا کے معانی معلوم نہیں تھے اور جب ان سے اس کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنی رائے سے قرآن کریم کی تفسیر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حضرت علیؑ جیسے عالم کا بھلا اس سے کیا موازنہ کیا جاسکتا ہے جسے دادا اور دادی کی میراث کے حصے کا بھی علم نہیں تھا؟ کیا حضرت علیؑ جیسے صراط مستقیم کے ہادی کا مقابلہ اس سے کیا جاسکتا ہے جس نے اپنی پہلی تقریر میں یہ کہا تھا کہ اگر میں سیدھے راستے پر چلوں تو میری پیروی کرنا اور اگر میں غلط راستے پر چلوں تو تم مجھے سیدھا کر دینا؟

حضرت علیؑ کا تو علم اتنا وسیع تھا کہ انھوں نے فرمایا تھا: سَلُونِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تم مجھے نہ پاؤ۔

حضرت علیؑ نے فرمایا تھا سَلُونِیْ عَنْ طُرُقِ السَّمَاءِ فَوَاللّٰہِ لَاَنَا اَعْلَمُ بِھَا مِنْ طُرُقِ الْاَرْضِ تم مجھ سے آسمانی راستے پوچھو۔ خدا کی قسم! میں انھیں زمینی راستوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ آپ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے: اِنَّ ھٰھُنَا لَعِلْمًا جَمًّا یہ سینہ علم کا مخزن ہے۔

---

[1] نہج الحق و کشف الصدق ص ۲۳۸، ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۹۔

حسن بصری ۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور وادی القریٰ میں پلے بڑھے۔ پھر وہ ۳۷ھ میں مدینہ واپس آگئے۔ مدینہ میں ایک سال قیام کرنے کے بعد وہ بصرہ چلے گئے تھے جبکہ امام علیؑ کی خلافت ۳۶ھ سے ۴۰ھ تک قائم رہی تھی۔ اس دوران حسن بصری اور امام علیؑ کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس حقیقت سے یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ امام علیؑ نے حسن بصری کو تصوف کا خرقہ پہنایا تھا۔ نیز یہ کہ اس وقت حسن بصری کی عمر اس لائق نہیں تھی کہ امام علیؑ انھیں تصوف کی تعلیم دیتے۔

(علامہ ہاشم معروف حسنی کی کتاب تصوف اور تشیع کا فرق مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

آپ اپنے کمال یقین کو ان الفاظ سے بیان کرتے تھے لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا اگر حجاب اٹھا دیئے جائیں تو بھی میرے یقین میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا۔[1]

ان تمام حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اَعْلَمُ النَّاس تھے۔

حضرت علیؑ زہد و کرم میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ تمام زاہدوں کے سردار اور ہر کریم کے رہنما تھے۔ آپ نے کبھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تھا اور آپ نے ہمیشہ چھوٹا موٹا لباس پہنا تھا۔

علی بن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ میں عید کے دن حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے لیے ایک مہر بند برتن لایا گیا۔ اس میں آپ کے لیے طعام رکھا ہوا تھا۔ جب آپ نے مہر توڑی تو میں نے دیکھا کہ اس برتن میں جو کی خشک روٹی تھی۔

میں نے آپ سے عرض کیا کہ مولا! جو کی خشک روٹی پر مہر لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

آپ نے فرمایا اس لئے کہ حسنینؑ اس میں گھی نہ ملا دیں۔[2]

آپ کے لباس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ آپ کا جوتا انتہائی کم قیمت ہوتا تھا اور جب وہ پھٹ جاتا تو آپ دست مبارک سے اسے گانٹھا کرتے تھے۔ اگر آپ کی قمیص کی آستین لمبی ہوتی تو آپ اسے اپنی تلوار سے کاٹ دیتے تھے اور دوبارہ سلوانے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ آپ کا سالن صرف سرکہ یا نمک ہوتا تھا۔ اگر کبھی آپ زیادہ تکلف کرتے تو اس کے ساتھ کچھ سلاد یا اونٹنی کے دودھ کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ آپ گوشت بہت کم کھایا کرتے تھے اور آپ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ اپنے شکم کو جانوروں کا قبرستان مت بناؤ۔ اس کے باوجود بھی آپ تمام لوگوں سے زیادہ طاقتور تھے۔[3]

جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو چشم فلک نے آپ سے بڑا عبادت گزار نہیں دیکھا۔ لوگوں نے نماز شب اور مناجات سحر گاہی حضرت سے ہی یاد کی تھیں۔ آپ کی پیشانی پر کثرت سجود کی وجہ سے داغ پڑ گئے تھے۔ آپ کی عبادت کی انتہا یہ ہے کہ جنگ صفین کے دوران لیلۃ الہریر میں جبکہ ساری رات نیزوں پہ نیزے اور تلواروں پر تلواریں کھنک رہی تھیں آپ نے نماز تہجد ترک نہیں کی تھی۔ آپ نے لشکر کے درمیان مصلیٰ بچھایا اور جنگ سے بے پروا ہو کر نماز شروع کر دی۔ تیر آپ کے دائیں بائیں گزرتے رہے لیکن آپ تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔

اگر آپ امیرالمومنین کی مناجات کو پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ خشوع و خضوع کے

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۷، ص ۱۵۳۔ دیگر تائید کے لیے کتاب ہذا کے دوسرے صفحات کی طرف رجوع فرمائیں

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۷، ص ۱۵۳۔ اس کے مزید تائید پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۹۔

اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے اور آپ کی دعائیں آپ کے اخلاص قلب کی مظہر ہیں۔

امام زین العابدین ہر رات ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اس کے باوجود آپ فرماتے تھے کہ میں کہاں اور امیرالمومنینؑ کی عبادت کہاں؟[1]

آپ امیرالمومنینؑ کو میدان شجاعت میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ سے بڑا مرد میدان آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ کی وجہ سے لوگوں کو دنیا کے پہلے مشہور سورماؤں کے نام بھول گئے اور بہادری میں قیامت تک آپ ضرب المثل بن گئے۔ آپ اتنے بڑے بہادر تھے کہ آپ زندگی میں کبھی میدان جنگ سے بھاگے نہیں اور بڑے سے بڑے لشکر سے آپ کبھی ڈرے نہیں۔ آپ نے جس سے بھی مقابلہ کیا اسے موت کے گھاٹ اتارا اور آپ کو کبھی دوسری ضرب مارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

روایات میں مذکور ہے کہ اگر آپ تلوار بلند کر کے حریف پر حملہ کرتے تو اس کے جسم کے دو حصے کر دیتے تھے۔ اگر آپ ہاتھ درمیان میں رکھتے تو حریف کو درمیان سے برابر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ ہمیشہ ایک ہی ضرب مارنے کے عادی تھے۔[2]

جب مشرکین آپ کو لشکر میں دیکھتے تھے تو ان کے چھکے چھوٹ جاتے تھے اور میدان ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے تھے۔ حضرت کی تلوار سے دین کے ستون قائم ہوئے اور ارکان اسلام کو تقویت ملی۔ آپ کے انداز جنگ کو دیکھ کر ملائکہ حیرت میں پڑ جاتے تھے۔

جنگ بدر اسلام اور کفر کی پہلی جنگ تھی۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد کم اور کفار کی تعداد کم از کم دو تہائی زیادہ تھی مگر اس جنگ میں آپ نے مجاہدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے کفار کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ آپ نے اس جنگ میں ولید بن عتبہ، عاص بن سعید اور نوفل بن خویلد جیسے پہلوانوں کو جہنم واصل کیا تھا۔ واضح رہے کہ نوفل بن خویلد وہی تھا جو ہجرت سے پہلے حضرت ابوبکر و طلحہ کو پکڑ کر اذیتیں دیا کرتا تھا۔ رسول کریمؐ نے نوفل کے قتل کی خبر سن کر فرمایا میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اس کے متعلق میری بددعا قبول فرمائی۔[3]

جنگ بدر میں ستر کافر قتل ہوئے تھے جن میں سے پینتیس کو تن تنہا حضرت علیؑ نے قتل کیا تھا۔ باقی پینتیس افراد کو تین سو بارہ مجاہدین اور تین ہزار فرشتوں نے مل کر قتل کیا تھا۔[4]

۱۔ ارشاد مفید ص ۲۵۶۔ اعلان الوریٰ ص ۲۵۵۔ بحار الانوار ج ۲۶، ص ۷۳، حدیث ۶۲۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۰۔

۳۔ مغازی واقدی ج ۱، ص ۶۲۔

۴۔ مغازی واقدی ج ۱، ص ۱۴۷، ۱۵۲۔ ارشاد مفید ص ۳۱۔۳۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۳۔

جبریل امینؑ نے آپ کی جنگ کو دیکھ جنگ احد میں یہ ندا دی تھی۔

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَار وَلَا فَتٰی اِلَّا عَلِی

ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں ہے[1]

جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی اور انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ رسول خداؐ ایک گڑھے میں گر گئے تھے۔ آپ کے دندان مبارک زخمی ہو گئے تھے۔ آپ کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نازک موقع پر حضرت علیؑ ہی تھے جنھوں نے شمع نبوت کی حفاظت کی تھی۔ جب پیغمبر اکرمؐ کو ہوش آیا تو آپ نے دیکھا کہ صحابہ موجود نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان کہاں چلے گئے؟ حضرت علیؑ نے عرض کیا انھوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا اور بھاگ گئے۔

اتنے میں آنحضرتؐ نے خون کے پیاسے کافروں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو حضرت علیؑ سے فرمایا ان لوگوں کو مجھ سے دور کرو۔ حضرت علیؑ نے بڑھتے ہوئے کفار پر حملہ کیا اور انھیں بھگا دیا۔ الغرض لشکر کفار نے کئی بار آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار حضرت علیؑ حملہ کر کے آپ کا دفاع کرتے رہے۔ پھر آپ نے بھاگنے والے مسلمانوں کو صدا دی کہ لوٹ آؤ۔ محمدؐ نہ تو مرے ہیں اور نہ قتل ہوئے ہیں۔ واپس آجاؤ۔

الغرض کافی دیر کے بعد کچھ افراد واپس آئے۔ اُس وقت جبریل امینؑ نے رسول خداؐ سے کہا کہ یہ ہے حقیقی وفاداری جسے علیؑ نبھا رہے ہیں اور ملائکہ اُن کی وفاداری پر رشک کر رہے ہیں؟

رسول خداؐ نے فرمایا کہ ایسا کیوں نہ ہو علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔[2]

احد کے ہنگامہ دار و گیر میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت میدان چھوڑ گئی تھی حضرت علیؑ نے کوہ استقامت بن کر داد شجاعت دی تھی۔ حضرت عثمانؓ میدان سے بھاگے تھے تو تین دن کے بعد مدینہ واپس آئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو رسول خداؐ نے فرمایا لَقَدْ ذَهَبْتُ بِهَا عَرِيضَةً تم نے راہ فرار کو کتنا کشادہ پایا۔[3]

۱۔ مناقب خوارزمی ص ۱۶۷، ح ۱۸۰۔ مناقب ابن مغازلی ص ۱۹۸۔۱۹۹، ح ۲۳۵۔ کفایۃ الطالب ص ۲۷۷۔ طبری ج ۲، ص ۱۹۷۔ سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۵۲۔ سنن نسائی ج ۳، ص ۹۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳۲۰۵۔ الریاض النضرۃ ج ۳، ص ۱۵۵۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۳۔ میزان الاعتدال ج ۲، ص ۳۱۷۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۹۔

۲۔ ذخائر العقبیٰ ص ۶۸۔ فضائل الصحابہ از احمد بن حنبل ج ۲، ص ۵۹۳، ح ۱۰۰۰۔ مجمع الزوائد ج ۶، ص ۱۱۳۔ نہج الحق و کشف الصدق ص ۳۳۹۔

۳۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۰۳۔ الکامل فی التاریخ از ابن اثیر ج ۲، ص ۱۱۰۔ سیرت حلبیہ ج ۲، ص ۲۲۷۔ البدایہ والنہایہ ج ۴، ص ۲۸۔ سیرت ابن کثیر۔ در منثور ج ۲، ص ۸۹۔

پھر یوحنا نے کہا کہ اگر آپ حضرات نے حضرت علیؑ کی شجاعت کا مشاہدہ کرنا ہے تو پھر غزوہ احزاب کے حالات پر نظر کریں۔ عرب کے تمام قبائل نے مل کر مدینہ کا محاصرہ کیا تھا اور ان حالات میں مسلمان سخت پریشان تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ○ جب وہ تمہارے اوپر اور تمہارے نیچے کی طرف سے (چڑھ) آئے تھے اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور دل خوف کے مارے حلق میں اٹک چکے تھے اور تم خدا کی نسبت مختلف گمان کر رہے تھے۔ (سورۂ احزاب آیت ۱۰)

ابوسفیان اس جنگ میں مشہور عرب سورما عمرو بن عبدود کو بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ایک ہزار آدمیوں سے تن تنہا جنگ کرتا تھا۔ اس نے خندق کو عبور کیا اور خیمہ رسولؐ کے سامنے آکر مبارز طلب ہوا مگر کسی کو اس کے مقابلے پر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت علیؑ اس سے مقابلے کے لیے نکلے تو خود رسول خداؐ نے آپ کو اپنی دستار باندھی اور تلوار ہاتھ میں دی۔ جب آپ نے عمرو سے جنگ کی اور اسے قتل کیا تو رسول خداؐ نے فرمایا تھا ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ جنگ خندق کے دن علیؑ کا ایک وار جن وانس کی قیامت تک کی عبادت سے افضل ہے۔[1]

اس کے بعد یوحنا نے کہا علمائے دین! ذرا انصاف سے بتائیں کہ جب عہد نبوی میں حضرت علیؑ خون کا دریا عبور کر کے اسلام کو بچانے میں مصروف تھے اس وقت اصحاب خلافہ کہاں تھے؟

اس کے بعد یوحنا نے کہا کہ اگر آپ حضرات واقدی اور بلاذری کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت علیؑ نے جہاد کے میداں میں کس طرح داد شجاعت دی تھی۔ بدر، احد، احزاب کے میدان ضرب حیدری کے گواہ ہیں اور خیبر کے اس دروازے کو آپ نے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا جسے متعدد آدمی کھولتے اور بند کرتے تھے۔ الغرض حضرت علیؑ کی شجاعت آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔

ابوبکر انباری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ، حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ جب آپ اٹھ کر گئے تو حاضرین میں سے کسی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ نے دیکھا علیؑ خود پر کتنا ناز کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا اگر وہ ناز کریں تو بجا ہے۔ اگر علیؑ کی تلوار نہ ہوتی تو اسلام قائم نہ ہوتا اور اس وقت علیؑ سب سے بڑے عالم ہیں اور ان کی اسلامی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔

جب اس شخص نے حضرت عمرؓ سے حضرت علیؑ کی تعریف سنی تو بولا پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے انھیں خلافت نہیں دی؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہمیں اگر علیؑ سے اختلاف ہے تو صرف اس

۱۔ واقدی، مغازی ج ۲، ص ۴۷۰ تا ۴۷۲۔

باتوں پر ہے۔

۱۔ یہ ابھی دوسروں سے کم سن ہیں۔

۲۔ انھیں خاندان عبدالمطلب سے زیادہ محبت ہے۔

۳۔ ان کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ معزول ہوئے تھے اور علیؑ نے سورۂ برأت کی تبلیغ کی تھی۔

حضرت علیؑ کی دلیری کا ایک اور واقعہ جنگ صفین سے متعلق ہے جنگ صفین میں حضرت علیؑ نے معاویہ کو پیغام بھیجا کہ فوجوں کو لڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ آؤ ہم تم آپس میں جنگ کریں تاکہ ہماری وجہ سے دوسرے لوگ نہ مریں۔ جب یہ پیغام معاویہ کو ملا تو اس وقت عمرو بن عاص معاویہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا: معاویہ! علی نے بڑے انصاف کی بات کی ہے۔ معاویہ نے کہا کہ تو نے آج تک جو بھی مشورہ دیا ہے وہ خیرخواہی پر مبنی ہوتا تھا لیکن آج کا مشورہ بالکل غلط ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں ابوالحسن سے دست بدست جنگ کروں حالانکہ تو ان کی شجاعت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تیرے دل میں بھی خلافت کی آرزو مچل رہی ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں مارا جاؤں اور تو شام پر حکومت کرے۔[1]

جس بھی قبیلے کے آدمی نے حضرت علیؑ سے جنگ کی تھی آج تک اس کا قبیلہ فخر کرتا ہے کہ ان کے ایک آدمی نے حضرت علیؑ سے مقابلہ کیا تھا اور حضرت علیؑ نے اسے قتل کیا تھا۔

عرب دنیا میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ یہاں ہم عمرو بن عبدود کی بہن عمرہ کا جس کی کنیت ام کلثوم تھی وہ مرثیہ بیان کرتے ہیں جو اس نے اپنے بھائی کی موت پر کہا تھا۔ اس نے کہا تھا:

لَوْ كَانَ قَاتِلُ عَمْرٍو غَيْرَ قَاتِلِهِ ... بَكَيْتُهُ أَبَدَ مَا عِشْتُ فِي الْأَبَدِ

لَكِنْ قَاتِلُهُ مَنْ لَا نَظِيرَ لَهُ ... قَدْ كَانَ أَلْوَهُ يُدْعَى نِصْفَ الْبَلَدِ

اگر عمرو کا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں جب تک زندہ رہتی اس پر روتی رہتی لیکن اس کا قاتل وہ ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اس کے والد کو "شیخ بطحا" کہا جاتا تھا۔[2]

یہ حقیقت ہے کہ ہر سورما خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں وہ آج تک آپ پر فخر کرتا ہے۔

حضرت علیؑ کے جود و سخا کی تو مثال ہی نہیں ملتی۔ آپ کی سخاوت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ نے اور آپ نے خاندان نے تین دن روزے رکھے تھے۔ پہلے دن افطار کا وقت ہوا تو در

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۰۔ ج ۸، ص ۵۳۔

۲۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳۲۔ الفصول المہمہ از ابن صباغ مالکی ص ۶۲۔ شیخ مفید، ارشاد ج ۱، ص ۱۰۸۔ ابن منظور، لسان العرب ج ۷، ص ۴۲۷۔

اہلبیتؑ پر سائل آیا اور پکارا کہ اے آل محمدؐ! میں مسکین ہوں، مجھے کھانا کھلاؤ۔ اہلبیت رسولؐ اور اس گھر کی خادمہ جناب فضہؑ نے روٹیاں اٹھا کر دے دیں اور پانی سے افطار کیا۔ دوسرے دن ایک یتیم آیا۔ آل محمدؐ نے اپنی روٹیاں اسے دے دیں اور خود پانی سے افطار کیا۔ تیسرے دن بھی دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی نے کہا کہ آل محمدؐ! میں قیدی ہوں مجھے کھانا کھلاؤ۔ آل محمدؐ نے اس دن بھی تمام روٹیاں سائل کو دے دیں۔ اللہ تعالیٰ کو اہلبیتؑ کا ایثار اتنا پسند آیا کہ اس نے سورۂ دہر کی یہ آیت نازل فرمائی: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○ وہ اس کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

حضرت علیؑ نے حالت رکوع میں ایک انگوٹھی رکات میں دی تھی۔ اللہ کو آپ کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ یہ آیت نازل فرمائی. إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ تمہارا ولی بس اللہ اور اس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۵۵)

ایک مرتبہ آپ کے پاس چار درہم تھے۔ آپ نے ایک درہم رات کے وقت صدقے میں دیا اور ایک درہم دن کے وقت صدقہ کیا۔ ایک درہم چھپا کر دیا اور ایک درہم علانیہ دیا۔ آپ کا یہ صدقہ خدا کو اتنا پسند آیا کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی. الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وہ جو اپنے مال کو رات اور دن میں اور چھپا کر اور کھل کر خرچ کرتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۴)
اللہ تعالیٰ نے آیت نجویٰ نازل فرمائی اور حکم دیا کہ جس نے بھی رسول خداؐ سے سرگوشی کرنا ہو وہ سرگوشی سے پہلے صدقہ دے۔ حضرت علیؑ نے صدقہ دیا اور متعدد بار آنحضرتؐ سے سرگوشی کی۔ اس آیت پر حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور نے عمل نہیں کیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو ہی منسوخ کر دیا۔

حضرت علیؑ باغات میں مزدوری کرتے تھے اور اس سے جو اجرت ملتی تھی اسے راہ خدا میں صدقہ کر دیتے تھے۔ محصل ضبی معاویہ کے پاس گیا۔ معاویہ نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں دنیا کے کنجوس ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں (اس کا اشارہ حضرت علیؑ کی طرف تھا)۔ معاویہ اگرچہ حضرت علیؑ کا کٹر دشمن تھا لیکن اس نے بھی یہ بات پسند نہ کی اور کہا کہ خدا تجھے ہلاک کرے، تو اس شخص کو بخیل کہہ رہا ہے کہ اگر اس کے پاس دو گھر ہوں ایک سونے سے بھرا ہوا اور دوسرا بھوسہ سے بھرا ہوا تو وہ بھوسے سے پہلے سونے سے بھرے گھر کو خیرات کر دے گا۔[1]

حضرت علیؑ اتنے بڑے زاہد تھے کہ انھوں نے بیت المال میں سونے چاندی کے ذخائر کو دیکھ کر

۱۔ ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۰۔

فرمایا تھا: یا دُنیا یا دُنیا اِلَیکِ عَنِّیْ اَبِیْ تَعَرَّضْتِ ؟ اَمْ اِلَیَّ تَشَوَّقْتِ ؟ لَا حَانَ حِیْنُکِ هَیْهَاتَ ! غُرِّیْ غَیْرِیْ لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْکِ قَدْ طَلَّقْتُکِ ثَلَاثًا لَا رَجْعَةَ فِیْهَا اے دنیا! اے دنیا دور ہو مجھ سے۔ کیا تو میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے؟ یا میری دلدادہ و فریفتہ بن کر آئی ہے۔ تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے سکے) بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ جا کسی اور کو دھوکا دے۔ مجھے تیری خواہش نہیں۔ میں تو تین بار تجھے طلاق دے چکا ہوں کہ جس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں ہے۔[1]

شب ہجرت حضرت علیؑ ہی تھے جو بے خطر بستر پیغمبرؐ پر سو گئے تھے۔ خدا نے آپ کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی تھی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کے لیے اپنی جان کو بیچ دیتا ہے۔ (سورۂ بقرہ، ۲۰۷)

یوحنا کا بیان ہے کہ جب علماء نے میری یہ باتیں سنیں تو ان میں سے کسی نے بھی ان کا انکار نہ کیا اور کہنے لگے کہ تم نے بالکل سچ کہا ہے۔ ہم نے یہ تمام باتیں اپنی کتابوں میں پڑھی ہیں اور اپنے ائمہ سے نقل کی ہیں لیکن خدا و رسولؐ کی محبت اور ان کی عنایت ان تمام باتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ عین ممکن ہے کہ اللہ نے ابوبکرؓ پر علیؑ سے زیادہ عنایت کی ہو اور انھیں علیؑ پر فضیلت دی ہو۔

یوحنا نے کہا کہ ہمیں غیب کا علم نہیں ہے اور ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے پاس غیب کا علم نہیں ہے۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی آپ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ○ ستیاناس ہو اُن کا جو علم کے بغیر بات کرتے ہیں۔ (سورۂ ذاریات، آیت ۱۰) ہم ظاہری شواہد کی بنا پر حضرت علیؑ کی فضیلت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

حضرت علیؑ جن کمالات کے جامع تھے وہ عنایت الٰہی کی قطعی دلیل ہے۔ اس سے بڑھ کر خدا کی عنایت اور کیا ہوسکتی ہے کہ خدا نے حضرت علیؑ کو شریف ترین نسب عطا کیا، عظیم ترین حلیم بنایا، شجاع ترین قلب کا مالک بنایا اور آپ کو بلند ترین مجاہد کا درجہ دیا۔ خدا نے آپ کو عبادت اور جود و کرم کی توفیق عطا کی اور امام المتقین بنایا۔ یہ سب عنایت الٰہی نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ اور جہاں تک خدا و رسولؐ کے محبّ یا محبوب ہونے کی بات ہے تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے متعدد مقامات پر حضرت علیؑ کی محبت اور محبوبیت کا اعلان کیا تھا۔ اگر آپ کو اور مواقع یاد نہ ہوں تو خیبر کو ہی یاد کریں۔ رسول خداؐ نے فرمایا تھا لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَدًا رَجُلًا یُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ کل میں علم ایسے مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس سے محبت کرتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۷۔

صبح ہوئی تو آپ نے اسلام کا پرچم حضرت علیؑ کو عطا فرمایا۔[1]

آپ کے مشہور عالم احمد خوارزم نے اپنی کتاب مناقب میں لکھا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا "اگر کوئی شخص اتنی مدت تک عبادت کرے جتنی مدت نوحؑ نے اپنی قوم میں قیام کیا تھا اور کوہ احد کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کر دے اور اتنی لمبی زندگی پائے کہ پاپیادہ ہزار حج کرے اور صفا و مروہ کے درمیان مقتول ہو جائے لیکن اُس کے دل میں علیؑ کی ولایت نہ ہو تو وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا اور جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔[2] اسی کتاب میں مرقوم ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: لَوِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلٰى حُبِّ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ لَمْ يَخْلُقِ اللّٰهُ النَّارَ اگر لوگ علیؑ بن ابی طالبؑ کی محبت پر جمع ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ دوزخ کو پیدا ہی نہ کرتا۔[3]

محبت علیؑ ایک ایسی نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا اور عداوت علیؑ ایسا گناہ ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں پہنچاتی۔[4]

احمد بن حنبل لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: مَنْ اَحَبَّنِيْ وَاَحَبَّ هٰذَيْنِ وَاَحَبَّ اَبَاهُمَا كَانَ مَعِيَ فِيْ دَرَجَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ جو شخص مجھ سے اور ان دو شہزادوں اور ان کے والد سے محبت رکھتا ہوگا تو وہ قیامت کے دن میرے درجے میں ہوگا۔[5]

۱۔ تاریخ دمشق از ابن عساکر در شرح حال امام علی بن ابی طالبؑ ج ۱، ص ۱۰۵، حدیث ۱۶۹، ص ۱۵۷، حدیث ۲۱۹۔۲۳۱۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۵۹۶، حدیث ۳۷۳۳۔ فرائد السمطین ج ۱، ص ۱۵۹۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۵۱۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۳۸، ۱۴۲۔ عیون الاثر ج ۱، ص ۱۳۲۔ مسند احمد ج ۲، ص ۲۸۲۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۸۷۸، حدیث ۳۳، (۲۴۰۵)۔ انساب الاشراف از بلاذری ج ۲، ص ۹۳۔ خصائص نسائی ص ۳۳، حدیث ۱۱۔ ابن مغازلی، مناقب علیؑ بن ابی طالبؑ ص ۱۸۱، حدیث ۲۱۲۔ طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۱۱۰۔ ینابیع المودۃ ص ۳۹۔ طبرانی، المعجم الصغیر ج ۲، ص ۱۰۰۔ مسند ابو داؤد طیالسی ص ۲۳۰۔ سبط بن جوزی، تذکرۃ الخواص ص ۲۳۔ بیہقی، سنن کبریٰ ج ۹، ص ۱۰۶، ۱۲۶۔ حلیۃ الاولیاء ج ۱، ص ۶۳۔ جزری، اسنی المطالب ص ۱۸۲۔ صحیح بخاری ج ۵، ص ۲۳۔ اُسد الغابہ ج ۴، ص ۲۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۴، ص ۱۸۲۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۱۲۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۷۔ ذہبی، تاریخ الاسلام، ج ۲، ص ۱۹۲۔ العقد الفرید ج ۲، ص ۱۹۲۔ الکامل فی التاریخ ج ۲، ص ۳۲۹۔ مسعودی، مروج الذہب ج ۳، ص ۱۲۔ نور اللہ شوستری احقاق الحق ج ۵، ص ۳۰۰۔ فضائل الخمسۃ ج ۲، ص ۱۶۱۔

۲۔ لسان المیزان ج ۵، ص ۲۱۹۔ میزان الاعتدال ج ۳، ص ۵۹۷۔

۳۔ مناقب خوارزمی ص ۶۷، ح ۳۹۔ الفردوس ج ۳، ص ۳۷۳، حدیث ۵۱۲۵۔

۴۔ الفردوس ج ۲، ص ۱۳۲، حدیث ۲۷۲۵۔ مناقب خوارزمی ص ۷۵، حدیث ۵۶۔

۵۔ مسند احمد ج ۱، ص ۷۷۔ سنن ترمذی ج ۵، ح ۳۷۳۳۔ تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۲۸۸۔ کنز العمال ج ۱۳، حدیث ۳۷۶۱۳۔

یوحنا نے کہا اب بھی محبت الٰہی کے متعلق کوئی ابہام رہ گیا ہے تو بتائیں جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث سے علیؑ کا محبِ ومحبوب خدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

علماء نے کہا یوحنا! رافضی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت کے بارے میں وصیت کی تھی جبکہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت کے لیے کوئی وصیت نہیں کی تھی۔

یوحنا نے کہا: علمائے دین! اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ . تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کر جائے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۰)

آپ کے مذہب کی مستند کتاب صحیح بخاری میں مرقوم ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا "مسلمان جب بھی رات کو سوئے تو اس کا وصیت نامہ اس کے سرہانے ہونا چاہیے۔"[1]

کیا آپ حضرات یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے امت کو وصیت کا اتنا تاکیدی حکم دیا ہو اور خود اس پر عمل نہ کیا ہو؟ جبکہ قرآن مجید یہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات کا حکم لوگوں کو دو پہلے اس پر خود عمل کرو۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کی مذمت میں آیا ہے: أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ یہ کیا کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۴)

اگر خدانخواستہ پیغمبر اکرمؐ وصیت کیے بغیر دنیا سے رخصت ہوئے ہوں تو ان کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ آپ نے حکم خدا کی نافرمانی کی تھی اور نعوذ باللہ آپ کے قول وفعل میں تضاد تھا اور آپ نے گزشتہ انبیاءؑ کی سنت کی خلاف ورزی کی تھی۔ انبیائے سابقین کی سیرت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے جانشین کے متعلق لوگوں کو وصیت کی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ آپ انبیاءؑ کی ہدایت کی پیروی کریں۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۹۱)

اصل بات یہ ہے کہ رسول خداؐ نے وصیت بھی کی تھی اور انبیاءؑ کی سنت پر بھی عمل کیا تھا لیکن آپ بغض کی وجہ سے کہتے ہیں کہ انھوں نے وصیت نہیں کی تھی۔

احمد بن حنبل آپ حضرات ہی کے ایک امام اور محدث تھے۔ انھوں نے اپنی مسند میں یہ روایت لکھی ہے۔ "سلمان فارسیؓ نے رسول خداؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ کا وصی کون ہے؟

آپ نے فرمایا: سلمانؓ! پہلے یہ بتاؤ کہ میرے بھائی موسیٰؑ کا وصی کون تھا؟

۱۔ صحیح بخاری ج ۴، ص ۲۔ صحیح مسلم ج ۳، ص ۱۲۴۹، حدیث ۱۶۔ سنن ابن ماجہ ج ۲، ص ۹۰۱، حدیث ۲۶۹۹۔

سلمانؓ نے کہا کہ اُن کا وصی یوشع بن نون تھا۔
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میرا وصی اور میرا وارث علیؑ بن ابی طالبؑ ہے۔
ابن مغازلی شافعی نے اس روایت کی نسبت رسول خداؐ کی طرف دی ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہر نبی کا کوئی نہ کوئی وصی اور وارث ہوتا ہے۔ میرا وصی اور وارث علیؑ ہے۔[1]
امام بغوی کو آپ حضرات مجدد مانتے ہیں۔ وہ آپ کے مذہب کے مشہور مفسر اور محدث تھے، انھوں نے اپنی کتاب معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ جب آیت انذار نازل ہوئی تو حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ رسول خداؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم جاؤ اور خاندان عبدالمطلب کے افراد کو میرے پاس لے آؤ۔ آنحضرتؐ کے گھر دعوت میں چالیس افراد آئے تو آپ نے گوسفند کی ایک ران اور دودھ کا ایک پیالہ اُن کی تواضع کے لیے پیش کیا۔ سب نے سیر ہوکر سالن کھایا اور دودھ پیا لیکن نہ تو سالن کم پڑا اور نہ ہی دودھ جبکہ اتنی غذا تو اُن میں سے ایک شخص کھانے کا عادی تھا۔ اس کے بعد آنحضرت نے فرمایا
اے خاندان عبدالمطلب! میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے۔ اور جو میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرے بعد میرا جانشین ہوگا؟ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور میں نے کہا یا رسول اللہؐ! میں حاضر ہوں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے۔ لوگو! اس کا حکم سننا اور اس کی اطاعت کرنا۔ لوگ اپنی جگہ سے اٹھے اور ہنسنے لگے اور انھوں نے ابوطالبؑ سے کہا کہ تمہارے بھتیجے نے تمھیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔[2]
اس روایت کو امام حنبل نے اپنی مسند میں اور طبری نے اپنی تاریخ میں بھی نقل کیا ہے۔[3]
اگر بالفرض آپ یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں نے جھوٹ لکھا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ آپ ان بزرگوں کے پیروکار ہیں جو خدا و رسولؐ پر جھوٹ بولتے تھے۔ اس قضیے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کے علماء نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ پھر مجھے سمجھائیں کہ روافض کا تصور کیا ہے؟ علمائے اسلام! خدا کے واسطے یہ بتائیں کہ حدیث غدیر کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں کیونکہ شیعہ اس حدیث کو بڑی شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حدیث غدیر جھوٹی ہے۔

۱۔ مناقب ابن مغازلی ص ۳۰۰۔۳۰۱، حدیث ۳۳۸۔ ذخائر العقبیٰ ص ۷۱، ۱۳۰۔
۲۔ بغوی، معالم التنزیل ج ۳، ص ۳۰۰۔
۳۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱، ص ۱۵۹۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۳۱۹۔۳۲۱۔

یوحنا نے کہا: سبحان اللہ!" آپ کے امام اور محدث نے مسند احمد میں براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ میں رسول پاکؐ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شامل تھا۔ واپسی پر آپ نے غدیر خم پر قیام فرمایا اور اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃ کا اعلان کرایا۔ چنانچہ آپ نے نماز پڑھائی۔ پھر دو درختوں کے درمیان جگہ کو صاف کرایا گیا۔ آپ نے نماز ظہر سے فارغ ہو کر علیؑ کے بازو کو پکڑ کر فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ میں ہر مومن کی جان پر خود اس سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں؟

سب نے کہا کیوں نہیں۔ پھر آپ نے علیؑ کے ہاتھ کو پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی بھی دکھائی دینے لگی اور آپ نے لوگوں سے فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ، اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَہُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَہُ. جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے، خدایا جو علیؑ سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اسے تنہا چھوڑ دے تو اسے رسوا کر۔

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؑ کو مبارک دیتے ہوئے کہا: بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ! اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَ مَوْلَا کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّ مُؤْمِنَۃٍ فرزند ابو طالبؑ! تمہیں مبارک ہو۔ آپ میرے اور ہر مومن مرد اور عورت کے مولا ہو گئے۔ احمد نے اس روایت کو ایک اور سند کے ساتھ ابو طفیل سے اور ایک اور سند کے ساتھ زید بن ارقم سے بھی نقل کیا ہے۔[1]

ابن عبدربہ نے العقد الفرید[2] میں سعید بن وہب سے اور ثعالبی نے اپنی تفسیر میں حدیث غدیر نقل کی ہے۔ سورۂ معارج کی تفسیر میں فہری کا واقعہ لکھ کر ثعالبی نے حدیث غدیر کی مزید توثیق کی ہے اور لکھا ہے کہ اعلان غدیر کے بعد جب رسول خداؐ مدینہ تشریف لائے تو حارث بن نعمان فہری آپ کے پاس آیا۔ اس وقت آپ کے پاس بہت سے صحابہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا: محمدؐ! آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی اور آپ کی رسالت کی گواہی دیں۔ ہم نے آپ کا کہا مانا۔ پھر آپ نے کہا کہ روزانہ پانچ نمازیں پڑھو۔ ہم نے آپ کے کہنے پر نمازیں پڑھیں۔ آپ نے کہا کہ رمضان کے روزے رکھو۔ ہم نے روزے رکھے۔ پھر آپ نے کہا کہ بیت اللہ کا حج کرو۔ ہم نے حج کیا لیکن آپ اس پر راضی نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ نے اپنے ابن عم کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا اور مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ کا اعلان کیا۔ یہ بتائیں کیا یہ اعلان آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا خدا کے حکم سے کیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے یہ اعلان حکم پروردگار سے کیا گیا ہے۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۹۳۔ ج ۴، ص ۳۶۸، ۳۷۲، ۳۸۱۔ ۲۔ العقد الفرید ج ۵، ص ۷۱۔

نعمان بن حارث نے پشت کی اور یہ کہتا ہوا چلا خدایا! اگر محمدؐ حق کہہ رہا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نازل کر۔ جیسے ہی وہ اپنی سواری کے قریب پہنچا تو آسمان سے ایک پتھر گرا اور اس کے سر پر لگا اور مقعد سے نکل گیا۔ حارث گرا اور اسی وقت مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا جو نازل ہو کر رہا۔ سورہ معارج)۔

پھر یوحنا نے کہا: علمائے دین! خوف خدا کریں۔ آپ کے علماء نے تو یہ روایات نقل کی ہیں جبکہ آپ کہتے ہیں کہ حدیث غدیر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے؟!

علماء نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ہمارے محدثین نے اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن عقل اس روایت کو ماننے پر آمادہ نہیں ہے۔ اگر حدیث غدیر کا یہی مفہوم ہوتا کہ حضرت علیؑ جانشین رسولؐ ہیں تو پھر یہ بات ناممکن تھی کہ صحابہ اس حدیث کو چھپاتے اور رسول خداؐ کے نامزد کردہ جانشین کو چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب کرتے جبکہ حضرت ابوبکرؓ کسی بڑے طاقتور قبیلے کے فرد نہیں تھے نیز صحابہ، رسول خداؐ کے اتنے فرمانبردار تھے کہ اگر آپ انہیں خودکشی کا بھی بالفرض حکم دیتے تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے لہٰذا وفات پیغمبرؐ کے بعد کے واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ حدیث غدیر سے خلافت مراد نہیں تھی کیونکہ عقلی طور پر یہ ماننا مشکل ہے کہ حبیب خداؐ کے اتنے بڑے اعلان کے بعد آپ کی امت نے اس کی پروا نہ کی ہو۔

یوحنا نے کہا: آپ کو اس پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی امت رسول خداؐ کی امت سے کم از کم چھ گنا زیادہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر جانے لگے تو آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ حضرت ہارونؑ، جہاں حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے وہاں آپ نبی بھی تھے اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی بہ نسبت ان سے زیادہ محبت کرتے تھے لیکن جب تیس دن پورے ہوئے اور حضرت موسیٰؑ واپس نہ آئے تو سامری نے سونے کا ایک بچھڑا بنا کر ان سے کہا تھا کہ یہ تمہارا اور موسیٰؑ کا رب ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ امت کی اکثریت نے سامری کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی اور حضرت ہارونؑ کو چھوڑ دیا تھا۔ حضرت رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد امت محمدؐ میں بھی وہی کچھ ہوا جو بنی اسرائیل میں ہوا تھا۔ ادھر آپ کی آنکھیں بند ہوئیں ادھر آپ کی امت نے آپ کے مقرر کردہ جانشین کو چھوڑ دیا اور اس کی بجائے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا حاکم بنا لیا۔ اگر قرآن کریم میں سامری کی داستان موجود نہ ہوتی تو کوئی بھی اس پر اعتماد نہ کرتا۔"

علماء نے کہا: یوحنا! اگر یہ بات صحیح ہے تو حضرت علیؑ نے ان سے جنگ کیوں نہ کی اور ان کی بیعت کیوں کر لی تھی؟

یوحنا نے کہا: اس میں شک نہیں ہے کہ وفات رسولؐ کے وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی

جبکہ مسیلمہ کذاب کے پاس اسی ہزار افراد یمامہ میں موجود تھے۔ دوسری طرف مدینہ اور مدینہ کے اطراف میں منافقین کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ نیز یہ کہ غزوات میں عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس کے دو چار افراد حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل نہ ہوئے ہوں۔ اب اگر حضرت علیؑ جنگ کرتے تو تمام عرب قبائل ان کے خلاف متحد ہو کر لڑتے اور آپ کا چند مخلص افراد کے علاوہ اور کوئی ساتھ نہ دیتا۔ جب مسیلمہ کذاب اور اس کے مرتد ساتھی یہ منظر دیکھتے تو فوراً مدینہ پر حملہ کر دیتے اور ان کا نشانہ بھی رسول خداؐ کا گھرانہ ہوتا۔ آپ نے ان زمینی حقائق کو دیکھ کر صبر کیا اور اپنی میراث کو لٹتے ہوا دیکھا۔ آپ نے پورے چھ ماہ تک اہل اقتدار کے سامنے اپنے حق کے دلائل پیش کئے اور اس مدت پر تمام اہلسنت مؤرخین متفق ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آپ ان کی بیعت کریں۔ اہلسنت کہتے ہیں کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؑ نے اہل اقتدار کی بیعت کر لی تھی لیکن روافض یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔

تاریخ طبری کے اس بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔[1] عباس بن عبدالمطلب اس طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ اگر حضرت علیؑ نے حکومت سے مصالحت نہ کی تو مرتدین کو روکنا ناممکن ہو جائے گا چنانچہ وہ حضرت علیؑ کے پاس آئے اور بولے کہ بھتیجے! آپ بیعت کر لیں۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر خلافت پر حضرت علیؑ کا حق نہ ہوتا تو آپ کبھی اس کا مطالبہ نہ کرتے اگر یہ مفروضہ قائم کر لیا جائے کہ حضرت علیؑ نے کسی حق کے بغیر دعویٰ کیا تھا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ آپ باطل پر تھے جبکہ رسول خداؐ کی یہ حدیث آپ حضرات کی کتابوں میں مذکور ہے عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ اس لیے آپ یہ تصور کیسے کر سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے ناحق دعویٰ کیا ہوگا جبکہ حضرت علیؑ کو ناحق ماننے سے پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے مقرر کردہ خلیفہ سے انحراف کر سکتے ہیں تو امت محمدؐ بھی محمد مصطفیٰؐ کے مقرر کردہ خلیفہ سے انحراف کر سکتی ہے۔ آپ کے علماء نے پیغمبر اسلامؐ سے یہ حدیث روایت کی ہے "تم لوگ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلو گے۔ اگر وہ کسی سوسمار کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی اس میں ضرور گھسو گے۔"[2]

قرآن مجید بتاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے مقرر کردہ خلیفہ کو تسلیم نہیں کیا تھا

۱۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۲۰۸۔

۲۔ معالم التنزیل، بغوی ج ۳، ص ۲۶۵۔ مجمع البیان ج ۱۰، ص ۳۲۶۔ (خفاف کے ساتھ) اس سے پہلے بھی اس حدیث کے نافذ بیان کئے جا چکے ہیں۔

اسی طرح سے امت اسلامیہ نے بھی بنی اسرائیل کی تاریخ دہرائی تھی۔

علماء نے کہا: یوحنا! کیا تم حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے؟

یوحنا نے کہا: اگرچہ میں روافض کی طرح متعصب نہیں ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے ان میں خلافت کی اہلیت دکھائی نہیں دی ہے اور جب میں نے اسلامی کتابیں پڑھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ خدا اور رسول اکرمؐ بھی حضرت ابوبکرؓ کو لائق خدمت نہیں جانتے تھے۔

علماء نے کہا: یہ ہماری کس کتاب میں لکھا ہے؟

یوحنا نے کہا: یہ آپ کی مستند ترین کتاب صحیح بخاری کے علاوہ الجمع بین الصحاح الستة، صحیح ابوداؤد، صحیح ترمذی اور مسند احمد بن حنبل[1] میں لکھا ہے کہ جب سورۂ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو رسول خداؐ نے وہ آیات حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کیں اور فرمایا کہ تم مکہ جاکر اجتماع حج میں ان آیات کو پڑھ کر سناؤ۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آیات الٰہی لے کر مقام ذی الحلیفہ تک ہی پہنچے تھے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو بلا کر فرمایا۔ تم جاؤ اور ابوبکرؓ سے وہ آیات لے کر حج کے اجتماع میں سناؤ۔ حضرت علیؑ گئے اور مقام جحفہ پر جاکر حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کی اور ان سے آیات لے لیں۔

حضرت ابوبکرؓ رسول خداؐ کے پاس مدینہ واپس آئے اور پوچھا کہ کیا میرے متعلق کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا "نہیں۔ جبرئیلؑ میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے کہا کہ اس کام کو یا تو خود آپ کریں یا ان آیات کی تبلیغ وہ کرے جو آپ میں سے ہو۔"

پیغمبر اکرمؐ نے اپنی زندگی میں جب انھیں چند آیات کی تبلیغ کے بھی قابل نہیں سمجھا تو وفات کے بعد وہ پورے قرآن اور امت کے وارث کیسے ہوسکتے ہیں؟ ضمنی طور پر اس واقعے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسولؐ کی جانشینی کی صلاحیت حضرت علیؑ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔

یہ سن کر حنفی نے کافی دیر تک سر زمین کی طرف جھکائے رکھا۔ پھر آہستہ سے سر اٹھا کر بولا

یوحنا! خدا کی قسم! تم نے تمام گفتگو عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق کی ہے۔ میں اس حدیث کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کرتا ہوں کہ خدا کی مشیت ہی یہ تھی کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس خلافت رسولؐ کی صلاحیت نہیں ہے اسی لیے رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے روانہ کیا تھا اور رسول خداؐ نے انھیں معزول کرکے عملی طور پر لوگوں کو بتایا تھا کہ ان میں خلافت کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسی لیے رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ ان آیات کی تبلیغ کا حق یا تو

۱۔ صحیح بخاری ج ۶، ص ۸۱۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۲۵۶، حدیث ۳۰۹۰۔۳۰۹۲۔ ج ۳، ص ۱۳۲، حدیث ۸۷۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۸۱۔

مجھے ہے یا علیؑ کو ہے۔[1]

پھر یوحنا نے مالکی فقہ کے عالم سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے؟

مالکی عالم نے کہا کہ میں کافی دیر سے سوچ رہا ہوں کہ حضرت علیؑ مسئلہ خلافت پر چھ ماہ تک حضرت ابوبکرؓ سے جھگڑتے رہے تھے اور اصول یہ ہے کہ جب دو افراد آپس میں جھگڑا کریں تو ان میں سے ایک حق پر اور ایک باطل پر ہوتا ہے۔ جھگڑنے والے دونوں افراد حق پر نہیں ہوتے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حق پر تھے تو حضرت علیؑ کو ناحق کہنا پڑے گا جبکہ فرمان رسولؐ ہے عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ۔[2] لہٰذا حدیث نبویؐ کے تحت ہم مجبور ہیں کہ حضرت علیؑ کو حق پر سمجھیں۔

پھر یوحنا نے حنبلی عالم سے پوچھا کہ اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

حنبلی عالم نے کہا: بھائیو! میں کب تک حق کو پوشیدہ رکھوں گا؟ مجھے یقین ہے کہ شیخین نے حضرت علیؑ کا حق غصب کیا تھا۔

یوحنا کا بیان ہے کہ اس کے بعد علمائے اسلام میں بحث شروع ہوگئی۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حق رافضیوں کے ساتھ ہے اور ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی ان کے زیادہ قریب ہیں۔ پھر شافعی عالم نے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ کی یہ حدیث صحیح نہیں ہے مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ فَلْیَمُتْ إِنْ شَاءَ یَهُودِیًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِیًّا جو کوئی مر جائے اور اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی اس کی مرضی، وہ ملت اسلام پر نہیں مرے گا۔

اب آپ حضرات فیصلہ کریں کہ امام زمانہ کون ہے؟

علماء نے کہا: بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ قرآن ہمارے زمانے کا امام ہے اور ہم قرآن کے مقتدی ہیں۔

شافعی عالم نے کہا: دوستو! تمہیں مغالطہ ہوا ہے کیونکہ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ (ائمہ قریش[3] میں سے ہوں گے)۔ جبکہ آپ قرآن کو کسی قوم اور قبیلے سے منسوب نہیں کر سکتے۔

بعد میں علماء نے کہا: رسول اکرمؐ ہمارے امام زمانہ ہیں۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۲۱۲۔ ابن ابی شیبہ، المصنف ص ۸۴۔۸۵، حدیث ۸۴۲ میں یہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ کنز العمال ج ۲، ص ۴۲۱، ح ۴۳۲۱ پر یہ حدیث موجود ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۵، ص ۳۷ پر بھی یہ روایت موجود ہے اس سے قبل بھی اس روایت کے کچھ تکملہ بیان کئے جا چکے ہیں۔

۲۔ کنز العمال ج ۲، ص ۴۲۱، حدیث ۴۳۲۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۵، ص ۳۷۔

۳۔ مسند ابی داؤد ص ۱۲۵، حدیث ۹۳۶۔ مسند احمد ج ۳، ص ۱۸۳۔ ابن ابی شیبہ، المصنف ج ۱۲، ص ۶۹، حدیث ۱۲۲۲۸، ص ۱۷۳، حدیث ۱۲۳۷۷۔ کنز العمال ج ۱۲، ص ۳۰، حدیث ۳۳۸۳۱۔

شافعی عالم نے کہا: اب بھی آپ کو مغالطہ ہوا ہے کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شیخین اور ان کے ہمنوا صحابہ نے رسول خداؐ کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ دیا تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے خلافت سازی کی تھی اور جب ان کے اس فعل پر لوگوں نے اعتراض کیا تو ہمارے علماء نے ہمیشہ یہ جواب دیا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے دراصل رسول خداؐ کی اس حدیث پر عمل کیا تھا: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً جو امام زمانہ کی پہچان کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

اسی لیے شیخین نے رسول اللہؐ کے جنازے کو چھوڑ دیا تھا اور خلافت کا فیصلہ کرنے چلے گئے تھے کہ مبادا ان کی موت ہو جائے اور وہ اپنے امام زمانہ کی پہچان سے غافل ہوں۔ اسی لیے انھوں نے بڑی جلدی کی تھی تاکہ لوگ جاہلیت کی موت مرنے سے محفوظ رہیں۔ ہمارے علماء کے اس جواب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً کی حدیث میں ''امام زمانہ'' سے رسول خداؐ مراد نہیں ہیں۔

پھر علماء نے شافعی عالم سے کہا کہ آپ بتائیں آپ کا امام کون ہے؟

اس نے کہا کہ اگر میں تمہارے قبیلے میں رہوں تو میرا کوئی امام نہیں ہے اور اگر میں اثنا عشری قبیلے کا فرد بن جاؤں تو پھر میرا امام محمد بن حسن ہے۔

علماء نے کہا: بھائی کوئی عقل کی بات کرو۔ یہ تو کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے۔ ایک فرد صدیوں سے امام چلا آرہا ہو؟ اور غیر سے فرد بھی ایسا ہو کہ آج تک اسے کسی نے دیکھا تک نہ ہو۔ ویسے بھی ایک شخص کا اتنے طویل عرصے تک زندہ رہنا عادۃً محال ہے۔

شافعی نے کہا: اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ دجال کافر ہے اور آپ حضرات کے نظریے کے مطابق ابھی تک زندہ ہے جبکہ وہ مہدی سے پہلے کا فرد ہے۔

آپ حضرات ابلیس کو بھی مانتے ہیں اور آپ اس کی طویل عمر کو بھی مانتے ہیں۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ حضرت خضرؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں زندہ ہیں۔ آپ حضرات یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ طول عمر کچھ اہل سعادت اور کچھ اہل شقاوت کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ اصحاب کہف تین سو نو برس تک کچھ کھائے پیئے بغیر سوتے رہے۔ لہٰذا اگر ابلیس و دجال کو طویل عمر مل سکتی ہے اور آپ کو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔ حضرت خضرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو طویل عمر مل جائے تو آپ کو اس پر بھی تعجب نہیں ہوتا۔ اگر نسل محمدؐ میں سے ایک ہادی کو اللہ طویل عمر عطا کر دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ نسل محمدؐ کا وہ فرد کھاتا پیتا ہو لیکن لوگ اسے نہ پہچانتے ہوں۔ لہٰذا آپ کا یہ شک عقلی تقاضوں کے بالکل منافی ہے۔

یوحنا نے کہا آپ کے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا میرے بعد میری امت کے تہتر گروہ بن جائیں گے ان میں سے ایک ناجی ہوگا اور بہتر دوزخی ہوں گے۔ کیا آپ حضرات ناجی فرقے کو پہچانتے ہیں؟

علماء نے کہا اہلسنت والجماعت ہی ناجی فرقہ ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ ناجی فرقہ کون سا ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا تھا جو اس عقیدے پر ہوں گے جس پر آج میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔[1]

یوحنا نے کہا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ اسی عقیدے پر ہیں جس پر پیغمبرؐ تھے۔

علماء نے کہا کہ بزرگوں سے یہ طریقہ منقول چلا آرہا ہے۔

یوحنا نے کہا آپ کے نقل کردہ قول پر کون اعتماد کرے گا؟

علماء نے کہا: وہ کیسے؟

یوحنا نے کہا اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ کے علماء نے ایسی بہت سی احادیث نقل کی ہیں جو حضرت علیؑ کی دوسروں پر فضیلت اور امامت پر دلالت کرتی ہیں لیکن آپ حضرات کہتے ہیں کہ یہ رسول خداؐ پر جھوٹ تراشا گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ کھلی طور پر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ آپ کے علماء جھوٹی باتوں کو نقل کرتے تھے۔ جب آپ نے اپنے علماء کی تکذیب کر دی ہے تو اب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کے راستے کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ بھی جھوٹ ہو۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے پیغمبرؐ روزانہ مسجد میں نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے لیکن آج تک آپ کے علماء یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ آنحضرتؐ سورۂ حمد کے لیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے یا نہیں؟ اور کیا آنحضرتؐ بسملہ پڑھنے کو واجب سمجھتے تھے یا نہیں؟ آپ کے علماء سے آج تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ پیغمبر اکرمؐ نماز ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے یا ہاتھ باندھ کر پڑھتے تھے؟ اور اگر بالفرض رسول خداؐ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تھے تو وہ حالت قیام میں ہاتھ سینے پر رکھتے تھے، ناف کے اوپر رکھتے تھے یا ناف کے نیچے ہاتھ رکھتے تھے؟ اسی طرح آج تک آپ حضرات یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ نماز کے وضو میں آنحضرتؐ سر کے مسح کے وقت تین بالوں پر مسح کرتے تھے یا سر کے چوتھے حصے کا مسح کرتے تھے؟ یا پھر پورے سر کا مسح کرتے تھے؟

اگر ہم کی زندگی کی نمازوں کو چھوڑ دیں اور صرف مدنی زندگی پر بحث کریں تو آپ نے مدینہ میں دس برس بسر کیے تھے۔ ایک دن میں پانچ نمازیں ہیں اور مہینہ اوسطاً تیس دن کا فرض کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ نے ایک ماہ میں ایک سو پچاس نمازیں پڑھی ہوں گی اور ایک سال میں

۱۔ طبرانی، المعجم الصغیر ج ۱، ص ۱۳۶۔ کنز العمال ج ۱، ص ۲۳۰، حدیث ۱۰۵۵۔ مجمع الزوائد ج ۱، ص ۱۸۹۔

بارہ مہینے ہوتے ہیں اس طرح گویا رسول خداؐ نے ایک سال میں اٹھارہ سو مرتبہ نماز پڑھی تھی اور جب ہم اٹھارہ سو کو دس سے ضرب دیتے ہیں تو حاصل ضرب اٹھارہ ہزار آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول اسلامؐ نے مدینہ کے دس سالوں میں اٹھارہ ہزار مرتبہ نماز پڑھی اور پڑھائی تھی۔ جب آپ کے علماء کے پاس رسول خداؐ کا وہ عمل محفوظ نہیں ہے جسے آپ نے اٹھارہ ہزار مرتبہ سرانجام دیا تھا تو آپ کے پاس ان کے وہ عمل کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں جنھیں آپ نے زندگی میں ایک یا دو بار انجام دیا تھا؟! لہٰذا آپ حضرات یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ پیغمبر اکرمؐ کے راستے پر چل رہے ہیں جبکہ اہلسنت والجماعت میں مختلف فرقے ہیں۔ کچھ فرقے عقائد کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں اور کچھ فقہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آئے ہیں اور ہر ایک کا عقیدہ دوسرے سے جدا ہے اور ہر ایک کی فقہ دوسرے کی فقہ سے بہت دور ہے۔ اس کے باوجود اہلسنت کو سنت پیغمبرؐ کا پیروکار اگر قرار دیں تو کیسے قرار دیں؟

یوحنا کا بیان ہے کہ میری یہ گفتگو سن کر سب نے اپنے سر جھکا لیے۔ پھر کچھ وقت کے لیے انھوں نے ایک دوسرے سے مباحثہ کیا اور آخر میں کہا: سچ یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ نجات پانے والا گروہ کون سا ہے۔ ہم میں سے ہر فرقہ نجات کا دعویدار ہے اور کہتا ہے کہ میرا فرقہ ناجی ہے اور دوسرے فرقے ہلاک ہونے والے ہیں مگر اس بات کا قوی امکان بھی ہے کہ نجات پانے والے دوسرے ہوں اور یہ ہلاک ہونے والے ہوں۔

یوحنا نے کہا: آپ حضرات کو تو اپنی نجات کے متعلق شک ہے لیکن روافض کو اپنی نجات کا یقین ہے اور اپنے علاوہ دوسرے فرقوں کی ہلاکت کا انھیں یقین ہے اور وہ استدلال کرتے ہیں کہ ان کا عقیدہ حق کے عین مطابق ہے اور انھیں اپنی نجات کے متعلق ایک فیصد بھی شک نہیں۔

علماء نے کہا: یوحنا! ہم آپ پر کوئی الزام نہیں لگاتے۔ آپ حق کو واضح کرنے کے لیے مناظرہ کرتے ہیں۔

یوحنا نے کہا: علمائے کرام! شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی قدیم نہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ خدا وجود رکھتا ہے لیکن وہ جسم اور مکان میں محدود نہیں ہے۔ وہ حلول سے پاک ہے۔ اس کے برعکس آپ حضرات خدا کی آٹھوں صفات ثبوتیہ کو قدیم جانتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ آپ کے امام فخر رازی نے بھی آپ کے اس عقیدے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے "یہود و نصاریٰ کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے کہا کہ خدا کے ساتھ دو اور قدیم ہیں جبکہ ہمارے اصحاب تو قدماء کے قائل ہیں۔"

امام حنبل کہتے تھے کہ اللہ جسم رکھتا ہے اور وہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بے ریش جوان کی شکل

میں نازل ہوتا ہے۔ خدارا بتایئے جو کچھ میں نے کہا ہے کیا یہ سچ نہیں ہے؟

علماء نے کہا: سچ ہے۔

یوحنا نے کہا اس سے معلوم ہوا کہ شیعوں کا عقیدہ آپ کے عقیدے سے بہتر ہے۔

علاوہ ازیں شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی بھی قبیح فعل انجام نہیں دیتا اور جہان خلقت میں کسی ضروری امر میں خلل نہیں ڈالتا۔ خدا کا کوئی فعل ظلم پر مبنی نہیں ہوتا۔ شیعہ خدا کی قضا پر راضی رہنے کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کی قضا بھی خیر پر مبنی ہے۔ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ خدا کا کوئی کام لغو اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کسی کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف نہیں دیتا اور اپنے کسی بندے کو گمراہ نہیں کرتا اور کسی بھی شخص کے لیے عبادت سے مانع نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے بندوں سے اطاعت کا مطالبہ کیا ہے اور معصیت سے منع کیا ہے۔ انسان اپنے افعال میں آزاد ہیں جبکہ آپ حضرات یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام رسوا کن گناہ خدا کی طرف سے ہیں جبکہ خدا اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

آپ اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ لوگ کفر، فسق، معصیت، قتل، چوری اور زنا جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی مرضی سے کر رہے ہیں یعنی وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ان سب کا تعلق خدا کے ارادے سے ہے اور خدا نے لوگوں سے اختیار سلب کر لیا ہے۔ اور آپ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ خدا ان افعال کے مرتکب افراد کو اس نافرمانی پر عذاب بھی دے گا۔ آپ خدا کی قضا پر راضی نہیں ہیں بلکہ آپ کے عقیدے کے تحت خود خدا بھی اپنی قضا پر راضی نہیں ہے۔

آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ نے خود ہی اپنے بندوں کو گمراہ کیا ہے اور وہ خود ہی ایمان و عبادت سے مانع ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ . . اللہ اس پر راضی نہیں ہے کہ اس کے بندے کافر ہو جائیں۔ اگر تم شکر کرو گے تو وہ تم سے راضی ہوگا اور کوئی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۂ زمر آیت ۷)

اے علمائے دین! آپ فیصلہ کریں کہ شیعوں کا عقیدہ بہتر ہے یا آپ کا عقیدہ بہتر ہے؟!! آپ کو کیا ہو گیا ہے جبکہ آپ کتاب پڑھتے ہیں کیا آپ غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ ولادت سے لے کر وفات تک ہر طرح کے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ گناہ کا تعلق وحی سے ہو یا کسی اور چیز سے، عمداً ہو یا اشتباہاً ہو انبیاءؑ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں لیکن آپ کا عقیدہ ہے کہ انبیاءؑ کو سہو یا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے محدثین نے یہاں تک لکھ دیا کہ

حقیقت گمشدہ

رسول کریمؐ کی زبان پر شیطان نے جملے القاء کیے تھے۔ لکھا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نماز صبح پڑھ رہے تھے اس وقت صحن کعبہ میں بہت سے مشرکین قریش جمع تھے۔ آپ سورۂ نجم کی انیسویں بیسویں آیت پر پہنچے تو آپ نے پڑھا اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ کیا تم نے لات و عزیٰ اور تیسرے منات کو بھی دیکھا ہے؟ اس وقت (نعوذ باللہ) شیطان نے آپ کی زبان پر یہ جملے القاء کر دیے تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى (وہ بلند اور روشن پیشانیوں والے ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے) جیسے ہی مشرکین نے آنحضرتؐ کے منہ سے اپنے خداؤں کی تعریف سنی وہ تو خوشی کے مارے سجدے میں گر گئے۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کلمات ہماری وحی کے نہیں تھے۔ یہ "القاء ابلیس" تھا۔ علمائے شیعہ نے ہمیشہ اس روایت کی مخالفت کی ہے۔[1] نیز ایک سنی عالم نے پوری کتاب لکھی ہے جس میں اس نے انبیائے کرامؑ کے گناہ ثابت کیے ہیں۔ اس کے جواب میں شیعہ عالم سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے تنزیہ الانبیاء لکھی تھی جس میں انھوں نے انبیاءؑ کو معصوم ثابت کیا تھا۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ان دو نظریات میں سے کون سا نظریہ حقیقت و نجات کے زیادہ قریب ہے۔

شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنی وفات سے قبل آیت وصیت پر عمل کیا تھا اور آپ نے اپنا وصی مقرر کر کے امت کو بے سہارا نہیں چھوڑا تھا جبکہ آپ حضرات یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور امت کو لاوارث چھوڑ کر چلے گئے تھے جبکہ قرآن مجید اور حدیث پیغمبرؐ میں وصیت کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ آپ حضرات یہ نظریہ قائم کر کے دراصل یہ تاثر دے رہے ہیں کہ رسول پاکؐ نے قرآن کی آیت وصیت پر عمل نہیں کیا تھا اور آپ کے قول و فعل میں تضاد تھا۔ اب آپ حضرات خود ہی بتائیں کہ ان دو عقیدوں میں سے لائق نجات عقیدہ کون سا ہے؟

شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو خلافت کے لیے متعین کیا تھا اور آپ حضرت علیؑ کو امت کا سرپرست بنا کر گئے تھے اور حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان آنحضرتؐ نے اسلام کی ابتدائی دعوت، دعوت ذی العشیرہ میں بھی ان الفاظ سے کیا تھا اِنَّ اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَ خَلِیْفَتِیْ مِنْ بَعْدِیْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا لَهٗ۔ اس حدیث کو طبری اور ابن اسحاق نے نقل کیا ہے۔ حجۃ الوداع سے واپسی پر رسول خداؐ نے غدیر خم کے مقام پر یہ اعلان کیا تھا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ حضرت عمرؓ نے آپ کو مبارک دی تھی اور کہا تھا بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَ مَوْلٰی کُلِّ

---

[1] محدثین کی یہ روایت قرآن کریم کی اس قطعی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے آسکتا ہے۔ (سورۂ فصلت آیت ۴۲) مترجم

مُؤْمِنٍ وَّ مُؤْمِنَۃٍ۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔[1]

حضرت سلمان فارسیؓ نے جب رسول خداؐ سے پوچھا کہ آپ کا وصی کون ہے تو آپ نے فرمایا: اِنَّ وَصِیِّیْ وَ وَارِثِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اس حدیث کو بھی امام حنبل نے نقل کیا ہے۔[2] آنحضرتؐ نے فرمایا شب معراج انبیاء نے مجھ سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے آپ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت کا اقرار لیا تھا اس کے بعد ہمیں نبوت عطا کی تھی۔ یہ حدیث تفسیر ثعلبی و بیان میں مرقوم ہے۔

نبی اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق فرمایا کہ "وہ خدا و رسول سے محبت کرتا ہے۔"

اس حدیث کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔[3]

آپ کے علماء نے یہ حدیث بھی لکھی ہے۔ "یہ کام یا تو میں خود کرسکتا ہوں یا میرے خاندان کا کوئی شخص کرسکتا ہے۔" اس سے آپ کا اشارہ حضرت علیؑ کی طرف تھا۔ یہ حدیث الجمع بین الصحیحین میں مرقوم ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ علیؑ! تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے حاصل تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔[4]

حضرت علیؑ کی شان میں خداوند عالم نے سورۂ ھل اتی اور آیت ولایت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ نازل فرمائی۔ آپ نے ہی حالت رکوع میں انگشتری صدقے میں دی تھی اور جب حضرت علیؑ نے جنگ خندق میں عمرو بن عبدود عامری کو قتل کیا تھا تو رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا۔ ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِیْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ جنگ خندق کے روز علیؑ کی ضربت میری امت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے۔[5] حضرت علیؑ کے فضائل کے کیا ہی کہنے، آپ برادر رسولؐ اور داماد رسولؐ ہیں۔ آپ شہر علم کا دروازہ ہیں۔ آپ امامُ الْمُتَّقِیْن اور سلطان دین، ور قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِیْن ہیں۔[6] آپ مشکلات کو حل اور تکالیف کو دور کرنے والے ہیں۔ آپ نص الٰہی کی رو سے امام ہیں اور آپ کے بعد

۱۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴، ص ۴۸۱۔ ۲۔ فضائل الصحابہ، امام احمد بن حنبل ج ۲، ص ۶۰۹ حدیث ۱۰۵۲۔

۳۔ صحیح بخاری ج ۵، ص ۲۳۔ صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۸۷۱۔۱۸۷۳، حدیث ۲۵۰۴۔

۴۔ صحیح بخاری ج ۵، ص ۲۳۔ صحیح مسلم ج ۵، ص ۱۸۷۰، حدیث ۲۴۰۴۔

۵۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳۲۔ تاریخ بغداد ج ۱۳، نمبر ۶۹۷۸۔ الفردوس بماثور الخطاب ج ۳، حدیث ۵۴۰۲۔

۶۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا خدا نے شب معراج مجھے علیؑ کے متعلق تین باتوں کی وحی فرمائی۔

(۱) وہ مؤمنین کا سردار ہے (۲) وہ متقین کا امام ہے (۳) وہ شرافت لوگوں کا رہبر ہے۔

فرائد السمطین ج ۱، حدیث ۱۰۵۔ یہ حدیث نقلی تفاوت کے ساتھ صفحہ ۱۴۵ (حدیث ۱۰۹) پر بھی مرقوم ہے۔

بحار الانوار ج ۱۰، ص ۳۴۳۔ حلیۃ الابرار ج ۱، ص ۱۳۳

آپ کے دونوں فرزند یکے بعد دیگرے امت کے رہنما ہیں۔ رسول اکرمؐ نے اپنے ان شہزادوں کے متعلق فرمایا تھا: هٰذان امامان قاما اَوْ قعدا وَاَبُوْهُمَا خَيْرٌ مِنْهُمَا یہ دونوں امام ہیں خواہ ظاہر کے مقابلے پر قیام کریں یا گھر میں بیٹھ جائیں اور ان کے والد ان سے بہتر ہیں۔[1] نبی اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا تھا: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔

امام حسینؑ کے بعد علی زین العابدینؑ امام ہیں۔ پھر ان کی نسل میں یکے بعد دیگرے خدا نے امامت کے سلسلے کو جاری رکھا تاآنکہ یہ سلسلہ قائم آل محمدؐ پر اختتام پذیر ہوا۔ حضرت مہدیؑ ہی امام زمانہ ہیں جو ان کی معرفت کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

آپ کی صحاح میں یہ روایت ہے کہ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: يَكُوْنُ مِنْ بَعْدِيْ اثْنَا عَشَرَ اَمِيْرًا میرے بعد میری امت میں بارہ امیر ہوں گے۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے کچھ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔[2] میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آنحضرتؐ نے کیا فرمایا تھا؟ میرے والد نے کہا کہ آپ نے فرمایا ان سب کا تعلق قریش سے ہوگا۔ صحیح بخاری[3] میں یہ حدیث ان الفاظ سے وارد ہے۔ لَا يَزَالُ اَمْرُ النَّاسِ مَاضِيًا مَا وَلِيَهُمُ اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا یعنی لوگوں کے معاملات اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک کہ ان پر بارہ افراد حکمرانی کریں۔ اس کے بعد آپ نے ایک جملہ آہستہ سے فرمایا جسے میں سن نہیں سکا۔ صحیح مسلم[4] میں یہ حدیث ان الفاظ سے وارد ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: لَا يَزَالُ اَمْرُ النَّاسِ قَائِمًا حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَيَكُوْنُ عَلَيْهِمُ اثْنَا عَشَرَ خَلِيْفَةً كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ دین کے معاملات قائم رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے اور ان کے لیے بارہ خلفاء آجائیں جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔[5] الجمع بین الصحیحین اور صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں رسول خداؐ سے یہ حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا یہ امر تمام نہ ہوگا یہاں تک قریش میں سے بارہ خلیفہ نہ ہو جائیں۔[5]

کفایۃ الطالب کے مؤلف نے جنہیں آپ ثقہ مانتے ہیں اپنی کتاب میں انس بن مالک سے روایت نقل کی کہ میں، سلمانؓ، ابوذرؓ، زید بن ثابتؓ اور زید بن ارقمؓ رسول اکرمؐ کی خدمت میں بیٹھے تھے

۱۔ کفایۃ الطالب ص ۴۳۸۔ عقد الدرر ج ۳۶، ص ۱۸۹۔

۲۔ مسند احمد ج ۵، ص ۹۲، ۹۳۔ سنن ترمذی ج ۵، ص ۶۴۳، حدیث ۲۲۲۸۔ تاریخ بغداد ج ۸، ص ۴۰۰۔ کنز العمال ج ۱۲، ص ۱۱۲، حدیث ۳۴۳۳۶۔

۳۔ صحیح بخاری ج ۴، ص ۲۱۸۔

۴۔ صحیح مسلم ج ۳، ص ۱۴۵۳، حدیث ۱۰۔

۵۔ صحیح مسلم ج ۳، ص ۱۴۵۳، حدیث ۵۔ مسند احمد ج ۴، ص ۹۲۔۹۳۔ اس حدیث کے مزید ماخذ پہلے بیان کیے گئے ہیں۔

کہ اتنے میں حسنؑ و حسینؑ آئے۔ رسول خداؐ نے دونوں بچوں کو اٹھا کر چوما۔ پھر ابوذرؓ اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے بھی بچوں کے ہاتھ چومے۔ پھر لوٹ کر ہمارے پاس آگئے۔ ہم نے آہستہ سے کہا ابوذرؓ! یہ تمھیں کیا ہوا۔ دو چھوٹے بچوں کے لیے تم نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور جا کر انھیں پیار کیا اور ان کے ہاتھ چومے؟ ابوذرؓ نے کہا کہ جو کچھ رسول خداؐ سے میں سن چکا ہوں اگر تم نے بھی سنا ہوتا تو تم اس سے بھی زیادہ ان کا احترام کرتے۔ ہم نے کہا: تم نے رسول خداؐ سے کیا سنا تھا؟ ابوذرؓ نے کہا کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ اور ان کے فرزندوں سے خطاب کر کے فرمایا تھا خدا کی قسم! اگر کوئی شخص اتنی نمازیں پڑھے اور روزے رکھے کہ اس کا بدن گل جائے تب بھی اس کی نماز اور روزہ اسے فائدہ نہیں پہنچائے گی جب تک وہ تم سے محبت نہ رکھے اور تمہارے دشمنوں سے دوری اختیار نہ کرے۔ علیؑ! جو بھی خدا کو تمہارے حق کا واسطہ دے کر حاجت طلب کرے تو اللہ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ اسے ناامید نہ لوٹائے۔ علیؑ! جو بھی تم سے محبت رکھے اور تم سے وابستہ رہے تو اس نے خدا کی مضبوط رسی تھام لی ہے۔

اس وقت ابوذرؓ اٹھے اور باہر چلے گئے۔ ہم نے رسول خداؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! ابوذرؓ نے ہمیں یہ خبر دی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ابوذرؓ نے سچ کہا۔ آسمان نے کسی ایسے شخص پر سایہ نہیں کیا اور زمین نے کسی ایسے شخص کا بوجھ نہیں اٹھایا جو ابوذرؓ سے زیادہ سچا ہو۔[1]

اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اور میرے اہلبیتؑ کو تخلیق آدمؑ سے سات ہزار برس قبل ایک نور سے پیدا کیا۔ پھر اس نے ہمیں پاک صلبوں اور رحموں میں منتقل کیا۔

میں (انس بن مالک) نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! آپ کہاں تھے اور کیسے تھے؟ رسول خداؐ نے فرمایا کہ ہم نورانی اجسام کی صورت عرش کے نیچے مقیم تھے۔ ہم اللہ کی تسبیح و تقدیس کیا کرتے تھے۔ پھر رسول خداؐ نے فرمایا: میں جب شب معراج سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچا تو جبرئیلؑ وہاں رک گئے۔ میں نے جبرئیلؑ سے کہا کہ آپ اس جگہ پہنچ کر میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا اے محمدؐ! میں یہاں سے آگے نہیں جا سکتا۔ اگر میں نے آگے قدم بڑھایا تو میرے پر جل جائیں گے۔ پھر جتنا خدا کو منظور تھا میں ایک نور سے دوسرے نور کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ وحی کی۔ محمدؐ! میں نے زمین پر نگاہ کی تو میں نے تمھیں منتخب کیا اور نبوت دی۔ پھر میں نے زمین پر نگاہ کی تو میں نے علیؑ کو چن لیا اور انھیں میں نے تمہارا جانشین اور تمہارے علم کا وارث اور تمہارے بعد امام مقرر کیا۔ میں تمہاری

۱۔ مجمع الزوائد ج ۵، ص ۱۹۷۔ ج ۶، ص ۲۳۲۔ مشکل الآثار ج ۱، ص ۲۳۳۔ مسند احمد بن حنبل ج ۲، ص ۱۷۵، ۲۳۳، طبع المیمنہ۔ الآل فی الضعفاء از ابن عدی ج ۵، ص ۱۸۱۴۔ البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۶۵۔ معتزلی، شرح نہج البلاغہ ج ۸، ص ۲۵۹۔ (تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ)۔

صلب سے پاک اولاد اور معصوم امام پیدا کروں گا جو میرے علم کے خزینہ دار ہوں گے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں دنیا و آخرت اور جنت و جہنم کو پیدا نہ کرتا۔ کیا تم انھیں دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا جی۔ اس وقت ندائے قدرت ہوئی۔ اے محمدؐ! اپنے سر کو اوپر اٹھاؤ۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے علی، حسن حسین، علی بن حسین، محمد بن علی، جعفر بن محمد، موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ، محمد بن علی، علی بن محمد، حسن بن علی اور حجت بن حسن کے انوار دکھائی دیئے۔ میں نے دیکھا کہ حجت بن حسن کا نور ان کے انوار کے درمیان کسی روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ ان سب پر افضل ترین درود و سلام ہو۔

میں نے عرض کیا: خدایا! یہ کون ہیں اور ان کے درمیان جس کا نور سب سے زیادہ روشن ہے یہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تمھارے بعد امت کے امام ہیں۔ یہ تمھاری نسل کے پاک افراد ہیں اور درمیان میں جس کا نور ضوفشاں ہے یہ میری طرف سے وہ حجت ہے جو ظلم و جور سے بھری ہوئی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا اور اہل ایمان کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان جائیں! آپ نے تو عجیب بات بتائی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ کچھ گروہ میری زبان سے یہ سب کچھ سنیں گے مگر الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور ہدایت پانے کے بعد منحرف ہو جائیں گے اور وہ مجھے میری ذریت کے متعلق اذیت دیں گے۔ خدا انھیں میری شفاعت کبھی نصیب نہ کرے۔[1]

اس کے بعد یونسؑ نے کہا: آپ حضرات یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے کسی کے متعلق وصیت نہیں کی تھی اور کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ رسول خداؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب کیا تھا اور ان کی بیعت کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کو رسول خداؐ نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو خلیفہ رسولؐ کا لقب دیا تھا۔ آپ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شیخین نے رسول خداؐ کے غسل و کفن میں شرکت نہیں کی تھی اور خلافت سازی کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے اور انھوں نے وہاں جا کر انصار سے خلافت کے متعلق جھگڑا کیا۔ ابھی رسول خداؐ کا جسد مبارک دفن نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھال لی تھی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام لانے سے قبل حضرت ابوبکرؓ چالیس برس تک مشرک اور بت پرست تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کی نسل میں امامت رکھوں گا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ میرا عہدہ امامت ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۴)

حضرت ابوبکرؓ نے اقتدار میں آنے کے بعد بنت رسول حضرت فاطمہ زہراؑ کو ان کے والد کی

---

[1] کفایۃ الاثر، ص ۶۹، ۷۰۔

میراث سے محروم کر دیا تھا۔ حضرت فاطمہؑ نے ان سے کہا تھا تعجب ہے کہ تم تو اپنے والد کی میراث پاؤ اور میں اپنے والد کی میراث سے محروم رہوں؟ تم کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہو۔ پھر حضرت فاطمہؑ نے استدلال کیا اور یہ آیات تلاوت فرمائیں۔

۱۔ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (زکریا نے دعا کی کہ خدایا مجھے بیٹا عطا فرما) جو میری اولاد اور اولاد یعقوب کی میراث کا وارث ہو۔ (سورۂ مریم آیت ۶)

۲۔ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ سلیمان داؤد کے وارث بنے۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۱۶)

۳۔ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے۔ (نساء: آیت ۱۱)

حضرت ابوبکرؓ کا موقف تھا کہ انبیاءؑ کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی وراثت نہیں ہوتی۔ اگر ان کا موقف صحیح ہوتا تو حضرت علیؑ، رسول خداؐ کی تلوار، عمامہ، خچر بطور میراث کبھی حاصل نہ کرتے۔ رسول خداؐ کے چچا عباسؓ نے حضرت علیؑ سے اس بات پر جھگڑا کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چیزیں میراث میں مجھے ملنی چاہئیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کی بیان کردہ "لاوارثی" حدیث صحیح ہوتی تو حضرت علیؑ اور جناب عباس بن عبدالمطلب میراث رسولؐ کے متعلق جھگڑا ہی کیوں کرتے؟

(۱) فدک (مدعا بہا) کا سارا مقدمہ ہی بے انصافی پر مبنی ہے کیونکہ حضرت فاطمہؑ فدک پر قابض تھیں اور حضرت ابوبکرؓ نے اس جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر گواہ بھی حضرت فاطمہؑ سے طلب کئے گئے تھے حالانکہ گواہ تو حضرت ابوبکرؓ کو پیش کرنے چاہیے تھے نہ کہ حضرت فاطمہؑ کو۔

(۲) حضرت فاطمہؑ کا مقدمہ براہ راست حضرت ابوبکرؓ کے خلاف تھا یا پھر نرم الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مقدمہ عوام کے خلاف تھا اور اس وقت حضرت ابوبکرؓ عوام کے سربراہ تھے۔ دونوں حالتوں میں حضرت فاطمہؑ مدعی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ "مدعا علیہ" تھے لیکن عدالت کی تاریخ میں یہ انوکھا واقعہ ہے کہ مدعا علیہ مقدمے کا فیصلہ کر رہا ہے۔

حضرت فاطمہؑ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا کہ یہ میری جائیداد ہے۔ مجھے میرے والد نے یہ عطا کی ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ ہبہ کے گواہ پیش کریں حالانکہ حضرت فاطمہؑ سے گواہ طلب کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ حضرت فاطمہؑ کی عصمت آیت تطہیر میں موجود ہے اور خدا نے ان کے متعلق یہ اعلان کیا ہے کہ ان سے ہر رجس دور ہے اور رجس میں غلط دعویٰ بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود حضرت فاطمہؑ سے گواہ طلب کئے گئے۔

حضرت علیؑ اور جناب ام ایمنؓ نے حضرت فاطمہؑ کے حق میں گواہی دی تھی اور جناب ام ایمنؓ کے متعلق رسول خداؐ نے جنتی ہونے کی گواہی دی تھی۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر حضرت

فاطمہؑ کا دعویٰ خارج کردیا کہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی اصول شہادت کے اعتبار سے ناکافی ہے۔

اب ذرا اہل حکومت کا دوہرا معیار بھی دیکھئے۔ حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ اور گواہوں کی گواہی کے باوجود انھیں حق نہیں دیا گیا۔ دوسری طرف انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کے حجروں کے متعلق ازواج رسولؐ کے دعوے کو قبول کرلیا اور وہ گھر بطور صدقہ امت میں تقسیم نہیں کئے۔ خلیفہ کے اس رویے کی وجہ سے حضرت فاطمہؑ سخت برہم ہوئیں اور انھوں نے اپنے شوہر کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد فلاں فلاں کو میرے جنازہ میں شریک نہ ہونے دینا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے جناب سیدہؑ کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور انھیں رات کی تاریکی میں دفن کردیا اور اہل حکومت کو اطلاع نہیں دی۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے یہ بھی کہا تھا: مجھے اس امر سے معزول کردو۔ جب تک علیؑ تمہارے اندر موجود ہیں تب تک میں تم میں بہترین شخص کا عنوان حاصل نہیں کرسکتا۔[2] اب اگر حضرت ابوبکرؓ نے صحیح کہا تھا تو انھیں علیؑ پر سبقت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا اور اگر انھوں نے غلط کہا تھا تو پھر وہ امامت کے اہل نہیں تھے۔ ہم ان کے اس قول کو تواضع پر محمول نہیں کرسکتے کیونکہ یہ ان کی امامت کے ضعیف ہونے کا سبب بن جائے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں کہا تھا: اِنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَعْتَرِیْنِیْ فَاِذَا زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ شیطان مجھ پر بھی سوار ہوجاتا ہے۔ جب میں ٹیڑھا ہوجاؤں تو تم مجھے سیدھا کردینا۔[3]

یہ واضح سی بات ہے کہ جس پر شیطان سوار ہوسکتا ہو وہ امامت کے لائق نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر خود یہ تبصرہ کیا تھا: کَانَتْ بَیْعَةُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلْتَةً وَلٰکِنَّ وَقٰی اللّٰهُ شَرَّهَا ابوبکرؓ کی بیعت اچانک ہوئی تھی لیکن خدا نے اس کے شر سے بچا لیا تھا البتہ اب اگر کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کردینا۔[4] بالفاظ دیگر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت شوریٰ اور مسلمانوں کی متفقہ آراء کے نتیجے میں قائم نہیں ہوئی تھی۔ آئندہ اس طرح کی خلافت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

رسول خداؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو لشکر اسامہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا تھا البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ نہیں گئے تھے۔ رسول خداؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو محکوم بنایا تھا اور ان پر اسامہ کو حاکم بنایا تھا لیکن حضرت علیؑ کی پوری زندگی کا مطالعہ کریں آپ کو کہیں بھی یہ نہیں ملے گا کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۶، ص ۲۸۰۔۲۸۱۔ واقعہ فدک کے ماخذ پہلے بیان کئے جاچکے ہیں۔

۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۳۰۔ کنز العمال ج ۵، ص ۵۸۸، حدیث ۱۳۷۴۔۱۳۷۵۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۲۱۰۔ نہج الحق ص ۲۶۳۔ شرح نہج البلاغہ معتزلی ج ۱، ص ۱۳۱۔

۳ و ۴۔ تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی در واقعات خلافت حضرت ابوبکرؓ۔

کسی کا محکوم بنایا ہو۔[1]

رسول خداؐ نے اپنی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکرؓ کو کسی منصب پر متعین نہیں کیا تھا البتہ ایک مرتبہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیات ان کے حوالے کی تھیں اور فرمایا تھا کہ اجتماع حج میں جاکر ان کی تبلیغ کردو لیکن جیسے ہی وہ روانہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ تبلیغ آیات کے لیے یا تو آپ خود جائیں یا اسے بھیجیں جو آپ میں سے ہو۔ رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو معزول کرکے ان کی جگہ حضرت علیؑ کو روانہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ بہت سے شرعی احکام سے ناواقف تھے مثلاً انھوں نے چور کا بایاں ہاتھ کٹوایا تھا اور قبیلۂ مسلمہ کو آگ میں جلایا تھا[2] جبکہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ آگ میں جلانے کا حق صرف اس ذات کو حاصل ہے جو آگ کا پروردگار ہے۔[3]

ایک مرتبہ کسی نے ان سے قرآن مجید میں کلالہ کی میراث کی آیت میں کلالہ کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنی ذاتی رائے سے یہ جواب دے رہا ہوں۔ اگر جواب صحیح ہو تو سمجھو کہ خدا کی طرف سے ہے ورنہ ابلیس کی طرف سے ہے۔

ایک مرتبہ ایک دادی آئی اور کہا کہ میرا پوتا فوت ہوگیا ہے۔ اس کی جائیداد میں سے مجھے کیا ملے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ مجھے کتاب و سنت میں تیرا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا۔ ابھی تم جاؤ۔ میں لوگوں سے پوچھ کر اس کا فیصلہ کروں گا۔ مغیرہ بن شعبہ نے ان سے کہا کہ رسول خداؐ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ احکام شرعی کے متعلق صحابہ سے پوچھا کرتے تھے۔

خالد بن ولید کو حضرت ابوبکرؓ نے فوج کا سپہ سالار بنا کر روانہ کیا۔ خالد نے مالک بن نویرہ کو ناحق قتل کیا اور اسی رات اس کی بیوی سے ہمبستری کی اور اس کے لیے اس نے عدت کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خالد سے اتنے بڑے جرم کی کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔

جب حضرت امیرالمومنینؑ نے بیعت ابوبکرؓ سے انکار کیا تو انھوں نے کچھ افراد جیسے جنھوں نے در بتولؑ کو نذر آتش کیا تھا۔[4] اس وقت گھر میں حضرت خاتون جنتؑ اور کچھ بنی ہاشم کے افراد بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ منبر پر بیٹھے تو حسنؑ و حسینؑ اور بنی ہاشم کے کچھ جوان اور کچھ دوسرے افراد آئے اور

۱۔ الملل والنحل از شہرستانی ج ۱، ص ۱۳۳۔ شرح نہج البلاغہ، معتزلی ج ۴، ص ۹۶۔

۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۱۳۔

۳۔ شرح السنہ از بغوی ج ۱۲، ص ۱۹۸۔ مجمع الزوائد ج ۶، ص ۲۵۱۔ کشف الاستار ج ۲، ص ۲۸، حدیث ۱۵۲۸۔

۴۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۱۹۔ نہج الحق ص ۲۷۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، معتزلی ج ۲، ص ۵۶ میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ چند آدمیوں کے ساتھ آئے تاکہ حضرت علیؑ کے گھر کو آگ لگا دی جائے۔ زبیر تلوار لے کر آگے بڑھے۔ حضرت فاطمہؑ گھر سے برآمد ہوئیں اور ان لوگوں کو اس حرکت سے روکنے لگیں۔ یہ واقعہ ابوبکر جوہری سے نقل کیا گیا ہے۔

انھوں نے ان پر اعتراض کیا۔ حسن و حسین علیہم السلام نے فرمایا نیچے آجاؤ۔ یہ ہمارے نانا کا منبر ہے۔[1] حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت اس حسرت کا اظہار کیا تھا کہ اے کاش! میں نے فاطمہؑ کے گھر کا دروازہ زبردستی نہ کھلوایا ہوتا۔ اے کاش! میں نے رسول خداؐ سے پوچھا ہوتا کہ کیا خلافت میں انصار کا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ اے کاش! میں نے سقیفہ میں اپنے دو ساتھیوں میں سے کسی کی بیعت کرلی ہوتی اور وہ امیر ہوتا اور میں وزیر ہوتا۔[2]

اس کے بعد یہ تانے کہا: علمائے دین! آپ کے بقول حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرکے سنت رسولؐ کی خلاف ورزی کی تھی جبکہ رسول خداؐ نے حضرت عمرؓ کو کبھی کوئی منصب سپرد نہیں کیا تھا البتہ ایک مرتبہ جنگ خیبر میں انھیں سالار لشکر بنا کر بھیجا تھا مگر وہ شکست کھا کر واپس آئے تھے اور کہتے تھے کہ فوج بزدل ہے اور فوج کہتی تھی کہ سالار بزدل ہے۔ رسول اکرمؐ نے ایک مرتبہ انھیں صدقات پر مقرر کیا تھا۔ عباس بن عبدالمطلب نے ان کے خلاف شکایت کی تھی۔ رسول خداؐ نے انھیں اس منصب سے معزول کر دیا تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا تو صحابہ نے ان پر اعتراض کیا تھا اور علیؑ نے کہا تھا کہ آپ نے عمرؓ کو اپنا نائب مقرر کیا ہے جبکہ عمرؓ تندخو ہیں۔ خود حضرت عمرؓ کی ذاتی قابلیت یہ تھی کہ ان کے سامنے ایک عورت کو لایا گیا جو زنا کی وجہ سے حاملہ تھی۔ آپ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم جاری کیا۔ حضرت علیؑ نے کہا اگر تم عورت پر حق رکھتے ہو لیکن اس کے شکم میں موجود بچے پر تو تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور کہا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ۔ حضرت عمرؓ کی علمیت کا یہ عالم تھا کہ جب پیغمبر اسلامؐ کی وفات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ محمدؐ نہیں مرے اور وہ کبھی نہیں مریں گے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے ان کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ○ آپ بھی مرجائیں گے اور وہ بھی مرجائیں گے۔ (سورۂ زمر آیت ۳۰) اس وقت عمرؓ نے کہا آپ نے سچ کہا ہے مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے آج ہی اس آیت کو سنا ہے۔[3]

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک پاگل عورت کو پیش کیا گیا جس نے زنا کیا تھا۔ انھوں نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ دیوانہ مرفوع القلم ہوتا ہے جب تک وہ ہوش و حواس میں نہ آجائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور کہا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ

۱۔ نہج الحق ص ۲۷۲۔ اسد الغابہ ج ۴، ص ۱۴۔ الصواعق المحرقہ ص ۱۷۵، مطبوعہ المیمنۃ مصر۔

۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۱۳۔ مروج الذہب ج ۲، ص ۳۰۱۔۳۰۲۔ نہج الحق ص ۳۶۵۔

۳۔ تاریخ الخمیس ج ۲، ص ۱۶۷۔ صحیح بخاری ج ۶، ص ۱۷۔

حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں خطبہ دیا اور اعلان کیا کہ پانچ سو درہم سے زیادہ کوئی عورت حق مہر نہیں لے گی۔ جو اس سے زیادہ حق مہر مقرر کرے گی میں اضافی رقم چھین کر بیت المال میں جمع کردوں گا۔ ایک مسلمان عورت مسجد میں آئی۔ اس نے حضرت عمرؓ سے کہا: "یہ کیسے ہوسکتا ہے اللہ تو ہمیں حق مہر میں پورا خزانہ دے اور عمرؓ ہمیں لینے سے روک دے؟" حضرت عمرؓ نے کہا کہ وہ کیسے؟

عورت نے فوراً یہ آیت پڑھی: وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ○ اگر تم ایک بیوی کو ایک قنطار (سونے کی کثیر مقدار) دے چکے ہو تو اس سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان اور واضح گناہ کے ذریعے سے دولت واپس لو گے؟ (سورۂ نساء: آیت ۲۰)

جب حضرت عمرؓ نے قرآن کی یہ آیت سنی تو کافی دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے پھر انھوں نے منبر سے یہ بسملے کہے: "لوگو! عمرؓ سے غلطی ہوئی اور عورت ٹھیک کہتی ہے۔"

پھر انھوں نے کہا تمام لوگ عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہیں یہاں تک کہ پردہ دار عورتیں بھی مجھ سے فقہ کو بہتر جانتی ہیں۔

حضرت عمرؓ بی بی عائشہؓ اور بی بی حفصہؓ کو بیس ہزار درہم سالانہ بیت المال سے دیتے تھے اور انھوں نے اپنا وظیفہ بھی بیس ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔ جب مسلمانوں نے اتنے بڑے وظیفے پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے بطور قرض یہ رقم بیت المال سے لی ہے۔[1]

حضرت عمرؓ نے حسنین کریمینؓ کو ان کے نانا کی میراث سے محروم رکھا اور انھیں خمس سے بھی محروم رکھا تھا۔[2]

حضرت عمرؓ نے ایک ہی جرم کی سزا ستر مختلف طریقوں سے دی تھی اور انھوں نے بیت المال کی دولت طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کی تھی جس سے سرمایہ دارانہ آمریت وجود میں آئی۔

حضرت عمرؓ نے دو حلال حرام کیے تھے اور اعلان کیا تھا کہ دو قسم کے حلال جو عہد رسولؐ میں حلال تھے میں انھیں حرام قرار دیتا ہوں اور جو خلاف ورزی کرے گا اسے سزا دوں گا۔ ان میں سے پہلا متعۃ الحج (حج تمتع) ہے اور دوسرا متعۃ النساء (نکاح موقت) ہے۔[3]

حضرت عمرؓ نے سنت رسولؐ اور سنت ابوبکرؓ سے اعراض کرتے ہوئے خلافت کے منصب کے لیے چھ رکنی شوریٰ تشکیل دی تھی۔ بعدازاں انھوں نے چھ کی بجائے چار رکنی شوریٰ تشکیل دی۔ بعد میں

۱۔ نہج الحق ص ۴۹۹۔ کتاب میں دس ہزار درہم لکھا ہوا ہے۔

۲۔ جصاص، احکام القرآن ج ۳، ص ۱۱۔

۳۔ نہج الحق ص ۴۸۱۔ درمنثور ج ۲، ص ۱۴۰۔ اس مسئلے کے کچھ مآخذ پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔

تین رکنی پھر دو رکنی اور آخر میں اسے ایک رکنی کمیٹی بنا دیا تھا۔ انھوں نے پہلے تو عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق کہا تھا کہ یہ ارادے کے کمزور آدمی ہیں لہٰذا خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ پھر انھوں نے ان کو "بادشاہ گر" کا کردار سونپ دیا اور کہا کہ اگر چھ میں سے تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو پھر عبدالرحمٰن جس کو خلیفہ مقرر کریں وہی خلیفہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ حضرت علیؑ اور حضرت عثمانؓ آپس میں کبھی متفق نہیں ہوں گے چنانچہ انھوں نے کہا: "اگر علیؑ اور عثمانؓ آپس میں متفق ہو جائیں تو اُن کی رائے صائب ہوگی اور اگر ان چھ آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تو جس گروہ میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اُس گروہ کی رائے صائب ہوگی۔" اس کے بعد انھوں نے یہ اعلان کیا کہ ان میں سے جو بھی بیعت سے تین دن تک تخلف کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔[1]

حضرت فاطمہؑ نے حضرت ابوبکرؓ سے فدک اور عوالی کے متعلق بحث کی۔ آخرکار حضرت ابوبکرؓ کو قائل ہونا پڑا۔ انھوں حضرت فاطمہؑ کو اُن کی جائیداد کی واگزاری کا قبالہ لکھ کر دیا۔ حضرت فاطمہؑ وہ تحریر لے کر وہاں سے روانہ ہوئیں۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آئے۔ انھوں نے حضرت فاطمہؑ سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ حضرت فاطمہؑ نے بتایا کہ ابوبکرؓ نے جائیداد کی واگزاری کے لیے قبالہ لکھ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؑ سے وہ قبالہ لے لیا اور اسے پھاڑ دیا۔[2] حضرت فاطمہؑ اُن پر سخت برہم ہوئیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور قبالہ لکھ کر دینے پر انھیں سرزنش کی۔ اس کے بعد دونوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر حضرت فاطمہؑ کو اُن کا حق واپس نہیں کریں گے اور جہاں تک خلیفہ ثالث کا تعلق ہے تو سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے رشتے داروں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور اُن پر نوازشات کرتے تھے۔ انھوں نے اسلامی مملکت کے تمام صوبے بنی امیہ کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ انھوں نے اپنے مادری بھائی ولید کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ولید نے وہاں شراب نوشی کی اور اُس کی جسارتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ ایک مرتبہ اُس نے شراب کے نشے میں نماز پڑھائی تھی۔[3] اہل کوفہ نے اسے اپنے شہر سے نکال دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے جرائم کی فہرست کافی لمبی ہے۔

۱۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۲۸۔۲۹۔ نہج الحق ص ۲۸۵۔ یہ روایت ماخذ سمیت پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ، معتزلی ج ۲۱، ص ۲۱۳۔

۳۔ معتزلی، شرح نہج البلاغہ ج ۳، ص ۱۸۔ تاریخ خمیس ج ۲، ص ۲۵۵۔۲۵۹۔ الکامل فی التاریخ ج ۳، ص ۵۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۳۲۔ اسد الغابہ ج ۵، ص ۹۰۔ نہج الحق ص ۲۹۰۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے چاروں دامادوں کو بیت المال سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنے ہر داماد کو ایک لاکھ مثقال سونا بیت المال سے دیا تھا۔ آپ نے دس لاکھ درہم خمس جو افریقہ سے آیا تھا مروان کو دے دیا تھا[1] آپ عوام سے دور رہتے تھے۔[2]

حضرت عثمانؓ نے عظیم القدر صحابہ کی توہین کی تھی۔ انھوں نے حضرت ابن مسعودؓ کو اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ اس کی وجہ سے وفات پاگئے تھے۔[3] حضرت ابن مسعودؓ ہمیشہ اُن کی مذمت کرتے تھے اور اُن پر کفر کا فتویٰ لگاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمارؓ بن یاسر کو اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ انھیں "فتق" کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔[4] حضرت عثمانؓ نے معاویہ کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے حضرت ابوذرؓ کو شام سے مدینہ بلوایا اور انھیں کوڑے لگوائے پھر "ربذہ" جلا وطن کر دیا جہاں انھوں نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت ابوذرؓ پر ستم توڑے تھے جبکہ یہ تینوں رسول خداؐ کے مقرب ترین اصحاب تھے۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کے بیٹے ابن عمر سے قصاص نہیں لیا تھا جبکہ انھوں نے "نوار" کو اسلام لانے کے بعد قتل کیا تھا۔

جب اُن کے مادری بھائی ولید بن عقبہ کی شراب نوشی کی گواہیاں مکمل ہوگئیں تب بھی حضرت عثمانؓ چاہتے تھے کہ اسے کوڑے نہ لگائے جائیں اور وہ حد شرعی سے بچ جائے۔ حضرت علیؑ نے انھیں مجبور کیا تو ولید پر حد جاری کرنے پر راضی ہوئے۔

حضرت عثمانؓ کی بنی امیہ نوازی کی وجہ سے پورا عالم اسلام اُن سے متنفر ہوگیا تھا۔ آخرکار مدینہ، مصر، کوفہ اور بصرہ کے ہزاروں افراد نے مدینہ پہنچ کر اُن سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے معزول ہونے سے انکار کر دیا۔ آخرکار صحابہ و تابعین نے انھیں قتل کر دیا۔

۱۔ تاریخ خمیس ج ۱، ص ۲۹۔ تاریخ طبری ج ۵، ص ۷۹۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۵۵، ابن قتیبہ، المعارف ص ۸۳۔ نہج الحق ص ۲۹۲۔ مقرزی، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۹۸۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء۔

۲۔ نہج الحق ص ۲۹۳۔ تاریخ خمیس ج ۲، ص ۲۹۲۔ مقرزی، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۹۹۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۶۲۔

۳۔ نہج الحق ص ۲۹۵۔ اسد الغابہ ج ۳، ص ۲۵۹۔ تاریخ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۹۳۔ تاریخ خمیس ج ۲، ص ۲۶۸۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۹۸۔ ج ۲، ص ۳۰۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے غلام ہنوم کو حکم دیا کہ ابن مسعودؓ کو تنبیہ کی جائے۔ حضرت عثمانؓ کے حکم سے اُن کے غلام ہنوم نے ابن مسعودؓ کو اس زور سے زمین پر پٹخا کہ وہ اپاہج ہوگئے اور دو سال تک صاحب فراش رہنے کے بعد اسی کو پیارے ہوگئے۔ (انساب الاشراف ج ۵، ص ۳۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۴۷۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۳) رضوانی

۴۔ تاریخ خمیس ج ۲، ص ۲۶۲۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱، ص ۴۲۔ مقرزی، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۳۸۔ نہج الحق ص ۲۹۶۔

حضرت عثمانؓ جنگ بدر اور جنگ احد میں بھی شریک نہیں تھے۔ حضرت عثمانؓ نے معاویہ کو اتنی قوت فراہم کر دی تھی کہ وہ حضرت علیؑ کی حکومت کے لیے چیلنج بن گیا تھا اور امت رسولؐ کو یہ روز بد بھی دیکھنا پڑا جب معاویہ پورے عالم اسلام کا بلا شرکت غیرے حاکم بن گیا[1] اور پھر اس نے حکم دیا کہ نماز جمعہ اور نماز عیدین کے خطبوں کا اختتام حضرت علیؑ پر سب و شتم سے کیا جائے۔

بنی امیہ کی حکومت نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا۔ دور معاویہ میں امام حسن مجتبیٰؑ کو زہر سے اور دور یزید بن معاویہ میں امام حسینؑ، اُن کے خاندان اور اصحاب کو تلواروں سے شہید کر دیا گیا اور اہل حرم کو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔[2]

پھر جب اقتدار حجاج بن یوسف کو ملا تو اُس نے خاندان رسولؐ کے بارہ ہزار افراد کو قتل کیا اور کچھ سادات کو زندہ دیواروں میں چنوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ لوگوں نے یہ عقیدہ رکھ لیا تھا کہ امام کے انتخاب کا انھیں حق حاصل ہے۔ اگر لوگ نص کی پیروی کرتے اور جب رسول اکرمؐ نے قلم دوات طلب کی تھی تو قلم دوات دیدیتے تو یوں گمراہ نہ ہوتے اور اسلام یوں بدنام نہ ہوتا اور مسلمانوں میں فرقے نہ بنتے۔

نبی اکرمؐ کو اپنی امت کے مستقبل کی اتنی فکر تھی کہ آپ نے دم واپسیں فرمایا تھا: اَئْتُوْنِیْ بِدَوَاۃٍ وَّکَتِفٍ، اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا "میرے لیے دوات اور شانے کی ہڈی لاؤ۔ میں تمھیں ایسی دستاویز لکھ دوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔"[3]

حضرت عمرؓ نے مزاحمت کی اور رسول خداؐ کو دستاویز نہیں لکھنے دی۔ اگر اُس دن حضرت عمرؓ رسول خداؐ کو دستاویز لکھنے سے نہ روکتے تو آج اسلام کی تعبیر و تشریح میں کوئی اختلاف نہ ہوتا اور امت بھٹکنے سے محفوظ رہتی۔

اس کے بعد یوحنا نے کہا: "علمائے دین! آپ لوگ جن کو روافض کہتے ہیں اُن کا وہی عقیدہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور آپ کا وہ عقیدہ ہے جسے آپ نے بیان کیا ہے۔ آپ اپنے دلائل سنا چکے

۱۔ امام اہل سنت حسن بصری کہتے ہیں کہ "معاویہ کے چار کام ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے ایک بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک اُس کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا درآنحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے اُس کا اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنانا۔ تیسرے زیاد کا اپنے خاندان کے ساتھ الحاق کرنا حالانکہ نبی اکرمؐ کا صاف حکم موجود تھا کہ لونڈا اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کو سنگسار کیا جائے اور چوتھے اس کا حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنا۔ وائے ہو اُس پر حجر اور اُس کے ساتھیوں کے بارے میں۔" (رضوانی)

۲۔ ینابیع المودۃ ج ۱، ص ۳۵۰ اور مقرم، مقتل الحسینؑ۔

۳۔ حدیث قرطاس کے حوالے پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔

ہیں اور اُن کے دلائل بھی سن چکے ہیں۔ اب میں آپ سب کو خدا کی قسم دے کر پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ آپ کے دلائل وزنی ہیں یا شیعوں کے اور آپ خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنے ضمیر کی عدالت میں خود ہی فیصلہ کریں کہ کون حق کے زیادہ قریب ہے اور کون حق سے منحرف ہے؟"

جیسے ہی یوحنا خاموش ہوا تو علماء نے متفقہ طور پر کہا: "خدا کی قسم! روافض حق پر ہیں اور اُن کا موقف درست ہے۔ ہم نے مسائل کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے اور ہم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ اہل حق ہمیشہ مظلوم رہے ہیں۔ یوحنا! گواہ رہنا کہ ہم آل محمدؐ کے دوست ہیں اور اُن کے دشمنوں سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں لیکن تم سے ہماری درخواست ہے کہ ہمارے عقیدے کو فاش نہ کرنا کیونکہ لوگ اپنے سلاطین کے دین پر ہوتے ہیں۔"

یوحنا کا بیان ہے کہ میں نے علماء کو خدا حافظ کہا اور اُن کی بزم سے اٹھ کر اس حال میں باہر آیا کہ میں اپنی دلیل سے آگاہ اور اپنے عقیدے سے مطمئن تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ میری وجہ سے علمائے اسلام کے شکوک دور ہوئے اور انھوں نے حق کا راستہ اپنالیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہدایت اسے نصیب ہوتی ہے جسے خدا ہدایت دیتا ہے۔ میں نے یہ رسالہ لکھا تاکہ راہ نجات کے متلاشی افراد کے لیے ذریعہ ہدایت ثابت ہو اور مجھے یقین ہے کہ جو بھی مسلمان اسے نگاہ انصاف سے پڑھے گا اسے ہدایت ضرور نصیب ہوگی البتہ جس کے دل اور زبان پر مہر لگ چکی ہو اسے اس رسالے کے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔

ہدایت ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہدایت اور توفیق خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔
اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ آپ کو جس سے محبت ہو ضروری نہیں کہ آپ اسے ہدایت کرسکیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ (سورۂ قصص آیت ۵۶)

سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ آپ انھیں عذاب الٰہی سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں اُن کے لیے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۶۔۷)

پروردگارا! ہم تیری عظیم نعمت پر تیری حمد کرتے ہیں اور محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجتے ہیں۔

بحرانی نے اپنی کتاب کشکول جلد دوم کے صفحہ ۲۸ پر اس رسالے کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:
"خدا نے یہ کتاب ہمارے ہاتھوں میں دی ہے جس کے لیے ہم خدا کی حمد و ثنا بجا لاتے ہیں"
والسلام

عقائد اہلسنت

امام احمد بن حنبل سے پہلے اہلسنت میں بہت سے فرقے پائے جاتے تھے۔ کچھ لوگ "مرجئی" کہلاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ایمان درست ہے تو پھر عمل کی کوئی اہمیت نہیں۔ عمل کرو تو کرو، نہ کرو تو نہ کرو کیونکہ ایمان کی موجودگی میں کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور کفر کی موجودگی میں کوئی نیکی فائدہ نہیں دے سکتی۔ ایک مذہب کو "قدری" کہا جاتا تھا۔ اس عقیدے سے وابستہ افراد تقدیر الٰہی کے منکر تھے۔ ایک گروہ کو "جہمی" کہا جاتا تھا۔ یہ گروہ جہم بن صفوان کا پیروکار تھا اور یہ لوگ صفات خداوندی کی نفی کرتے تھے۔ ایک گروہ "خوارج" کا تھا۔

الغرض امام احمد بن حنبل کے منصب امامت پر فائز ہونے سے قبل اہلسنت کہلانے والے افراد بہت سے فکری اور اعتقادی اختلافات رکھتے تھے۔ انھوں نے اہل حدیث کے تمام فرقوں کو یکجا کیا اور ان کی شیرازہ بندی کی اور اپنے مقرر کردہ اصول کو اساس قرار دے کر مختلف فرقوں کو وحدت کی لڑی میں پرویا۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ اُن کے اصول سلف صالحین اور صحابہ و تابعین کے عقائد پر مبنی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان اصول کو صحابہ و تابعین کی بجائے خود امام حنبل کی طرف منسوب کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ یہ اصول اُن سے قبل موجود نہیں تھے اور نہ ہی اُن پر علماء کا اجماع ہوا تھا۔ روز ابتدا سے لے کر آج تک اہلسنت میں جو شدید اختلاف پایا جاتا ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ متوکل عباسی کے عہد میں حنبلی عقائد کو بڑا فروغ ملا کیونکہ متوکل نے انھیں اپنا مقرب بنایا تھا اور اُس نے امام حنبل کی اتنی سرپرستی کی تھی کہ وہ مسلمہ امام بن گئے تھے۔

حنبلی ذہنیت ایک عرصے تک اہلسنت پر حکومت کرتی رہی۔ پھر ابو الحسن اشعری کا دور آیا۔ موصوف پہلے معتزلی افکار کے مبلغ تھے لیکن انھوں نے معتزلی عقائد کو خیرباد کہہ کر حنبلی عقیدے کو اپنا لیا تھا۔ ابو الحسن اشعری نے عقائد میں حنبلی طرز فکر پر اکتفا نہیں کیا تھا اور وہ حنبلی عقیدے کے مقلد محض نہیں تھے۔ انھوں نے حنبلی عقائد کے ساتھ ساتھ عقل کے تقاضوں کو بھی عقائد میں شامل کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے عقائد کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا تھا کہ انھیں نہ تو حنبلی عقائد کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی حنبلی مخالف کہا جا سکتا تھا۔

ابو الحسن اشعری کے عقائد کو مسلمانوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مذہب اشعری کو اہلسنت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔

چنانچہ مقریزی نے امام اشعری کے عقائد و اصول کو بیان کرنے کے بعد لکھا:

''یہ امام اشعری کے اصول کا خلاصہ اور اجمال ہے۔ بلاد اسلامیہ میں رہنے والے افراد اُن پر عقیدہ رکھتے ہیں اور جو ان نظریات سے انحراف کرے اُس کا خون مباح ہے۔''[1]

اشعری کے نئے طرز فکر کی وجہ سے حنابلہ اور اشاعرہ میں کئی بار خونریز لڑائیاں ہوئیں اور اُن میں اختلافات کی آگ بھڑکتی رہی۔ حنابلہ تشبیہ و تجسیم کی روایات پر لفظ بہ لفظ ایمان رکھتے ہیں۔ حنابلہ ایسی صفات الٰہی کے قائل ہیں جو خدا کے شایان شان نہیں ہیں۔ اس کے برعکس اشاعرہ ان عقائد سے کوسوں دور ہیں۔ اگر ہم ان اختلافات سے صرف نظر کرلیں تو ہم معتزلہ کے ختم ہونے کے بعد اہلسنت کو دو گروہوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک گروہ اشاعرہ ہے اور دوسرا گروہ حنابلہ ہے۔ اس باب میں ہم دونوں مکاتب فکر کا بیان کریں گے۔

حنبلی (سلفی) مکتب

سلفی عقائد کو سمجھنے کے لیے اس کے تین تاریخی مراحل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۔ امام احمد بن حنبل کا دور

۲۔ ابن تیمیہ کا دور

۳۔ محمد بن عبدالوہاب کا دور

(۱) امام احمد بن حنبل کا دور

امام حنبل عقیدے کے لیے سماع پر انحصار کرتے تھے یعنی وہ اثبات عقائد کے لیے آیات اور احادیث پر انحصار کرتے تھے اور عقلی دلیل و برہان کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

عقل کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایک مقدمے کی ضرورت ہے کیونکہ سماع اس وقت ہی مؤثر ہوسکتا ہے جب انسان قرآن و حدیث کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ یہ حدیث رسول اکرمؐ کا ہی فرمان ہے۔

اگر کسی شخص کا خدا و رسولؐ پر ایمان نہ ہو یا وہ کلام رسولؐ پر اعتماد نہ رکھتا ہو یا پھر اسے سنائی جانے والی حدیث کے متعلق یقین نہ ہو تو پھر اس حالت میں سماع کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔ حدیث کو

۱۔ الخطط المقریزی ج ۲، ص ۳۶۰۔

کی تھی تو معتزلہ نے لوگوں سے جبراً اپنے عقائد منوائے تھے اور جو افراد بالخصوص اصحاب حدیث اُن کے نظریات کو ماننے میں تردد کرتے تھے تو انھیں سخت اذیتیں دی جاتی تھیں۔ معتزلہ کی اس روش کو دیکھ کر اُن کے مخالفین نے عقل کی حجیت کا ہی انکار کر دیا تھا۔ ورنہ اُن کے پاس عقل کو چھوڑ کر صرف متون پر انحصار کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں تھی۔

معتزلہ محض عقلیت پسند اور حنابلہ محض روایت پسند تھے۔ اُن کی کشمکش کی وجہ سے مشترک نکات پر بھی اُن کا اتفاق نہ ہوسکا۔ ہر گروہ نے شدت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنے اپنے نظریات کو الہامی نظریات کا درجہ دیدیا۔ اور اس شدت پسندی سے اس بنیادی مشکل کا حل نہ ہوسکا جس پر عقائد دین کی تفہیم کی اساس قائم تھی اور دینی عقائد کے لیے ایک ایسی اساس کی ضرورت ہے جس پر سب کا اتفاق ہوتا کہ دین فکر کے لیے وجہ مشترک ثابت ہوسکے۔

چنانچہ حنا الفاخوری اور خلیل الجر اپنی کتاب میں کہتے ہیں: "برہان کی دو اقسام ہیں ایک برہان عقلی ہے جو عقل اور مبانی عقل کے علاوہ اور کسی چیز پر انحصار نہیں کرتی اور دوسری برہان سمعی ہے جو قرآن، حدیث اور اجماع کی اساس پر قائم ہے۔ جب ہم معتزلہ کے طرز تفکر کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ برہان عقلی کے علاوہ کسی دوسری چیز کو ماننے پر تیار نہیں تھے اور اُن کا نظریہ یہ تھا کہ جس برہان سمعی کی تائید برہان عقلی سے نہ ہوتی ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے برعکس متکلمین بالخصوص اشاعرہ کا مکتب فکر ہے۔ جب ہم اس مکتب فکر کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ برہان عقلی کے منکر ہیں سوائے اس کے جس کا شریعت نے حکم دیا ہو۔

اشاعرہ کی نظر میں عقل کی کوئی اہمیت نہیں ہے البتہ اگر کسی مقام پر شرع عقل کی تائید کر دے تو یہ اور بات ہے۔[1]

محترم قاری! آپ نے ان دونوں مکاتب فکر کے فرق کو ملاحظہ فرمایا۔ یہ دونوں مکاتب فکر ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ اشاعرہ عقل کی افادیت و اہمیت کے سرے سے ہی منکر ہیں جبکہ معتزلہ عقل کے علاوہ اور کوئی بات سننے پر تیار ہی نہیں تھے۔ سوچ کے اس تضاد کی وجہ سے مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا ہوئے۔ اور اگر آج کوئی شخص یہ چاہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو تو اسے طرز تفکر کے اس اختلاف کا خاتمہ کرنا ہوگا اور افراط و تفریط پر مبنی دونوں قسم کی آراء کو چھوڑ کر درمیانی راستا اپنانا ہوگا جس میں عقل کی اہمیت بھی ہو اور سماع کا بھی مقام ہو۔ طرز تفکر کی وجہ سے اختلاف کتنا پیدا ہوتا ہے اس کے لیے اعمال عباد کے مسئلے کو ہی دیکھ لیں۔

۱۔ تاریخ الفلسفۃ العربیۃ ج ۱، ص ۱۷۹۔

حجت ماننے سے پہلے خدا و رسولؐ پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور کیا آیات و احادیث ایمان کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں یا نہیں؟ یہ ایک عجیب سا سوال ہے اور منطقی اصلاح میں اس مسئلے کو ہم یوں حل کر سکتے ہیں کہ کسی چیز کو خود اُس کے ذریعے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے "دور" لازم آتا ہے جبکہ باتفاق عقلاء دور باطل ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں۔

اگر ہم قرآن کریم کی ایک آیت کے ذریعے سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ سننے والا آیت پر ایمان رکھتا ہو۔ اگر وہ شخص آیت پر ایمان نہ رکھتا ہو تو ہم آیت کے ذریعے سے اُس پر حجت تمام نہیں کر سکتے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ آیت پر ایمان کے لیے وجود خدا پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور ہم "حد اوسط" کو حذف کر دیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آیت پر ایمان خود آیت پر ایمان پر موقوف ہے اور یہ بات بدیہی طور پر باطل ہے۔

اب ہم اپنے آپ سے پوچھیں گے کہ یہ وحی کس پر نازل ہوتی ہے؟ کیا وحی غیر انسان پر نازل ہوتی ہے؟ اور اگر وحی انسان پر ہی نازل ہوتی ہے تو اللہ نے وحی کو انسان کے لیے مخصوص کیوں کیا ہے؟ اس کی اول و آخر وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انسان کے پاس عقل جیسی گراں بہا دولت موجود ہے اسی لیے اسے وحی کا شرف دیا گیا ہے۔ اب وحی کے لیے عقل کو معیار ماننا پڑے گا۔ اس معیار کو تسلیم کیے بغیر وحی کا اثبات مشکل ہے۔

اسی مقام سے حنبلی طرز تفکر کے انحراف کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اس میں عقل کو اُس کا جائز مقام نہیں دیا گیا اور اس میں عقیدے کے استدلال کے لیے عقل کے تقاضوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ ہم سب اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جب تک کوئی دلیل عقل کے مطابق نہ ہو اُس وقت تک وہ ثابت اور قائم نہیں رہ سکتی۔ حنابلہ، حشویہ اور اشاعرہ کو یہ اشتباہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے حقیقت عقل کو پہچانا ہی نہیں تھا۔ اگر عقل کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو آپ کو تعلیمات آل محمدؐ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اس کے برعکس حنابلہ، حشویہ اور اشاعرہ کا موقف یہ ہے کہ عقل کبھی شریعت کے مطابق اور کبھی مخالف بھی ہو سکتی ہے اسی لیے عقل کو حجت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر عقل کو معمولی قسم کی حجت مان بھی لیا جائے تو بھی اسے یہ حجت شرع کی وجہ سے نصیب ہوگی۔

حنابلہ اور اُس کے ہم فکر افراد کی یہ رائے یکطرفہ ہے۔ دراصل یہ رائے معتزلی نظریات کا ردعمل ہے۔ معتزلی عقل کو ذاتی طور پر حجت کا درجہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ سمعی دلیل جو عقل کے منافی ہو اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب مامون، معتصم اور واثق جیسے عباسی خلفاء نے نظریہ اعتزال کی سرپرستی

معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے اور اگر انسان کو اُس کے اعمال کا خالق تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے عقل کے تقاضوں کی نفی لازم آئے گی۔ چنانچہ جب معتزلہ نے یہ نظریہ اپنالیا تو اس نظریے کی مخالفت میں جتنی بھی روایات تھیں انھوں نے اُن تمام روایات کو پس پشت ڈال دیا اور اس فکر کے بالکل برعکس حنابلہ یہ کہتے ہیں کہ انسانی اعمال کا اُس کے ذاتی ارادے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسانی اعمال ارادہ خداوندی سے مربوط ہیں جبکہ انسان اپنے معاملات میں مجبور ہے۔ پھر انھوں نے اپنے عقیدے کے اثبات کے لیے کچھ آیات اور کچھ احادیث کو بطور دلیل پیش کیا۔

حنابلہ کی پوری عمارت سماع پر قائم ہے اُن کے ہاں عقل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ امام حنبل نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ زنا، چوری، شراب خوری، حرام خوری، قتل، شرک اور اس کے علاوہ باقی جتنے بھی گناہ ہیں اُن سب کی بنیاد قضا و قدر پر ہے۔[1]

ضرورت عقل کی روایات

اگر ہم مسئلے کو پوری توجہ کے ساتھ دیکھیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اشاعرہ، حنابلہ اور معتزلہ نے حقیقت عقل کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ائمہ اہلبیتؑ کی کچھ روایات کا مطالعہ کریں۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: جب خدا نے عقل کو پیدا کیا تو اُس سے کہا کہ نزدیک آجا۔ حکم الٰہی سن کر عقل قریب ہوئی۔ پھر حکم ہوا کہ چلی جا۔ حکم سن کر وہ چلی گئی۔ اُس وقت خدا نے فرمایا: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو تجھ سے بہتر ہو۔ میرے امر و نہی کا تعلق تجھ سے ہوگا۔ میں تجھے ہی ثواب یا عذاب دوں گا۔[2]

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہشام بن حکم کے سامنے عقل کی اہمیت پر ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ زیادہ استفادہ کی غرض سے ہم اس خطبے کو یہاں اپنے قاری کے لیے نقل کرتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہل عقل کو اس طرح بشارت دی ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ○ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ○ (اے رسولؐ!) آپ میرے بندوں کو بشارت سنا دو جو بات سنتے ہیں اور جو بات اچھی ہوتی ہے اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں خدا نے ہدایت دی ہے

۱۔ شہرستانی، الملل والنحل ج ۱، ص ۱۴۳۔

۲۔ مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسولؐ ج ۱، ص ۸۳، حدیث ۲۶۔

اور یہی صاحبان عقل ہیں۔ (سورۂ زمر آیت ۱۷۔ ۱۸)

اے ہشام! خدا نے عقل کے ذریعے لوگوں پر حجت تمام کی ہے اور بیان کے ذریعے انبیاء کی مدد کی ہے اور دلائل کے ذریعے اُن کی اپنی ربوبیت کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

(لوگو) تمہارا معبود بس ایک ہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو دریاؤں میں لوگوں کے فائدے کے لیے چلتی ہیں اور اُس پانی میں جسے خدا آسمان سے برسا کر اُس کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے اور زمین میں طرح طرح کے چوپائے پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیے گئے بادلوں میں عقل مندوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۳۔۱۶۴)

اے ہشام! اللہ تعالیٰ نے اپنی شناخت کے لیے ان نشانیوں کو رہنمائی کا عنوان قرار دیا ہے کیونکہ ان اشیاء کے لیے مدبر کا ہونا ضروری ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

اسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور آفتاب اور ماہتاب کو کام میں لگا دیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۂ نحل، آیت ۱۲) نور

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

وہی تو (خدا) ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے۔ پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتا ہے پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ اور کوئی تم میں سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور کوئی اس لیے زندہ رکھا جاتا ہے کہ اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے تاکہ تم سمجھو۔ (سورۂ مومن: آیت ۶۷) نور

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں اور جو رزق خدا نے آسمان سے اتارا ہے جس کے ذریعے زمین کو اُس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا ہے اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۂ جاثیہ آیت ۵) (زور

اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

جان لو کہ خدا مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے۔ ہم نے تمام نشانیوں کو واضح کر کے بیان کر دیا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ (سورۂ حدید: آیت ۱۷) (زور

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَّجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں بعض کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور بعض کی اتنی نہیں ہوتیں باوجودیکہ پانی سب کو ایک ہی پانی ملتا ہے اور ہم بعض میووں کو بعض پر لذت میں فضیلت دیتے ہیں۔ یقیناً ان چیزوں میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۂ رعد آیت ۴) (زور

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

اسی کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بجلی کو خوف اور امید کا مرکز بنا کر تمھیں دکھلاتا ہے اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اُس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۂ روم آیت ۲۴) (زور

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

(اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا کیا حرام کیا ہے۔ خبردار کسی کو اس کا شریک نہ بنانا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ اپنی اولاد کو غربت کی وجہ سے قتل نہ کرنا کہ ہم تمھیں بھی رزق دے رہے ہیں اور انھیں بھی اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ اُن کے پاس نہ پھٹکنا اور کسی ایسے جاندار کو قتل نہ کرنا جس کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے سوائے حق

کے۔ خدا ان باتوں کی تمھیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورۂ انعام، آیت ۱۵۲) اور

هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے کیا اس میں تمہارے غلام اور کنیزیں بھی شریک ہیں کہ تم سب برابر ہو جاؤ اور تم اُن سے اس طرح سے ڈرو جس طرح اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔ ہم اس طرح سے عقل والوں کے لیے نشانیوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں۔ (سورۂ روم، آیت ۲۸)

ہشام! اللہ تعالیٰ نے اہل عقل کو نصیحت کرتے ہوئے اور آخرت کا شوق دلاتے ہوئے فرمایا ہے،

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشہ ہے جبکہ آخرت کا گھر تقویٰ رکھنے والوں کے لیے بہت اچھا گھر ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (سورۂ انعام، آیت ۳۲) اور

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا اور تم صبح و شام اُن (کی بستیوں) کے پاس سے گزرتے ہو تو کیا پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے؟ (سورۂ صافات: آیت ۱۳۶ تا ۱۳۸) اور

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

ہم اُس بستی والوں پر اُن کے فسق و فجور کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔ ہم نے عقل مندوں کے لیے اس بستی میں ایک واضح نشانی باقی رکھی ہے۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۳۴۔۳۵)

اے ہشام! عقل اور علم دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ○

ہم لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۳) اور

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

جب اُن لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۰) اور

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

جو لوگ کافر ہیں اُن کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے۔ یہ کفار بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۷۱) اور

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○

ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں لیکن کیا آپ بہروں کو بات سنا سکتے ہیں اگرچہ وہ کچھ بھی (سنتے) سمجھتے نہ ہوں۔ (سورۂ یونس، آیت ۴۲) اور

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے؟ (نہیں) یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ (سورۂ فرقان، آیت ۴۴) اور

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ○

یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے جنگ نہیں کر سکیں گے مگر یہ کہ بستیوں میں قلعہ بند ہو کر یا دیواروں کی اوٹ میں رہ کر۔ اُن کا آپس میں بڑا رعب ہے۔ تم شاید یہ خیال کرتے ہو کہ یہ سب متحد ہیں۔ ہرگز نہیں ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ (سورۂ حشر، آیت ۱۴) اور

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

کیا تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو جبکہ تم کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے؟ (سورۂ بقرہ: آیت ۴۴)

ہشام! اللہ تعالیٰ نے اکثریت کی مذمت کی ہے اور فرمایا ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اگر آپ روئے زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو راہ خدا سے بھٹکا دیں گے۔ (سورۂ انعام، آیت ۱۱۶) اور

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو یوں انھیں گے کہ اللہ۔ آپ کہہ دیں کہ تمام حمد اللہ کے لیے ہے لیکن اکثریت سمجھ نہیں رکھتی۔ (سورۂ لقمان، آیت ۲۵) اور

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ لیکن ان کی اکثریت بے علم ہے۔ (سورۂ اعراف: آیت ۱۳۱) اور
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ ان کی اکثریت بے عقل ہے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۱۰۳) اور
اَكْثَرُهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ ان کی اکثریت ناشکری ہے۔ (سورۂ یونس: آیت ۶۰)
ہشام! اللہ نے اقلیت کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے
وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ○
میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔ (سورۂ سبا: آیت ۱۳) اور
وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ شکر گزار اتفاقاً کم ہوتے ہیں۔ (سورۂ ص: آیت ۲۴) اور
وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ .
آل فرعون میں اس مرد مومن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہ کیا تم اس شخص کو قتل کرو گے جس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ (سورۂ مومن: آیت ۲۸) اور
وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ اس پر تھوڑے ہی آدمی ایمان لائے تھے۔ (سورۂ ہود: آیت ۴۰)
ہشام! اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے اہل عقل کو بہترین نام دیا اور انھیں بہترین لباس پہنایا۔ چنانچہ ارشاد اقدس الٰہی ہے
يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ ○
وہ جسے چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۶۹) اور
وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ ○
وہ جو علم میں پختہ ہیں کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اہل عقل کے علاوہ اور کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۷) اور
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ○
یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۹۰) اور
اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○
بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے۔ بس سمجھتے وہی ہیں جو عقل مند ہیں۔ (سورۂ رعد: آیت ۱۹) اور
اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ

يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ○

(بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں خدا کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ آپ کہہ دیں کہ کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو عقل مند ہیں۔ (سورۂ زمر: آیت ۹) اور

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ○

یہ کتاب جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور اہل عقل نصیحت حاصل کریں۔ (سورۂ ص: آیت ۲۹) اور

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَى وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ○ هُدًى وَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ ○

ہم نے موسیٰ کو (کتاب) ہدایت عطا کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنایا جو عقل والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ (سورۂ مومن: آیت ۵۳۔۵۴) اور

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ○ آپ یاد آوری کرتے رہیں یقیناً یاد آوری اہل ایمان کو فائدہ دیتی ہے۔ (سورۂ ذاریات: آیت ۵) اور

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ ... یقیناً ان باتوں میں اس کے لیے یاد آوری ہے جس کے پاس دل ہو۔ (سورۂ ق: آیت ۳۷) یہاں دل سے عقل مراد ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ

ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا کی۔ (سورۂ لقمان: آیت ۱۲)

ہشام! لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا حق کے سامنے تواضع اختیار کرنا تاکہ تو سب سے بڑا عقل مند بن سکے۔ ہوش و حواس رکھنے والا شخص صاحب حق کی طرف جاتا ہے۔

بیٹا! یہ دنیا ایک گہرا سمندر ہے۔ اس میں بہت سی مخلوق ڈوب چکی ہے۔ اس سمندر میں تیرا کی کے لئے تیرے پاس تقویٰ کی کشتی ہونی چاہیے جس کا پیندہ ایمان اور بادبان توکل ہو۔ اور اس کشتی کا ملاح عقل، رہنما علم اور دلیل صبر ہونا چاہیے۔

ہشام! ہر چیز کی ایک دلیل ہوتی ہے اور عقل کی دلیل غور و فکر کرنا ہے اور غور و فکر کی دلیل خاموشی ہے۔ ہر چیز کی ایک سواری ہوتی ہے اور عقل کی سواری تواضع ہے۔ تمہاری جہالت کے ثبوت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جس چیز سے خدا نے منع کیا ہے تم اسے انجام دو۔

ہشام! خداوند عالم نے انبیاء و مرسلین کو بندوں کی طرف اس لیے بھیجا تاکہ بندے خدا کے

متعلق سوچ بچار کریں۔ جو بہتر انداز میں لبیک کہتا ہے اس کی معرفت بہتر ہوتی ہے اور جو خداوند عالم کے اوامر کو سب سے زیادہ جانتا ہے وہ بہتر عقل رکھتا ہے اور جس کی عقل کامل ہو وہ دنیا و آخرت میں بلند ترین مقام حاصل کرے گا۔

ہشام! خدا نے انسان کو دو حجتیں عطا کی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ظاہری حجت خدا کے نمائندے ہیں۔ نمائندوں سے انبیاءؑ و ائمہؑ مراد ہیں اور باطنی حجت عقل ہے۔

ہشام! عقل مند وہ ہے جسے حلال شکر سے باز نہ رکھے اور حرام اُس کا صبر نہ چھین لے۔[1]

ہشام! جو شخص تین چیزوں کو تین چیزوں پر مسلط کرے وہ اپنی عقل کی تباہی کا خود ذمہ دار ہے۔

جو شخص نور تفکر کو طویل آرزوؤں سے تاریک بنا دے اور حکمت کے حسن کو اپنی بیہودہ باتوں سے ختم کر دے اور عبرت آموزی کے نور کو اپنی خواہشات سے بجھا دے اس نے ہوائے نفس کے ذریعے اپنی عقل کو ختم کر دیا اور جس نے اپنی عقل کو ختم کر دیا اُس نے اپنے دین و دنیا کو تباہ کر لیا۔

ہشام! تیرا عمل خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کیسے پائے جبکہ تو نے اپنے دل کو امر پروردگار سے ہٹا کر دوسری چیزوں میں مشغول اور ہوائے نفس کے ذریعے اپنی عقل کو کمزور کر رکھا ہے۔

ہشام! تنہائی پر صبر کرنا عقل مندی کی علامت ہے۔ جو کوئی اللہ کے متعلق غور و فکر کرے گا وہ اہل دنیا اور طالبان دنیا کو چھوڑ دے گا اور اپنا دل اُن چیزوں سے لگائے گا جو خدا کے پاس ہیں۔ خدا وحشت کی گھڑیوں میں اس کا مونس اور تنہائی کے لمحوں میں اُس کا مددگار ہوگا۔ فقر سے اسے بے نیاز کر دے گا اور قوم قبیلہ نہ ہونے کے باوجود عزت سے سرفراز فرمائے گا۔

ہشام! حق اطاعت خداوندی کے لیے برقرار ہوا ہے اور اطاعت الٰہی کے سوا نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اطاعت کا تعلق علم سے ہے اور علم حافظے میں حضر ہے اور حافظہ عقل میں پنہاں ہے اور علم وہ ہے جو کسی عالم ربانی کے پاس ہو اور علم کی پہچان عقل ہی کر سکتی ہے۔

ہشام! عالم کا تھوڑا سا عمل بھی مقبول ہے اور کئی گنا ثواب کا موجب ہوتا ہے جبکہ خواہشات کے پیروکاروں اور اہل جہالت کا زیادہ عمل بھی مردود ہے۔

ہشام! عالم دنیا کے تھوڑے سے ساز و سامان پر بھی راضی ہوتا ہے اگر حکمت کے ساتھ ہو لیکن عالم باری دنیا پا کر بھی حکمت کے قلیل حصے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تجارت نفع بخش قرار پاتی ہے۔

۱۔ مقصد یہ ہے کہ اگر حلال ذرائع سے اپنی حاجت حاصل کرنے تو شکر کرے اور اگر حاجت کا حصول حرام ذرائع کے سوا ممکن نہ ہو تو پھر صبر کرے۔

ہشام! عقل مند دنیا کے بیہودہ کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں گناہوں کی تو بات ہی اور ہے۔ ترک دنیا فضیلت ہے جبکہ ترک گناہ واجب ہے۔

ہشام! عقل مند نے جب دنیا اور اہل دنیا کو غور سے دیکھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سخت محنت کے بغیر دنیا نہیں مل سکتی اور جب اُس نے آخرت کو غور سے دیکھا تب بھی اسی نتیجے پر پہنچا کہ آخرت بھی سخت محنت کے بغیر نہیں مل سکتی چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ سخت محنت کر کے اُس چیز کو حاصل کرے جو جاودانی ہے۔

ہشام! عقل مند نے دنیا سے زہد اختیار کیا اور آخرت کا مشتاق بنا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ دنیا طالب بھی ہے اور مطلوب بھی اسی طرح آخرت طالب بھی ہے اور مطلوب بھی۔ جو آخرت کو طلب کرے گا دنیا اسے اپنی طرف بلائے گی کہ آؤ مجھ سے اپنے حصے کا رزق لے لو اور جو طالب دنیا ہوگا آخرت اسے طلب کرے گی اور پھر موت اسے آلے گی۔ یوں وہ اپنی دنیا و آخرت تباہ کر دے گا۔

ہشام! جو شخص دولت کے بغیر بے نیازی اور حسد کے بغیر اطمینان قلب اور دین کی سلامتی چاہتا ہو اسے چاہیے کہ وہ خشوع و خضوع کے ساتھ خدا سے اپنی حاجت طلب کرے اور یہ دعا کرے کہ خدا اُس کی عقل کو کامل کر دے کیونکہ جو عقل مند ہوگا وہ اسی مقدار پر قناعت کرے گا جو اُس کے لیے کافی ہو اور جو کافی مقدار پر قانع ہو وہ بے نیاز ہو جائے گا اور جو اُس مقدار پر قناعت نہ کرے جو اُس کے لیے کافی ہو تو وہ بے نیازی حاصل نہیں کر سکے گا۔

ہشام! اللہ تعالیٰ نے ایک نیک قوم کے متعلق حکایت کی ہے کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ دل ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور دلوں کی روشنی تاریکی میں بھی بدل جاتی ہے تو انھوں نے اپنے رب سے یہ التجا کی رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً . یعنی اے ہمارے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت دی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دینا اور اپنی طرف سے ہمیں رحمت عطا کرنا۔ (سورۂ آل عمران آیت ۸)

جو شخص خدا کے متعلق غور و فکر نہیں کرے گا وہ خدا ترس نہیں بن سکے گا اور جو شخص خدا کے متعلق غور و فکر نہیں کرے گا اُس کا دل بصیرت و معرفت پر باقی نہیں رہ سکے گا۔ ایسا شخص اپنے دل میں معرفت کی حقیقت کو حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا کے متعلق غور و فکر وہی کرے گا جس کی زبان اس کے عمل کی تصدیق کرنے والی ہوگی اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد نہیں ہوگا۔ جب تک عاقلانہ بات نہ کی جائے تب تک خدا عقل کی مخفی باتوں کو واضح نہیں کرتا۔

ہشام! امیر المومنینؑ فرمایا کرتے تھے۔

عقل سے بہتر کوئی چیز ایسی نہیں جس سے خدا کی عبادت کی گئی ہو اور جب تک کسی شخص میں یہ چند خصوصیات پیدا نہ ہوں اُس وقت تک اس کی عقل کو کامل نہیں سمجھا جاسکتا

۱۔ اس نے کفر و شرک نہ کیا ہو۔
۲۔ اس سے بھلائی کی امید کی جاتی ہو۔
۳۔ زائد دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کرتا ہو۔
۴۔ بیہودہ گفتگو سے پرہیز کرتا ہو۔
۵۔ دنیا سے بقدر ضرورت حصہ لیتا ہو۔
۶۔ پوری زندگی حصول علم سے سیر نہ ہو۔
۷۔ شہرت کی بجائے گمنامی سے پیار کرتا ہو۔
۸۔ خدا کو کھو کر عزت پانے سے خدا کو پا کر ذلت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔
۹۔ دوسروں کی معمولی نیکی کو زیادہ اور اپنی زیادہ نیکی کو کم تصور کرتا ہو۔
۱۰۔ تمام لوگوں کو اپنے سے بہتر اور اپنے کو تمام لوگوں سے کم تر سمجھتا ہو۔

یہ خصوصیات تمام نیکیوں کی بنیاد ہیں۔

ہشام! عقل مند جھوٹ نہیں بولتا اگرچہ خواہش نفس اُس سے جھوٹ کا مطالبہ کیوں نہ کرے۔

ہشام! جس میں مروت (غیرت، جواں مردی اور انسانیت) نہیں اُس میں دین نہیں اور جس میں عقل نہیں اُس میں مروت نہیں۔ آدمیوں میں سے وہ آدمی قیمتی ہے جو دنیا کو اہمیت نہ دیتا ہو۔ تمہاری جان کی قیمت جنت کے سوا اور کچھ نہیں لہٰذا اپنی جان کو جنت کے سوا دوسری قیمت پر نہ بیچو۔

ہشام! امیرالمومنینؑ فرمایا کرتے تھے کہ عقل مند وہ ہے جس میں یہ تین خصوصیات ہوں

۱۔ جب اس سے کوئی سوال کیا جائے تو جواب دے۔
۲۔ جب دوسرے بات کرنے سے عاجز آجائیں تو بات کرے۔
۳۔ ہمیشہ ایسا مشورہ دے جس میں سب کا فائدہ ہو۔

اگر کسی شخص میں ان خصوصیات میں سے کوئی ایک خصوصیت کم ہو وہ احمق ہے۔

ہشام! امیرالمومنینؑ نے فرمایا تھا صدر مجلس میں اُس شخص کو بیٹھنا چاہیے جس میں یہ تینوں خصوصیات یا ان میں سے ایک خصوصیت موجود ہو۔ جس شخص میں کوئی خوبی نہ ہو پھر بھی صدر مجلس میں بیٹھے وہ احمق ہے اور امام حسن مجتبیٰؑ نے فرمایا تھا اگر تم حاجت مند ہو تو اسے اُس کے اہل افراد سے طلب کرو۔

لوگوں نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ! اہل افراد کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جنھیں اللہ نے اپنی کتاب میں اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورۂ زمر آیت ۹) کہہ کر یاد کیا ہے یعنی عقل مند لوگ۔

ہشام! امام زین العابدینؑ کا ارشاد گرامی ہے نیک لوگوں کی صحبت نیکی کی ترغیب دیتی ہے۔ علماء کے آداب سیکھنا عقل کو بڑھاتا ہے اور عادل حکمران کی اطاعت عزت کا کمال ہے۔ حلال روزی کمانا جوانمردی کا کمال ہے اور مشورہ مانگنے والے کو اچھا مشورہ دینا حق نعمت کی ادائیگی ہے۔ دوسروں کو اذیت نہ دینا عقل کا کمال اور حال و مستقبل میں جسم کی راحت کا سبب ہے۔

ہشام! عقل مند اس شخص کے سامنے نہیں بولتا جس سے تکذیب کا اندیشہ ہو، اُس سے نہیں مانگتا جس سے انکار کا خوف ہو، اُس کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس کے کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اُس شخص سے امید نہیں باندھتا جو امید پوری نہ کرے اور اگر اُس کا خیال ہو کہ کوئی کام دشوار ہے اور اُس سے بگڑ جائے گا تو اُس کام کو نہیں کرتا۔ [1]

الغرض کتب احادیثؑ میں ایسی کئی روایات موجود ہیں جن میں اہمیت عقل کو واضح کیا گیا ہے۔

عقل خدا کا عطا کردہ وہ نور ہے جس سے انسان حقائق اشیا کا علم حاصل کرتا ہے۔ عقل ایک علیہ الٰہی ہے۔ اسے انسان کا ذاتی امر نہیں سمجھنا چاہیے جو قوت سے فعل کی طرف منتقل ہوتا ہو۔ فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ عقل انسان میں موجود قوت کا نام ہے جس سے وہ "تصوری" کا انکشاف کرتا ہے مثلاً اجتماع نقیضین محال ہے اور ہر متغیر حادث ہے۔ جب کوئی شخص کسی تصوری کا انکشاف کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ مرحلہ عقل پر پہنچ چکا ہے۔ عقل مراتب نفس میں سے ایک مرتبہ ہے یعنی جب نفس منزل کمال پر پہنچتا ہے تو "حضرت انسان" عقل مند کہلاتا ہے۔

جب ہم نتائج کو خواہ وہ بیس واسطوں سے ہی کیوں نہ حاصل ہوئے ہوں ضروریات سے ملاتے ہیں تو انھیں "معقولات" کا نام دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ کو عقل کے سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ انھوں نے عقل کو معقول اور علم کو معلوم کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ وہ معلوم و معقول کے چکر میں جا پھنسے ہیں اور اس نور سے غافل ہو گئے ہیں جو "تعقل اشیاء" کی بنیاد ہے اور یہ حقیقی گمراہی ہے۔

ہم اپنے وجدان سے اس نور کی پہچان کر سکتے ہیں جس کے ذریعے سے حقائق اشیا کی شناخت کی جاتی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نور نہ تو ہماری ذات کا حصہ ہے اور نہ ہی ہماری معلومات کا حصہ ہے۔ یہ ایک خدا کا فیضان ہے۔ اس کے ذریعے سے خدا نے انسان کو علم دیا ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم حقائق اشیا کا ادراک کرتے ہیں ورنہ بچپنے میں یہ عقل کہاں ہوتی ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے

---

[1] مرآۃ العقول ج ۱، ص ۳۹۔۳۵۔

آگاہ ہے کہ اگر عقل فیضان الٰہی کے بجائے انسان کے نفس کا حصہ ہوتی تو پھر کسی بھی وقت انسان سے جدا نہ ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکم سے برآمد کیا تو تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (سورۂ نحل آیت ۷۸)

اس آیت میں ہمیں عقل اور علم کی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ عقل اور علم دونوں نور ہیں اور جب ہم نے شکم مادر سے دنیا میں قدم رکھا تھا تو اس وقت ہم ان دونوں سے محروم تھے لیکن بعد میں خدا نے ہمیں علم اور عقل کی دولت سے نوازا۔ ہمیں کھلے دل سے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ دونوں نعمتیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اگر یہ ہم میں پہلے سے موجود ہوتیں تو بچپن میں بھی ہوتیں۔

حضرت رسول اکرمؐ نے اس حقیقت کو اس طرح سے بیان فرمایا ہے "جب کوئی بچہ بالغ ہوتا ہے تو اس کے دل سے ایک پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور انسانی دل میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان واجب و مستحب سمجھنے اور بھلے برے کی تمیز کرنے لگ جاتا ہے۔ عقل کا دل میں وہی مقام ہے جو گھر میں چراغ کا ہے۔"

جس طرح وحی نور الٰہی اور معصوم عن الخطاء ہے اسی طرح عقل بھی نور الٰہی اور معصوم عن الخطاء ہے۔ عقل اور وحی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عقل اور وحی ایک ہی چراغ کے دو پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو نور اول یعنی عقل سے نوازا پھر نور ثانی یعنی وحی (بصورت قرآن و حدیث) عطا فرمائی اور یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل اور تصدیق کرتے ہیں۔

عقل اور وحی کے درمیان جو تعلق ہے وہ "بڑھاوا دینے" کا ہے۔ جناب امیرؑ نے انبیاءؑ کی ذمے داریاں بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا "انبیاءؑ اس لیے آئے تاکہ چراغ عقل کی لو کو بڑھا دیں۔"

لہٰذا قرآن مجید کی تعلیمات کے عقلی بنیاد پر استوار ہونے کی بنا پر جو کہ "ذکر" پر قائم ہیں عقل میں اور وحی میں کوئی دوری نہیں ہے۔ عقل سلیم وہ ہے جو وحی کے زیر سایہ پروان چڑھے، وحی کے سرچشمے سے قوت حاصل کرے اور منزل مقصود تک پہنچے لہٰذا ایسی عقل جس کی رہنما وحی ہو اسے کشف معارف کے لیے "معیار" بنایا جا سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف ہوا اور مختلف مذاہب وجود میں آئے۔

اصحاب حدیث نے فکری جمود کی وجہ سے متون حدیث کے ظاہری الفاظ پر اکتفا کیا اور معتزلہ نے تاویل سے کام لیا جبکہ اشاعرہ نے کوشش کی کہ کسی طرح سے تاویل اور متن پر عمل کو یکجا کیا جا سکے۔ اس کے برعکس فلاسفہ نے بالکل الگ راستے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی تخلی

قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حقائق کا ادراک کر سکتا ہے مگر ان کا کوئی گروہ آج تک حقیقت تک نہیں پہنچ سکا ہے۔

حنابلہ کے پاس عقلی طور پر ترک عمل کی بظاہر کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ حنابلہ نے عقل پر چار حرف بھیج کر اپنے آپ کو متون کا پابند کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی آدمی حنابلہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس فرقے کے بہت سے عقائد عقل اور فطرت سے متصادم ہیں۔ حنابلہ ایسی روایات پر ایمان رکھتے ہیں جن سے خدا کی تشبیہ و تجسیم لازم آتی ہے۔ ان کے عقائد یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ تجسیم، تشبیہ، رؤیت باری اور جبر جیسے عقائد جو اہل کتاب کے عقائد تھے حنابلہ کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ان کے اشتباہ کی اصل وجہ احادیث کے متعلق ان کا غلط طرز فکر تھا۔ انھوں نے مفہوم حدیث میں غور و فکر اور اسناد حدیث میں تحقیق نہیں کی اور نہ ان کو قرآن و عقل کی کسوٹی پر پرکھا بلکہ ان کے ظاہری الفاظ پر عقیدہ قائم کر لیا۔ حنابلہ اس قدر عامیانہ تقلید کے خوگر ہیں کہ ان کو جو بھی حدیث ملی انھوں نے اس پر عمل کر لیا اور یہ نہیں دیکھا کہ وہ حدیث معصوم تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں، اس کی کوئی سند بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو سند صحیح ہے یا نہیں۔ انھوں نے یہ تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ حدیث شاذ یا ناقابل قبول تو نہیں۔ نیز کہیں یہ حدیث "اسرائیلیات" سے تعلق تو نہیں رکھتی مثلاً کعب الاحبار اور وہب بن منبہ (اور تمیم داری) کی بیان کردہ تو نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ان کی حدیث نوازی کی انتہا یہ ہے کہ حدیث خواہ شرعی متون اور عقل و حواس کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ حجت کا درجہ رکھتی ہے اور جو ان احادیث کا انکار کرے وہ کافر اور جو ان پر عمل نہ کرے وہ فاسق ہے۔[1]

اگر ہم ہر جھوٹی جھوٹی حدیث پر ایمان رکھنے لگیں تو اسلامی عقائد ہزاروں خودساختہ احادیث اور اسرائیلیات کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ حنابلہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف اُن کا گروہ کتاب و سنت کا پیرو ہے اور باقی لوگ یا تو گمراہ ہیں یا کافر ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ تمام مسلمان سنت رسولؐ کی حجیت کا اقرار کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ باقی مسلمانوں کا حنابلہ سے سنت پر اور اُس کی حجیت پر اختلاف نہیں ہے، اختلاف حنابلہ کے طرز عمل پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا رسول خداؐ سے مروی ہر حدیث کو آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیے یا اس کی سند اور متن کی تحقیق بھی کرنی چاہیے؟ باقی مسلمان کہتے ہیں کہ حدیث کی سند اور اس کے متن کی تحقیق کرنی چاہیے پھر اس پر عمل کرنا چاہیے جبکہ حنابلہ حدیث کے متعلق کسی طرح کی تحقیق کو ضروری نہیں جانتے اور اندھا دھند ایمان رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ غالباً اسی لیے زمخشری نے کہا تھا:

۱۔ مفتی محمد عبدہ کے شاگرد جناب رشید رضا کی تقریر کا اقتباس بحوالہ الانوار علی السنۃ المحمدیۃ از علامہ محمود ابوریہ ص ۲۳۔

وَاِنْ قُلْتُ مِنْ اَهْلِ الْحَدِيْثِ وَجَزْمِهٖ
يَقُوْلُوْنَ تَيْسٌ لَيْسَ يَدْرِيْ وَيَفْهَمُ

اور اگر میں کہتا ہوں کہ میں اہلحدیث ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو نرا بکرا ہے۔ اس کے پاس عقل و دانش نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

رسول خداؐ نے فرمایا: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ جو کوئی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں سمجھ لے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہ پیشگوئی فرمادی تھی کہ دشمنان اسلام آپ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کریں گے[1] اور اس طرح

۱۔ استاد مرتضیٰ مطہری اپنی کتاب سیری در سیرت نبوی میں رقم طراز ہیں۔
ایک شخص نیک نیتی سے لوگوں کی ہدایت کرنا چاہتا ہے، اس کی کوئی دنیاوی غرض نہیں ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں پیغمبر اکرمؐ یا ائمہ اطہارؑ سے منسوب کرکے کوئی حدیث بیان کروں تو لوگ ان مبارک ناموں کی وجہ اس حدیث کو قبول کرلیں گے مثلاً سوچتا ہے کہ لوگ اس قدر فضیلت یا فضول باتیں کرتے ہیں تو ان کو اس سے روکنے کے لئے اگر میں فلاں دعا کی فضیلت میں ایک حدیث گھڑ لوں تاکہ لوگ وہ دعا پڑھیں یا کسی سورہ کی تلاوت کے ثواب کے بارے میں حدیث گھڑ لوں کہ فلاں فلاں سورہ اگر چالیس مرتبہ مسلسل پڑھیں تو یہ اثر ہوگا۔ اس شخص کا مقصد بھی نیک ہے اور نیت بھی اچھی ہے لیکن کیا جھوٹ بول کر یا حدیث گھڑ کر اس نیک مقصد کو حاصل کرنا چاہیے؟! کیا یہ اچھی بات ہے؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔ تاریخ میں بہت سے لوگوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایک حدیث ہے جو تفسیر کی بیشتر کتابوں میں آئی ہے اور غالباً مجمع البیان کے مقدمے میں بھی آئی ہے نیز میں نے دوسری کتابوں میں بھی دیکھی ہے۔ یہ حدیث "تلاوت قرآن کے فضائل" کے بارے میں ابی بن کعب سے نقل ہوئی ہے مثلاً سورۂ انعام کی فضیلت اور اسے پڑھنے کا ثواب، سورۂ غاشیہ کی فضیلت اور اسے پڑھنے کا ثواب، سورۂ یٰسین پڑھنے کا ثواب، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران پڑھنے کا ثواب وغیرہ۔ ہر ایک سورہ کے لیے ایک بات کہی گئی ہے۔ یہ سب "فضائل اور ثواب" پیغمبر اکرمؐ سے روایت کئے گئے ہیں۔ ایک آدمی اس شخص کے پاس گیا جو انھیں روایت کر رہا تھا اور اس سے پوچھا بھائی! آخر کیا وجہ ہے کہ صرف تم ہی یہ احادیث بیان کرتے ہو۔ تمہارے سوا کوئی بھی ان کو روایت نہیں کرتا؟ اس نے کہا بھائی! اگر سچ پوچھتے ہو تو درحقیقت ان احادیث کو میں نے رضائے الٰہی کے لیے گھڑا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ لوگ محفلوں میں زمانۂ جاہلیت کے قصے بیان کرتے ہیں اور دور جاہلیت کے اشعار پڑھتے ہیں تو میں نے سوچا کہ لوگ وقت ضائع کر رہے ہیں چنانچہ میں نے اس بیہودہ کام کی جگہ لوگوں کو تلاوت قرآن کی طرف مائل کرنے کے لئے ان احادیث کو پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کرکے نقل کردیا۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟؟
دوسرا آدمی آتا ہے اور ایک خاص مقصد کے لیے ایک خواب گھڑ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس خواب کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کر رہا ہے۔ کیا یہ کام درست ہے کہ انسان نیک مقصد کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرے؟ نہیں۔ یہ غلط کام ہے۔
حضرت علامہ طباطبائی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر المیزان میں لکھا ہے۔ تمام انبیائے کرامؑ اور حضرت رسول اکرمؐ نے تبلیغ رسالت کے جن آداب کا خیال رکھا ہے اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بزرگوار "حق" تک پہنچنے کے لیے ہرگز "باطل" سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ وہ حق تک پہنچنے کے لیے حق ہی سے استفادہ کرتے تھے۔ (رضوانی)

اسلام کو بگاڑنے کی کوششیں کریں گے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ حدیث کا مطالعہ علمی اور منطقی انداز سے کیا جائے۔ حنابلہ کی طرح سے آنکھیں بند کرکے مطالعہ کرنے سے نفع کی بجائے نقصان ہوگا۔ حنابلہ ہر حدیث پر ایمان رکھتے ہیں خواہ معقول ہو یا نہ ہو۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ حدیث آیت کے مطابق ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام حنبل لکھتے ہیں احادیث جس طرح سے ہم تک پہنچی ہیں اور راویوں نے جس طرح سے نقل کی ہیں ہم بھی اسی طرح ان کو نقل کر رہے ہیں۔ ہم ان احادیث پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔[1]

راوی کہتا ہے کہ علی بن عیسیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ ایک حنبلی نے امام حنبل سے پوچھا کہ ان احادیث کا کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں زمین پر رکھتا ہے تو امام حنبل نے کہا کہ ہم ان احادیث پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہم "کیوں" اور "اس کا کیا مطلب ہے" جیسے الفاظ نہیں کہتے۔ ہم احادیث کو تصویر کا رنگ نہیں دیتے اور احادیث کی تاویل کرکے اُن سے انحراف نہیں کرتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے۔ ہم کسی حدیث کو رد نہیں کرتے۔[2]

حنابلہ کی روش یہ ہے کہ وہ کسی حدیث کو رد نہیں کرتے۔ وہ تمام احادیث کو قبول کرتے ہیں۔ اُن کی بے ربط توجیہات انتہائی مضحکہ خیز ہیں جبکہ صفات خداوندی سے متعلق چند احادیث سے تجسیم و تشبیہ کے تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ حنابلہ کا ایک گروہ "حشویہ" یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے۔

شہرستانی لکھتے ہیں کہ حشویہ تشبیہ کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا سے مصافحہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کے بدن کو چھوا بھی جا سکتا ہے نیز اگر مسلمان خلوص کے ساتھ خدا کی عبادت کریں تو وہ دنیا و آخرت میں خدا کے ساتھ گلے بھی مل سکتے ہیں۔[3]

احادیث تجسیم کے چند نمونے

تجسیم کے مفہوم پر مبنی احادیث کے چند نمونے ہم کتاب السنۃ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ وہ احادیث ہیں جنھیں امام حنبل کے فرزند عبداللہ نے اپنے والد امام حنبل سے نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ابن خزیمہ کی کتاب التوحید سے بھی چند روایات پیش کریں گے۔

۱۔ شہرستانی، الملل والنحل ج ۱، ص ۱۶۵۔

۲۔ محمد بن عبدالوہاب، رسالہ ہائے عقائد الاسلام ص ۱۵۵۔

۳۔ شہرستانی، الملل والنحل ج ۱، ص ۹۶۔

۱۔ عبداللہ نے اپنے والد امام حنبل سے اور انھوں نے اپنی سند سے حضرت رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہمارا پروردگار اپنے کچھ بندوں کی ناامیدی اور کچھ بندوں کے تقرب کی وجہ سے ہنستا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کیا خدا بھی ہنستا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پھر ہم اپنے خدا کے ہنسنے کی بھلائی سے بے نصیب رہیں گے۔[1]

اس کے علاوہ اور روایات بھی موجود ہیں جن میں خدا کے ہنسنے کا ذکر موجود ہے۔

۲۔ عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کے سامنے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد انھوں نے حدیث کی اسناد سعید بن جبیر تک بیان کیں۔ راویوں نے کہا کہ الواح ایک یاقوت سے حاصل کیے گئے ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کہا ہو کہ یاقوت سرخ تھا یا نہیں؟

میں کہتا ہوں کہ سعید نے کہا ہے کہ ان کا تعلق ایک زمرد سے تھا اور اُس پر سونے سے لکھا گیا تھا۔ وہ تحریر خدائے رحمان نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھی اور لکھتے وقت قلم سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اسے آسمان پر رہنے والوں نے سنا تھا۔[2]

۳۔ عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا۔ انھوں نے اپنی اسناد سے ابو عطا سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے اپنے ہاتھ سے مرواریدکے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے لیے الواح لکھ رہا تھا اور حضرت موسیٰؑ قلم چلنے کی آواز سن رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بس ایک حجاب حائل تھا۔[3]

محترم قاری! اب یہ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں کہ کیا ان روایات سے تجسیم و تشبیہ کے عقیدے کا اظہار نہیں ہوتا؟

جی ہاں! یہ روایات تجسیم و تشبیہ کو ثابت کرتی ہیں اور جو شخص ان روایت کو تسلیم کرکے کہے کہ وہ خدا کو تخیل و تصور کی حدود میں محدود نہیں سمجھتا وہ جھوٹا ہے۔ جو لوگ اس طرح کی روایت کے قائل ہیں وہ خدا کو تصور و توہم میں مقید قرار دیتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے بھائی نے ایک وہابی شیخ سے جو کہ حنبلی فکر کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے صفات الٰہی کے بارے میں بحث کی۔ میرے بھائی کا اصرار تھا کہ خدا ان صفات سے پاک ہے اور اُس نے اس عقیدے کی تردید کے لیے ہر ممکن دلائل دیئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں میرے بھائی نے پوچھا: اگر خدا کو ان صفات جسمانیہ سے متصف مان لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا کا

۱۔ کتاب السنہ ص ۵۶، حدیث ۲۶۲۔ ۲۔ ایضاً ص ۷۶، حدیث ۳۸۲۔ ۳۔ ایضاً ص ۷۶، حدیث ۳۸۳۔

چہرہ ہے اور اُس کے دو ہاتھ، دو پاؤں اور دو آنکھیں ہیں تو کیا انسان یہ صفات سن کر اُس کا تصور نہیں کرے گا؟ جبکہ یہ بات یقینی ہے کہ انسان اسے اپنے تصورات کی دنیا میں لے آئے گا اور اپنے ذہن میں اُس کا ہیولا قائم کرے گا جبکہ خدا تصور کی حدود سے بلند ہے۔

وہابی شیخ نے کہا کہ اگر تم اپنے ذہن میں خدا کا تصور قائم کرلو تو آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ البتہ دوسروں کو اس کی خبر مت دو...!!

میرے بھائی نے کہا کہ ایک شخص بت تراش کر اُس کی عبادت کر رہا ہے اور آپ ذہن میں خدا کا ہیولا تراش کر اُس کی عبادت کر رہے ہیں۔ اب یہ بتائیں کہ اس بت پرست اور آپ کے درمیان کیا فرق ہے؟

وہابی شیخ نے کہا تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ رافضیوں کی گفتگو ہے۔ خدا اُن کے چہروں کو سیاہ کرے۔ وہ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ خدا کو ان صفات سے متصف نہیں مانتے۔ وہ ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

میرے بھائی نے کہا: عقول حق سبحانہ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں اور آنکھیں اسے دیکھنے سے عاجز ہیں اور اُس کے لیے "کہاں" کا لفظ کہنا صحیح نہیں ہے اور "کس طرح" کے الفاظ اُس کے شایان شان نہیں ہیں کیونکہ "کب اور کہاں اور کس طرح" جیسی کیفیات کا وہ خالق ہے۔ خدا وہ ہے جو تمہارے تصور کی حدوں سے بلند ہو اور جو تمہارے تصور میں سما جائے وہ خالق نہیں، مخلوق ہے۔ ائمہ اہلبیتؑ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کُلُّ مَا تَصَوَّرْتُمُوْهُ فِیْ اَدَقِّ مَعَانِیْهِ فَهُوَ مَخْلُوْقٌ مِثْلُكُمْ مَرْدُوْدٌ اِلَیْكُمْ جس چیز کا تم نے اُس کے گہرے معنی کے ساتھ تصور کیا ہے وہ تمہاری طرح کی ہی مخلوق ہے اور تمہاری طرف پلٹے گی۔ چنانچہ خدا کی پہچان کا کمال اُس کے نہ پہچاننے میں ہے۔

وہابی شیخ نے غصے سے کہا: جو کچھ خدا نے اپنے متعلق کہا ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے۔

محترم قاری! یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو من کل الوجوہ جسم مانتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے صرف ہاتھ کے ہی قائل نہیں بلکہ اُس کی انگلیوں[1] کے بھی قائل ہیں۔ پھر انگلیوں میں جوڑوں کے بھی قائل ہیں جیسا کہ ابن خزیمہ نے کتاب التوحید میں انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے لیے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اُس نے اپنی چھنگلی اوپر اٹھائی اور اُس کے ایک پور سے پہاڑ کو چھوا تو پہاڑ ڈھے گیا۔"

۱۔ خدا کی آنکھوں اور انگلیوں نیز چہرے اور ہاتھ کی تفصیلی بحث ہو ابن خزیمہ اور شیخ صدوق کے نظریات جاننے کے لیے دیکھئے "احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار" جلد دوم، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی۔

حمید نے ابن خزیمہ سے کہا کہ کیا میں اس روایت کو نقل کرسکتا ہوں؟ ابن خزیمہ نے کہا کہ انس نے اس روایت کو پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے اور تو مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ کیا میں اسے نقل کروں؟[1]

عبداللہ نے بھی اپنے والد امام حنبل سے اور انھوں نے اپنی اسناد سے انس بن مالک سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے لیے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو یوں کہا اور اپنی چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے وہ روایت نقل کی۔[2]

اب ہم اپنے قاری سے پوچھتے ہیں کہ ان روایات سے آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ اس روایت میں پہلے تو خدا کے لیے ہاتھ کا اثبات کیا گیا ہے پھر ہاتھ میں انگلیاں بتائی گئی ہیں پھر انگلیوں میں سے چھنگلیا کو مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر چھنگلیا میں سے ایک پور کو بتایا گیا ہے!!

براہ کرم کچھ دیر کے لیے یہیں ٹھہریے تاکہ ہم آپ کو ایک پورا منظر دکھا سکیں۔ یہ لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے دو بازوؤں اور سینے کے بھی قائل ہیں۔

عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے کہا... پھر اسناد بیان کرنے کے بعد ابن عمر کی زبانی نقل کیا کہ "ملائکہ خدا کے دو بازوؤں اور خدا کے سینے کے نور سے بنائے گئے ہیں۔"[3]

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: کافر کی کھال خدا کے بازو کے حساب سے ۴۲ ذراع موٹی ہوگی اور اس کے دانت بھی خدا کے بازو کی لمبائی کے مطابق ۴۲ ذراع کے ہوں گے۔[4]

ابو ہریرہ کی روایت سے جہاں خدا کے لیے بازوؤں کا اثبات ہوتا ہے وہاں بازو کی لمبائی چوڑائی کا تذکرہ بھی موجود ہے ورنہ کھال کی موٹائی اور دانتوں کی لمبائی ماپنے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ ان لوگوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا یہ لوگ خدا کے لیے پاؤں کے بھی قائل ہیں:

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اپنی اسناد کے ساتھ انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا اہل نار کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ پھر دوزخ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟ یہاں تک کہ خدا اپنا پاؤں دوزخ میں ڈالے گا اس وقت دوزخ کہے گی کہ بس بس۔ اب کافی ہے۔[5]

ابن خزیمہ نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: دوزخ پُر نہ ہوگی یہاں تک کہ اللہ اپنا پاؤں اس میں ڈالے گا۔ آگ کہے گی کہ بس کافی ہے، کافی ہے۔ پھر جہنم آگ سے بھر جائے گی۔[6]

عزیز قاری! کچھ دیر کے لیے مزید رک جایئے۔ یہ لوگ خدا کے لیے سانس لینے کے بھی قائل ہیں۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اپنی اسناد سے ابی بن کعب سے نقل کیا ہے وہ کہتا تھا

۱۔ کتاب التوحید ص ۱۱۳۔ ۲۔ کتاب السنہ ص ۹۵، حدیث ۲۱۷۔ ۳۔ ایضاً ص ۱۹۰، حدیث ۱۰۰۹۔
۴۔ ایضاً حدیث ۱۰۰۷۔ ۵۔ ایضاً ص ۱۸۴، حدیث ۹۷۶۔ ۶۔ کتاب التوحید ص ۹۲۔

"ہوا کو برا نہ کہو اس کا تعلق خدا کے سانس سے ہے۔"[1]

اب فرمایئے خدا کی شکل و صورت مکمل ہونے میں کس چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ ہاتھ پاؤں اور چہرہ تو بن ہی گیا۔ شاید آواز باقی رہ گئی ہے۔ آیئے یہ روایت پڑھئے تاکہ یہ گنجائش بھی باقی نہ رہے۔

جی ہاں! یار لوگوں نے خدا کے لیے آواز کا اثبات بھی کیا ہے لیکن انھوں نے یہاں بے ذوقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے لوہے کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے اپنی سند سے بیان کیا ہے جب اللہ تعالیٰ وحی کے لیے گفتگو کرتا ہے تو اہل آسمان کو اس کی آواز یوں سنائی دیتی ہے جیسے سخت پتھر پر لوہے کے گرنے کی آواز ہو۔[2]

حنابلہ نے اسی پر بس نہیں کیا۔ انھوں نے خدا کے وزن کا بھی اعلان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب خدا کرسی پر بیٹھتا ہے تو کرسی کے چرچرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اگر خدا کا وزن نہ ہوتا تو کرسی کے پایوں سے آوازیں کیوں نکلتیں؟

عبداللہ بن امام حنبل نے اپنی اسناد سے حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے: جب خدا کرسی پر بیٹھتا ہے تو اس سے تازہ بنے ہوئے محمل کی طرح چرچر کی آوازیں نکلتی ہیں۔[3]

مقصد یہ ہے کہ جیسے اونٹ کی محمل میں بھاری آدمی بیٹھے تو اس سے چرچراہٹ ہوتی ہے اسی طرح جب خدا کرسی پر بیٹھتا ہے تو کرسی بھی چرچراتی ہے۔

اسی طرح انھوں نے اپنی اسناد سے عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت رسول خداؐ کے پاس آئی اور بولی کہ آپ خدا سے دعا مانگیں کہ وہ مجھے جنت عطا فرمائے۔ رسول خداؐ نے اللہ کی عظمت بیان کی اور فرمایا کہ خدا کی کرسی آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ جب بھی خدا اس پر بیٹھتا ہے تو چار انگلیوں کے برابر جگہ خالی رہتی ہے اور کرسی سے یوں آوازیں نکلتی ہیں جیسا کہ اگر کوئی محمل پر سوار ہو تو وہ چرچراتی ہے۔[4]

ابن خزیمہ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے وزن کی وجہ سے۔"[5]

ان تمام روایات کو جمع کریں تو خدا کا خیالی خاکہ مکمل ہو جاتا ہے اور وہ واجب الوجود کی بجائے ایک انسان دکھائی دینے لگتا ہے جس میں تمام انسانی صفات موجود ہیں۔ اس کا جسم ہے، اعضاء ہیں اور وہ محدود بھی ہے۔ ان روایات سے تو یہی خاکہ بنتا ہے لیکن لوگوں سے شرمندگی کی وجہ سے وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان کے ہاں خدا کے قد کاٹھ کا اندازہ بھی موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا

۱۔ کتاب السنہ ص ۹۲۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۷، حدیث ۳۵۳۔ ۳۔ ایضاً ص ۷۹، حدیث ۴۰۲۔
۴۔ ایضاً ص ۷۹، حدیث ۴۰۹۔ ۵۔ کتاب التوحید ص ۱۰۶۔

ہے کہ حدیث میں مرقوم ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنی شکل پر بنایا۔ اس کا طول ستر ہاتھ رکھا۔

یہ حضرات اس بات کے بھی قائل ہیں کہ خدا کو دیکھنا بھی ممکن ہے جیسا کہ ابن خزیمہ نے اپنی اسناد سے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا میں نے اپنے رب کو حسین ترین شکل میں دیکھا۔ اس نے مجھ سے کہا اے محمدؐ! میں نے عرض کیا لبیک وَسَعْدَیْک فرمایا کہ جانتے ہو ملکوت اعلیٰ کے رہائشی کس بات میں جھگڑ رہے تھے؟ میں نے عرض کیا پروردگار! مجھے نہیں معلوم۔ اس وقت اللہ نے اپنا ہاتھ میرے دو شانوں کے درمیان رکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک کو اپنے سینے میں محسوس کیا۔ اس وقت میں مشرق و مغرب کے درمیان جو کچھ بھی تھا سب سے آگاہ ہو گیا۔[1]

ابن خزیمہ نے اپنی اسناد سے نقل کیا ہے عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب نے ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص کو یہ پوچھنے کے لئے بھیجا کہ کیا محمد مصطفیٰؐ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟

ابن عباسؓ نے اثبات میں جواب دیا۔ ابن عمر نے اپنے آدمی کو ابن عباسؓ کے پاس دوبارہ بھیجا اور کہا کہ ان سے کہو کہ وہ یہ بتائیں کہ انھوں نے کس طرح سے دیکھا تھا؟ ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول پاکؐ نے خدا کو سرسبز باغ میں دیکھا تھا۔ اس کے سامنے سونے کا قالین بچھا ہوا تھا اور وہ سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کرسی کو چار فرشتوں نے اٹھا رکھا تھا۔ ایک فرشتہ مرد کی صورت میں تھا۔ دوسرا بیل کی، تیسرا گدھ اور چوتھا شیر کی صورت میں تھا۔[2]

۱۔ کتاب التوحید ص ۱۴۷۔

۲۔ ایضاً ص ۱۹۸۔

فرشتوں کی صورتوں کے بارے میں اس طرح کی روایت تفسیر نور الثقلین میں بھی موجود ہے جو ایک روائی تفسیر ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمی اور تفسیر منسوب بہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام وغیرہ میں بھی جو روائی تفاسیر ہیں بہت سی اللہ روایات موجود ہیں۔

علامہ سید مرتضیٰ عسکری اسلامی عقائد قرآن کی روشنی میں (مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) میں رقمطراز ہیں۔ تفسیر قمی میں ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت داؤدؑ اپنی محراب میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک پرندہ ان کے سامنے آ گرا حضرت داؤدؑ کو وہ پرندہ بہت بھلا معلوم ہوا۔ آپ کو نماز یاد نہ رہی اور آپ اسے پکڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پرندہ اڑ کر حضرت داؤدؑ اور اوریا کی مشترکہ دیوار پر جا بیٹھا۔ حضرت داؤدؑ پرندے کو پکڑنے کے لئے دیوار پر چڑھے تو آپ کو دوسری طرف ایک عورت نظر آئی جو نہا رہی تھی۔ جب عورت نے حضرت داؤدؑ کا سایہ دیکھا تو اس نے بال کھول کر اپنا بدن ڈھانپنے کی کوشش کی۔ حضرت داؤدؑ اس کو دیکھتے ہی دل ہار گئے۔ پھر آپ اپنی محراب میں واپس آ گئے۔ اس کا شوہر اوریا جہاد پر گیا ہوا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے سالار لشکر کو لکھا کہ وہ فلاں فلاں جگہ جائیں اور اپنے اور دشمنوں کے درمیان تابوت رکھیں اور اوریا کو تابوت کے آگے رکھیں۔ چنانچہ سالار لشکر نے آپ کے حکم کی تعمیل میں اوریا کو تابوت کے آگے رکھا جس کے نتیجے میں اوریا قتل ہو گیا اور حضرت داؤدؑ نے اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔" اس کے جواب میں عرض ہے کہ

ہم نے مشتے اور خروارے چند عقائد بیان کئے ہیں ورنہ اس طرح کی روایات سے حنابلہ اور ان کے ہم مکتب افراد کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ ہم سردست ان روایات پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان کے دوسرے عقائد سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ انھیں رسوا کرنے کے لیے یہی روایات کافی ہیں۔ کچھ حنابلہ کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے عقیدے کی (یعنی توجیہات پیش کرنا شروع کر دیں اور کہا کہ خدا کا جسم تو ہے مگر بلا کیف۔

اشعری نے اسی توجیہ کو معتبر جانا اور کتاب الابانہ کے صفحہ ۱۸ پر لکھا کہ خدا کا چہرہ ہے مگر بلا کیف جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (سورۂ رحمٰن ۲۷) اور اللہ کے دو ہاتھ ہیں مگر کیفیت کے بغیر جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے: خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (سورہ ص ۷۵)

کسی شاعر نے کیا ہی خوب کہا تھا:

قَدْ شَبَّهُوهُ بِخَلْقِهِ وَتَخَوَّفُوا ... شَنَعَ الْوَرَىٰ فَتَسَتَّرُوا بِالْبَلْكَفَه

انھوں نے خدا کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی پھر لوگوں کی نارضگی سے ڈر کر یہ کہہ دیا کہ وہاں

اس روایت کے راوی نے اہل سنت کی بیان کردہ متعدد روایات کو جمع کیا ہے۔ اس نے اپنے خیال سے متاثر ہو کر کچھ باتوں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ پھر اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ اب ہم یہاں سند روایت سے تعرض کئے بغیر متن روایت کا جائزہ لیتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

(۱) جب دو متعارض احادیث تمہارے سامنے ہوں تو اہل سنت کی حدیث کو چھوڑ دو۔

(۲) حضرت داؤدؑ کے متعلق تراشی گئی روایت کا اہل بیتؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ راوی نے کہا۔ حضرت داؤدؑ اور اوریا کی بیوی کے بارے میں لوگ جو کہتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے کہا: اہل سنت یہ بات کہتے ہیں۔

علامہ ہاشم معروف حسنی اپنی کتاب تصوف فی الشیعہ کا فرق (مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) میں لکھتے ہیں:

"بعض دانشور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ تفسیر قمی اور تفسیر امام حسن عسکریؑ مذہب شیعہ کا اولین ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ علماء ان دونوں تفاسیر کی بیشتر روایات کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں اور علمائے شیعہ کی اکثریت ان دونوں تفسیروں کے انتساب کو بھی درست نہیں مانتی۔ جہاں تک امام حسن عسکری علیہ السلام سے منسوب تفسیر کا تعلق ہے اس کا راوی صرف محمد بن قاسم استرآبادی ہے جو متقدمین رجال دراۃ کے مطابق کذاب اور وضاع تھا۔

اسی کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ جناب محمد بن یعقوب کلینی کی کتاب "کافی" بھی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہی ہے۔ اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی روایات موجود ہیں اور علمائے شیعہ "کافی" کی نصف روایتوں پر اعتماد نہیں کرتے۔"

قرآن مجید کے سوا دنیا کی کوئی کتاب "حرف آخر" نہیں ہے لہٰذا یہ کہنا کہ یہ بات "کافی" میں لکھی ہے کافی نہیں ہے۔ کتب تشیع میں سلیم اور سقیم دونوں طرح کی روایات کو جانچنے کے لیے "معیارات" مقرر ہیں۔

(رضوانی)

کیفیت نہیں پائی جاتی اور یوں انھوں نے اپنے عقیدے کو "بلا کیف" کے پردے میں چھپایا ہے۔

ہر وہ شخص جسے خدا نے عقل سلیم کی دولت عطا کی ہے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ بلا کیف کا جملہ لغاظی ہے۔ اس سے اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کیفیت کو نہ جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور کوئی مطلب ذہن میں نہیں آتا بلکہ ابہام کچھ مزید بڑھ جاتا ہے جبکہ حقیقت تو بڑی واضح ہے کہ جب کوئی شخص ان نصوص کے حقیقی معنی کو ماننے کا اعلان کرتا ہے تو وہ کیفیت کو مستثنیٰ نہیں کر سکتا کیونکہ الفاظ سے تو کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور جب حقیقی معنی پر الفاظ کو محمول کیا جائے تو اس سے تجسیم وتشبیہ لازم آتی ہے۔ پھر بلا کیف کہہ کر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں یونیورسٹی میں اپنے پروفیسر صاحب سے استواء علی العرش کے مفہوم پر بحث کر رہا تھا۔ جب پروفیسر صاحب میرے ہاتھوں زچ ہو گئے تو کہنے لگے کہ ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ استواء معلوم اور کیفیت مجہول ہے اور اس کے متعلق پوچھنا بدعت ہے۔ میں نے عرض کیا: جناب! آپ نے تو مسئلہ کو مزید الجھا دیا ہے۔ آپ نے "پانی" کا معنی "پانی" ہی کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ناراض ہو کر کہا: وہ کیسے؟ میں نے کہا: استاد محترم! سیدھی سی بات ہے اگر استواء کے معنی معلوم ہیں تو پھر اس کی کیفیت مجہول کیسے ہے؟ اگر استواء معلوم ہے تو پھر کیفیت بھی معلوم ہے اور اگر "کیفیت" مجہول ہے تو پھر استواء کو بھی مجہول ہی رہنے دیں کیونکہ آپ کسی طرح سے معنی اور کیفیت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں رکھ سکتے۔ جب انسان استواء کا معنی سمجھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی کیفیت بھی ذہن میں آ جاتی ہے۔

عقل کسی چیز کی توصیف اور اس کی کیفیت میں فرق نہیں کرتی۔ یہ دونوں ایک ہی ہیں مثلاً آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے متعلق آپ کے پاس جو علم ہے وہی اس کی کیفیت کا علم ہے۔ پھر جب آپ کہتے ہیں کہ استواء معلوم ہے تو استواء کا علم اس کی کیفیت کا علم کہلائے گا۔ آپ بتائیے کہ آپ نے کس بنیاد پر کیفیت کو مجہول کہا ہے؟ اگر آپ کیفیت کو مجہول اور استواء کو معلوم کہیں گے تو آپ کے کلام میں تضاد ہو جائے گا اور آپ سے یہ پوچھا جا سکتا کہ حضرت! آخر یہ کیسے ہوا کہ آپ نے استواء کو تو جان لیا مگر کیفیت کو نہ جان سکے؟!

پروفیسر صاحب کافی دیر تک خاموش رہے اور کچھ نہ بولے۔ پھر انھوں نے کہا کہ معذرت چاہتا ہوں، مجھے جلدی ہے۔ یہ کہا اور چلے گئے۔

سیدھی سی بات ہے کہ جب الفاظ کے حقیقی معنی مراد ہوں اور یہ کہا جائے کہ کیفیت مراد نہیں ہے تو اس طرح کے الفاظ کو سوائے یاوہ گوئی کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ

خدا حقیقی معنی میں ہاتھ رکھتا ہے اور پھر کہے کہ بھائی وہ حقیقی معنی میں ہاتھ رکھتا ہے لیکن دوسرے ہاتھ کی طرح سے نہیں۔ اس طرح کی بات کرنے والے شخص کا آخری جملہ دراصل پہلے جملے کی تردید ہوتا ہے۔ جب ہاتھ کو حقیقی معنی میں مان لیا گیا ہے تو پھر اس کی کیفیت بھی وہی ہونی چاہیے جو کسی بھی ہاتھ کی ہوسکتی ہے اور جب وہی متکلم یہ کہے کہ اس میں وہ کیفیت موجود نہیں ہے جو ہاتھ میں ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہاتھ سے حقیقی معنی مراد ہی نہیں لے رہا۔ اگر بلاکیف قسم کے لایعنی الفاظ تنزیہ خداوندی کے لیے کافی ہیں تو پھر ان لوگوں کو کچھ اس طرح کی گفتگو کرنی چاہیے۔

خداوند عالم کا جسم ہے مگر بلاکیف، اس کا جسم دوسرے اجسام کے مشابہ نہیں۔ خدا خون رکھتا ہے مگر بلاکیف، اس کا خون دوسرے خون کے مشابہ نہیں ہے۔ خدا گوشت پوست رکھتا ہے مگر بلاکیف خدا ہاں رکھتا ہے مگر بلاکیف اگر بلاکیف کہنے سے تنزیہ خداوندی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں تو انھیں اس طرح گفتگو کرنی چاہیے اور ساتھ ہی یہ باور بھی کرنا چاہیے کہ اس سے تنزیہ خداوندی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

فرقہ مشبہ معرفت خداوندی کے معاملے میں اتنا تہی دامن ہے کہ اس فرقے سے وابستہ ایک شخص نے کہا تھا: مجھے خدا کے لیے شرمگاہ اور داڑھی کا اثبات کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مجھے ان دو چیزوں سے معاف رکھو۔ باقی ہر چیز کے بارے میں تم پوچھ سکتے ہو۔[1]

ان آیات کے متعلق ہم اپنا موقف واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی خواہ مخواہ ان آیات کی تاویل کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ قرآن وسنت کے ظاہری الفاظ کے متعلق یہ بہانہ بنا کر تاویل کی جائے کہ ان کے ظاہری الفاظ قرین عقل نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ قرآن وسنت میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جو خلاف عقل ہو۔ لوگ لغت نہی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ "نصوص" کے بعض الفاظ قرین عقل نہیں ہیں۔ ان آیات کی تاویل کرنے کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ الفاظ کو دلالت معنوی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مفرد

۲۔ مرکب

اگر جملے میں کوئی قرینہ موجود ہو تو مرکب معنی کو مفرد معنی سے جدا کرنا لغوی طور پر صحیح ہوتا ہے اور اگر جملے میں کوئی قرینہ اور علامت موجود نہ ہو تو اس کے لغوی معنی ہی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً اگر ہم لفظ "شیر" کو تنہا بولیں تو اس سے مراد جنگل کا شیر ہی ہوگا۔ لفظ شیر اگر کسی جملے میں استعمال ہو اور اس

---

۱ شہرستانی، الملل والنحل ج ۱، ص ۹۲۔

جملے میں کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو اسے حقیقی معنی سے جدا کرتا ہو تو اس سے اصلی معنی ہی مراد ہوں گے مثلاً کوئی کہے کہ "رات کو میں نے ایک شیر دیکھا جو اپنا شکار کھا رہا تھا۔" اس جملے میں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جو لفظ کو اس کے اصلی معنی سے جدا کرے لہٰذا ہم اس سے جنگل کا شیر ہی مراد لیں گے لیکن اگر یہ کہے کہ "رات کو میں نے ایک شیر دیکھا جو گاڑی چلا رہا تھا" تو اس کے معنی بدل جائیں گے اس جملے میں شیر سے مراد شیر نیستاں کی بجائے دلیر آدمی ہوگا۔ کسی شاعر کا شعر ہے

اَسَدٌ عَلَیَّ وَفِی الْحُرُوْبِ نَعَامَۃٌ

فَتَخَاءُ تَنْفِرُ مِنْ صَفِیْرِ الصَّافِرِ

وہ مجھ پر تو شیر ہے لیکن جنگوں میں کمزور شتر مرغ ہے جو سیٹی کی آواز سن کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

یہاں شاعر کی مراد بالکل واضح ہے کہ وہ آدمی بزدل ہے لیکن مجھ کمزور پر رعب جماتا ہے۔

اب آپ قواعد زبان کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ جب کوئی لفظ ترکیب میں آجائے اور قرینہ بھی پایا جائے تو وہ لفظ اپنے حقیقی معنی کی بجائے ترکیبی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا بھی یہی اسلوب ہے مثلاً جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ان کے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے (سورۂ فتح آیت ۱۰) تو بغیر کسی تاویل کے اس کا ترکیبی معنی "دست قدرت"[1] ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے اَلْبَلَدُ فِیْ یَدِ السُّلْطَانِ (شہر بادشاہ کے ہاتھ میں ہے) شہر بادشاہ کے ظاہری ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ شہر بادشاہ کے دست تصرف میں ہے اور بالفرض اگر بادشاہ کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں تب بھی یہ جملہ صحیح ہے اور اس سے اس کے مفرد معنی مراد نہیں لئے جائیں گے۔ باقی آیات قرآن کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ اس طرح کے معنی کو تاویل نہیں، ترکیبی معنی کہا جائے گا۔ قرآن کریم کو پڑھتے وقت آیات کی ترکیب کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس سے جو معنی حاصل ہوں وہی مراد لینے چاہئیں اور لفظ کے مفرد معنی پر رک جانا صحیح نہیں ہے۔ ترکیبی معنی کو تاویل و تحریف کہنا بھی درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس حنابلہ نے لوگوں کو مفرد معنی تک ہی محدود رکھا تھا اور ترکیبی معنی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

۱۔ اس کتاب کے فارسی مترجم جناب سید محمد رضا مہری نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ خَلَقْتُ بِیَدَیَّ کی آیت میں لفظ ید کا ترکیبی معنی دست قدرت صحیح ہے لیکن یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ کی آیت میں اس سے دست قدرت کا ترکیبی معنی لینا صحیح نہیں ہے۔ اس کی بجائے یہاں اس کا ترکیبی معنی "دست بیعت" ہے کیونکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ وہ لوگ جو آپ کی بیعت کر رہے تھے دراصل خدا کی بیعت کر رہے تھے۔ بیعت کے وقت اُن کے ہاتھوں پر خدا کا دست بیعت تھا۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کے ظاہری الفاظ حجت ہیں[1] البتہ مفہوم کے تعین کے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ لفظ مفرد معنی میں استعمال ہوا ہے یا ترکیبی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب کوئی لفظ ترکیبی معنی میں استعمال ہوا ہو تو پھر اس سے مفرد معنی مراد لینا غلط ہے اور اس ایسا سمجھنے والا کلام عرب سے نابلد ہے یا پھر جان بوجھ کر دوسروں کو گمراہ کر رہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم امام احمد بن حنبل اور ان کے عقائد کو الوداع کہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے متعلق مکتب اہلبیتؑ کی تعلیمات کو پیش کر دیں تاکہ ہمارے محترم قاری کو یہ اندازہ ہو سکے کہ کلام آل محمدؐ سے جو روشنی پھوٹ رہی ہے اُس کو قرآن حکیم کے چراغ کی تائید حاصل ہے اور آج ہم جس فکری پسماندگی کا شکار ہیں اُس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمان ائمہ اہلبیتؑ سے اور اُن کی تعلیمات سے دور ہو چکے ہیں ورنہ امام جعفر صادقؑ نے کیا ہی خوب فرمایا تھا۔ لَوْ عَلِمَ النَّاسُ مَحَاسِنَ كَلَامِنَا لَاتَّبَعُوْنَا اگر لوگ ہمارے کلام کے محاسن کو جان لیتے تو ضرور ہماری پیروی کرتے۔

صفات الٰہی کی یہ گفتگو ہم شیخ صدوق کی کتاب التوحید سے نقل کر رہے ہیں۔ یہ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں توحید کے متعلق آل محمدؐ کے جواہر کلام کو جمع کیا گیا ہے۔ ہم اپنے محترم قاری سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ان جواہر پاروں کو غور سے پڑھیں اور اُن پر تدبر کریں پھر ان جواہر پاروں کا عبداللہ بن احمد بن حنبل کی کتاب السنہ اور ابن خزیمہ کی کتاب التوحید سے موازنہ کریں۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کلام میں کیا فرق ہے (حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا ملفوظ ہے اِنَّا لَاُمَرَاءُ الْكَلَامِ وَفِيْنَا تَنَشَّبَتْ عُرُوْقُهٗ وَعَلَيْنَا تَهَدَّلَتْ غُصُوْنُهٗ ہم امیر سخن ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے وجود میں پیوست ہیں اور اس کی شاخیں ہمارے سروں پر سایہ فگن ہیں)۔

۱۔ ظواہر قرآن کی حجیت کے ذیل میں حضرت آیت اللہ خوئی طاب ثراہ البیان فی تفسیر القرآن میں رقم طراز ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہار مافی الضمیر اور افہام وتفہیم کا کوئی خاص طریقہ نہیں اپنایا تھا۔ آپ نے افہام وتفہیم کا وہی طریقہ اپنایا جو آپ کی قوم میں رائج تھا۔ آپ اپنی قوم کے لیے قرآن لے کر آئے تاکہ وہ اسے سمجھے اور اس کی آیتوں میں غور کرے۔ قرآن جن کاموں کا حکم دے انھیں بجا لائے اور جن باتوں سے روکے ان سے رک جائے۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
آقائے خوئی لکھتے ہیں روایات متواترہ میں حکم دیا گیا ہے کہ روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھو اور جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے دیوار پر دے مارو۔ وہ جھوٹی ہیں اور انھیں قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہی ائمہ طاہرین علیہم السلام کا فرمان ہے۔ یہ روایات تصریح کرتی ہیں کہ "ظواہر قرآن حجت ہیں" اور قرآن کو عام اہل زبان جو فصیح عربی جانتے ہوں سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کی دوسری روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ صحیح شرائط کو باطل شرائط سے الگ کرنا ہو تو ان کا کتاب خدا سے موازنہ کرو اور جو بات کتاب خدا کے خلاف ہو اسے مسترد کر دو۔ (رضوانی)

حضرت رسول اکرمؐ کا خطبہ

تمام حمد و ثنا اُس اللہ کے لیے ہے جو اپنی اولیت میں منفرد ہے۔ وہ ازل سے ہی عظمت، ملکیت، بزرگی اور بڑائی کا مالک ہے۔ اُس نے جو کچھ بھی بنایا کسی نمونے اور مثال کے بغیر بنایا۔

ہمارے رب کی ربوبیت اور اُس کا لطف قدیم ہے۔ اُس نے اپنے علم سے ہر چیز کو اُس کے مناسب حال صلاحیتیں بخشی ہیں اور ہر چیز اپنی زبردست قدرت سے بنائی ہے۔ اس نے نور سحر سے تاریکی کو دور کیا (نور وجود سے عدم کے پردے کو چاک کیا)۔ کسی میں یہ مجال نہیں کہ اُس کی تخلیق اور اُس کی صناعی کو بدل ڈالے یا اُس کے حکم کو معطل کردے اور اُس کے فیصلے کو مسترد کرے۔ اُس کی مشیت بے چون و چرا ہے۔ اُس کی ملکیت لازوال ہے۔ اُس کی حکومت دائمی ہے۔ اس کی ذات پاک ازلی اور جاودانی ہے۔ وہ کثرت ظہور کی وجہ سے ہماری آنکھوں سے پنہاں ہے۔ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کے قریب ہے۔ وہ ہر چیز میں آشکار ہے بغیر اس کے کہ آنکھوں سے نظر آئے جبکہ وہ "منظر اعلیٰ" میں ہے۔ اُس نے چاہا کہ اُس کے بندے صرف اُسی کی عبادت کریں جبکہ اُس کا نور اور اُس کی بے انتہا رفعت مخلوق کے لیے حجاب تھی۔ چنانچہ اُس نے انبیاء کو بھیجا تاکہ مخلوق پر حجت تمام ہو سکے اور انبیاء لوگوں کے لیے عملی نمونہ اور اُن کے اعمال کے گواہ بنیں۔ خدا نے پیغمبروں کو اُن کی اپنی نوع میں سے منتخب کیا کہ لوگوں کو جنت کی بشارت دیں اور جہنم سے ڈرائیں تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ دلیل سے زندہ رہے اور لوگ اپنے رب کے بارے میں جسے وہ نہیں جانتے غور کریں اور اسے پہچانیں اور اُس کے سوا باقی معبودوں کا انکار کرکے اور ہر طرح کے عناد و مفاد کو چھوڑ کر صرف اسی کی عبادت کریں۔[1]

امام علی رضا علیہ السلام کی حدیث

فتح بن یزید جرجانی کا بیان ہے کہ جب میں مکہ مکرمہ سے خراسان واپس جا رہا تھا تو میں نے امام علی رضاؑ کو دیکھا کہ آپ عراق کی طرف آرہے تھے۔ میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ جو شخص خدا سے ڈرے گا ہر چیز اُس سے ڈرے گی اور جو شخص خدا کی اطاعت کرے گا ہر چیز اُس کی اطاعت کرے گی۔ میں کوشش کرکے آپ کے قریب گیا اور میں نے سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا

فتح! جس کا مقصد خدا کو راضی کرنا ہو وہ مخلوق کی ناراضگی کی پروا نہیں کرتا اور جو اپنے خالق کو ناراض کرتا ہے وہ اس لائق ہے کہ مخلوق اُس سے ناراض ہو۔ خدا کی توصیف صرف اُن الفاظ سے کی

---

[1] شیخ صدوق، کتاب التوحید، ص ۴۴، حدیث ۲۔

جاسکتی ہے جس سے خود اُس نے اپنی توصیف کی ہے۔ کوئی شخص اپنی طرف سے اُس کی کیا توصیف کرے کہ حواس اُس کے ادراک سے اور اوہام اس تک رسائی سے، ذہنی تصورات اُسے محدود کرنے سے اور آنکھیں اُس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں؟ وہ توصیف کرنے والوں کی توصیف اور بیان کرنے والوں کے بیان سے بلند و برتر ہے۔ وہ نزدیک ہوتے ہوئے بھی دور اور دور ہوتے ہوئے بھی نزدیک ہے۔ اُس کی دوری نزدیکی اور اس کی نزدیکی دوری ہے۔ اسی نے اشیاء کو وہ کیفیت بخشی ہے جس حالت میں وہ ہیں اور اسی نے زمان و مکان کو بنایا ہے لہٰذا اُس کے لیے کیف اور مکان کے الفاظ نہیں بولے جاسکتے کیونکہ کیفیت اور مکان اس کی تخلیق ہیں۔

فتح! ہر جسم کسی نہ کسی خوراک سے غذا حاصل کرتا ہے لیکن وہ روزی کا محتاج نہیں بلکہ روزی کا دینے والا ہے۔ وہ نہ جسم ہے، نہ صورت۔ نہ تو اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے نہ اس کی کوئی انتہا ہے اور نہ اس میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ وہ اُن خواص سے پاک ہے جو اُس نے اجسام کو بخشے ہیں۔ وہ لطیف ہے، علیم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، واحد ہے، احد ہے اور بندوں کی پناہ گاہ ہے۔ اُس نے کسی کو جنم نہیں دیا اور کسی نے اُس سے جنم نہیں لیا۔ اُس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ اجسام کو وجود بخشنے اور صورتوں کو بنانے والا ہے۔ اگر وہ ایسا ہوتا جیسا کہ فرقہ مشبہہ کہتا ہے تو خالق، مخلوق سے، رازق مرزوق سے اور موجد ایجاد سے ممیز نہ ہوسکتا۔ وہ اُن سے مختلف ہے۔ کوئی چیز اُس کے مانند نہیں ہے۔

فتح نے عرض کیا "خدا ایک ہے اور انسان بھی ایک ہے۔ تو کیا خدا اور انسان ایک ہونے میں ایک دوسرے کی مانند نہیں؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا "تم نے ایک محال بات کہی ہے۔ خدا تمہیں ایمان پر ثابت رکھے۔ معانی میں تشبیہ ممنوع ہے۔ الفاظ تو ایک ہی ہوتے ہیں مگر معانی مختلف ہوتے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہے جبکہ حقیقت میں انسان ایک نہیں ہے۔ وہ کئی چیزوں سے مل کر بنا ہے۔ انسان میں مختلف اعضاء اور مختلف رنگ ہیں۔ وہ الگ الگ اجزاء کا مرکب ہے۔ اُس کے اجزاء کی نوعیت جدا جدا ہے۔ اُس کا خون اس کے گوشت سے الگ ہے۔ اس کا گوشت اُس کے خون سے الگ ہے۔ اُس کے پٹھے الگ ہیں اور رگیں الگ ہیں۔ اس کے بال الگ ہیں اور اس کی کھال الگ ہے۔ اس کی سیاہی الگ اور اس کی سفیدی الگ ہے۔ یہی حال دوسری مخلوقات کا ہے۔ تم انسان کو لفظی طور پر تو "ایک" کہہ سکتے ہو مگر معنوی طور پر ایک نہیں کہہ سکتے جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ من کل الوجوہ "ایک" ہے۔ وہ اجزاء سے مل کر نہیں بنا۔ اس میں اختلاف، تفاوت اور کمی بیشی نہیں ہے جبکہ انسان مرکب ہے۔ مخلوق ہے۔ بنایا گیا ہے۔ مختلف اجزاء و جواہر سے بنا گیا ہے لیکن بلحاظ جسم یک ہے (یعنی حقیقی طور پر ایک نہیں "اعتباری طور پر" ایک ہے)۔"

نخ نے عرض کیا "آپ نے مجھے نجات دی۔ خدا آپ کو نجات دے۔ آپ مجھے اس مخمصہ سے نجات دلائیں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے تو کیا وہ کانوں سے سنتا اور آنکھوں سے دیکھتا ہے؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا "وہ جس سے دیکھتا ہے اسی سے سنتا ہے اور جس سے سنتا ہے اسی سے دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے لیکن مخلوق جیسی آنکھوں سے نہیں۔ وہ سنتا ہے لیکن مخلوق جیسے کانوں سے نہیں۔ کوئی مخفی چیز اس سے پوشیدہ نہیں یہاں تک کہ اندھیری رات میں کالے پتھر پر رینگنے والی کالی چیونٹی بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ خدا دیکھتا ہے لیکن مخلوق کی طرح حاسہ چشم کا محتاج نہیں۔ مختلف آوازیں اسے شبہے میں نہیں ڈالتیں۔ ایک کی بات، دوسرے کی بات سننے سے مانع نہیں ہوتی اور جب ہم کہتے ہیں کہ وہ سنتا ہے تو وہ مخلوق کی طرح کانوں کا محتاج نہیں ہے۔" (شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۹۱، حدیث ۱۸)

امیر المومنین علیہ السلام کا خطبہ

حمد اللہ کے لیے مخصوص ہے جو کسی چیز سے نہیں بنا اور اس نے جس چیز کو بنایا اسے لا شیء سے بنایا۔ اس نے اشیا کے ظہور کو اپنی ازلیت کا گواہ بنایا اور ان کی کمزوری کو اپنی قدرت کی دلیل بنایا اور ان کی فنا کو اپنی بقا کا گواہ بنایا۔ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں کہ اس کے متعلق "کہاں" کا اطلاق کیا جا سکے۔ کوئی اس کے مثل نہیں ہے کہ اس کے لیے "کیسا" کا لفظ استعمال کیا جا سکے۔ کوئی چیز اس کے علم سے مخفی نہیں کہ اس کے علم کو کسی خاص جہت میں مخصوص کیا جا سکے۔ وہ اپنی ایجاد کردہ مخلوقات کی صفات سے جدا ہے اور تغیر پذیر اشیا کے تغیر سے پاک ہے۔ وہ اپنی بزرگی اور بڑائی کی وجہ سے ہر طرح کے تغیر سے پاک ہے۔ عقل مندوں کی عقلیں اُس کو پہچاننے سے عاجز ہیں اور عمیق افکار اُس کی کیفیت جاننے سے قاصر ہیں۔ خواص فطرتیں اُس کے تصور کی خواہی کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ مکان اُس کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتے اور اندازے اس کے جلال کا وزن نہیں کر سکتے۔ میزاں اس کی کبریائی کا وزن نہیں کر سکتے اور اوہام اس کی معرفت کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ بلند پرواز عقلوں اس کے کشف و احاطہ سے ناامید ہیں اور ذہن اس کی شان کا تصور کرنے سے عاجز ہیں۔ علوم کے سمندر اس کی ماہیت کی طرف اشارہ کرنے سے خشک ہیں اور ظاہر اوہام اس کے مقام قدرت کی طرف پرواز بھرنے کے بعد تھک ہار کر واپس آ چکے ہیں۔ وہ واحد ہے مگر عدد سے نہیں۔ وہ قدیم ہے مگر زمانے سے نہیں۔ وہ قائم ہے مگر ستون سے نہیں۔ اللہ جنس نہیں ہے کہ دیگر اجناس اس کی مانند ہو جائیں۔ وہ شکل نہیں ہے کہ دوسری اشکال اس کی نظیر ہو جائیں۔ وہ اشیاء کی مانند نہیں ہے کہ اس پر کسی صفت کو منطبق کیا جا سکے۔

عقلیں اس کے ادراک کی متلاطم موجوں میں بھٹک کر رہ گئیں اور اوہام اس کے ذکر ازلیت کے احاطہ سے متحیر ہیں۔ فہم و دانش اس کی توصیف قدرت سے تنگنائی میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اذہان اس کے افلاک ملکوت کی پہنائیوں میں ڈوب گئے ہیں۔ وہ نعمتیں عطا کرنے پر قادر ہے۔ اس کی کبریائی تک کسی کی پہنچ نہیں۔ تمام اشیاء کا انتظام اس کے دست قدرت میں ہے۔ وقت اور زمانہ اسے کہنہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی اوصاف اس کا احاطہ کرسکتے ہیں۔ مضبوط و مستحکم پہاڑ اپنے مقام پر اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور حاقتور افلاک اپنے دور ترین افق تک اس کے سامنے سرنگوں ہیں۔

اس نے موجودات کے اختلاف کو اپنی ربوبیت کا اور ان کی عاجزی کو اپنی قدرت کا گواہ بنایا ہے اور ان کے حدوث کو اپنے قدوم کا اور ان کی فنا کو اپنی بقا کا شاہد بنایا ہے۔ موجودات اس کی دسترس سے باہر اور اس کے احاطہ قدرت سے خارج نہیں ہیں۔ موجودات کے وجود کے ذرات اس کے علم سے خالی اور اس کے دست قدرت سے آزاد نہیں ہیں۔ اس کی قدرت کی علامت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ بنایا ہے اور اس کی حکمت کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کے خواص مقرر کئے ہیں اور اس ذات بے ہمتا کے قدیم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ اشیا کو منظر عام پر لایا ہے اور اس کی صنعت میں خلل نہ پڑنا اس کی قدرت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے لیے کوئی انتہا بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے کوئی نمونہ نہیں ہے۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ تمام مثالوں اور مخلوقات کی صفات سے بہت بلند ہے۔ (شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۶۹)

(۲) ابن تیمیہ کا دور

ایک زمانے میں اشعری عقائد اسلامی دنیا میں بہت مقبول تھے اور اسے مسلمانوں کے سرکاری مذہب کا درجہ حاصل تھا۔ ابوالحسن اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے امام حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کے عقائد پس منظر میں چلے گئے تھے یہاں تک کہ ابن تیمیہ منظر عام پر آئے۔

ابن تیمیہ ۶۶۱ھ میں حنبلی مشائخ کے گھر شہر حران میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر حنابلہ کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ ابن تیمیہ کے والد دمشق کے ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر دوسرے علماء سے حدیث، رجال، لغت، تفسیر، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد وہ مدرسے میں پڑھانے لگے۔ اس طرح ابن تیمیہ کو حنبلی عقائد پھیلانے کا موقع ملا۔ انھوں نے نیم مردہ حنبلی عقائد میں نئی جان ڈال دی۔ انھوں نے اپنے مدرسے میں صفات خداوندی کے متعلق بحثیں کیں اور تجسیم کے موضوع پر نئے سرے سے دلائل دیئے۔

اہل حماۃ نے ایک تفصیلی خط لکھ کر ابن تیمیہ سے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (سورۂ طٰہٰ: آیت ۵) اور ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ (سورۂ فصلت آیت ۱۱) جیسی آیات کا مفہوم پوچھا اور ساتھ ہی قَلْبُ الْإِنْسَانِ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (انسان کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے) جیسی احادیث کا مطلب بھی دریافت کیا تھا۔

ابن تیمیہ نے اس خط کا اہل حماۃ کو طولانی جواب لکھا تھا اسی لیے اس خط کو "عقیدہ حمویہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خط میں ابن تیمیہ نے تجسیم و تشبیہ کے عقائد کو اپنی طرف منسوب کرنے کی بجائے سلف صالح جیسے مبہم افراد کی طرف منسوب کیا اور ان عقائد کی خوب وکالت کی۔ اگر اُن کی تحریر سے "سلف صالح" جیسے مبہم الفاظ کو نکال دیا جائے تو ابن تیمیہ کا چھپا ہوا چہرہ منظرِعام پر آسکتا ہے۔ اُس دور کے علماء نے ابن تیمیہ کے اس خط سے شدید اختلاف کیا اور اُن کے افکار کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ ابن تیمیہ نے امیر دمشق کا سہارا لیا اور امیر دمشق نے اُن کی مدد کی۔

ابن کثیر نے اس واقعہ کو یوں نقل کیا ہے۔ "شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے لیے دمشق میں ایک نئی آزمائش کھڑی ہوئی۔ کچھ فقہاء نے اُس کے خلاف ہنگامہ کیا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ ابن تیمیہ کو قاضی جلال الدین حنفی کی عدالت میں پیش کیا جائے لیکن ابن تیمیہ حاضر نہ ہوا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کی طرف سے یہ اعلان کرایا گیا کہ ابن تیمیہ نے اہل حماۃ کو جو مسائل لکھ کر بھیجے ہیں وہ سراسر باطل ہیں۔

امیر سیف الدین جاکان نے اُس کی حمایت کی اور ابن تیمیہ کے خلاف جن علماء نے ہنگامہ کیا تھا انھیں سزائیں دیں۔ ہنگامہ کرنے والے علماء میں سے کچھ چھپ گئے اور جو ہاتھ لگے انھیں کوڑے لگائے گئے۔ ان علماء کا حشر دیکھ کر باقی علماء خاموش ہو گئے۔[1]

ابن کثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء سلطان کے خوف سے خاموش ہو گئے تھے۔ سلطان کی آشیرباد پاکر ابن تیمیہ کا رہا سہا خوف دور ہو گیا اور اُس نے عقائد تجسیم کی کھل کر تبلیغ کی۔

ابن تیمیہ کے ان عقائد کا گواہ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ سیاح ابن بطوطہ ہے۔

ابن بطوطہ بیان کرتے ہیں کہ میں دمشق میں تھا اور جمعہ کا دن تھا کہ تقدیر مجھے مسجد اموی میں لے گئی۔ میں مسجد میں گیا تو دیکھا کہ ابن تیمیہ منبر افروز ہے اور تقریر میں کہہ رہا ہے "اللہ تعالیٰ عرش کو چھوڑ کر آسمان دنیا پر نیچے اترتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ منبر کی سیڑھیاں اترا اور پھر کہا کہ جس طرح میں اب نیچے اترا ہوں وہ بھی اسی طرح نیچے اترتا ہے۔

ابن الزہراء نامی ایک مالکی فقیہ نے اس پر اعتراض کیا تو مسجد میں موجود لوگ کھڑے ہو گئے

۱۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ج ۱۳، ص ۳۔ دیکھئے ۶۹۸ھ کے واقعات۔

اور انھوں نے گھونسوں اور جوتوں سے اس بچارے کو اتنا مارا کہ اس کا عمامہ زمین پر گر گیا۔ اس نے عمامہ کے نیچے ابریشم کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا کہ اس نے ابریشم کی ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی لہٰذا وہ اسے سزا دلوانے قاضی عزالدین بن مسلم کے گھر لے گئے۔ حنبلی قاضی نے اسے جیل بھجوا دیا پھر اس پر تعزیر نافذ کی۔[1]

ابن تیمیہ کے متعلق اس طرح کا ایک واقعہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اپنی کتاب الدرر الکامنہ جلد اول ص ۱۵۴ پر نقل کیا ہے۔

اس طرح کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تجسیم باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے ابن تیمیہ سخت متعصب تھا اور وہ خدا کے نزول و صعود کے لیے اپنے سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی عملی مثالیں دیتا تھا اور یہ عین کفر ہے۔ وہ اپنے عقائد کو "عقائد سلف" کے عنوان سے پیش کرتا تھا اور لوگوں کو یہ تاثر دیتا تھا کہ اب تک مسلمان اسی عقیدے پر کاربند رہے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے کو چھپانے کے لیے سلف صالحین پر افترا پردازی کیا کرتا تھا۔ حقیقت میں افراد یہ بات جان گئے تھے کہ ابن تیمیہ حنبلی افکار کا مبلغ ہے۔ امام احمد بن حنبل سے پہلے بھی مسلمانوں میں مختلف عقائد رائج تھے لہٰذا حنبلی فکر کو ہی سلف صالحین کا عقیدہ کہنا درست نہیں ہے۔ مسلمانوں کا مختلف مکاتب فکر میں بٹ جانا اس امر کی دلیل تھا کہ ہمارے اسلاف ایک عقیدے کے پیرو نہیں تھے۔ ان میں بہت سے عقائد و مذاہب رائج تھے اور ہر شخص اپنے عقیدے کو صحیح کہتا تھا جبکہ ہماری نظر میں وہ تمام لوگ حقیقت سے کوسوں دور تھے۔ شہرستانی نے الملل والنحل میں مذہب سلف کے متعلق ابن تیمیہ کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے

"متاخرین کا ایک گروہ اپنی گفتگو میں اقوال سلف کا اضافہ کرنے لگا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آیات کی تفسیر ظاہری الفاظ کی بنیاد پر کرنی چاہیے جیسے کہ سلف سے وارد ہے اور آیات میں تاویل اور توقیف نہ کی جائے بلکہ وہی تفسیر کی جائے جو ابن تیمیہ نے کی تھی۔ اس طرز فکر کی وجہ سے لوگ تشبیہ میں گرفتار ہوئے ہیں جبکہ تشبیہ عقیدہ سلف کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ اس طرح کی تشبیہ اس سے قبل یہودیوں کے ایک دو مذاہب میں رائج تھی لیکن سب یہودی تشبیہ کے قائل نہیں تھے۔ یہودیوں کے جو مکاتب تشبیہ کے قائل ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ تورات میں ایسے الفاظ تھے جو تشبیہ پر دلالت کرتے تھے۔[2]

ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ "اس وقت میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ باتیں اگرچہ میں نے اپنے سابقہ جوابات میں نہیں لکھی تھیں لیکن بہت سے اجتماعات میں وہ باتیں کہہ چکا ہوں کہ قرآن کریم میں جتنی بھی آیات صفات ہیں ان کی تاویل کے متعلق صحابہ میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ میں نے صحابہ

۱۔ سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۱ ص ۱۱۰۔ ۲۔ الملل والنحل ص ۸۴۔

سے منقول تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے کی تمام روایات کو اچھی طرح سے کھنگال کر دیکھا ہے۔ میں نے ایک سو سے زائد چھوٹی بڑی تفاسیر دیکھی ہیں۔ ان میں مجھے ایک صحابی بھی ایسا دکھائی نہیں دیا جس نے آیات صفات اور احادیث صفات کی ایسی تاویل کی ہو جو لفظی مفہوم کے خلاف ہو۔"[1]

ابن تیمیہ کی ایسی باتوں سے عوام متاثر ہو جاتے اور اس کی باتوں کو صحابہ اور سلف صالحین کا نظریہ سمجھ کر قبول کر لیتے تھے لیکن اگر ماثور تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے تو ابن تیمیہ کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ابن تیمیہ نے تفسیر طبری کی توثیق کی ہے اور لکھا ہے "اس تفسیر میں کوئی بدعت موجود نہیں ہے۔ اس کے مؤلف نے متہم افراد سے روایت نہیں لی ہے۔"[2]

ابن تیمیہ نے الفتاوی الکبیرہ کی جلد ۶ ص ۳۲۲ پر لکھا ہے کہ آیت الکرسی کا تعلق عظیم ترین آیات صفات سے ہے جبکہ طبری نے اپنی اسناد سے ابن عباس کا وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ کے متعلق یہ قول نقل کیا ہے اہل تاویل نے کرسی کے مفہوم کے متعلق اختلاف نظر کا اظہار کیا ہے۔ کچھ حضرات نے ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خدا کی کرسی سے اس کا "علم" مراد ہے۔ طبری نے ابن عباسؓ سے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا میں بھی "کرسی خدا" سے "علم خدا" مراد ہے۔[3]

ابن تیمیہ نے کہا تھا کہ سلف نے آیات صفات میں لفظی معنی سے تجاوز نہیں کیا تھا اور اس کے متعلق ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا جبکہ طبری کے بقول ان آیات کی تاویل کے متعلق ان میں اختلاف تھا ابن تیمیہ نے کہا تھا کہ ایک سو چھوٹی بڑی تفاسیر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی بھی صحابی نے آیات صفات کی تاویل نہیں کی تھی حالانکہ تفسیر طبری میں "کرسی خدا" کے متعلق ابن عباسؓ سے دو تاویلات منقول ہیں۔ آیت الکرسی کے آخری ٹکڑے وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ کے متعلق طبری لکھتے ہیں:

"وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ کے متعلق اہل تحقیق کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے وہ کسی مثال اور نظیر و شبیہ سے بلند ہے۔ وہ یہاں "علو" کو ظاہری بلندی کے معنی میں نہیں لیتے۔ وہ کہتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ کوئی جگہ ذات حق سے خالی ہو۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ وہ اونچی جگہ پر رہتا ہے تو اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ باقی جگہیں اس سے خالی ہیں۔"[4]

یہ ہے کلام سلف، لیکن ابن تیمیہ نے ایک انوکھی راہ کا انتخاب کیا تھا۔ اُس نے اپنی بات کو وزن دینے کے لیے جھوٹ موٹ لکھ دیا کہ یہ "سلف صالحین" کا نظریہ ہے جبکہ طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف بھی خداوند عالم کو ایک مکان میں محدود نہیں سمجھتے تھے۔ ابن تیمیہ نے اہل حدیث کے

۱۔ ابن تیمیہ، تفسیر سورۂ نور ص ۱۷۸۔ ۲۔ المقدمہ فی اصول التفسیر ص ۵۱۔
۳۔ تفسیر طبری ج ۳، ص ۷۔ ۴۔ تفسیر طبری ج ۳، ص ۹۔

ہم اپنے طویل خط میں بہت سی آیات اور روایات لکھ کر خدا کے لیے مکان کا اثبات کیا اور یہاں تک لکھ دیا کہ "اللہ ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس کا تخت آسمان کے اوپر ہے۔"[1]

ابن تیمیہ نے تفسیر طبری کی طرح ابن عطیہ کی تفسیر کی بھی توثیق کی تھی اور کہا تھا کہ ابن عطیہ کی تفسیر بہترین تفاسیر میں سے ہے۔ ابن عطیہ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ کی ان تمام روایات کو نقل کیا ہے جنھیں طبری نے نقل کیا ہے۔ ابن تیمیہ نے تفسیر طبری سے کچھ آیات صفات کی روایات نقل کی ہیں جو کہ اس کے عقیدے کی مؤید ہیں لیکن ابن عطیہ نے ان روایات کے متعلق لکھا ہے،

"یہ فرقہ مجسمہ اور جاہل لوگوں کی باتیں ہیں، انھیں پیش نہیں کرنا چاہیے۔"[2]

سورۂ قصص آیت ۸۸ میں ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ اور سورۂ رحمٰن آیت ۲۷ میں ہے وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ○ ابن تیمیہ نے ان دونوں آیات سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی چہرہ مراد لیا ہے جبکہ طبری نے اپنی تفسیر میں كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کے ضمن میں لکھا ہے کہ إِلَّا وَجْهَهُ کے متعلق اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات وجہ سے اس کی "ذات" مراد لیتے ہیں جس سے آیت کے معنی یہ بنتے ہیں کہ اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں وجہ کے معنی "رضا" ہے یعنی ہر چیز ختم ہو جائے گی سوائے اس عمل کے جو رضائے الٰہی کے لیے انجام دیا گیا ہو۔ ان حضرات نے اپنے قول کی دلیل میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْبًا لَسْتُ مُحْصِيَهُ رَبَّ الْعِبَادِ إِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ

میں خدا سے اپنے ان گنت گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ میں اپنا چہرہ اپنے رب کی طرف کرتا ہوں اور اسی کے لیے اپنے عمل انجام دیتا ہوں۔[3] اس بیان کے بعد طبری نے اور کوئی اضافہ نہیں کیا۔

بغوی کہتے ہیں، وجہ سے "وہ" خود مراد ہے۔ اس طرح آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر "وہ" خود باقی رہے گا۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس سے اس کی ملکیت مراد ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی ہوں گے کہ ہر چیز ختم ہو جائے گی مگر اس کی "ملک" باقی رہے گی۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کے متعلق ابو العالیہ نے کہا اس سے مراد ہے کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی مگر وہ "عمل" باقی رہے گا جو بوجہ اللہ انجام دیا گیا ہو۔" بغوی نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔[4]

تفسیر درمنثور میں اس آیت کے ضمن میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس کا مطلب ہے ہر چیز ختم ہو جائے گی مگر جس عمل کا ہدف رضائے الٰہی ہوگا وہ عمل باقی رہے گا۔

۱۔ ابن تیمیہ، مجموع الرسائل الکبریٰ ص ۳۲۹، ۳۳۲۔ ۲۔ شوکانی، تفسیر فتح القدیر ج ۱، ص ۲۷۲۔
۳۔ تفسیر طبری ج ۲۰، ص ۸۲۔ ۴۔ تفسیر بغوی ج ۳، ص ۴۵۹۔

مجاہد سے بھی یہی قول منقول ہے کہ جس عمل کا ہدف خدا کی رضا ہوگا وہ عمل باقی رہے گا۔
سفیان نے کہا کہ وہ نیک اعمال باقی رہیں گے جن کا ہدف خدا کی رضا ہوگا۔

محترم قاری! سلف کے اقوال تو یہ ہیں جنھیں ہم نے اہمیت کی تفاسیر سے نقل کیا ہے اور مفسرین نے ان پر کوئی اضافہ بھی نہیں کیا ہے نجانے ابن تیمیہ کن سلف کی بات کر رہا ہے؟!

ابن تیمیہ کے جواب میں ہم قرآن کریم کی یہ دو آیات لکھ رہے ہیں:

لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ تم لوگ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو اور جانتے بوجھتے حق کو کیوں چھپاتے ہو؟ (سورۂ آل عمران: آیت ۷۱)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ○ جو لوگ ہماری واضح آیات اور ہدایت کو (کسی فاسد مقصد سے) چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں اسے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسے لوگوں پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۵۹)

ابن تیمیہ کی کذب بیانی دیکھ کر اُس دور کے علماء نے اُس کی شدید مذمت کی تھی اور اس کے خلاف فتوے دیئے تھے اور لوگوں کو اُس سے متنفر کیا تھا یہاں تک کہ اسے جیل جانا پڑا تھا اور جیل میں اس کے لکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ابن تیمیہ کو اُس کے فاسد عقائد کی وجہ سے دمشق کی جیل میں رکھا گیا تھا اور وہیں اُس نے وفات پائی۔

عالم اسلام کے بہت سے علماء و حفاظ نے اس کی آراء کی تردید کی تھی۔

ذہبی نے ایک خط میں اس کے عقائد پر اسے خوب ملامت کی تھی۔ علامہ امینی نے الغدیر ج ۵ ص ۸۸ پر کوثری کی کتاب تکملۃ السیف الصیقل کے ص ۱۹۰ کے حوالے سے ذہبی کا پورا خط نقل کیا ہے۔ ذہبی کا خط خاصا طویل ہے اس لیے ہم اس کے صرف چند جملے نقل کرتے ہیں:

''ابن تیمیہ! تیری پیروی کرنے والا کفر و گمراہی کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے۔ اگر کسی کے پاس علم اور بصیرت کم ہو اور وہ تیری پیروی کرے تو باطنی اور شہوانی بن جاتا ہے۔ جو شخص اپنے ہاتھ اور زبان سے تیرا دفاع کرتا ہے وہ در پردہ تیرا دشمن ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تیرے اکثر پیرو پسماندہ اور کم عقل ہیں یا جھوٹے اور کند ذہن ہیں؟ یا غریب، بزدل اور مکار ہیں؟ یا بے توقیر اور نادان ہیں؟ اگر یقین نہ آئے تو ان کا امتحان لے کر اور ان کے متعلق عادلانہ تحقیق کر کے دیکھ لے۔''

ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب الدرر الکامنہ جلد اول ص ۱۴۷ پر لکھتے ہیں:

''لوگوں نے اسے یہاں وہاں سے رد کر دیا تھا اور اس کی وجہ اس کی بے قدر بدعات اور

خود ساختہ آراء تھیں۔ اس نے کتاب وسنت اور اجماع و قیاس پر ہاتھ صاف کیے تھے، اسی لیے دمشق میں منادی کرادی گئی کہ جو شخص ابن تیمیہ کے عقائد کو مانتا ہے اس کا خون اور مال حلال ہے۔"

حافظ عبدالکافی سبکی نے ابن تیمیہ کے رد میں شفاء الاسقام فی زیارۃ خیر الانام علیہ الصلاۃ والسلام نامی کتاب لکھی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب الدرۃ المضیئۃ فی الرد علی ابن تیمیۃ کے مقدمے میں لکھا ہے "امابعد! ابن تیمیہ نے اصول عقائد میں بہت سی بدعات کی بنا ڈالی ہے۔ اس نے اسلام کی بنیادوں کو خراب کیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کتاب وسنت کی پیروی کی آڑ میں چھپایا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ وہ حق کی طرف دعوت دیتا ہے اور بہشت کی طرف ہدایت کرتا ہے جبکہ وہ قرآن وسنت کی پیروی سے منحرف اور بدعت میں معروف ہے۔ وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو چکا ہے۔ اس نے اجماع امت کی مخالفت کی ہے۔ ابن تیمیہ کی باتوں سے اللہ تعالیٰ کی جسمانیت اور اس کی ذات کا مرکب ہونا لازم آتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو "محل حوادث" مانتا ہے۔"[1]

حافظ سبکی کے علاوہ بھی دسیوں علماء نے ابن تیمیہ پر اعتراضات کیے تھے۔ ہم ان کی آراء کو اس مختصر کتاب میں نقل کرنے سے معذرت چاہتے ہیں۔ ہم ابن تیمیہ کے متعلق ابن حجر ہیثمی کے اس تبصرے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "ابن تیمیہ کو خدا نے خوار، گمراہ، اندھا، بہرہ اور ذلیل کیا ہے۔"

یہ ہمارا نہیں، ان علماء کا قول ہے جنھوں نے اس کے فاسد عقائد کو بیان کیا ہے اور اس کی تکذیب کی ہے۔ اگر کوئی شخص ابن تیمیہ کے متعلق زیادہ معلومات جاننا چاہتا ہے تو اسے "ابوالحسن سبکی" کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ابوالحسن سبکی امام اور مجتہد ہیں۔ تمام علماء ان کی امامت، عظمت اور اجتہاد کے قائل ہیں۔ نیز اُن کے عظیم القدر فرزند تاج کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔ امام عز بن جماعہ اور دیگر شافعی، مالکی اور حنفی علماء کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔

ابن تیمیہ نے صرف متاخرین صوفیہ پر اعتراض نہیں کیا بلکہ عمر بن خطاب اور علی بن ابی طالبؑ پر بھی اعتراض کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ اُس کے کلام کو اہمیت نہیں دیتے اُن کے نزدیک ابن تیمیہ بدعتی، گمراہ، گمراہ کن اور مفرط ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے عدل کے مطابق اس سے معاملہ کرے (یعنی اسے کبھی نہ بخشے) اور ہمیں اس کے عقیدے اور نظریے سے اپنی امان میں رکھے۔ آمین

الملل والنحل ہی میں ہے کہ ابن تیمیہ خدا کے لیے جہت کا بھی قائل ہے۔ اس نے ایسے مطالب کا اثبات کیا ہے جو اس کے پیروؤں سے جسمانیت واستقرار کے عقیدے کا تقاضا کرتا ہے۔

فی الوقت ہم ابن تیمیہ کی باتوں کو یہاں رد کرتے ہیں البتہ وہابیت کی تردید کے وقت ہم اس

۱۔ شہرستانی، الملل والنحل ج ۳، ص ۳۱۔

کے کچھ نظریات بیان کریں گے کیونکہ وہابیت تاریخی طور پر ابن تیمیہ کے عقائد کا تسلسل ہے جبکہ خود ابن تیمیہ حنبلی عقائد کا پرچارک تھا۔

ابن تیمیہ حق و باطل کو بڑی مہارت سے گڈ مڈ کر دیتا تھا۔ حنبلی عقائد کو عام مسلمان سمجھ نہیں پاتے تھے اور ابن تیمیہ نے انھیں آسان بنا کر پیش کیا تھا چنانچہ بعض مسلمان اسے پسند کرتے تھے اور انھوں نے اسے "شیخ الاسلام" کا لقب دیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ اگر باطل حق کا نقاب الٹ کر اپنی اصل صورت میں سامنے آتا تو کوئی بھی مسلمان اس کی پیروی نہ کرتا۔

اس نکتے کو امام علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ خطبہ ۵۰ میں یوں بیان فرمایا ہے:

"فتنوں کے وقوع کا آغاز وہ نفسانی خواہشیں ہوئی ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور وہ نئے ایجاد کردہ احکام کہ جن میں قرآن کی مخالفت کی جاتی ہے اور جنھیں فروغ دینے کے لیے کچھ لوگ دین خدا کے خلاف باہم ایک دوسرے کے مددگار ہو جاتے ہیں۔ اگر باطل حق کی آمیزش سے خالی ہوتا تو وہ ڈھونڈنے والوں سے پوشیدہ نہ رہتا اور اگر حق باطل کے شائبہ سے پاک و صاف سامنے آتا تو عناد رکھنے والی زبانیں بھی بند ہو جاتیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ ادھر سے لیا جاتا ہے اور کچھ اُدھر سے اور دونوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر شیطان اپنے دوستوں پر چھا جاتا ہے اور صرف وہی لوگ بچے رہتے ہیں جن کے لیے توفیق الٰہی اور عنایت خداوندی پہلے سے موجود ہو۔"

(۳) محمد بن عبدالوہاب کا دور

محمد بن عبدالوہاب، ابن تیمیہ کے افکار کا مکمل پیرو تھا۔ اس نے حنبلی عقائد کی ترویج میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی تحریک کا آغاز نجد سے کیا جہاں بدترین حالات کا دور دورہ تھا۔ ظلم و زیادتی عام تھی۔ کسی کو ناحق قتل کرنا معمولی بات تھی۔ چنانچہ ایسے ماحول میں ابن عبدالوہاب نے حنابلہ کے خشک عقائد کو خوب پھیلایا بلکہ تاریخ میں پہلی بار ایک مکمل علاقے پر اس نے حنبلی نظریات مسلط کر دیے ورنہ اس سے قبل حنبلی عقائد اتنے مقبول نہیں تھے۔

اُس سے پہلے حنبلی عقیدہ تاریخ کے دو ادوار سے گزر چکا تھا۔ سب سے پہلے اس وقت جب حنبلی نظریات عام ہوئے اور اس کا اعزاز اشاعرہ کو ملا اور امام حنبل پس منظر میں چلے گئے۔ اس صورتحال پر ہم یوں تبصرہ کر سکتے ہیں کہ اشاعرہ نے امام حنبل کے نظریات کو ہائی جیک کر لیا تھا۔ دوسرا دور وہ ہے جب ابن تیمیہ نے حنبلی نظریات کا پرچار تو کیا لیکن اسے کچھ زیادہ پذیرائی نہ مل سکی کیونکہ ابن تیمیہ کے مقابلے پر اس دور کے بہترین علماء موجود تھے اور وہ دلائل سے اس کی آراء کی تردید کر دیتے تھے۔ ایک مرحلے پر تو ابن تیمیہ کو سلطان کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن حکومت کو بالآخر علماء کے مطالبات

کے سامنے جھکنا پڑا۔ چنانچہ ابن تیمیہ کو جیل بھیج دیا گیا اور اس کے لکھنے لکھانے پر پابندی لگا دی گئی۔

آج بھی ابن تیمیہ کے نظریات چند کتابوں یا پھر چند بیمار دلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔[1]

ابن تیمیہ کے برعکس ابن عبدالوہاب کو میدان کھلا ملا تھا اور اس نے نجد کے پسماندہ علاقے میں اپنے عقائد کو پھیلایا اور آل سعود کی حکومت نے اس کی بھرپور مدد کی۔ اس کے نظریات کو بزور شمشیر مسلط کیا گیا۔ وہابی لشکر جب بھی کسی علاقے پر یورش کرتا تو لوگوں سے کہتا کہ یا تو وہابیت کو قبول کرو یا پھر کفر و شرک کے فتوے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس صورت میں تمہاری جان اور تمھارا مال حلال ہو جائے گا۔ اور لشکر کشی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ہم توحید خالص کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ ابن عبدالوہاب نے توحید کے متعلق اپنے نظریات کو کچھ اس طرح سے بیان کیا تھا:

"توحید کی دو اقسام ہیں۔ ایک توحید ربوبیت اور دوسری توحید الوہیت۔ توحید ربوبیت کو تو ہر مسلمان اور مشرک مانتا ہے جبکہ توحید الوہیت اسلام اور کفر کی درمیانی سرحد ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ توحید کی ان دونوں اقسام کو اچھی طرح سمجھے اور ان پر عقیدہ رکھے۔

کافر بھی توحید ربوبیت کے قائل تھے۔ وہ بھی مانتے تھے کہ کائنات کا خالق و مدبر اور روزی رساں اللہ ہے جیسا کہ قرآن مجید بتاتا ہے۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ آپ کہہ دیں کہ آسمان و زمین سے تمہیں رزق کون فراہم کرتا ہے اور سماعتوں اور بصارتوں کا مالک کون ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ یہ سب کہیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ آپ کہہ دیں کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ (سورۂ یونس، آیت ۳۱) نیز وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے کام میں لگایا ہے تو وہ یقیناً یہ کہیں گے کہ اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے اور اللہ نے ہی انھیں مسخر کیا ہے۔ (سورۂ عنکبوت آیت ۶۱)

اللہ تبارک و تعالیٰ کو ارض و سماء کا خالق اور کائنات کا رازق و مدبر تو مشرکین عرب بھی مانتے تھے۔ اگر تم بھی ان ہی کی طرح سے صرف اسی عقیدے تک محدود ہو تو پھر تمہارا عقیدہ تمہارے اسلام کے لیے کافی نہیں ہے۔ اسلام کے لیے تمہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہوگا یعنی یہ ماننا ہوگا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور لا الٰہ الا اللہ کے معنی کی گہرائی کو محسوس کرو گے تب تم مسلمان کہلائے جاؤ گے۔[2]

۱۔ سبحانی، الملل والنحل ج ۴، ص ۳۵۳۔ ۲۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب، رسائل فی عقائد الاسلام ص ۳۸۔

محمد بن عبدالوہاب اپنی جاہلانہ گفتگو سے پورے عالم اسلام کو کافر قرار دینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے اپنی بحث کی تان یہاں آکر توڑی:

"ہمارے زمانے کے مشرک، مشرکین عرب سے بھی بدتر ہیں کیونکہ مشرکین عرب کے متعلق قرآن حکیم یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ خوشحالی کے زمانے میں شرک کرتے تھے لیکن جب ان پر کوئی افتاد ٹوٹ پڑتی تو وہ تمام بتوں کو بھول کر خدائے واحد کو ہی پکارا کرتے تھے جیسے کہ قرآن کریم میں آیا ہے فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ○ پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو پکارتے ہیں اور خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں لیکن جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو جھٹ شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۵) جبکہ ہمارے زمانے کے مشرک "مشکلات" میں بھی خدا کو نہیں پکارتے بلکہ "اپنے جیسے بندوں" کو پکارتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا مدد کرنے میں تاخیر کرتا ہے مگر اولیاء مدد کرنے میں تعجیل کرتے ہیں۔"[1]

ابن عبدالوہاب کی نظر میں جو بھی حضرت رسول اعظمؐ اور ان کے اہلبیت معظمؑ سے متوسل ہو یا ان کے مزارات مقدسہ کی زیارت کرے وہ مشرک اور کافر ہے اور اس کا شرک ان مشرکین سے زیادہ ہے جو لات، منات، عزیٰ اور ہبل کی پوجا کرتے تھے۔

چنانچہ ابن عبدالوہاب نے اپنے اس عقیدے کی وجہ سے نجد و حجاز کے ہزاروں مسلمانوں کے قتل اور ان کے گھروں کی لوٹ مار کو جائز قرار دیا تھا۔ اس کے پیروؤں کا نعرہ تھا "وہابی بن جاؤ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، تمہاری بیوی بیوہ اور تمہارے بچے یتیم کہلائیں گے۔"

لطف یہ ہے کہ اُس کا بھائی سلیمان بن عبدالوہاب اس کے عقائد کا مخالف تھا۔ اس نے محمد اور اس کے پیروؤں کے رد میں الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوھابیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں اس نے لکھا کہ "اولیاء اللہ کی تعظیم کرنا اور ان کے مزارات پر جانا امام احمد بن حنبل سے پہلے بھی موجود تھا اور مسلمانوں کے کسی بھی امام نے ان مسائل کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں کہا تھا اور کسی امام نے بھی تم لوگوں کی طرح بلاد اسلام کو بلاد شرک و حرب قرار نہیں دیا تھا۔ تم لوگوں کی حالت تو اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ جو لوگ تمہاری ہاں میں ہاں ملا کر دوسرے مسلمانوں کو کافر نہ کہیں تم انھیں بھی کافر کہتے ہو۔ ائمہ کے زمانے کو آٹھ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن ہم نے آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی امام نے ایسے مسلمانوں کو کافر کہا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی صاحب عقل اس طرح کی بات نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! تمہاری تمام تر گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل کے بعد پوری امت اپنے علماء اور امراء سمیت

۱۔ محمد بن عبدالوہاب، اربع قواعد، ص ۳۔

مرتد اور کافر ہوگئی تھی۔ اگر تمہارا یہی مقصد ہے تو پھر ہم کو اس سوچ پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔ خدایا! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں۔ ہم دوبارہ تیری پناہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی بعض لوگوں کی طرح یہ بات کہیں کہ حجت "تمہاری" وجہ سے قائم ہوئی ہے۔ (کتاب مذکورہ کا ص ۳۸)

سلیمان بن عبدالوہاب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۴ پر لکھا ہے

"آج کے مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ ان "ملاؤں" کے دام فریب میں اسیر ہیں جو خود کو کتاب و سنت کے داعی کہتے ہیں اور حسب دل خواہ جو چاہتے ہیں استنباط کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ان سے کہیں کہ اپنے قول کو اہل علم کے نظریات سے ملا کر دیکھ لو تو وہ نہیں مانتے۔ ان میں سے ہر شخص یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ میرے قول پر عمل کریں اور جو بھی میرے قول کا مخالف ہے وہ کافر ہے۔ اس جماعت میں شامل تمام لوگ اہل اجتہاد کے خصائل سے یکسر عاری ہیں۔ خدا کی قسم! ان میں اہل اجتہاد کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود وہ لوگوں کو کامیابی سے فریب[1] دے رہے ہیں۔ پوری امت مل کر

۱۔ مصر کے دانشور جناب صالح الوردانی — جنھوں نے حالیہ دنوں میں شیعہ مذہب قبول کیا ہے لکھتے ہیں:
مصر میں یہ بات میرے لیے انتہائی تعجب کا باعث تھی کہ اسلامی تنظیمیں ابن تیمیہ کی پیروی پر زور کیوں دیتی ہیں؟
جب میں نے اس معاملے پر غور کیا تو یہ سوالات میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے
(۱) ابن تیمیہ میں آخر ایسی کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے اسلامی قائدین لوگوں کو اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں؟
(۲) ابن تیمیہ سے پہلے جتنے بزرگ علماء گزرے ہیں کیا وہ سب باطل پر تھے؟ اگر ایسا ہے تو اُن کا کیا بنے گا؟
(۳) مروجہ مذاہب کو رد کرنے کے جذبے کو نوجوانوں میں اتنی شدت سے رواج دینے کی کیا ضرورت ہے؟
غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چند خفیہ ہاتھ نوجوان ذہنوں کو پہلے مقرر شدہ مرکز سے بدل کرنا چاہتے ہیں اور اُن کا ہدف یہ ہے کہ جب نوجوان اپنی فقہ سے بددل ہو جائیں گے تو انہیں آسانی سے فریب دیا جا سکے گا۔
جب میں نے وہابی لٹریچر پڑھا تو ان سوالات کے جوابات دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہی وہ نظریہ ہے جس نے نوجوانوں اور مختلف تنظیموں میں رخنہ ڈالا ہے اور وہابیت کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ دوسرے اسلامی مذاہب کو حقیر سمجھا جائے اور ابن تیمیہ کو اسلامی دنیا کا ہیرو تسلیم کرایا جائے۔ اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ وہابیت ایک طرف اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتی، صرف حدیث کی پیروی کرتی ہے جبکہ یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے کیونکہ وہابی "امام احمد بن حنبل" کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے بعد وہ "ابن تیمیہ" اور "محمد بن عبدالوہاب" کے مقلد ہیں۔
میں اس حقیقت کو پانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہابی شخصی تقلید کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ عوام کو چار مشہور ائمہ کی تقلید سے نکال کر ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کی تقلید کے دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو فریب دے کر ان کے مسلمہ فقہی مذاہب سے دور کیا اور انھیں ایک ایسے محدود دائرے میں لے آئے جو عام مسلمانوں سے بڑے فاصلے پر واقع ہے۔ حزب التکفیر نے جب تقلید کی

دہائی دے رہی ہے لیکن وہ اس کے جواب میں ایک لفظ تک نہیں کہتے کیونکہ وہ اپنے سوا پوری امت کو کافر اور جاہل تصور کرتے ہیں۔ خدایا اس گمراہ کو ہدایت دے اور راہ حق کی طرف پلٹا دے۔"

مخالفت میں آواز بلند کی تھی تو اس کے پیرو بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہوئے تھے۔ اس سے پہلے لوگ مشہور فقہاء کی تقلید کرتے تھے۔ اس کے بعد لوگ حزب التکفیر کے قائد شکری مصطفیٰ کی تقلید کرنے لگ گئے۔

علاوہ ازیں دوسرے اسلامی مذاہب کے تقابلی مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ

(۱) تمام سابقہ مذاہب کتب اہلبیت (ع) کو رد کرنے پر متفق ہیں۔

(۲) ان لوگوں نے کتب اہلبیت (ع) کو صرف چند سیاسی اغراض کی وجہ سے رد کیا ہے۔

(۳) اسلام کے مشہور فقہاء امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی ائمہ اہلبیت (ع) کے شاگرد تھے۔

(۴) اسلامی مذاہب میں سے شیعہ وہ واحد مذہب ہے جس نے احکام دین کو اہلبیت رسول (ع) سے حاصل کیا ہے۔

(۵) حنبلی مذہب، حاص کر ابن تیمیہ کا گروہ کتب اہلبیت (ع) کا بدترین دشمن ہے۔

(۶) ابن تیمیہ تمام سنی علماء کی بہ نسبت شیعوں سے زیادہ بغض اور عداوت رکھتا تھا۔

ان تمام نتائج کو جمع کرنے سے مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اس وقت اسلامی دنیا میں بہت سے نظریات رائج ہیں اور سب کے سب سیاست کی پیداوار ہیں اور ان نظریات کے بیچ درمیان ایک نظریہ ایسا بھی ہے جس سے تمام نظریات دشمنی رکھتے ہیں۔ وہ نظریات اسلامی مذاہب کی شکل میں موجود ہیں اور جس نظریے کی مخالفت پر ان سب مذاہب کا اتفاق ہے وہ نظریہ مذہب اہلبیت (ع) ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام مذاہب مذہب اہلبیت (ع) سے آخر کیوں نفرت رکھتے ہیں اور اس دشمنی کی کیا وجہ ہے؟ اور یہ کہ مذہب اہلبیت (ع) کیا ہے اور کس نظریے کی پیروی کرتا ہے؟ لطف کی بات ہے کہ اس کا جواب میری قوم سے مجھے نہ مل سکا کیونکہ سیاست کے تقاضوں نے اہلبیت (ع) کی تمام خصوصیات کو لوگوں کے اذہان سے محو کر دیا ہے اور کچھ تذکرہ بچا بھی ہے تو وہ صرف اتنا جس سے حکمرانوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ جس دن سے معاویہ نے اقتدار سنبھالا اور بنی امیہ تخت نشین ہوئے اُس دن سے امت کو اہلبیت رسول (ع) کی دشمنی کا سبق پڑھایا گیا۔ تمام بلاد اسلامی میں منبروں پر حضرت علیؑ اور اُن کی اولاد پر سب و شتم کیا جاتا تھا اور بات یہاں تک محدود نہ رہی بلکہ حضرت علیؑ، اُن کی اولاد اور ان کے شیعوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا اور اُن کی عمارات اور اُن کے علوم کو برباد کر دیا گیا اور ان مقاصد کی تکمیل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ (التشیع والسیاسۃ فی الاسلام، ص ۱۳۳)

یہ وہ دور تھا جب بی بی عائشہ، ابن عمر اور ابوہریرہ احادیث رسولؐ کے سرکاری راوی تھے اور لوگ انہیں اسلام کا ترجمان سمجھ کر اُن کی بیان کردہ احادیث پر عمل کرتے تھے۔ اُن کی تعلیمات کے نتیجے میں لوگ آل محمد (ع) کے مخالف بن گئے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آل محمد (ع) سے دشمنی آج کی نہیں صدیوں پرانی ہے اور اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس دشمنی کی ابتدا اُس وقت ہوئی تھی جب موجودہ مذاہب کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ آل محمد (ع) سے دشمنی کی تکمیل معاویہ کی رہنمائی میں انجام پائی۔ معاویہ نے لوگوں کو اُن افراد کی طرف متوجہ کیا تھا جو اُس کی حکومت کو جائز سمجھتے تھے اور معاویہ کے نظریات سے دشمنی نہیں رکھتے تھے۔ ایسے تمام افراد جو حضرت علیؑ کی رہبری میں خط اہلبیت (ع) کی پیروی کرتے تھے، معاویہ نے اُن سے کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کیا اور انہیں معاشرے سے کاٹ کے رکھ دیا تھا۔

(تقریب ص ۴۳ مطبوعہ مجمع علمی اسلامی) رضوانی

مسئلہ "توحید ربوبیت" کی تحقیق

محمد بن عبدالوہاب نے جس مسئلے کی وجہ سے اہل قبلہ کو کافر کہا تھا اور آج تک اس کے پیروکار بھی ان کو کافر کہہ رہے ہیں، آیئے اس مسئلے کی ماہیت کو سمجھیں۔

پہلے تو ہم "توحید ربوبیت" کے مفہوم کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ لفظ "رب" سے "خالق" مراد لینا صحیح نہیں ہے اور یہ مفہوم قرآن حکیم کی منشاء کے خلاف ہے کیونکہ رب کے معنی لغت اور قرآن کریم میں "مدبر" اور "متصرف" کے ہیں۔ نیز رب کے کچھ اور مصادیق بھی ہیں مثلاً یہ لفظ تربیت، اصلاح، ریاست، مالکیت اور ہمراہ ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے جبکہ وہابی "رب" سے خالق[1] مراد لیتے ہیں۔

وہابیوں کے اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے حسب ذیل آیات پر توجہ فرمائیں

(۱) بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ بلکہ تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اسی نے انھیں بنایا ہے۔ (سورۂ انبیاء آیت ۵۶)

(۲) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۱)

اب ہم وہابیوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے بقول لفظ رب کے معنی اگر خالق ہے تو پھر سورۂ بقرہ اور سورۂ انبیاء کی ان آیات میں رب کے ساتھ ساتھ خَلَقَكُمْ اور فَطَرَهُنَّ کے الفاظ کیوں آئے ہیں؟ ہاں! اگر ان آیات میں "رب" کے معنی مدبر لیے جائیں تو پھر خَلَقَكُمْ اور فَطَرَهُنَّ کے الفاظ

۱۔ فرعون نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے اور کیا (نیل کی) یہ نہریں جو میرے حکم سے بہہ رہی ہیں میری نہیں ہیں۔ (سورۂ زخرف آیت ۵۱)

فرعون نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ملک مصر کی تمام چیزیں اس کے کنٹرول میں تھیں۔ اسے یہ زعم تھا کہ لوگوں کا دانہ پانی اس کے کنٹرول میں ہے۔ وہ جب چاہے لوگوں کا پانی بند کر دے اور روزی بند کر دے چنانچہ لوگوں کی زندگی کے فیصلے کرنے کا حق اس کا ہے۔ لوگ اپنے مقدمے فیصل کرانے اسی طاغوت کے پاس جاتے تھے۔ اس کے دماغ میں یہ خناس سما گیا تھا کہ وہ لوگوں کا "رب" ہے لہٰذا اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ "دین" یعنی "قانون" ہے چنانچہ لوگوں کو اس کا حکم ماننا چاہیے خواہ وہ یہ حکم دے کہ بنی اسرائیل قبطیوں کی خدمت کریں اور خواہ یہ حکم دے کہ بنی اسرائیل کے نومولود لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ کسی کو اس کے اس حکم کے آگے لب کشائی کا حق نہیں۔ فرعون نے کبھی "خالق" ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ میں نے زمین اور آسمان بنائے ہیں۔ وہ یہی کہتا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی یعنی میں تمہارا "رب اعلیٰ" ہوں۔ میری مرضی کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ میرے حکم کے بغیر کوئی سانس نہیں لے سکتا۔ حکم میرا ہے۔ فیصلہ میرا ہے۔ اختیار میرا ہے۔ اس لیے میرے دین و قانون اور میرے نظام کو مانو۔

(اسلامی عقائد قرآن کی روشنی میں ص ۲۰۸ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

بالکل صحیح ہوں گے اور سورۂ بقرہ کی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ تمہارے معاملات کا مدبر بھی ہے اور سورۂ انبیاء کی آیت کا مطلب ہوگا کہ آسمانوں اور زمین کا خالق ان میں متصرف ہے اور بلحاظ مالک ان کی تدبیر کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں لہٰذا ابن عبدالوہاب کا یہ کہنا کہ "توحید ربوبیت کو تو مسلمان اور کافر سب مانتے ہیں" بالکل فضول سی بات ہے اور اس کا یہ قول نص قطعی کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (اے رسولؐ!) آپ کہہ دیں کہ کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور پروردگار تلاش کروں جبکہ وہ تمام چیزوں کا رب ہے۔ (سورۂ انعام آیت ۱۶۵)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ کیا تم لوگ مجھ سے یہی چاہتے ہو کہ میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور رب کو تلاش کروں جبکہ وہی اللہ ہر چیز کا پہلے سے رب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ تمام "موجودات" کا مدبر ہے اور خدا کے سوا کوئی مدبر نہیں ہے جبکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم زبان سے اللہ کا اقرار کر کے رب کسی اور کو مانتے ہو اور دوسروں کو مدبر تسلیم کرتے ہو۔

اگر کافر اللہ کو پہلے سے ہی رب مانتے تھے تو پھر مذکورہ بالا آیت کا مفہوم کچھ بھی نہیں رہے گا۔ یہ ایک مہمل اور اضافی کلمہ سمجھا جائے گا۔ اگر وہ اللہ کو پہلے سے ہی رب مانتے تھے تو اللہ نے قرآن مجید میں یہ کیوں فرمایا کہ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں کسی غیر اللہ کو رب مانوں؟"

اس سے ملتی جلتی آیت سورۂ مومن میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب فرعون نے اپنے دربار میں حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تو مومن آل فرعون نے دربار میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جس کا قصور یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ میرا رب ہے جبکہ وہ تمہارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے۔ (آیت ۲۸)

اگر وہابیوں کے بقول تمام لوگ اللہ کو رب مانتے تھے تو پھر مومن آل فرعون نے یہ کیوں کہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کا قصور اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں کہ وہ کہتے ہیں میرا رب "اللہ" ہے؟

علاوہ بریں قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر "رب" کے معنی خالق کے بجائے "مدبر امور" کے ہیں اور عہد نزول قرآن کے اکثر افراد اللہ کے سوا بہت سی دوسری قوتوں کو مدبر کائنات مانتے تھے۔

ابن عبدالوہاب، ابن تیمیہ کا مقلد تھا جبکہ ابن تیمیہ احمد بن حنبل کا مقلد تھا۔ ابن تیمیہ ایک پڑھا لکھا اور ہوشیار آدمی تھا لیکن اس کے دلائل کے توڑ کے لیے اس وقت بہت سے علماء بھی موجود تھے جبکہ ابن عبدالوہاب کو بالکل خالی میدان ملا تھا۔ مقابلہ کرنے والے علماء وہاں موجود نہیں تھے اسی لیے

اس نے اپنے گروہ کے علاوہ باقی تمام اہل قبلہ پر کفر کا فتویٰ عائد کیا تھا۔ اس مطلب کی مزید وضاحت کے لیے ہم "توحید الوہیت" کے عنوان سے کچھ معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

توحید الوہیت کا مفہوم

"توحید الوہیت" سے وہابیوں کی مراد یہ ہے کہ عبادت صرف اور صرف اللہ کی کرنی چاہیے اور کسی کو عبادت میں اس کا شریک نہیں بنانا چاہیے۔ توحید کے اسی مفہوم کی تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو مبعوث کیا تھا۔

اس مفہوم میں کسی قسم کا اشکال نہیں ہے البتہ اصطلاح میں اشکال موجود ہے کیونکہ لفظ "اللہ" قرآن مجید میں معبود کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا ہم اس توحید کو توحید عبادت کا نام دے سکتے ہیں البتہ چونکہ مفہوم پر ہمارا اتفاق ہے اس لیے ہم اصطلاحات پر خواہ مخواہ بحث کرنا نہیں چاہتے۔

اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ عبادت صرف خدا کی ہی کرنی چاہیے۔ غیر خدا کی عبادت قطعاً حرام ہے البتہ "عبادت" کا مفہوم سمجھنے میں وہابیت کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ توحید خالص صرف اللہ کی عبادت کا نام ہے تو ہمارے اس جملے کا صحیح مفہوم تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ہمیں عبودیت کا مفہوم معلوم ہو۔ جب تک ہمارے پاس عبودیت اور بندگی کو بتانے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوگا اس وقت تک ہم مسلم اور مشرک میں تمیز نہیں کر سکیں گے۔ اب اگر کوئی مسلمان توسل کی نیت سے اولیاء اللہ کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور ان کی تعظیم بجا لاتا ہے تو کیا وہ مشرک بن جائے گا؟ اس بات کا تمام تر دارومدار "عبادت کا مفہوم" جاننے پر ہے۔

مفہوم عبادت کے متعلق ایک وہابی سے مباحثہ

وہابیت کی تعلیم یہ ہے کہ ہر طرح کی عاجزی، انکساری، فروتنی اور تذلل "عبادت" کے دائرے میں آتی ہے اور جو بھی شخص کسی کے سامنے اظہار عجز کرتا ہے وہ اس کی عبادت کرتا ہے۔ ایسا کرنے والا عابد ہوتا ہے اور جس کے سامنے اظہار عجز کرتا ہے وہ معبود ہوتا ہے چنانچہ ایسا آدمی مشرک ہوتا ہے۔ پس جو کوئی رسول خداؐ کی زیارت کو جائے اور آپ کی قبر مطہر کو چومے یا برکت کے لیے قبر کو مس کرے وہ کافر و مشرک ہے۔ یہی حکم باقی قبور کے لیے ہے (وہ اسے قبر پرستی کہتے ہیں)۔

ابن عبدالوہاب نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے "جو شخص فائدہ حاصل کرنے یا نقصان دور کرنے کی غرض سے کسی قبر، درخت، ستارے، فرشتے یا انبیاء و مرسلین کی طرف "متوجہ" ہو اس

نے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کی نفی کر کے اپنے لیے ایک اور "اللہ" ڈھونڈ لیا ہے لہٰذا ایسے شخص سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر وہ توبہ کرلے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اور اگر یہ مشرک کہے کہ میں تو صرف تبرک کا قصد رکھتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ نفع نقصان صرف خدا کے ہاتھ میں ہے تو اس سے کہو کہ بنی اسرائیل نے بھی تمھاری طرح کی بات کہی تھی۔ جب وہ دریا پار کر کے ایک بت پرست قوم کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں کی عبادت کے لیے بیٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں آپ ہمارے لیے بھی ایسا ایک معبود بنا دیں تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے فرمایا تھا۔ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ○ تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔[1] (سورۂ اعراف آیت ۱۳۸)

ابن عبدالوہاب اپنے دوسرے رسالے میں لکھتا ہے: اسی طرح جو بھی کسی پتھر یا درخت سے برکت چاہتا ہے یا برکت حاصل کرنے کی غرض سے قبر یا قبہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اس نے درحقیقت اسے اپنا معبود بنالیا ہے اور اپنا خدا مان لیا ہے۔[2]

آیئے دیکھیں کہ وہابی عالم محمد سلطان معصومی اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ پڑھنے والے ان موحد مسلمانوں کے بارے میں کیا کہتا ہے جو رسول اکرمؐ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور آپ کی ضریح مبارک سے برکت حاصل کرتے ہیں۔

معصومی لکھتا ہے: حقیر کو چار مرتبہ مدینہ طیبہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جب میں نے گہری نظر سے مسجد نبویؐ اور قبر رسولؐ کے اردگرد کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں ایسے اعمال دکھائی دیئے جو ایمان کے بالکل متضاد، اسلام کی عمارت کو منہدم کرنے والے اور عبادات کو باطل کرنے والے تھے۔ مجھے وہاں غلو کی پیدا کردہ شرکانہ باتیں نظر آئیں۔ مجھے وہاں جہالت کے انبار، اندھی تقلید اور ناجائز تعصبات دکھائی دیئے۔ اس طرح کے غلط کام کرنے والوں میں اکثریت دور دراز علاقوں سے آنے والوں کی تھی جنھیں دین کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ان لوگوں نے محبت رسولؐ میں اتنا غلو کیا ہے کہ قبر رسولؐ کو ایک بت بنالیا ہے اور انھیں اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔[3]

وہابیت نے مفہوم عبادت کے متعلق جس طرح سے غلط بحث کیا ہے اس کی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے "عبادت" کے مفہوم کو متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا ہر طرح کی تعظیم عبادت ہے؟ صرف فرقتی کو شرعی اور عقلی طور پر سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی کے سامنے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے مثلاً ایک شاگرد اپنے استاد کے سامنے اور ایک

۱۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب، رسائل فی عقائد الاسلام ص ۳۶۔

۲۔ المشاھدات المعصومیہ عند قبر خیر البریہ ص ۱۵۔

سپاہی اپنے سپہ سالار کے سامنے انتہائی انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ شاگرد اپنے استاد کی یا سپاہی اپنے سالار کی عبادت کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے سامنے عاجزی کا پیکر بنے رہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ شفقت کے ساتھ ان کے سامنے اپنے کندھے جھکائے رکھو۔ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۴)

ویسے بھی مومن کو مومن کے ساتھ فروتنی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیے۔ ارشاد ربی ہے فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ عنقریب اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ سے محبت کرتے ہوں گے اور اللہ ان سے محبت کرتا ہوگا اور جو مومنوں کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے۔ (سورۂ مائدہ آیت ۵۴)

اگر فروتنی "عبادت" ہوتی تو پھر خدا نے مومن کو مومن کے سامنے عبادت کا حکم دیا ہے جبکہ ایسا ہونا محال ہے۔ اس کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں جنھوں نے وہابیت کے محل کو زمین بوس کر دیا ہے قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ . اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو۔ (سورۂ بقرہ آیت ۳۴)

غیر خدا کے سامنے سجدہ کرنے سے زیادہ اظہار ذلت تو ناممکن ہے لہٰذا وہابیوں کو چاہیے کہ وہ فرشتوں پر کافر و مشرک ہونے کا فتویٰ لگا دیں اور (اگر ان میں جرأت ہے تو) یہ بھی کہہ دیں کہ آدمؑ طاغوت تھے۔ (نعوذ باللہ)

سوال یہ ہے کہ اس طرح کے نظریات بیان کرتے وقت وہابی قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے کوئی بھی صاحب عقل یہ تاویل نہیں کر سکتا کہ حضرت آدمؑ مسجود ملائک نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت "قبلہ" کی تھی۔ اگر کوئی اس طرح کی تاویل کرتا ہے تو یقیناً وہ غلطی پر ہے کیونکہ آدمؑ کے لیے بھی سجدہ اسی طرح سے تھا جس طرح سے دوسرا سجدہ ہوتا ہے۔ یہاں سجدہ کے لفظ سے کوئی دوسرا معنی لینا صحیح نہیں ہے۔ الغرض حضرت آدمؑ کے "قبلہ" ہونے کی تاویل ایک بے سند اور بے دلیل تاویل ہے۔ اگر حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ نہ ہوتا اور ان کی حیثیت ایک قبلے کی ہوتی تو ابلیس کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے تو واشگاف الفاظ میں کہا تھا ءَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ○ کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶۱)

اگر حضرت آدمؑ قبلہ بنے ہوتے تو ابلیس کیوں کہتا أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ یعنی اس سے بہتر ہوں؟ اور افضل مفضول کے سامنے سجدہ کرے تو کیسے کرے؟ ابلیس نے تو چیخ چیخ کر کہا تھا ارءَيْتَكَ هَذَا الَّذِي

كَرَّمْتَ عَلَيَّ . کیا تو نے اسے دیکھا ہے جسے تو نے مجھ پر برتری دی ہے؟ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۶۲)
ابلیس نے سجدہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس سے حضرت آدمؑ کی برتری مقصود ہے۔

ایک دن شمالی سوڈان کے شہر بربر میں ایک وہابی شیخ سے میرا مباحثہ ہوا جو وہاں کی مقامی تنظیم انصار السنۃ کا سربراہ تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ ملائکہ نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کیا تھا، اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں تو اس نے کہا وہ سجدہ خدا کے حکم سے ہوا تھا۔ وہابی شیخ نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے جواب سے میری دلیل کی قوت ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے کہا کہ جناب! معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے۔ غیراللہ کو سجدہ کرنا شرک کا سب سے بڑا مظہر ہے اور یہ عین شرک ہے۔ ہم آپ کی بات کو مان لیتے ہیں کہ اس سجدے کا حکم خدا نے دیا تھا تو کیا جب ملائکہ نے سجدہ کیا تھا تو وہ اس سجدے سے مشرک بن گئے تھے یا بدستور موحد تھے؟

شیخ نے کہا کہ وہ غیراللہ کا سجدہ کرکے بھی موحد رہے تھے۔

میں نے کہا کہ جناب! آپ کی اس بات کو عالم تو کیا کوئی جاہل بھی نہیں مانے گا کیونکہ حکم سجدہ ہونے یا نہ ہونے سے سجدے کی ماہیت تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ آپ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کسی کو گالیاں دینا غلط کام ہے اور فرض کریں اور فرض کرنے میں کوئی عیب نہیں ہوتا کہ اللہ ہمیں حکم دے کہ تم فرعون کو گالیاں دو۔ تو کیا ہماری گالیاں حکم خداوندی کے باوجود گالیاں ہی رہیں گی یا وہ گالیاں فرعون کے حق میں مدح وثنا میں تبدیل ہو جائیں گی؟ آپ اس کے لیے ایک اور مثال سنیں۔ اگر بالفرض خدا یہ کہے کہ تم فلاں شخص کی مہمان نوازی کرو اور ہم اس شخص کی مہمان نوازی کریں تو ہمارا یہ عمل مہمان نوازی ہوگا یا کچھ اور کہلائے گا؟ اگر ہمارا یہ عمل مہمان نوازی ہی کہلائے گا تو پھر آپ کو بھی خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ حکم کی وجہ سے اشیا کی ماہیت نہیں بدلتی۔ اگر حکم کی وجہ سے فرعون کو دی جانے والی گالی، گالی ہی رہتی ہے اور حکم کے تحت کی جانے والی مہمان نوازی، مہمان نوازی ہی رہتی ہے تو غیراللہ کے لیے کیا جانے والا سجدہ اگر شرک ہے تو پھر حکم کے بعد بھی وہ شرک ہی کہلائے گا، توحید خالص نہیں بن جائے گا اور آپ کی گفتگو کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ملائکہ کو بھی مشرک مانتے ہیں۔

میری یہ دلیل سن کر وہابی شیخ ہکا بکا رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ جب شیخ خاموش ہوا تو میں نے اُس سے کہا کہ جناب! آپ کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں یا آپ ہماری طرح سے یہ مانیں کہ سجدہ "عبادت" سے خارج ہے یا پھر آپ اپنی ضد پر اڑے رہیں کہ سجدہ شرک کا بدترین مظہر ہے اور ملائکہ نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرکے شرک کیا تھا اور یہ شرک اللہ کی اجازت سے ہوا تھا جبکہ کوئی بھی مسلمان بقائمی ہوش وحواس یہ بات نہیں مان سکتا اور قرآن کریم کی یہ آیت اس نظریے کی تردید کرتی ہے

قُلْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اے رسولؐ) آپ کہہ دیں کہ اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیتا کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (سورۂ اعراف، آیت ۲۸)

اگر سجدہ عبادت شرک ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا کبھی حکم نہ دیتا۔

اگر وہابی سجدہ آدمؑ کی یہ تاویل علیل کریں کہ یہ سجدہ خدا کے حکم سے ہوا تھا تو پھر ہم ان سے یہ پوچھیں گے کہ حضرت یعقوبؑ، ان کی زوجہ اور ان کے گیارہ بیٹوں نے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا تھا۔ یہاں تو اللہ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اللہ نے نہ تو حضرت یعقوبؑ کو مشرک کہا اور نہ ہی ان کے گیارہ بیٹوں کو مشرک کہا جبکہ انھوں نے سجدہ کیا تھا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا وَقَالَ یٰٓاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا .. اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب یوسف کے آگے سجدے میں گر پڑے اور اس وقت یوسف نے کہا کہ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا۔ (سورۂ یوسف، آیت ۱۰۰)

حضرت یوسفؑ کا خواب سورۂ یوسف کی چوتھی آیت میں مذکور ہے۔ آپ نے اپنے والد سے کہا تھا: ... اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ○ میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے جو مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ (سورۂ یوسف، آیت ۴)

مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا گیا تھا۔ الغرض سجدہ آدمؑ اور سجدہ یوسفؑ کی آیات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرف سجدہ بلکہ ہر وہ عمل جس سے کسی کی تعظیم کا مظاہرہ ہو، عبادت نہیں ہے۔

جب ملائکہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کر کے مشرک نہیں بنے اور حضرت یعقوبؑ، ان کی زوجہ اور ان کے گیارہ فرزند حضرت یوسفؑ کو سجدہ کر کے مشرک نہیں بنے تو ایک موحد مسلمان قبر رسولؐ یا قبور ائمہ پر خضوع کا مظاہرہ کرے تو وہ بھی مشرک نہیں بنے گا۔ اگر ایک مسلمان رسول خداؐ یا ائمہ اہلبیتؑ میں سے کسی بزرگوار کی قبر کے گرد چکر لگاتا ہے تو اسے غیر اللہ کی عبادت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ویسے تو ہر مسلمان بیت اللہ کے گرد طواف کرتا ہے اور حج و عمرہ میں صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی کرتا ہے تو کیا مسلمان کعبہ یا صفا و مروہ کی عبادت کرتے ہیں؟ جبکہ ظاہری طور پر تو قبر رسولؐ کے گرد طواف کرنے اور بیت اللہ کے گرد طواف کرنے میں کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیتا۔ قرآن حکیم میں بیت اللہ کے گرد طواف کرنے کا واضح الفاظ میں حکم دیا گیا ہے جیسا کہ فرمان قدرت ہے:

وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ○ قدیم ترین گھر کا طواف کرو۔ (سورۂ حج، آیت ۲۹)

صفا و مروہ میں طواف کا حکم بھی خدا نے دیا ہے "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو کوئی بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۵۸)

برادران اسلام! ذرا ٹھنڈے دل سے بتائیں کہ جب کوئی مسلمان بیت اللہ کا طواف کر رہا ہوتا ہے تو کیا وہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں اینٹ پتھر سے بنے اس مکان کی عبادت کر رہا ہوں؟ اگر صرف عاجزی کا اظہار عبادت ہوتا تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا کہ مسلمان پتھروں سے بنے ہوئے ایک گھر اور صفا و مروہ کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم عنقریب عبادت کے حقیقی مفہوم کو واضح کریں گے لیکن وہابیت کے لیے مشکل یہ ہے کہ اس نے آج تک عبادت کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ لوگ قبر پیغمبرؐ کو چوم رہے ہیں تو ان کے ذہن میں فوراً اُن مشرکین کا تصور ابھرتا ہے جو بتوں کو چوما کرتے تھے اور پھر اپنی بیمار ذہنیت کو کام میں لا کر وہ ایک مسلمان کو بھی مشرک کہنے لگ جاتے ہیں۔

وہابیت کی اصل مشکل یہی ہے حالانکہ بعض اوقات دو عمل دیکھنے میں یکساں ہوتے ہیں لیکن ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے مثلاً ایک مشرک پتھر کے بت کو چومتا ہے اور ایک موحد خانہ کعبہ میں نصب "حجر اسود" کو چومتا ہے۔ ظاہری طور پر تو دونوں پتھر کو ہی چوم رہے ہیں۔ اب وہابی ہمیں بتائیں کہ ایک پتھر کے بت کو چومنے میں اور حجر اسود کو چومنے میں ظاہری طور پر کیا فرق ہے؟ جبکہ حجر اسود کو چومنے والا موحد کہلاتا ہے اور پتھر کے بت کو چومنے والا مشرک کہلاتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ایک قاعدے کا استخراج کیا جائے جس کے تحت ہم یہ کہہ سکیں کہ عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ جب ہمارے پاس یہ قاعدہ ہوگا تو ہم ٹھوکریں کھانے سے بچ جائیں گے۔

قرآن میں عبادت کا مفہوم

"عبادت" اس لفظی اور عملی خضوع کو کہا جاتا ہے جب خضوع کرنے والا اس چیز کو اپنا "معبود" یا "رب" مانے یا یہ مانے کہ اس کا معبود اپنے افعال میں خود مختار ہے یا اپنی زندگی کا خود مالک ہے۔ جب کوئی شخص یہ عقیدہ رکھ کر عمل کرے تو وہ "مشرک" ہے۔ قرآن مجید میں ہے "وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ○ انھوں نے خدا کے علاوہ بہت سے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعہ عزت ثابت ہوں۔ (سورۂ مریم آیت ۸۱)

یہ آیت بتاتی ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کی "الوہیت" کے معتقد تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○ جو خدا کے ساتھ اور معبود قرار دیتے ہیں وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے۔ (سورۂ حجر آیت ۹۶)

یہ آیت وہابیت کی سرکوبی کرتی ہیں کیونکہ ان میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ بت پرست اپنے معبودان باطل کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآن میں ہے۔ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○ آپ مشرکین سے منہ موڑ لیں۔ ہم آپ کو ان لوگوں (کے شر) سے بچانے کے لیے جو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں کافی ہیں۔ جو خدا کے ساتھ اور معبود قرار دیتے ہیں وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے۔ (سورۂ حجر آیت ۹۴ تا ۹۶)

ان آیت مبارکہ میں "اساس شرک" کی وضاحت کر دی گئی ہے یعنی خود تراشیدہ معبودوں کی الوہیت کا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول اکرمؐ نے مشرکوں کو توحید کا پیغام دیا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اِنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ جب اُن لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ لا الٰہ الا اللہ کہو تو وہ تکبر (کے سبب اسے قبول نہیں) کرتے تھے۔ (سورۂ صافات ۳۵)

جب انبیاءؑ نے لوگوں کو لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دی تو انھوں اسے قبول نہیں کیا کیونکہ یہ دعوت ان کے عقائد کے خلاف تھی۔ وہ لوگ غیر خدا کو معبود مانتے تھے، اُن کے لیے خدائے واحد کی الوہیت کو تسلیم کرنا مشکل تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی کی الوہیت کو نہ مانے اس وقت تک وہ اس کی عبادت نہیں کرتا یعنی عبادت کے لیے الوہیت کا عقیدہ ضروری ہے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ . . اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ (سورۂ اعراف، آیت ۵۹)

یہ آیت بتاتی ہے کہ وہ لوگ خدا کی عبادت سے منحرف تھے اور خود ساختہ معبودوں کی الوہیت کے قائل تھے۔ پس شرک کا معیار یہ ہے کہ انسان کسی کی الوہیت کا عقیدہ رکھ کر اُس کے سامنے جھکے یا کسی کو رب مانے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ اس کا خالق، مالک ہے اور اس کی زندگی اور موت[1] اس کے ہاتھ میں ہے تو یہ شرک ہے چاہے یہ عقیدہ کسی صاحب شفاعت و نبوت کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص اس صاحب شفاعت کا "بندہ" قرار دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کفار و مشرکین کو خدا کی عبادت کی دعوت دی گئی ہے:

۱۔ یہ ساری کائنات خدائے حی ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ موت و حیات اس کے بلند قدرت میں ہے۔ کائنات میں اس کے سوا کسی کے پاس اختیارات نہیں ہیں اس لیے ہمیں اپنی مرادیں صرف اسی وحدہ لاشریک سے مانگنی چاہئیں اور صرف اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔ قرآن کریم بڑی وضاحت سے یہ اعلان کر رہا ہے کہ بارش برسانا، سبزہ اگانا، بیماریوں سے شفا دینا، دشمن پر فتح دینا، روزی دینا اور غربت دور کرنا صرف خدائے حی و قیوم کا کام ہے۔ خدا ہی کائنات کا حقیقی معبود ہے، اس کی قدرت اور افعال میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

(اسلامی عقائد قرآن کی روشنی میں مطبوعہ ادارہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ... مسیحؑ نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ (سورۂ مائدہ آیت ۷۲)

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ○ (اے رسولؐ) تمہارا یہ دین ایک ہی دین ہے اور میں تمہارا رب ہوں تم میری ہی عبادت کرو۔ (سورۂ انبیاء آیت ۹۲)

نیز اگر انسان کسی چیز کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ اپنی ذات یا اپنے افعال میں خود مختار ہے اور اسے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس عقیدے کے تحت اگر کوئی کسی کے سامنے جھکے تو وہ مشرک کہلائے گا لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کے سامنے یہ عقیدہ رکھ کر جھکے کہ اس کے اعمال خالصتاً اسی کے پیدا کردہ ہیں اور اس میں توفیق ایزدی کا کوئی دخل نہیں ہے تو ایسا شخص مشرک ہے خواہ وہ اس کے سامنے معمول کا کوئی عمل ہی کیوں نہ بجالائے اور اس عمل کا تعلق بات کرنے اور حرکت کرنے تک ہی کیوں نہ محدود ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ ہادیان دین کے معجزات خود ان کے اپنے پیدا کردہ ہیں اور پھر ان کے سامنے جھکے تو اُس کا جھکنا غیراللہ کی عبادت شمار ہوگا۔ ہم تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سر درد کی گولی کے متعلق بھی یہ عقیدہ رکھے کہ یہ "ذاتی طور پر" شفا دیتی ہے تو اس کا یہ عقیدہ شرک ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ عبادت کے لیے صرف خاکساری اور خضوع کا اظہار کافی نہیں ہے بلکہ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ وہ چیز اس کی رب ہے، معبود ہے یا ذاتی افعال و صلاحیت کی مالک ہے۔

توحید و شرک کا فرق

میں لفظ "ذاتی" پر بار بار زور دے رہا ہوں کیونکہ اس لفظ میں ایک باریک نکتہ پوشیدہ ہے۔ یہی نکتہ توحید اور شرک کے درمیان حد فاصل ہے اور اسی نکتے کی طرف وہابیت متوجہ نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے لیے اس نکتے کو پہچاننا انتہائی ضروری ہے۔ اگر ہم اس نکتے کو سمجھ گئے تو پھر بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور ہم طبیعی اور غیبی اسباب کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

وہابی کہتے ہیں کہ طبیعی اسباب سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً ہر شخص مادی اسباب سے استفادہ کرسکتا ہے لیکن غیبی اسباب سے توسل کرنا شرک ہے یعنی اگر آپ ایسی خواہش کریں جو مادی وسائل سے حاصل نہ ہوسکتی ہو اور آپ غیبی امداد مانگیں تو یہ شرک ہے۔

وہابیت کا یہ عقیدہ واضح طور پر غلط مبحث ہے کیونکہ انھوں نے مادی اور غیبی اسباب کو شرک اور توحید کا معیار قرار دیا ہے اور فیصلہ کرلیا ہے کہ مادی وسائل سے استفادہ عین توحید اور غیبی اسباب سے استفادہ عین شرک ہے۔ اگر ہم گہری نظر سے مادی اور غیبی اسباب کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے

کا کہ توحید و شرک کا معیار دونوں قسم کے اسباب سے بالکل الگ ہے۔ اصل میں شرک و توحید کا معیار انسان کے عقیدے میں چھپا ہے۔ اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اسباب و وسائل "بالذات" مؤثر ہیں اور ان کا خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو یہ شرک کہلائے گا۔ فرض کیجئے کوئی شخص کسی دوا کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ "خود دوا" میں یہ تاثیر ہے کہ وہ مرض کو ٹھیک کرتی ہے اور اس کی تاثیر میں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہے تو ایسا شخص مشرک ہے۔ لہٰذا اسباب خواہ طبیعی ہوں یا غیبی اُن کا اصل موضوع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ انسان ان اسباب کو اصلاً فائدہ مند یا نقصان دہ سمجھتا ہے یا خدا کی دی ہوئی قوت سے ان کی تاثیر کا قائل ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ کوئی بھی سبب اپنے وجود اور تاثیر میں آزاد نہیں ہے اور اس کا وجود خدا کا پیدا کردہ ہے اور اس میں جو اثر ہے وہ بھی خدا نے اُس میں رکھا ہے تو اس کا یہ عقیدہ عین توحید کہلائے گا۔ میں یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوں کہ کوئی مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اسباب و وسائل کے اثرات "ذاتی" ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اس لیے کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو مشرک یا کافر کہے۔ اگر مسلمان انبیائے کرامؑ اور اولیائے عظام سے توسل کرتے ہیں یا اُن کے آثار کو باعث برکت سمجھتے ہیں تو اسے شرک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ مختلف اسباب سے استفادہ کی ایک طبیعی صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی "اسباب" کے متعلق گفتگو فرمائی ہے۔ بعض مقامات پر اُس نے ان امور کو اپنی طرف اور بعض مقامات پر اسباب سے منسوب کیا ہے مثلاً سورۂ ذاریات آیت ۵۸ میں ہے۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ یقیناً اللہ ہی رزق دینے والا مضبوط قوت کا مالک ہے اس آیت میں اللہ نے رزق کو اپنی طرف نسبت دی ہے۔

۲۔ وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ انھیں کھلاؤ اور لباس پہناؤ۔ (سورۂ نساء، آیت ۵)
اس آیت میں اللہ نے رزق کو بندوں کی طرف نسبت دی ہے۔

۳۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ بھلا دیکھو کہ جو کچھ تم بوتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ (سورۂ واقعہ آیت ۶۳۔۶۴)
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود کو زارع کہا ہے۔

۴۔ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ... کاشتکاروں کو وہ فصل بھلی لگتی ہے تاکہ کفار کا دل جلائے۔ (سورۂ فتح، آیت ۲۹)
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو زارع کہا ہے۔

۵۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے

(سورۂ زمر آیت ۴۲) لیکن سورۂ انعام آیت ۶۱ میں ہے حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

۶۔ حق شفاعت کو اپنے لیے مخصوص قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (اے رسولؐ!) آپ کہہ دیں کہ تمام قسم کی شفاعت اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ (سورۂ زمر آیت ۴۴) لیکن سورۂ نجم آیت ۲۶ میں ہے وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ بھی مؤثر نہ ہوگی مگر جب خدا اجازت دیدے (تو اس کے بعد مؤثر ہوگی)۔

خدا نے غیب کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کیا ہے اور اپنے سوا سب کے لیے اس کی نفی کرتے ہوئے سورۂ نمل آیت ۶۵ میں فرمایا ہے قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (اے رسولؐ) آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا مگر سورۂ آل عمران آیت ۱۷۹ میں ہے کہ غیب کی اطلاع کے لیے وہ اپنے رسولوں میں سے بعض کو چن لیتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اور اللہ تمہیں غیب کی باتوں سے مطلع نہیں کرے گا البتہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

اب بتائیے کہ کیا ان آیات کے مفہوم میں نعوذ باللہ تضاد ہے جبکہ صداقت قرآن کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کی آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہاں! ظاہر بین نگاہیں شاید یہ محسوس کریں کہ آیات قرآن میں تضاد ہے حالانکہ ان میں ہرگز کوئی تضاد نہیں۔ اصل میں ان آیات میں اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے ہم نے ابھی بیان کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس ہر کام کی قوت موجود ہے اور وہ قوت اُس کی "ذاتی" ہے جبکہ دوسرے اسباب وعلل کام سرانجام دیتے ہیں لیکن اُن کی قوت ذاتی نہیں ہے، وہ حکم الٰہی کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس مطلب کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر یوں بیان فرمایا ہے: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ آپ نے تیر نہیں پھینکا جب آپ نے پھینکا تھا بلکہ اللہ نے وہ تیر پھینکا تھا۔ (سورۂ انفال آیت ۱۷)

اس آیت میں ہے اِذْ رَمَيْتَ یعنی جب آپؐ نے تیر پھینکا۔ عمل تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى یعنی دراصل وہ تیر اللہ نے پھینکا تھا۔

مقصد یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے "قوت پروردگار" کے تحت تیر پھینکا تھا۔ اصل تیر پھینکنے والا اللہ تعالیٰ تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کے زیر سایہ تیر پھینکا تھا۔

ان آیات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ایسے افعال جو کسی واسطے کے بغیر انجام پاتے ہیں یعنی خدا اُن کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

۲۔ ایسے افعال جو کسی ذریعے سے انجام پاتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے تو بادلوں کے ذریعے برساتا ہے اور مریض کو شفا دیتا ہے تو دوا کے ذریعے شفا دیتا ہے۔ اب اگر کوئی انسان ان "اسباب" سے متوسل ہو اور اُس کا عقیدہ یہ ہو کہ اسباب اور وسائل کی یہ قوت خدا کی عطا کردہ ہے اور یہ بالذات آزاد نہیں ہیں تو ایسا شخص موحد کہلائے گا اور اگر یہ عقیدہ نہ ہو تو پھر مشرک کہلائے گا۔

کیا قادر ہونا یا نہ ہونا توحید و شرک کا معیار بن سکتا ہے؟

وہابیت کو توحید اور شرک کے بارے ایک اور اشتباہ یہ ہوا ہے کہ جس سے انسان کوئی چیز مانگ رہا ہے اس کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ جس سے کچھ مانگا جا رہا ہے کیا وہ دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر کسی ایسے سے مانگا جائے جو قدرت رکھتا ہو تو پھر یہ توحید ہے ورنہ شرک ہے۔ گویا قوت اور عدم قوت توحید اور شرک کا معیار ہے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔

منطقی طور پر اس مسئلے کا توحید اور شرک سے کیا واسطہ ہے؟ اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ اس بات سے ہے کہ جس سے طلب کیا جا رہا ہے کیا وہ دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟

سوال یہ ہے کہ تنگ مزاج اور بدتمیز وہابی "شرطے" روضہ رسولؐ میں کھڑے زائرین کو جھڑکیاں دے کر یہ کیوں کہتے ہیں "اے مشرک! رسول اللہؐ تجھے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟"

خدا جانے وہ فراموش کار ہیں یا جاہل — ہماری نظر میں تو وہ جہالت کے زیادہ قریب ہیں — آخر انہیں یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ فائدہ دینے یا نہ دینے کا توحید اور شرک سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

وہابیوں کی ایک اور جہالت یہ ہے کہ وہ مُردوں سے توسل اور سوال کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔

ابن تیمیہ کے شاگرد ابن قیم نے لکھا ہے "شرک کی ایک اور قسم مُردوں سے مرادیں مانگنا، ان کی پناہ لینا اور ان کی طرف متوجہ ہونا ہے اور یہ چیز دنیا میں شرک کی بنیاد ہے کیونکہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کا نامہ اعمال بند ہو جاتا ہے اور وہ کسی طرح کے نفع و نقصان پر قادر نہیں ہوتا۔"[1]

ایسی غیر منطقی بات صرف وہی کر سکتا ہے جس کے پاس علم دین کے متعلق معلومات نہ ہوں۔ آخر یہ کہنے کی کیا تک ہے کہ اگر ایک مخصوص چیز زندہ انسان سے مانگی جائے تو توحید ہے اور مُردہ

۱۔ مفید ابن عبدالوہاب، فتح المجید ص ۶۷، طبع ششم۔

انسان سے مانگی جائے تو شرک ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق توحید اور شرک سے نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مُردہ کسی کی حاجت پوری نہیں کرسکتا اس لیے اس سے کی جانے والی درخواست رائیگاں جائے گی۔

ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ توحید اور شرک کا حقیقی معیار عقیدہ ہے اور عقیدے کا تعلق کسی کی زندگی اور موت سے نہیں لہٰذا ابن قیم کی گفتگو باطل ہے۔ ابن قیم نے لکھا ہے۔ ''مرنے والے کے اعمال کا دفتر بند ہو جاتا ہے۔'' اگر اس کی بات کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ میت سے درخواست کرنا بے سود ہے لیکن اسے کسی طور شرک نہیں کہا جاسکتا۔ ابن قیم کی یہ بات کہ ''مردہ کسی قسم کے نفع و نقصان پر قادر نہیں ہوتا'' ادھوری بات ہے کیونکہ نفع نقصان کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا کے سوا کوئی بھی نفع نقصان کا مالک نہیں ہے خواہ زندہ ہو یا مُردہ۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدا جسے نفع نقصان کا مالک بنانا چاہے وہ نفع نقصان پہنچانے کے قابل بن جاتا ہے اور اس میں کسی زندہ اور مُردہ کی تخصیص نہیں ہے۔

وہابیت کی طرف سے اور اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر بات کی جائے۔ ہمارا قاری ہمارے بیان کردہ اصول کو مدنظر رکھ کر ان کی تردید کرسکتا ہے۔ ان شرائط کو مدنظر رکھ کر ہر مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ غیبی یا مادی کاموں میں اولیاء اللہ سے پناہ طلب کرسکتا ہے اور انھیں وسیلہ بناسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ○ قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ○ قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي سلیمان نے کہا کہ اے دربار والو! کوئی تم میں ایسا ہے جو قبل اس کے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر ہمارے پاس آئیں ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے۔ جنات میں سے ایک قوی ہیکل جن نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، میں اس کو آپ کے سامنے لا حاضر کرتا ہوں اور مجھے اس پر قدرت بھی حاصل ہے میں امین بھی ہوں۔ ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا کہا کہ میں اسے آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔ (سورہ نمل آیت ۳۸ تا ۴۰)

حضرت سلیمانؑ نے ایک امر غیبی کے متعلق اپنے دربار والوں سے مدد طلب کی تھی۔ ان میں سے جس کے پاس کتاب کا ''کچھ'' علم تھا اس کے پاس ملکہ بلقیس کا تخت لانے کی طاقت موجود تھی۔

لہٰذا اس نے چشم زدن میں ملکہ کا تخت ملک سبا سے اٹھا کر حضرت سلیمانؑ کے سامنے پیش کر دیا۔

جس کے پاس کتاب کا "کچھ" علم تھا اس نے حضرت سلیمانؑ کی اتنی مدد کر دی تھی اور ہم بھی ان سے مدد مانگتے ہیں جن کے پاس کتاب کا "مکمل" علم ہے اور وہ حضرت رسول مقبولؐ اور ان کے اہلبیتؑ ہیں۔

ہماری اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توسل کا تعلق توحید اور شرک سے نہیں ہے البتہ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا توسل طلب کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ علمائے اسلام خواہ ان کا تعلق متقدمین سے ہو یا متاخرین سے، اُن میں سے آج تک ایک بھی عالم نے توسل کو حرام نہیں کہا بلکہ بہت سی روایات میں اسے جائز کہا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت حسب ذیل ہے:

رسول اکرمؐ کے وسیلے سے نابینا کا بینا ہونا

عثمان بن حنیف کہتے ہیں کہ ایک نابینا پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہؐ! آپ اللہ سے درخواست کریں کہ وہ مجھے شفایاب فرمائے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں دعا کر دوں گا اور اگر صبر کرو تو بہتر ہے۔ اس نے کہا کہ آپ دعا فرمائیں۔ رسول خداؐ نے اس سے فرمایا کہ تم ٹھیک سے وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو اور نماز کے بعد یہ دعا پڑھو اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ، یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ لِتُقْضٰی، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ "خدایا! میں تیرے نبی محمد (ص) کے واسطے سے جو نبی رحمت ہیں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمدؐ! میں آپ کے وسیلے سے اپنی حاجت خدا کے حضور لے جا رہا ہوں تاکہ وہ پوری ہو سکے۔ خدایا! انہیں میرا شفیع قرار دے۔"

عثمان بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ وہ شخص ہمارے پاس آیا۔ وہ بینا ہو چکا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی نابینا نہ رہا ہو۔[1]

آیت اللہ شیخ جعفر سبحانی اپنی کتاب "آئین وہابیت" میں فرماتے ہیں:

"اس حدیث کے محکم ہونے اور اس کی سند کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ "ابن تیمیہ" نے بھی اس حدیث کی سند کو مانا ہے اور کہا ہے کہ حدیث میں جس "ابو جعفر" کا ذکر آیا ہے اس سے مراد ابو جعفر عطمی ہے جو ثقہ ہے۔"

۱۔ سنن ابن ماجہ ج ۱، ص ۴۴۱۔ مستدرک حاکم ج ۱، ص ۳۱۳۔ مسند احمد ج ۴، ص ۱۳۸۔ الجامع الصغیر ص ۵۹۔ ذہبی، تلخیص مستدرک۔

رفاعی نے جو دور حاضر میں وہابیت کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ لَا شَكَّ اَنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ صَحِيْحٌ وَّ مَشْهُوْرٌ وَقَدْ ثَبَتَ فِيْهِ بِلَا شَكٍّ وَّلَا رَيْبٍ اِرْتِدَادُ بَصَرِ الْاَعْمٰى بِدُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے۔ دعائے پیغمبرؐ سے اندھے کی بینائی واقعتاً لوٹ آئی تھی۔[1]

رفاعی کتاب التوصل میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو نسائی، بیہقی، طبرانی، ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم کی روایت میں وَشَفِّعْهُ فِيَّ کی بجائے اَللّٰهُمَّ شَفِّعْنِيْ فِيْهِ کے الفاظ آئے ہیں۔ زینی دحلان نے خلاصۃ الکلام میں لکھا ہے اس حدیث کو بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن ماجہ نے سنن میں اور حاکم نے مستدرک میں اپنی اسناد صحیح کے ساتھ اور جلال الدین سیوطی نے اپنی جامع میں نقل کیا ہے۔[2]

کتب حدیث میں اس کے علاوہ وسیلے کے متعلق اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے حسب ذیل کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔ حضرت آدمؑ نے رسول خداؐ کا واسطہ دے کر اپنی توبہ قبول کرائی تھی۔ یہ حدیث مستدرک حاکم جلد ۲، ص ۶۱۵۔ درمنثور جلد اول صفحہ ۵۹ بحوالہ طبرانی میں نیز ابو نعیم اور بیہقی کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ گزشتہ انبیاءؑ کے پیغمبر اکرمؐ سے متوسل ہونے کی حدیث طبرانی کی معجم الکبیر اور معجم الاوسط میں موجود ہے۔ نیز ابن حبان اور حاکم نے اس خبر کو صحیح قرار دیا ہے اور حدیث توسل بحق سائلین سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ ۲۵۶ حدیث ۷۷۸ باب مساجد اور مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۱ پر موجود ہے۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کا اجماع اور دیندار افراد کی سیرت جواز توسل پر دلالت کرتی ہے۔ مسلمان روز اول سے لے کر آج تک انبیاءؑ و صالحین سے متوسل ہوتے رہے ہیں اور کسی بھی عالم نے ان پر نہ تو اعتراض کیا اور نہ ہی اسے حرام کہا ہے۔ فی الحال ہم "وہابی عقائد" پر اس مختصر تبصرے کو کافی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی مکمل تردید کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

علمائے اسلام نے وہابیت کے رد میں دسیوں کتابیں اور ہزاروں مقالے لکھے ہیں۔

علامہ سید محسن امین نے وہابیت کے رد میں ایک طولانی قصیدہ لکھا ہے جس میں ان کے عقائد کی بھرپور تردید کی ہے اور ان کے اشکالات کا جواب دیا ہے۔ سید محسن امین کا یہ قصیدہ ۵۴۶ اشعار پر مشتمل ہے اور کتاب کشف الارتیاب فی اتباع محمد بن عبدالوہاب کے آخر میں مرقوم ہے۔

۱۔ التوصل الی حقیقۃ التوسل ص ۱۵۸۔

۲۔ کشف الارتیاب ص ۳۰۹ بحوالہ خلاصۃ الکلام یہ تمام حوالے "آئین وہابیت" کے صفحہ ۱۴۹ پر مرقوم ہیں۔ کتاب آئین وہابیت اردو میں چھپ گئی ہے۔

اشاعرہ کی تضاد بیانی

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو الحسن اشعری کا تعلق معتزلہ سے تھا۔ پھر اس نے اس فرقے کو چھوڑ کر حنبلی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اشعری ویسے تو حنبلی ہو گیا تھا لیکن مرتے دم تک وہ اپنے معتزلی افکار سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ اس کے عقائد پر معتزلی افکار کی چھاپ باآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

اشعری نے کوشش کی تھی کہ وہ سلفی عقائد کی عقلی توجیہ پیش کرے اور سلفی عقائد کو نقل و عقل کے تقاضوں سے ہم آہنگ ثابت کرے لیکن اس کام میں اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلفی عقائد سینہ بہ سینہ نقل ہوئے تھے اور وہ حدیث پر مبنی تھے جبکہ احادیث میں سے بہت سی احادیث صحیح نہیں تھیں۔ ان میں ایسی احادیث بھی تھیں جنھیں اسلام دشمن عناصر نے اسلام میں داخل کیا تھا اس لیے ابو الحسن اشعری ان کی توجیہ و تعلیل کے وقت تضاد بیانی کا شکار ہو گئے۔

رؤیت خدا کا عقیدہ

ہم یہاں صرف ان کی صرف ایک تضاد بیانی کا ذکر کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس سے اشعری انداز فکر کی پوری نشاندہی ہو جائے گی۔ اس موضوع کا تعلق رؤیت باری کے مسئلہ سے ہے۔ اہل سنت کا اس امر پر اجماع ہے کہ خدا کو دیکھنا ممکن ہے۔

ابو الحسن اشعری اور ان کے شاگردوں نے کوشش کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے اس مسئلے کو کتب حدیث سے نکال کر عقل و برہان کے دائرے میں لایا جائے۔ اہل سنت کی کتابیں رؤیت خداوندی کی روایات سے بھری پڑی ہیں۔ اصل بحث پیش کرنے سے پہلے ان احادیث کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

جابر کہتے ہیں کہ ہم رسول اکرمؐ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ چودھویں کی رات تھی۔ رسول اکرمؐ نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا "تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس کے دیکھنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوگی۔ اگر تم سے ممکن ہو تو سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور سورج کے غروب ہونے سے قبل کوئی نماز قضا نہ کرو۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۔ سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے قبل اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو۔ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۳۰)

صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۳۵، باب فضل صلاۃ العصر اور جلد ۹ ص ۱۵۶ نیز صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۳۹ حدیث ۲۱۱ باب فضل صلاتی الصبح والعصر والمحافظۃ علیہما میں ایک طویل حدیث

میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ کچھ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ جب چودھویں کی رات ہو اور چاند کے سامنے کوئی بادل نہ ہو تو کیا تمہیں چاند کے دیکھنے میں کوئی شک ہوتا ہے؟

صحابہ نے عرض کیا: نہیں۔ یا رسول اللہؐ!

رسول اللہؐ نے فرمایا تم قیامت کے دن اللہ کے دیکھنے میں کوئی شک نہ کرو۔ ہاں اگر تمہیں ایک دوسرے کو دیکھنے میں شک ہو تو یہ اور بات ہے۔ وہ لوگ جو خدا کی عبادت کرتے ہیں خواہ نیک ہوں یا بدکار، خدا ان کے سامنے پہلے تو اس سادہ شکل و صورت میں آئے گا جس میں وہ خدا کو پہلے دیکھ چکے ہوں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا۔ تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟ ہر امت جس کی عبادت کرتی تھی اس کی پیروی کر رہی ہے۔ وہ کہیں گے اگرچہ دنیا میں لوگوں سے ہماری ضرورتیں وابستہ تھیں لیکن ہم نے ان سے دوری اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے لوگوں سے دوستی نہیں کی تھی کیونکہ ہم اپنے پروردگار کے انتظار میں تھے۔ ہم اس کی عبادت کرتے تھے۔

پھر خدا ان سے کہے گا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں۔

وہ دو یا تین بار کہیں گے کہ ہم کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیتے۔

یہاں تک کہ کچھ اس کے انکار کی کوشش بھی کریں گے۔ وہ کہے گا کہ کیا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی علامت مقرر ہے جس سے تم اسے پہچان سکو؟

وہ کہیں گے: پنڈلی۔

پھر خدا اپنی پنڈلی کو ظاہر کرے گا۔

صحیح بخاری جلد ۶ ص ۵۶۔۵۷۔ تفسیر سورۂ نساء، جلد ۹ صفحہ ۱۵۸ کتاب توحید۔

صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۱۶۳۔ ۱۶۷ حدیث ۲۹۹ باب معرفۃ طریق الرؤیۃ۔

جریر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں حضرت رسول خداؐ نے فرمایا کہ تم اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ (صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۱۵۹ کتاب توحید در ضمن آیت بجیدہ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ (سورۂ دہر آیت ۲۲)

اس کے علاوہ کتب صحاح میں رؤیت خداوندی کی دسیوں احادیث موجود ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں دارقطنی نے ایسی احادیث جمع کی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن خدا دکھائی دے گا۔ ایسی احادیث کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔

نیز ابن قیم نے اپنی کتاب حادی الارواح میں ان احادیث کی تحقیق کی ہے۔ ان کی تعداد

تیس تک پہنچتی ہے اور ان میں سے اکثر معتبر ہیں۔

دارقطنی نے یحیٰی بن معین سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میرے پاس دیدار خداوندی کی سترہ احادیث ہیں جو سب کی سب صحیح ہیں۔[1]

چنانچہ ان احادیث کی وجہ سے جو اہل سنت کے ہاں صحیح ہیں، عقیدہ رؤیت قائم کیا گیا۔

حنابلہ کے امام نے اس بارہ میں افراط سے کام لیتے ہوئے اس عقیدے کے تمام مخالفین پر کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ رؤیت الٰہی کے ماننے والوں نے رؤیت کو آخرت تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ خدا کا دیدار دنیا میں بھی ممکن ہے۔ اسفرائنی کہتے ہیں کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ مومنین کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ از روئے عقل اللہ کا دیدار ہر حال میں ہر زندہ کے لیے جائز ہے اور نقل کی بنا پر آخرت میں اہل ایمان کے لیے واجب ہے۔[2]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے ایک جھوٹی حدیث بھی تراشی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں سب سے پہلے رسول خداؐ نے دیکھا تھا۔ یہ روایت پہلے نقل کی جاچکی ہے۔

اس تمہید کے بعد ان کے علماء نے یہ دعوے بھی کیے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے۔ چنانچہ شعرانی، ابن جوزی اور شبلنجی نے عبداللہ بن احمد بن حنبل سے روایت کی ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے والد امام احمد بن حنبل سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ پروردگار! تیرے تقرب کے لیے بہترین چیز کون سی ہے؟

اللہ نے فرمایا: اے احمد! میرا کلام۔

میں نے عرض کیا پروردگار! فہم کے ساتھ یا فہم کے بغیر؟

اللہ نے فرمایا خواہ فہم کے ساتھ ہو خواہ فہم کے بغیر۔[3]

آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے تین بار خدا کو خواب میں دیکھا ہے۔ تیسری بار ۱۲۶۶ھ میں دیدار ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے خدا کو دیکھا وہ بہت ہی نورانی صورت تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ باتیں کیں جو میں بھول گیا ہوں۔ پھر میں بیدار ہوگیا۔ ایک بار میں نے ایک طولانی خواب میں اپنے آپ کو جنت کے دروازے پر خدا

۱۔ فتح الباری فی شرح صحیح البخاری ج ۱۳، ص ۴۰۷۔ ۲۔ الفرق بین الفرق ص ۵۔

۳۔ طبقات شعرانی ج ۱، ص ۵۴، حدیث ۹۳۔ مناقب احمد ص ۵۲۷ بحوالہ ابن جوزی۔ شبلنجی، نور الابصار ص ۳۶۵۔

کے روبرو پایا۔ میرے اور اس کے درمیان مروارید کا ایک پردہ حائل تھا جو مختلف رنگوں سے مزین تھا۔
اللہ نے حکم دیا کہ مجھے مقام عیسیٰؑ پر اور پھر مقام محمدؐ پر لے جایا جائے۔ فرشتے مجھے ان بزرگوں کے پاس لے گئے اور وہاں میں نے جو کچھ دیکھا یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جو اس نے مجھ پر کیا ہے۔[1]

رؤیت خداوندی کے متعلق ہمارے اہل سنت بھائیوں کا یہ عقیدہ ہے جبکہ اللہ ان کی باتوں سے پاک و پاکیزہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں آج تک خدا کی معرفت نصیب ہی نہیں ہوئی۔

اس طرح کے عقیدے سے حسب ذیل خرابیاں لازم آتی ہیں

مذکورہ احادیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے جبکہ کسی چیز کا دیکھنا تب ممکن ہوتا ہے جب وہ چیز قابل دید ہو اور جسم، حجم اور رنگ کی حامل ہو۔ دیکھنے کی ایک شرط یہ ہے کہ جسم آنکھوں کے سامنے ہو اور دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے کے درمیان رکاوٹ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ایک اور شرط یہ ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھ بھی صحیح سالم ہو۔ اب اگر خدا کو قابل رؤیت مان لیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا جسم ہے، مخصوص رنگ رکھتا ہے اور ایک مکان میں محدود ہے جبکہ یہ تمام چیزیں خدا کے لیے محال ہیں۔

عقیدہ رؤیت کو ماننے کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ مختلف صورتوں میں متشکل ہوتا رہتا ہے کیونکہ روایت میں ہے کہ خدا ان کے سامنے دوسری صورت میں آئے گا اور اہل ایمان اس صورت سے آشنا نہیں ہوں گے۔ وہ آکر کہے گا کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ اہل ایمان کہیں گے کہ ہم تجھ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔ پھر وہ ان کے سامنے ایسی صورت میں آئے گا جسے وہ پہچانتے ہوں گے۔

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی پہچان کا ذریعہ پنڈلی ہوگی۔ آخرکار اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا تو اہل ایمان اسے پہچان لیں گے !!!

اس طرح کے عقائد کفر کے برابر ہیں اور ان اسرائیلی احادیث کا منطقی نتیجہ ہیں جنھیں بخاری اور مسلم نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔

ہمارے دوران اہلسنت کی حالت یہ ہے کہ انھوں نے تنزیہ خداوندی پر مذکورہ کتابوں کو ترجیح دی ہے۔ اگر یہ احادیث نہ ہوتیں تو کوئی بھی صاحب عقل اس بات کو ماننے پر آمادہ نہ ہوتا۔

اس کے برعکس جب ہم دین کے سچے محافظوں کی زندگی اور تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اہلبیت رسولؐ نے ہر اس عقیدے کی مخالفت کی تھی جو تجسیم و تشبیہ کا متقاضی ہو۔ آل محمدؐ نے ہمیشہ کعب الاحبار اور وہب بن منبہ جیسے افراد کی اسرائیلی روایات کی کھل کر مخالفت کی تھی۔ عقیدہ تجسیم اور

۱۔ تفسیر روح المعانی ج ۹، ص ۵۲، دار احیاء التراث العربی، طبع ۱۹۸۵ء بیروت۔

عقیدہ تشبیہ کو پھیلانے میں کعب الاحبار اور وہب بن منبہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ تجسیم و رؤیت کا عقیدہ اہل کتاب کی تمام کتابوں میں ملتا ہے لیکن معارف قرآن کے سراسر خلاف ہے۔

خلاصہ یہ کہ رؤیت کی احادیث اگرچہ زیادہ ہیں چونکہ وہ عقل کے خلاف ہیں اس لیے اصول عقائد میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اب اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے نظریہ سے دستبردار ہو جائیں اور مان لیں کہ یہ احادیث عقائد کی دنیا میں قابل بحث ہیں تب بھی یہ احادیث آل محمدؐ کی متواتر تعلیمات کے خلاف ہونے کی بنا پر قابل قبول نہیں ہوں گی۔ آل محمدؐ نے ہمیشہ تجسیم و رؤیت کے عقائد کی مخالفت کی تھی۔

نفی رؤیت کے متعلق اہل بیتؑ کی احادیث

ابوقرہ محدث امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ سے حلال و حرام کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے۔ پھر بولے کہ فرزند رسولؐ! ہمارے پاس ایک روایت ہے جس میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار اور اپنے کلام کو دو انبیاء میں تقسیم کیا ہے۔ کلام کے لیے اس نے حضرت موسیٰؑ کو اور دیدار کے لیے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مخصوص کیا۔

امام نے فرمایا اچھا بتاؤ کہ یہ آیتیں خدا کی طرف سے جن و انس تک کس نے پہنچائی تھیں؟

۱۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (سورۂ انعام، آیت ۱۰۳)

۲۔ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ○ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۰)

۳۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ: آیت ۱۱)

ابوقرہ رسول اکرمؐ نے۔

امام رضاؑ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک فرد آئے اور دنیا کو بتائے کہ خدا نے اسے نبی بنا کر بھیجا ہے اور لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرتیں جبکہ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے) وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا (وہ اس کا علمی احاطہ نہیں کر سکتے) اور لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (کوئی چیز اس کی مانند نہیں) جیسی آیات پیش کرے اور پھر خود ہی کہے کہ میں نے اپنی ان آنکھوں سے خدا کو دیکھا ہے اور میرا علم اس کو محیط ہے اور وہ انسانی صورت رکھتا ہے!!! کیا تمہیں ایسی احادیث پیش کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ بڑے سے بڑے زندیق نے بھی رسول اکرمؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ خدا کے متعلق پہلے کچھ کہتے تھے پھر اس کی تردید کیا کرتے تھے۔

ابوقرہ کیا اللہ تعالیٰ نے وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (اس نے اسے دوبارہ دیکھا۔ سورۂ نجم ۱۳)

کی آیت نہیں اتاری؟

امام علی رضاؑ اس کے بعد والی آیت صاف بتا رہی ہے کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے کسے دیکھا تھا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے ما کَذَبَ الْفُؤادُ ما رَأیٰ ○ جو کچھ ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا اسے ان کے دل نے نہیں جھٹلایا تھا۔ (سورۂ نجم آیت ۱۱)

قرآن کریم نے خود بیان کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے کیا چیز دیکھی تھی۔ فرمان قدرت ہے: لَقَدْ رَأیٰ مِنْ آیاتِ رَبِّهِ الْكُبْرىٰ ○ انھوں نے خدا کی عظیم نشانیاں دیکھی تھیں۔ خدا کی نشانیاں اور ہیں اور خدا اور ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۱۸)

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: وَلا يُحيطُونَ بِهِ عِلْمًا اگر یہ مان لیا جائے کہ آنکھیں اسے دیکھ سکتی ہیں تو پھر اس کا علمی احاطہ ممکن ہو جائے گا اور وہ شناخت شدہ قرار پائے گا۔

ابوقرہ: کیا آپ ان روایات کی تکذیب کرتے ہیں؟

امام علی رضاؑ جب روایات قرآن کے خلاف ہوں تو لامحالہ میں ان کی تکذیب کروں گا اور ویسے بھی مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ کوئی علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور کوئی چیز اس کے مانند نہیں ہے۔[1]

عبداللہ بن سنان روایت کرتے ہیں کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا کہ ایک خارجی آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ابوجعفر! آپ کس کی عبادت کرتے ہیں؟

آپ نے فرمایا: میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔

اس نے کہا: تو کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟

آپ نے فرمایا: "اسے ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ دل حقیقت ایمان سے اسے دیکھتے ہیں۔ مقابل کے ذریعے اس کی پہچان نہیں ہوتی، حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے اور وہ لوگوں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ وہ نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے اور علامات سے مشخص کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے حکم میں ظلم نہیں کرتا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ وہ شخص آپ کے پاس سے یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسالَتَهُ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے۔[2]

اسحاق بن احمد نے امام علی نقی علیہ السلام سے خط کے ذریعے عقیدہ رویت کے متعلق پوچھا تو امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: "رویت کے لیے ضروری ہے کہ دیکھنے والے اور دیکھے

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۱۱۰۔۱۱۲، حدیث ۹۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۰۸، حدیث ۵۔

جانے والے کے درمیان ایسی فضا ہو جہاں سے نگاہ گزر سکے۔ اگر دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے کے درمیان فضا اور روشنی موجود نہ ہو تو دیکھنے والا کچھ نہیں دیکھ سکتا اور رؤیت ممکن نہیں ہوتی نیز دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے کے درمیان ایک طرح کی مشابہت جنم لیتی ہے کیونکہ جب دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے کے درمیان دیکھنے کا سبب مساوی ہو تو مشابہت لازم آتی ہے کیونکہ اسباب کے لیے اپنے سبب سے متصل ہونا ضروری ہے۔"[1]

محمد بن عبیدہ نے امام علی رضا علیہ السلام کو ایک خط لکھا اور اس میں رؤیت کے متعلق شیعہ سنی روایات کا تذکرہ کیا۔ امام نے اپنے ہاتھ سے اس کے جواب میں تحریر فرمایا

"سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ دیکھنے سے شناخت لازم آتی ہے اور اس کے متعلق کسی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آنکھوں سے خدا کو دیکھا جا سکتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ شناخت میں آجائے گا اور ایسی شناخت کو یا تو ایمان کہا جائے گا یا ایمان نہیں کہا جائے گا اور رؤیت کی وجہ سے جو شناخت حاصل ہوگی اگر وہ شناخت ایمان کہلائے گی تو پھر جو شناخت دلیل سے حاصل ہوگی وہ ایمان کے منافی کہلائے گی کیونکہ دونوں قسم کی شناختیں ایک دوسرے کی ضد ہیں جس سے یہ لازم آئے گا کہ دنیا میں کوئی بھی مومن موجود نہیں ہے کیونکہ آج تک کسی نے خدا کو دیکھا نہیں۔ اور اگر رؤیت کی وجہ سے حاصل ہونے والی شناخت ایمان نہ ہو تو پھر اکتسابی شناخت اور آخرت کی شناخت یا تو ختم ہو جائے گی یا ختم نہ ہوگی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خداوند متعال کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ آنکھ سے دیکھنے کا نتیجہ وہی ہوگا جس کی ہم نے وضاحت کر دی ہے۔"[2]

امکان رؤیت کے متعلق اشاعرہ کے عقلی دلائل کا جائزہ

اشاعرہ رؤیت باری تعالیٰ کے لیے حسب ذیل عقلی دلائل پیش کرتے ہیں:

(الف) آنکھ سے خدا کا دیدار کرنے میں کوئی عقلی رکاوٹ نہیں ہے کیونکہ حاسہ چشم سے دیکھنے سے کسی قسم کا غلط نتیجہ لازم نہیں آتا اور نہ ہی یہ خدا کے متعلق عقلی طور پر محال ہے کیونکہ

۱۔ رؤیت کا امکان خدا کے حادث ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ کسی چیز کا دکھائی دینا اس کے حادث ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اگر رؤیت سے کوئی چیز حادث بن سکتی ہوتی تو پھر ہر حادث کے لیے قابل رؤیت ہونا ضروری ہوتا۔

۲۔ رؤیت، دکھائی دینے والی چیز میں کسی جدید معنی کا سبب نہیں بنتی کیونکہ رنگوں کو بھی دیکھا جاتا ہے

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۱۰۹، حدیث ۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۰۹، حدیث ۸۔

لیکن ان میں کوئی نیا معنی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ رنگوں کا تعلق "جوہر" سے نہیں "عرض" سے ہے۔

۳۔ اثبات رویت سے نہ تو تشبیہ لازم آتی ہے نہ ہی اس سے خدا کی جنسیت کی تشخیص ہوتی ہے اور نہ ہی پروردگار کی حقیقت میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے کیونکہ ہم سیاہی اور سفیدی کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن مشاہدے کی وجہ سے نہ تو وہ ہم جنس بنتی ہیں اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جہاں تک اشاعرہ کی پہلی دلیل کا تعلق ہے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رویت کے لیے صرف حادث ہونے کی شرط کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ کچھ اور شرائط بھی ضروری ہیں مثلاً دیکھنے کا عمل تب مکمل ہوتا ہے جب دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے میں مناسب فاصلہ ہو۔ نیز دیکھی جانے والی چیز کا حجم بھی ضروری ہے جو انعکاس نور کا موجب بن سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب بعض حادث اشیاء میں یہ شرائط نہیں ہوتیں تو وہ نہیں دیکھی جا سکتیں لیکن رویت کے لیے ضروری ہے کہ وہاں جہت موجود ہو یعنی دیکھی جانے والی چیز نگاہوں کے سامنے ہو اور پھر جسمیت کا ہونا بھی ضروری ہے لہٰذا جہاں جہت اور جسمیت آجائے وہ چیز حادث ہوتی ہے۔

اس میں عام خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے یعنی ہر دیکھی جانے والی چیز حادث ہوتی ہے لیکن ہر حادث چیز قابل رویت نہیں ہوتی۔

جہاں تک اشاعرہ کی دوسری دلیل کا تعلق ہے کہ رویت سے دیکھی جانے والی چیز میں نئے معنی پیدا نہیں ہوتے تو ہم عرض کریں گے کہ ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کیونکہ مشاہدے سے اس کا حادث ہونا ثابت ہوتا ہے۔ روشنی کا متصل ہونا اور سامنے آنا حادث کی صفات ہیں۔ اگر ان دو شرائط کی نفی کر دی جائے تو پھر آنکھوں کا مشاہدہ ہی باقی نہیں رہتا۔

جہاں تک اشاعرہ کی تیسری دلیل کا تعلق ہے تو وہ بھی پہلی دو دلیلوں کی طرح صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے۔ یہ کہنا کہ تشبیہ لازم نہیں آتی بالکل غلط ہے۔ رویت سے تشبیہ تو ہر صورت میں لازم آتی ہے اور اس سے کسی طرح فرار ممکن نہیں کیونکہ مشاہدے کے لیے روبرو ہونا ضروری ہے اور کسی چیز کا روبرو ہونا اس کے لیے جہت اور مکان کا متقاضی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تشبیہ ہو سکتی ہے کہ اس میں جہت بھی پائی جائے اور جسمیت بھی پائی جائے جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سے پاک ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے۔

(ب) اشاعرہ میں سے باقلانی نے رویت خداوندی پر یوں بحث کی ہے۔ "رویت خداوندی کی دلیل یہ ہے کہ خدا موجود ہے اور ہر موجود قابل رویت ہوتا ہے کیونکہ دیکھنا صرف جنسیت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔

ہم تمام مختلف اجناس کو نہیں دیکھتے۔ اور حادث ہونے کی بھی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم ایک چیز کو ایسی وضع میں دیکھتے ہیں کہ وہ اس حالت میں حادث نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اس میں معنی کا حدوث بھی وجہ نہیں ہے کیونکہ اعراض کو دیکھا جاتا ہے جبکہ ان میں موجود معنی حادث نہیں ہوتا۔[1]

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں جب ہم "اعراض" کو دیکھتے ہیں تو "جواہر" کو بھی دیکھتے ہیں۔[2]

رؤیت، جواہر و اعراض دونوں میں مشترک ہے اور رؤیت مشترک کے لیے ایک علت کا ہونا ضروری ہے اور وہ علت یا "وجود" ہوسکتا ہے یا "حدوث" ہوسکتا ہے لیکن حدوث کسی چیز کے وجود کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ اس کا تعلق عدم سے ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ علت، وجود کو ہونا چاہیے۔ . اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رؤیت، "ممکن" اور "واجب" میں مشترک ہے۔[3]

یہ اتنی بودی دلیل ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ بہت سی اشیاء قابل رؤیت نہیں ہیں لیکن ان کے وجود میں کوئی شک نہیں ہے۔ افکار، عقائد، قدرت اور ارادے جیسی روحانی و نفسیاتی کیفیات موجود تو ہیں لیکن دیکھی نہیں جاسکتیں چنانچہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کسی چیز کے وجود کے لیے اس کا دیکھا جانا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشاعرہ نے بھی اس پر اعتراضات کیے ہیں مثلاً شارح المواقف تفتازانی نے شرح المطالع میں اور قوشجی نے شرح تجرید میں اس پر نکتہ چینی کی ہے۔[4]

اگرچہ لفظ "حدوث" کی بہ نسبت لفظ "وجود" شرائط رؤیت کے عنوان کے طور پر بہتر لفظ ہے لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ ہر موجود مطلقاً قابل رؤیت ہوتا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرائط رؤیت کا پایا جانا بھی ضروری ہے اور یہ شرائط صرف خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کے لیے مناسب ہیں جبکہ خدا کا مخلوق پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ اور اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ خالق کائنات پر طبیعی قوانین کا اطلاق محض تشبیہ ہے اور معرفت پروردگار سے ناواقفیت ہے۔

الغرض اشاعرہ اس طرح کے بودے دلائل سے رؤیت الٰہی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے کلام سے کہیں بلند ہے۔

اشاعرہ کے قرآنی دلائل کا جائزہ

اشاعرہ رؤیت خداوندی کے اثبات کے لیے اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

۱۔ مذاہب الاسلامیین از ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی ج ۱، ص ۶۱۳۔

۲۔ من العقیدۃ الی الثورۃ از ڈاکٹر حسن حنفی ج ۲، ص ۲۵۳۔

۳۔ الملل والنحل از شہرستانی ج ۲، ص ۱۹۹۔ ۴۔ مظفر، دلائل الصدق ج ۱، ص ۹۹، ۱۰۳۔

۱۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَتَذَرُوْنَ الْآخِرَةَ ○ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ○ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ○ مگر تم لوگ دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو۔ اس دن کچھ چہرے خوش اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے اور کچھ چہرے اداس ہوں گے جنھیں یہ خیال ہوگا کہ ان پر مصیبت پڑنے والی ہے۔ (سورۂ قیامت ۲۰ تا ۲۵)

اشعری نے کہا ہے کہ لفظ ناظرۃ اسم فاعل ہے اور اس کا مصدر "نظر" ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ چار معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ اس کا پہلا معنی ہے عبرت حاصل کرنا اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ یہ لوگ اونٹ کی عجیب وغریب خلقت سے عبرت کیوں نہیں حاصل کرتے؟ (سورۂ غاشیہ آیت ۱۷)

۲۔ اس کا دوسرا معنی ہے انتظار کرنا مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً ... یہ لوگ تو بس ایک چنگھاڑ کے منتظر ہیں۔ (سورہ یٰس آیت ۴۹)

۳۔ اس کا تیسرا مطلب ہے رحمت کرنا ہے وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اللہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۷۷)

۴۔ اس لفظ کا چوتھا مطلب ہے "دیکھنا"۔

پھر اشعری نے کہا کہ سورۂ قیامت کی آیت اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں پہلے تین معانی صحیح نہیں ہیں کیونکہ پہلا معنی عبرت حاصل کرنا ہے۔ یہ معنی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آخرت جزائے اعمال کی جگہ ہے، مقام عبرت نہیں اور اس کا دوسرا معنی "انتظار کرنا ہے" اور یہ معنی بھی مناسب نہیں کیونکہ آیت کا تعلق چہروں سے ہے اور ویسے بھی انتظار کرنا ایک زحمت ہے اور جنت میں زحمت غیر مناسب ہے اور تیسرا معنی یعنی رحمت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ رحمت کرنا خالق کا کام ہے، مخلوق کا نہیں اور جب "نظر" کے پہلے تینوں معانی باطل ہیں تو پھر اس سے چوتھا معنی یعنی "دیکھنا" ہی صحیح ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد اشعری نے کلام عرب سے استشہاد کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب لفظ "نظر" کا صلہ اِلٰی حرف جار سے ہو تو اس کا معنی دیکھنا ہوتا ہے اور جب نظر انتظار کے معنی میں ہو تو اس کا صلہ اِلٰی سے نہیں آتا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً اس آیت میں يَنْظُرُوْنَ سے انتظار کرنا مراد ہے لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے لفظ اِلٰی استعمال نہیں فرمایا جبکہ سورۂ قیامت کی آیت میں لفظ اِلٰی موجود ہے جس سے انتظار مراد نہیں ہوسکتا اور لفظ نَاظِرَةٌ سے قبل لفظ وُجُوْهٌ موجود ہے۔ اس سے دونوں آنکھوں سے دیدار کرنا مراد ہے۔ اشعری کہتے ہیں کہ سورۂ قیامت کی آیت میں لفظ نَاظِرَةٌ کے معنی انتظار کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ انتظار میں ایک طرح کی زحمت ہوتی ہے اور اہل ایمان کو جنت

اور قیامت میں کوئی زحمت نہیں ہوگی کیونکہ جنت نعمت کی جگہ ہے ثواب و عقاب کی نہیں۔[1]

اشعری نے یہ کہا ہے کہ جب لفظ "نظر" کلام عرب میں دیکھنے کے معنی میں ہو تو یہ حرف اِلٰی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور اگر یہ لفظ انتظار کے معنی میں ہو تو بجائے خود متعدی ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ نَاظِرَۃٌ اسم فاعل ہے اور اسم فاعل عمل میں تابع فعل ہوتا ہے۔ تابع ہونے کی وجہ سے یہ ضعیف عامل ہے اور اسے تقویت کی ضرورت ہے اور یہاں پر اس کا مفعول بھی عامل پر مقدم ہے اور مفعول مقدم ہونے کی وجہ سے اس کے عمل میں مزید ضعف پیدا ہوا ہے اس لیے اس لفظ کو اِلٰی کے ساتھ تقویت دی گئی ہے۔

اشعری کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جب لفظ "نظر" انتظار کے معنی میں ہو تو اس کو متعدی بنانے کے لیے اِلٰی کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ بجائے خود متعدی ہوتا ہے۔ بعض اوقات انتظار کے لیے بھی لفظ نظر کا صلہ اِلٰی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے لیے جمیل بن معمر کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

وَاِذَا نَظَرْتُ اِلَیْکَ مِنْ مُلْکٍ وَالْبَحْرُ دُوْنَکَ زِدْتَنِیْ نِعَمًا

جب میں تجھ جیسے بادشاہ کا انتظار کروں اور سمندر ہمارے درمیان حائل ہو تو تو میری نعمتوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اس شعر میں نَظَرْتُ انتظار کے معنی میں آیا ہے۔

شاعر رسولؐ، حسان بن ثابت کا شعر ہے:

وُجُوْہٌ یَوْمَ بَدْرٍ نَاظِرَاتٌ اِلَی الرَّحْمٰنِ یَاْتِیْ بِالْفَلَاحِ

روز بدر تمام چہرے خدا کی طرف سے ملنے والی کامیابی کے انتظار میں تھے۔

اس شعر میں بھی نَاظِرَاتٌ انتظار کے معنی میں ہے اور اس کا صلہ حرف اِلٰی سے لایا گیا ہے۔

شعر و ادب کی دنیا میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

علاوہ ازیں لفظ "نظر" جب انتظار کے معنی میں ہو تو اس کو بعض اوقات حرف "با" سے بھی متعدی بنایا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد پروردگار ہے۔ فَنَاظِرَۃٌ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ○ میں اپنے قاصدوں کے جواب کا انتظار کروں گی۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۳۵)

لفظ نَاظِرَۃٌ کبھی حرف جار کے ساتھ اور کبھی بجائے خود متعدی ہوتا ہے۔

۲۔ اشعری کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ انتظار ایک طرح کی زحمت ہے اور اہل بہشت کے لیے زحمت نامناسب ہے۔

۱۔ سبحانی، الملل والنحل ج ۲، ص ۲۰۳۔

ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اشعری سے کس نے یہ کہا تھا کہ ان آیات کا تعلق جنت کے اندرونی حالات سے ہے؟ یہ آیت اندرون جنت کی نعمتوں کو بیان نہیں کر رہی بلکہ موقف حساب میں انتظار کی گھڑیاں گزارنے کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں اور سیاق آیات بھی اس بات کی تائید کرتا ہے تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اس کا تعلق روز قیامت کے حساب کتاب سے ہے کیونکہ کفار و مشرکین اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ ان پر سخت مصیبت پڑنے والی ہے۔ اگر بالفرض وہ دوزخ میں پہنچ چکے ہوتے تو انھیں یہ خیال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا آیت کا سیاق و سباق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لفظ ناظرۃ انتظار کے معنی میں ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہ ایک حقیقی معنی ہے اس لیے اشعری کو یہ معنی حذف کرنے کا حق نہیں تھا۔ اگر ہم لفظ نظر کو انتظار کے معنی میں لیں تو حاسہ چشم سے رؤیت خداوندی کی نفی ثابت ہوگی اور اگر بالفرض لفظ نظر سے رؤیت مراد لیں تو پھر وہ مجازی معنی ہوں گے۔ شیخ سبحانی نے اس معنی کو ایک لفظ کے حذف سے بیان کیا ہے اور کہا ہے،

"تقدیر عبارت" یہ ہوگی اِلٰی ثَوَابِ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اپنے رب کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔

ویسے بھی جب چار آیات کا آپس میں تقابل کیا جائے تو انسانی عقل "تقدیر عبارت" کو تسلیم کرتی ہے۔ پہلی اور دوسری آیت میں اور تیسری اور چوتھی آیت میں دو گروہوں کا ایک دوسرے سے موازنہ پیش کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں جو ابہام تھا اسے چوتھی آیت میں دور کر دیا گیا ہے۔

اب مذکورہ چاروں آیات میں کیفیت تقابل کچھ اس طرح سے ہے۔

۱۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (اس دن کچھ چہرے خوش ہوں گے) اس کے مقابلے پر فرمایا وَوُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (اس دن کچھ چہرے اداس ہوں گے)۔

۲۔ پہلے گروہ کے لیے فرمایا اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (اپنے رب کی رحمت و ثواب کے منتظر ہوں گے) اس کے مقابلے پر دوسرے گروہ کے لیے فرمایا تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (انھیں خیال ہوگا کہ ان پر سخت مصیبت پڑنے والی ہے)۔

جب چوتھی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ گنہگاروں کے گروہ کو یہ خیال ستا رہا ہوگا کہ ان پر ایسا سخت عذاب نازل ہونے کو ہے جو ان کی ہڈیوں کو سرمہ بنا دے گا اور ان کی کمر توڑ دے گا اب اس کے عین مقابلے میں نیکوکار گروہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اپنے رب کی رحمت اور فضل و کرم کے منتظر ہوں گے۔

آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں ہوگا کہ اس دن کچھ چہرے اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے اور اس کی ماہیت کی شناخت میں مصروف ہوں گے۔ اگر یہ معنی لیے جائیں تو دونوں گروہوں کی تقابلی کیفیت ختم ہو جائے گی اور یہ خلاف ظاہر ہے۔ تقابل کا طریقہ یہ ہے کہ جب دو چیزوں کا موازنہ کیا جائے تو

انھیں معنی و مفہوم میں متحد ہونا چاہیے اور ان کا اختلاف صرف نفی و اثبات میں ہونا چاہیے۔[1]

اس تقابل سے آیت کا مفہوم روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے اور اس میں کسی طرح کا ابہام باقی نہیں رہتا اور یہ مفہوم مراد لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آیت میں موقف قیامت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا موقع و محل کے پیش نظر اس کے معنی ثواب اور رحمت کی امید کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتے۔ ائمہ اہلبیتؑ سے اس موضوع پر بہت سی احادیث مروی ہیں چنانچہ شیخ صدوق کتاب التوحید میں لکھتے ہیں کہ امام رضاؑ سے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے اس دن کچھ چہرے شاداں و فرحاں اپنے رب کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔[2]

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ آیت میں موجود لفظ ناظرۃ انتظار کے معنی میں ہے، اس سے خدا کو دیکھنا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر اس سے دیکھنے کے معنی لیے جائیں تب بھی یہ رحمت الٰہی کا کنایہ ہوگا۔ اس طرح کی مثالیں لغت اور ادب میں بکثرت پائی جاتی ہیں مثلاً اگر یہ کہا جائے فُلَانٌ يَّنْظُرُ اِلٰى يَدِ فُلَانٍ (فلاں شخص کی نظر فلاں شخص کے ہاتھ پر ہے) تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ہر وقت اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے ہے بلکہ اس کا مطلب ہے وہ ہر وقت اس کی سخاوت کا منتظر رہتا ہے۔

کسی شاعر نے اس مفہوم کو اس طرح سے بیان کیا تھا:

اِنِّیْ اِلَیْکَ لِمَا وَعَدْتَ لَنَاظِرٌ نَظَرَ الْفَقِیْرِ اِلَی الْغَنِیِّ الْمُوْسِرِ

میں تیرے وعدے کی وجہ سے اسی طرح تیری نگاہ التفات کا امیدوار ہوں جیسے فقیر دولت مند کی نگاہ کرم کا امیدوار ہوتا ہے۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن اہل ایمان رحمت الٰہی پر نگاہیں جمائے ہوئے ہوں گے جبکہ کافروں کی حالت ایسی ہوگی کہ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان کی طرف نگاہ التفات نہیں کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ (سورۂ آل عمران ۷۷)

اس آیت میں وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ کا مطلقاً یہ مفہوم نہیں ہے کہ خدا ان کی طرف بالکل ہی نظر نہیں کرے گا بلکہ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان پر نگاہ رحمت نہیں کرے گا۔ یہاں دیکھنا یا نہ دیکھنا مراد نہیں ہے کہ اس سے انھیں تہدید کی جا سکے کیونکہ یہ مقام، مقام رحمت ہے۔

دلیل دوم۔ اشاعرہ نے رؤیت الٰہی کو ممکن ثابت کرنے کے لیے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى

۱۔ سبحانی، الملل والنحل ج ۲، ص ۲۰۳۔ ۲۔ توحید صدوق ص ۱۱۶، حدیث ۱۹۔

الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر (پہاڑ پر) پہنچے اور ان کے پروردگار نے ان سے کلام کیا تو کہنے لگے کہ اے پروردگار میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں مجھے اپنا دیدار کرا۔ پروردگار نے کہا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم مجھ کو دیکھ سکو گے۔ جب پروردگار نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ تیری ذات پاک ہے اور میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔ (سورۂ اعراف ۱۴۳)

ابو الحسن اشعری نے تو اس آیت سے استدلال نہیں کیا تھا البتہ اشاعرہ نے اس آیت سے رؤیت خداوندی کا استدلال کیا ہے۔ ہم یہاں شیخ باجوری کا استدلال نقل کرتے ہیں۔[1]

(۱) یہ آیت بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند عالم سے دیدار کا سوال کیا تھا اور وہ معتزلہ سے کہیں بہتر جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کون سی چیز ممکن ہے اور کون سی چیز ناممکن ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوتا کہ رؤیت محال ہے تو آپ اس کی درخواست ہی نہ کرتے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے دیدار کو ایسی شرط سے مشروط کیا جو ممکن الوقوع تھی اور وہ شرط پہاڑ کا اپنی جگہ پر قائم رہنا تھا اور یہ بات واضح ہے کہ جو چیز کسی ممکن سے مشروط ہو وہ بھی ممکن ہوتی ہے۔

(۳) معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال اپنی قوم کی فرمائش پر کیا تھا لیکن ہمارے مطابق معتزلہ غلط کہتے ہیں کیونکہ معتزلہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رؤیت خداوندی کو ممکن ماننا کفر ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ قوم نے دیدار کی فرمائش کی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی فرمائش پر دیدار کی درخواست کی تھی۔ جب معتزلہ کے مطابق دیدار الٰہی کا عقیدہ کفر ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے مطالبے پر کافرانہ درخواست نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ درخواست قوم کی فرمائش پر نہیں کی گئی تھی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود کی تھی اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی فرمائش پر یہ درخواست کی تھی تو آپ نے صواب اللہ باطل کی تائید کی تھی اور یہ بات نبی کے شایان شان نہیں ہے۔

[illegible]

[illegible]

---

[1] [illegible]

سے آزاد ہوئے اور مصر سے باہر آئے تو انھوں نے کچھ لوگوں کو بت پرستی کرتے دیکھا تو حضرت موسیٰؑ سے کہا اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ آپ ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دیں جیسے ان کے معبود ہیں۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۳۸)

حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی خواہش کو پوری قوت سے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ تم تو جاہل قوم ہو۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۳۸)

اب اگر بنی اسرائیل کی یہ خواہش کہ وہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں باطل ہوتی تو حضرت موسیٰؑ انھیں ٹوک دیتے لیکن آپ نے بھی خدا سے دیدار کی درخواست کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیدار الٰہی نہ تو کفر ہے اور نہ ہی باطل ہے۔

(۴) ابن فورک نے اشعری سے نقل کیا ہے کہ دیدار کی درخواست کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے لَنْ تَرَانِیْ (تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے) کہا تھا اور اگر ذات خدا قابل رویت نہ ہوتی تو لَنْ تَرَانِیْ کی بجائے لَسْتُ بِمَرْئِیٍّ کہتا یعنی میں دیکھے جانے کے قابل نہیں ہوں۔

اب ہم اشاعرہ کے استدلال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ہمارا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ مرئی نہیں ہے اس کو دیکھنا محال ہے۔ اور جہاں تک حضرت موسیٰؑ کی درخواست کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے مطالبے پر یہ سوال کیا تھا لیکن اشاعرہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس واقعے سے متعلق تمام آیات کو یکجا کیا جائے اور پھر نتیجہ نکالا جائے۔

(۱) سورۂ طٰہٰ آیت ۸۰ میں ہے یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ○ اے بنی اسرائیل! ہم نے تمھیں تمہارے دشمن سے نجات دلائی اور کوہ طور کی داہنی جانب تم سے وعدہ کیا اور ہم نے تم پر من وسلویٰ نازل کیا۔

پھر آگے ہے وَمَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰى ○ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ○ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ○ اے موسیٰ! تم نے اپنی قوم سے (آگے چلے آنے میں) جلدی کیوں کی؟ انھوں نے کہا وہ میرے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے پروردگار میں نے تیری طرف آنے کی جلدی اس لیے کی کہ تو خوش ہو۔ فرمایا کہ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا ہے (سورۂ طٰہٰ: آیت ۸۳ تا ۸۵)

(۲) سورۂ بقرہ آیت ۵۵ تا ۵۷ میں ہے وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○ جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ! جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آ پکڑا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر موت آ جانے کے بعد ہم نے تم کو دوبارہ زندہ کیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیے رکھا اور تمہارے لیے من وسلویٰ اتارا۔ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں اُن کو کھاؤ۔ اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

(۳) سورۂ بقرہ آیت ۵۱ میں ہے۔ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ○ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تو تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو معبود بنایا اور تم ظالم تھے۔

(۴) سورۂ نساء آیت ۱۵۳ میں ہے یَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُبِينًا ○ (اے رسولؐ) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم ان پر ایک کتاب آسمان سے اتار لاؤ۔ تو یہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بڑی درخواستیں کر چکے ہیں (ان سے) کہتے تھے کہ ہمیں خدا کو آشکارا (یعنی آنکھوں سے) دکھا دو سو ان کے ظلم کی وجہ سے ان کو بجلی نے آ پکڑا۔ پھر انھوں نے کھلی نشانیاں آنے کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا تو اس سے بھی ہم نے درگزر کی اور موسیٰ کو صریح غلبہ دیا۔

(۵) سورۂ اعراف آیت ۱۴۲ میں ہے وَوَاعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ○ ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے مکمل کر دیا تو اس کے پروردگار کی چالیس رات کی میعاد پوری ہوگئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے جانشین ہو۔ ان کی اصلاح کرتے رہنا اور فسادیوں کے راستے پر نہ چلنا۔

سورۂ اعراف آیت ۱۴۵ میں ہے وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ○ ہم نے (تورات کی) تختیوں میں ان کے لیے ہر چیز کی تفصیل لکھ دی پھر (ارشاد فرمایا کہ) اسے مضبوطی سے پکڑے رہو اور اپنی قوم سے بھی کہہ دو کہ ان باتوں کو جو (اس میں درج ہیں اور) بہت بہتر ہیں پکڑے رہیں۔ میں عنقریب تم کو نافرمان لوگوں کا ٹھکانہ دکھاؤں گا۔

سورۂ اعراف آیت ۱۴۸ میں ہے وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ موسیٰ کے بعد اُن کی قوم نے اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا جس کے جسم سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ نہ اُن سے بات کرسکتا ہے اور نہ اُن کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ اُس کو انھوں نے معبود بنا لیا اور اپنے حق میں ظلم کیا۔

سورۂ اعراف آیت ۱۵۰ میں ہے وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ جب موسیٰ اپنی قوم کے پاس نہایت غصے اور افسوس کی حالت میں واپس آئے تو کہنے لگے کہ تم نے میرے بعد کتنا برا عمل کیا۔ کیا تم نے اپنے پروردگار کا حکم (یعنی میرا اپنے پاس آنا) جلد چاہا۔ (یہ کہا) اور (شدت غضب سے تورات کی) تختیاں زمین پر ڈال دیں اور اپنے بھائی کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے ماں جائے! لوگ تو مجھے کمزور سمجھتے تھے اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں تو آپ ایسا کام نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر ہنسیں اور مجھے ظالم لوگوں میں مت شمار کیجئے۔

سورۂ اعراف آیت ۱۵۵ میں ہے وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ○ موسیٰ نے اُس میعاد پر جو ہم نے مقرر کی تھی اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب (کر کے کوہ طور پر جمع) کئے۔ جب اُن کو لرزے نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار! اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھ کو پہلے بھی ہلاک کرسکتا تھا۔ تو کیا اس فعل کی سزا میں جو ہم میں سے بے عقل لوگوں نے کیا ہے تو ہمیں ہلاک کر دے گا۔ یہ تو تیری آزمائش ہے۔ اس سے تو جس کو چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت بخشے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔

اب ہم ان آیات مبارکہ کے حسب ذیل نکات پر توجہ کرتے ہیں

(۱) بنی اسرائیل کی التجا جو دو علیحدہ علیحدہ سورتوں میں مذکور ہے دراصل ایک ہی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر دیکھ نہ لیں اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ہمیں واضح طور پر خدا کا دیدار کرائیں۔

اس درخواست کے بعد بجلی بھی گری تھی اور خدا کی طرف سے بخشش بھی ہوئی تھی۔ اس کے

بعد بچھڑے کی پوجا کا واقعہ پیش آیا تھا۔

۲۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۰ میں ہے کہ مقررہ وعدہ گاہ کے بعد بنی اسرائیل پر "من وسلویٰ" اترا تھا اور اس کے بعد سامری اور بچھڑے کا واقعہ پیش آیا تھا۔

۳۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۵ میں وعدہ گاہ کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ جمع ہونے کی وہ جگہ تھی جو اس کے لیے مقرر ہوئی تھی۔

اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ درخواست وعدہ گاہ میں پیش کی گئی تھی کیونکہ اس میں صاعقہ اور رجفہ کا اضافی قرینہ موجود ہے۔

۴۔ کیا رؤیت کی درخواست حضرت موسیٰؑ کے ذریعے اسی وعدہ گاہ میں دی گئی تھی جو چالیس راتوں پر مشتمل تھی۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۱ میں ہے کہ بچھڑے کی پوجا کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا تھا۔

سورۂ اعراف کی آیات ۱۴۳۔ ۱۴۸ میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے تورات کی تختیاں وصول کی تھیں اور واپسی پر دیکھا تھا کہ ان کی قوم بچھڑے کو پوج رہی تھی اور سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۲۔ ۸۵ میں وعدہ گاہ کو بیان کیا گیا ہے اور بچھڑے کی پوجا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۳ میں دیدار کی درخواست کے بعد بچھڑے کی پوجا کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

المختصر بنی اسرائیل نے درخواست وعدہ گاہ میں پیش کی تھی اور اس کے بعد بچھڑے کی پوجا کا واقعہ پیش آیا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے ذریعے رؤیت کی درخواست بھی اسی وعدہ گاہ میں پیش کی گئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ ان کی قوم گئو سالہ پرستی میں مبتلا ہو چکی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم کا سوال اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور حضرت موسیٰؑ کی درخواست اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ دونوں کا تعلق اسی ایک وعدہ گاہ سے تھا اس لیے ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ بات بعید از فہم ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم نے دو مرتبہ درخواست کی ہو اور وہ بھی اس حالت میں کہ ان پر بجلی بھی گر چکی تھی اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اگر بجلی گرنے اور پہاڑ کے ریزہ ریزہ ہونے کے بعد بھی بنی اسرائیل دیدار کا تقاضا کرتے تو حضرت موسیٰؑ انھیں اس کے سربستہ نقصانات ضرور یاد دلاتے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی فرمائش پر دیدار کی درخواست کی تھی۔

امام علی رضا علیہ السلام نے مامون کے دربار میں یہی موقف اختیار کیا تھا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ میں مامون کے دربار میں موجود تھا اور امام علی رضا علیہ السلام بھی وہاں موجود تھے

ماموں نے کہا فرزند رسولؐ کیا آپ انبیاءؑ کو معصوم[1] نہیں کہتے؟

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ○ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ○ وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا ○ (اے رسولؐ) بے شک ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے تاکہ خدا (اہل مکہ کی طرف سے) آپ پر لگنے والے اگلے پچھلے الزامات ختم کر دے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر رکھے اور زبردست طریقے سے آپ کی مدد کرے۔ (سورۂ فتح آیت ۱ تا ۳)

اکثر علماء اور مترجمین نے لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ کا یہ ترجمہ کیا ہے "تاکہ خدا آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے" اور یوں انہوں نے بزعم خویش یہ استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی گناہ سرزد ہوتے تھے البتہ خدا نے انہیں معافی دیدی تھی۔

ان آیات کا تعلق صلح حدیبیہ کے موقع سے ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط بہت سے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔

بقول واقدی حضرت عمرؓ نے جوش کے عالم میں رسول اکرمؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟

رسول اکرمؐ: کیوں نہیں۔

حضرت عمرؓ: پھر آپ ذلت آمیز شرائط کیوں تسلیم کر رہے ہیں؟

رسول اکرمؐ: میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کروں گا اور وہ بھی مجھے ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

اس کے باوجود حضرت عمرؓ رسول اکرمؐ کے ساتھ جسارت آمیز گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح سے ملاقات کی اور ان سے بھی اس سلسلے میں بات کی مگر ان دونوں نے اُن سے اتفاق نہیں کیا۔

اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اُس دن میرے دل میں رسالت کے بارے میں شک پیدا ہوا تھا اور میں نے رسول اکرمؐ سے ایسے تلخ سوالات کئے تھے جیسے بعد میں کبھی نہیں کئے۔ صلح حدیبیہ کے بعد خدا نے سورۂ فتح نازل فرمائی جس میں رسول اکرمؐ اور مسلمانوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ "صلح" درحقیقت رسول اکرمؐ اور مسلمانوں کی "فتح" ہے۔

مشرکین کی نظر میں رسول اکرمؐ نے ۱۳ برس تک "مکہ میں" توحید کی دعوت دیکر اور ان کے معبودوں کا انکار کر کے جرم اور گناہ کیا تھا۔ "ہجرت" کے بعد جنگ بدر کے مقتولین کا قتل اہل مکہ کی نظر میں رسول اکرمؐ کا ایک اور سنگین گناہ تھا۔

سورۂ فتح کی ابتدائی آیت بتاتی ہے کہ خدا نے اس صلح کے ذریعے اپنے حبیبؐ کے وہ تمام اگلے پچھلے گناہ ڈھانپ دیے ہیں — جو مشرکین مکہ کی نظر میں آپ کے گناہ تھے یعنی تبلیغ اور جہاد — کیونکہ اب وہ لوگ ان باتوں کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیں گے جن کو وہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ سمجھتے تھے۔ اس صلح کی وجہ سے ان باتوں پر پردہ پڑ چکا ہے۔ آیت میں حضرت رسول اکرمؐ کے ذمے کسی حقیقی گناہ کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس تبلیغ و جہاد کا تذکرہ ہے جسے مشرکین مکہ گناہ سمجھتے تھے۔ اور ایسے ہی جیسے حضرت موسیٰؑ نے اپنے متعلق کہے تھے وَلَھُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ یعنی میں ان کی نظر میں مجرم ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں۔

جس طرح سے حضرت موسیٰؑ کا فعل قبطیوں کی نظر میں ان کا گناہ تھا اسی طرح سے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی دعوت اور ان کا جہاد اہل مکہ کی نظر میں گناہ تھا۔ (علامہ سید مرتضیٰ عسکری، اسلامی عقائد قرآن کی روشنی میں) رضوانی۔

امام نے فرمایا: ہاں۔

پھر مامون نے انبیاءؑ سے متعلق بہت سی قرآنی آیات کے متعلق پوچھا اور امام علیہ السلام نے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔

مامون نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي تو کیا حضرت موسیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ خدا قابل رویت نہیں ہے؟ اور اگر معلوم تھا تو انھوں نے ایسا سوال کیوں کیا؟

امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ بن عمران جانتے تھے کہ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن جب خدا نے ان سے کلام کیا اور انھیں اپنا مقرب بنایا تو بنی اسرائیل نے ان سے کہا کہ ہم آپ کی باتوں پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم اپنے کانوں سے خدا کی باتیں نہ سنیں۔ اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد سات لاکھ تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے ان میں سے ستر ہزار افراد کا انتخاب کیا۔ پھر ستر ہزار میں سے سات ہزار اور سات ہزار میں سے سات سو اور سات سو میں سے ستر افراد کا انتخاب کیا اور انھیں کوہ طور پر لے گئے۔ آپ نے ان لوگوں کو پہاڑ کے نشیب میں بٹھایا اور خود پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور وہاں جا کر اللہ سبحانہ سے عرض کیا کہ خدایا مجھ سے کلام فرما اور اپنی گفتگو ان لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا اور بنی اسرائیل نے خدا کے کلام کو اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سامنے اور عقب سے سنا۔ اللہ نے وہ کلام ایک درخت سے ایجاد کیا تھا۔

پھر ان لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ ہم اس کلام کو اس وقت تک خدا کا کلام نہیں مانیں گے جب تک ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے ایسی بیہودہ بات کی اور تکبر کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ظالمانہ رویے کی وجہ سے ان پر بجلی گرائی اور وہ سب کے سب مر گئے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے عرض کی پروردگار! میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور اب یہ مر گئے ہیں۔ جب میں جب قوم کے پاس واپس جاؤں گا تو وہ اپنے رشتے داروں کو نہ پا کر مجھے الزام دیں گے اور کہیں گے کہ تم خدا سے مناجات کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے اس لیے تم نے وہاں جا کر ان لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ خداوندا! مجھے بتا تو سہی کہ میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟

اللہ نے انھیں زندگی دی اور حضرت موسیٰؑ نے انھیں اپنے ساتھ لیا۔ ان لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اگر آپ خدا سے دیدار کی درخواست کریں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی درخواست ضرور قبول کرے گا۔ آپ اسے دیکھ کر ہم سے اس کی کیفیت بیان کریں گے اور اس طرح سے ہم خدا کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا اے میری قوم! خدا کو آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا اور خدا کیفیات سے پاک ہے۔ اس کی پہچان اس کی نشانیوں سے ہوتی ہے اور اس کی توصیف اس کے بیان سے کی جاسکتی ہے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ جب تک آپ خدا سے یہ درخواست نہیں کریں گے اس وقت تک ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔

حضرت موسیٰؑ نے عرض کی پروردگار! جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ تو نے سن لیا ہے اور تو ان کی مصلحت سے بھی آگاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی فرمائی اے موسیٰ! جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں تم مجھ سے اس کی درخواست کرو۔ ان کی جہالت کا میں تم سے کوئی مواخذہ نہیں کروں گا۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے عرض کی کہ پروردگار! مجھے اپنا دیدار کرا تاکہ میں تجھے دیکھوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو۔ اگر وہ تجلی کے وقت اپنی جگہ پر قائم رہا تو تم مجھے عنقریب دیکھ لو گے۔ پھر جب اُن کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی فرمائی یعنی اپنی نشانی کا جلوہ دکھایا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا۔[1] حضرت موسیٰؑ بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑے جب آپ کو ہوش آیا تو بولے:

پروردگار! میں تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں اور تیری طرف لوٹ کر آتا ہوں۔

مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کی جہالت کو چھوڑ کر تیری معرفت کی طرف آرہا ہوں اور میں ان میں سے پہلا مومن ہوں یعنی اس چیز پر ایمان لانے میں سبقت کرتا ہوں کہ تجھے آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

مامون نے کہا: ابوالحسن! آپ نے کیا ہی اچھا جواب دیا ہے۔

۱۔ جمعہ کے دن آخری ساعتوں میں پڑھی جانے والی دعاء "دعائے سمات" میں ہے

واسئلک اللّٰھم بمجدک الذی کلمت بہ عبدک ورسولک موسی بن عمران علیہ السلام فی المقدسین من جانب الطور الایمن من الشجرۃ واسئلک بکلمتک التی غلبت کل شیء وبنور وجھک الذی تجلیت بہ للجبل فجعلہ دکا وخر موسی صعقا وبمجدک الذی ظھر علی طور سیناء فکلمت بہ عبدک ورسولک موسی بن عمران خدایا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری اُس بزرگی کے واسطے سے جس سے تو مقدس مقامات میں اپنے بندے اور رسول حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ہم کلام ہوا۔ تو کوہ طور کی داہنی جانب سے درخت کے ذریعے اُن سے ہم کلام ہوا اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اُس کلمے کے واسطے سے جو ہر چیز پر غالب ہے اور تیری ذات اقدس کے اُس نور کے واسطے سے جس کی تجلی سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑے اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری اُس بزرگی کے واسطے سے جس کا ظہور طور سینا پر ہوا اور جس کے توسط سے تو نے اپنے بندے اور رسول حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے کلام کیا۔ (رضوانی)

یہ حدیث کافی طویل ہے۔ ہم نے بقدر ضرورت اسے نقل کیا ہے۔ مکمل حدیث شیخ صدوق کی کتاب "عیون اخبار الرضا" میں موجود ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کے اس جواب کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے آپ نے واضح بتایا ہے کہ یہ درخواست بنی اسرائیل کی فرمائش پر کی گئی تھی اور تدبیر الٰہی سے اس کا جواب انجام پذیر ہوا تھا۔ بنی اسرائیل انتہائی سنگدل، سرکش اور ضدی تھے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کی باتوں پر کان دھرنے کو تیار نہ تھے اور پہاڑ کو اس لیے گرایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل محسوسات کے خوگر تھے۔

لہٰذا حضرت موسیٰؑ کی طرف ایسی چیز کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۵ میں بتا دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا تھا اور جب آپ نے لوگوں کی حیات نو کی درخواست کی تھی تو آپ نے ادب سے ابتدا کرتے ہوئے فرمایا تھا لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ (پروردگار! اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھ کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا) تاکہ بنی اسرائیل مجھ پر ان ستر افراد کے قتل کی تہمت نہ لگائیں۔ پھر آپ نے کہا تھا اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا کیونکہ جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے وہ بے عقل ہیں۔

اشاعرہ کی اس دلیل کے جواب میں کہ خدا نے رؤیت کو پہاڑ کے ثابت رہنے سے مشروط کیا تھا اور پہاڑ کا ثابت رہنا ممکن تھا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رؤیت ممکن ہے کیونکہ جو چیز ممکن سے مشروط ہو وہ بھی ممکن ہوتی ہے عرض ہے کہ خدا نے رؤیت کو صرف پہاڑ کے ثابت رہنے سے مشروط نہیں کیا تھا بلکہ شرط یہ تھی کہ اگر تجلی کے بعد پہاڑ ثابت رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے ورنہ نہیں دیکھ سکو گے اور تجلی کے بعد پہاڑ کا ثابت رہنا ناممکن تھا۔ خدا نے رؤیت کو ناممکن سے مشروط کیا تھا اور جو چیز ناممکن سے مشروط ہو وہ ناممکن ہوتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے رؤیت کو محال قرار دینے کے لیے حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے۔ سورۂ اعراف، آیت ۴۰) جیسے الفاظ استعمال کیوں نہیں کیے تو عرض ہے کہ ایسے الفاظ خدا نے کفار کے جنت میں داخل ہونے کے لیے فرمائے ہیں اور کہا ہے کہ جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے اس وقت تک کفار و مشرکین بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

کفار کے جنت میں داخل ہونے اور رؤیت الٰہی کے درمیان ایک لطیف فرق ہے، وہ یہ کہ کفار کا جنت میں جانا "محال عقلی نہیں ہے" اس لیے خدا نے فرمایا کہ جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے تب تک کفار جنت میں نہیں جا سکیں گے جبکہ رؤیت الٰہی پہلے سے ہی ناممکن تھی اس لیے اس مضمون کو اونٹ کے سوئی کے ناکے سے گزرنے کی طرح مشروط نہیں فرمایا بلکہ اسے تجلی کے بعد پہاڑ کے

قائم رہنے سے مشروط فرمایا اور یہ "محال عقلی" ہے۔

اشاعرہ کا یہ کہنا بھی بے محل ہے کہ اگر رؤیت الٰہی ناممکن تھی تو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے یہ کیوں نہ کہا کہ تم ایک محال چیز کا مطالبہ کر رہے ہو لہٰذا تم اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جاؤ۔

یہ سچ ہے کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے ایسے جملے نہیں آئے ہیں اور ویسے بھی قرآن کریم کسی داستان کو جزئیات سمیت بیان نہیں کرتا۔ وارثان قرآن ائمہ اہل بیتؑ نے فرمایا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا تھا تو حضرت موسیٰؑ نے انھیں سمجھایا تھا کہ تمہارا یہ مطالبہ سراسر غلط ہے۔ آپ کی نصیحت کے باوجود وہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے۔

اشاعرہ کی دوسری باتیں احتمالات سے زیادہ نہیں ہے اور احتمالات کا دروازہ اتہائی وسیع ہوتا ہے۔ احتمال کا دروازہ تو صریح نصوص کے متعلق بھی کھلا رہتا ہے لہٰذا

(۱) ایسے عقلی احتمال قابل قبول ہیں جو حجت کو بے اثر بنا سکیں جبکہ ذہن میں پیدا ہونے والا ہر احتمال قابل قبول نہیں ہوتا۔

(۲) ہمارے پاس عدم رؤیت کے متعلق نص موجود ہے۔ پہلے تو ہمیں اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔ اس کے بعد ان نصوص کا جائزہ لینا چاہیے جو واضح عقلی دلائل کے ساتھ اس کی معارض ہوں یا اسے مقید اور مخصوص کرتی ہوں۔

اشاعرہ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اگر خدا قابل رؤیت نہ تھا تو خدا حضرت موسیٰؑ سے لَنْ تَرَانِیْ کی بجائے لَسْتُ بِمَرْئِیٍّ فرماتا۔ اور اگر خدا لَسْتُ بِمَرْئِیٍّ فرماتا تو عدم رؤیت کے لیے ان الفاظ کی وضاحت زیادہ قوی ہوتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اشاعرہ کی ضد ہے ورنہ لَسْتُ بِمَرْئِیٍّ اور لَنْ تَرَانِیْ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ لَنْ تَرَانِیْ کے الفاظ امتناع رؤیت پر دلالت کرتے ہیں یا نہیں؟

عربی میں لفظ لَنْ تاکید نفی پر دلالت کرتا ہے اور کلام میں "ہرگز نہیں" کا مفہوم اور معنوی نفی کا استمرار پیدا کرتا ہے۔ البتہ اس کے "محمول" کو دیکھ کر اس کے استمرار کا تعین کیا جاتا ہے مثلاً فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا آج میں کسی آدمی سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔ (سورۂ مریم، آیت ۲۶)

حضرت مریمؑ نے بات نہ کرنے کے استمرار کو ایک دن کے لیے مشروط کیا تھا لہٰذا انھوں نے اس دن کسی سے بات نہیں کی تھی۔

اور کبھی استمرار کو ابدیت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے مثلاً وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا وہ ہرگز موت کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۹۵) اور اَبَدًا کا استمرار دنیا کے لیے ہے جبکہ آخرت کے عذاب

کو دیکھ کر کئی بار موت طلب کریں گے۔ استمرار کا دنیا سے قرینہ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ہے اور لن ناصبہ کا اصول یہ ہے کہ اگر یہ زمانے کے ساتھ مشروط نہ ہو تو ہمیشہ ہمیشہ کی نفی کے معنی دیتا ہے۔

اگر یہاں یہ کہا جائے کہ کبھی انسان کہہ دیتا ہے لَنْ اَفْعَلَ (میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا) پھر کچھ دن بعد وہ اس فعل کو کرنے لگ جاتا ہے تو اس صورت میں اس کی ابدیت اور استمراریت کہاں جائے گی اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مدت متکلم کے ارادے اور حالات پر موقوف تھی۔ جب اس کے حالات بدل گئے اور ارادہ تبدیل ہو گیا تو اس نے وہ کام انجام دے دیا۔ اس سے حرف لن ناصبہ کی استمراریت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست رؤیت کے جواب میں فرمایا لَنْ تَرَانِیْ تو یہاں بھی ابدی نفی پائی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تم مجھے کبھی، کسی بھی مقام پر، کسی بھی زمانے میں ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت کو تجلی کے بعد پہاڑ کے قائم رہنے کے ساتھ مشروط کیا جبکہ تجلی کے بعد پہاڑ کا قائم رہنا ناممکن تھا۔ جب حضرت موسیٰ ہوش میں آئے تو انھوں نے سُبْحَانَکَ کہہ کر سب سے پہلے اللہ کی تنزیہ بیان کی۔

اس آیت میں "تنزیہ" رؤیت کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ واضح رہے کہ [illegible] ایک طرح کا نقص تھا اور خدا ہر نقص سے پاک ہے۔ عدم رؤیت کے تمام [illegible] ہیں لہٰذا اس واقعے کو کسی طور بھی رؤیت الٰہی کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

واضح رہے کہ لَنْ تَرَانِیْ میں لفظ لَنْ کو صرف دنیا سے محدود نہیں [illegible] اس آیت کا سیاق کسی محدودیت یا تخصیص کو قبول نہیں کرتا اور اس کی ایک اور وجہ سُبْحَانَکَ کی تنزیہ بھی ہے اور تنزیہ کو کسی زمانے کے ساتھ محدود نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسی کئی آیات ہیں جن سے عدم رؤیت کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور ان آیات میں سے یہ آیت سب سے زیادہ واضح ہے لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ○ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرتیں جبکہ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے اور وہ بھید جاننے والا اور خبردار ہے۔ (سورۂ انعام، آیت ۱۰۳)

(۱) "ادراک" دسترس حاصل کرنے کا نام ہے یہ صرف آنکھ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ حواس خمسہ میں سے ہر حاسہ کے ادراک کی نوعیت الگ الگ ہے [illegible] ادراک وہ ہے جو آنکھ سے ہوتا ہے اور اس کا تعلق قوت شامہ سے ہے۔ ایک ادراک وہ ہے جو [illegible] کے کسی سے ہوتا ہے اور اس کا تعلق قوت لامسہ سے ہے اور جہاں تک دیکھنے کا تعلق ہے تو وہ آنکھوں سے مخصوص ہے۔ اب اگر کوئی شخص بالفرض یہ کہے کہ میں نے فلاں شخص کو آنکھوں سے [illegible] دیکھا نہیں پایا تو اس کا

کلام متناقض ہوگا۔[1]

(۲) اللہ نے آنکھوں سے نہ دیکھے جانے کو اپنی مدح کے عنوان سے پیش کیا ہے کہ آنکھوں کی اس تک رسائی نہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ خدا قابل رؤیت ہے تو یہ اس کے لیے عیب شمار ہوگا۔[2]

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کا جملہ دنیا و آخرت دونوں سے متعلق ہے اور اَلْأَبْصَارُ بصر کی جمع ہے جس پر الف لام استغراق کا لگایا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آنکھوں والی جتنی بھی مخلوق ہے ان کی آنکھیں خدا کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اس میں کسی طرح کا استثناء نہیں ہے۔

ابوالحسن اشعری نے اس آیت سے جان چھڑانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے متعلق ایک احتمال یہ ہے کہ یہ صرف دنیا سے مربوط ہو اور آخرت میں دیدار الٰہی سے یہ آیت مانع نہ ہو کیونکہ خدا کا دیدار سب سے بڑی لذت ہے اور سب سے بڑی لذت کا تعلق آخرت سے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَلْأَبْصَارُ سے کفار کی آنکھیں مراد ہوں کیونکہ اہل ایمان سے تو دیدار کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اشعری کی یہ بات اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کی تردید میں کچھ لکھا جائے کیونکہ اس نے اپنے غلط عقیدے کو احتمالاً پیش کیا ہے اور "احتمالات" کو بنیاد بنا کر حقائق سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔

سچ یہ ہے کہ اشعری نے حقیقی عقیدے میں شک پیدا کرنے کے لیے مذکورہ احتمال پیش کیے تھے۔ اشعری کی مجبوری یہ تھی کہ وہ جن "احادیث" کو مانتا تھا ان میں ایسی "جھوٹی احادیث" شامل ہیں جن میں خدا کی رؤیت کو ثابت کیا گیا ہے۔

رؤیت کے لیے فخر رازی کے دلائل کا جائزہ

فخر الدین رازی نے — جنھیں امام المتشککین کہنا چاہیے کیونکہ انھوں نے ہر حقیقت کے متعلق شک کیا ہے — لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کی واضح دلالت سے بھی اس آیت کو مشکوک بنانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ انھوں نے اپنی تفسیر کبیر کے صفحہ ۱۲۳ پر لکھا ہے: "ہمارے اصحاب نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جاسکتا ہے اور اہل ایمان قیامت کے دن اس کا دیدار کریں گے۔ ان کے استدلال کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کی آیت مقام مدح پر ہے۔ اگر رؤیت محال ہوتی تو یہ الفاظ مدح نہیں

۱۔ سبحانی، الملل والنحل ج ۲، ص ۲۲۷۔

۲۔ فاضل بغدادی سیوری، النافع یوم الحشر فی شرح باب حادی عشر، ص ۲۳۔

کہلا سکتے تھے کیونکہ جو اشیا معدوم ہیں انھیں تو ویسے بھی دیکھنا ناممکن ہوتا ہے مثلاً انسان خوشبو یا بدبو کو نہیں دیکھ سکتا اور ذائقہ و ارادے کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ان چیزوں کا نہ دیکھا جانا ان کے لیے کسی طور بھی مدح کا موجب نہیں ہے۔ اصول یہ ہے کہ معدوم اشیا کی رؤیت ناممکن ہوتی ہے اور مدح کی شکل یہ ہے کہ کوئی چیز قابل دید تو ہو لیکن آنکھوں پر ایسا پردہ پڑ جائے کہ آنکھیں اس کے دیدار سے عاجز ہوں تو یہ موقع مدح کا ہے کیونکہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کی آیت مدح خداوندی پر مشتمل ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ قابل رؤیت ہے۔

اس اشکال کے جواب میں گزارش ہے کہ

۱۔ رازی نے اپنے قیاس میں خدا کو مخلوق سے تشبیہ دی ہے جبکہ اللہ کا فرمان ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

۲۔ اگر لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کی آیت مقام مدح میں ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا قابل رؤیت ہے تو پھر اللہ نے اپنی مدح میں یہ بھی تو فرمایا ہے۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۱۱۱)

اس آیت میں بھی تو اللہ کی مدح ہے کہ اس کے ہاں کوئی بیٹا اور شریک نہیں ہے اور اس کا کوئی یاور و مددگار نہیں ہے۔ اب بتایئے کیا اللہ کا کوئی بیٹا اور شریک ہے یا اس کا کوئی یاور و مددگار ہے؟؟!

جس طرح سے یہاں "تلازم" امکان پذیر نہیں ہے اسی طرح سے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ میں بھی تلازم کا کوئی امکان نہیں ہے۔

"مدح معدوم" کے متعلق ہمارا جواب یہ ہے کہ مدح صرف لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کا ضمیمہ بھی موجود ہے۔ یہاں مدح "تقابل" کے انداز میں کی گئی ہے۔

(۲) فخر رازی نے دوسرا اشکال اس طرح سے پیش کیا ہے "ابصار" جمع کا صیغہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ تمام اعضاء پر یہ لفظ مشتمل نہ ہو اور تمام آنکھیں اس کے ضمن میں نہ آتی ہوں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہو کہ کچھ آنکھیں اسے درک نہ کر سکیں اور کچھ آنکھیں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آیت میں مجموعی انداز میں نفی کی گئی ہے۔ مجموع کے ہر جز کی نفی نہیں کی گئی۔ اس کا مفہوم [illegible] نفی رؤیت کا متقاضی نہیں [illegible] نفی کا تعلق مجموع [illegible] نہیں ہے۔

[illegible] اشکال کے متعلق ہمارا جواب یہ ہے

[illegible]

نفی متوجہ نسبت ہے (عموم اور اس کا متعلق) اس کا مفہوم عموم سلب ہے۔

مقصد آیت یہ ہے کہ تمام آنکھوں میں موجود تمام نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ اگر نفی متوجہ عموم ہوتی تو اس سے صرف عموم کا سلب لازم آتا لیکن یہاں یہ صورتحال نہیں ہے۔ اس کی نظیر یہ آیتیں ہیں جن کا مفہوم سلب عمومی ہے یعنی اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اللہ کسی بھی زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور۔ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ○ اللہ کسی بھی کافر سے محبت نہیں رکھتا اور ... لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ اللہ کسی بھی ظالم سے محبت نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ اور وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ کے جملوں میں تقابل موجود ہے جو کہ قطعی طور پر سلب عمومی پر دلالت کرتا ہے۔ پہلے جملے میں عمومی نفی ہے جبکہ دوسرے جملے میں عمومی اثبات ہے۔

(۳) فخر رازی نے ضرار کوفی کی زبانی ایک اور توجیہ نقل کی ہے کہ وہ کہتا تھا: اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حواس خمسہ کے ساتھ ایک چھٹی حس پیدا کرے گا۔ اس چھٹی حس سے خدا کا دیدار ہوگا کیونکہ آنکھوں کے ساتھ خدا کو دیکھنا ناممکن ہے جبکہ آنکھوں کے علاوہ ایک اور حاسہ سے اللہ عزوجل کو درک کرنا جائز ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ موقف گول میز کانفرنس سے فرار پر مبنی ہے۔ ہمارا سارا اختلاف آنکھوں سے دیدار کے متعلق ہے جس کے بارے میں علمائے اہلسنت نے یہ لکھا ہے کہ جس طرح انسان چودھویں کے چاند کو دیکھتا ہے اسی طرح اہل ایمان قیامت کے دن آنکھوں سے خدا کا دیدار کریں گے۔

(۴) فخر رازی لکھتے ہیں کہ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ کی آیت میں درک کی نفی کی گئی ہے اور یہ لفظ رؤیت کا مترادف نہیں ہے۔ بعض اوقات اس کے معنی پکڑے جانا اور لپیٹ میں لینا بھی ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ ○ اصحاب موسیٰ نے کہا اب تو ہم پکڑے گئے ہیں۔ (سورۂ شعراء۔ آیت ۶۱) اور فرعون کے متعلق آیا ہے۔ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ جب حالت غرق نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ (سورۂ یونس۔ آیت ۹۰)

ان آیات میں لفظ درک صرف شناخت اور رؤیت کے معنی میں نہیں ہے۔

اسی طرح لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ میں بھی درک کی نفی کی گئی ہے لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس سے رؤیت کی نفی ہی مراد لیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے لیے احاطہ نقص ہے اور ہم احاطہ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو بس رؤیت کی بات کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم یہ بات قبول کرتے ہیں کہ درک کا لفظ دسترس حاصل

کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی صرف احاطہ نہیں ہے اور ان کے درمیان کوئی تراوف اور تلازم نہیں ہے۔ لفظ درک میں ایک عمومی مفہوم پایا جاتا ہے جس میں جان لینا اور دسترس حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ معنی کا تعین اس کے متعلق سے مشخص کیا جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ "میں نے نگاہ سے فلاں شخص کو درک کیا" تو اس کا صرف یہی مفہوم ہوگا وہ شخص قابل رؤیت ہے اور میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ میں نے فلاں کی آواز کو اپنے کان سے درک کیا تو اس کا بھی یہی مفہوم ہوگا کہ میں نے اس کی آواز پر دسترس حاصل کی ہے جیسا کہ اصحاب موسیٰ نے کہا تھا، اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ یعنی دشمن ہم تک پہنچنے کو ہے۔ رازی کے پاس اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ کسی تک پہنچنا احاطہ کا متقاضی ہے کوئی علمی دلیل نہیں ہے جبکہ رؤیت بذات خود ایک احاطہ ہے خواہ وہ جز پر واقع ہو یا کل پر واقع ہو اور جس چیز کا جز دیکھنے میں آئے گا اس کا کل بھی قابل مشاہدہ قرار پائے گا۔

المختصر لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کی آیت اس امر کی محکم دلیل ہے کہ آنکھیں ذات حق کو دیکھنے سے قاصر ہیں اور یہ چیز حکم عقل کے بھی عین مطابق ہے اور برادران اہل سنت کے اشکالات کی کوئی علمی اہمیت نہیں ہے۔ یہ اشکال صرف شک کو جنم دینے کے لیے کھڑے کئے گئے ہیں اور ان میں سے اکثر اشکالات مضحکہ خیز ہیں۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے قاری کو اس اصل سبب سے آگاہ کریں جس کی وجہ سے لوگوں نے الٰہیات کے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔

محترم قاری سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس امر پر غور کریں کہ اہل سنت کے تمام گروہ آخر ایسی باتوں کو خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہیں اور پھر یہ بھی سوچیں کہ آخر شیعہ خدا کو ہمیشہ ہر نقص سے پاک رکھنے پر اصرار کیوں کرتے ہیں؟

یقیناً اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن ہم یہاں ایک جامع جواب دیتے ہیں جو اجمالی طور پر تمام جوابات پر مشتمل ہے وہ یہ کہ اہل سنت نے اپنا دین اہلبیتؑ سے نہیں لیا۔ انھوں نے صحابہ کی روایات پر ہی دین کی عمارت کھڑی کی لیکن خدا کی پہچان تو صرف اس کے اپنے بتائے ہوئے طریقے سے ہی ممکن ہے۔ خدا کی معرفت کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور ابو ہریرہ دوسی کی روایات سے ممکن نہیں ہے اور اگر اہل سنت میں سے کچھ قابل وثوق لوگوں نے ائمہ اہلبیتؑ سے معارف الٰہی نقل بھی کیے تو ان کے علماء نے ائمہ ہدیٰ کی بیان کردہ روایات کو اپنی کتابوں میں لکھنا پسند نہیں کیا۔ اگر علمائے اہل سنت نے ائمہ اہلبیتؑ کی روایات کو اہمیت دی ہوتی تو وہ اس تنگنائی میں کبھی نہ پھنستے۔

امام حسین علیہ السلام نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:

ہم اللہ کا کامیاب گروہ ہیں۔ ہم رسول اللہؐ کے اہل بیت اور قرابت دار ہیں۔ ہم ثقلین کا جزو ثانی ہیں۔ رسول اللہؐ نے ہمیں ہمدوش قرآن قرار دیا ہے اور ہم اس کتاب کے شارح ہیں جس میں ہر خشک و تر کا ذکر موجود ہے۔ باطل جس کے نہ تو سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی پیچھے سے آسکتا ہے۔ رسول اللہؐ نے قرآن کی تفسیر کا فرض ہمیں سونپا تھا اور ہم اس کی تاویل کے بیان سے قاصر نہیں ہیں بلکہ ہم اس کے حقائق کی پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ ہماری اطاعت کرو۔ ہماری اطاعت واجب ہے کیونکہ وہ خدا و رسولؐ کی اطاعت سے متصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: .. أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ . (سورۂ نساء آیت ۵۹) اور .. وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ○ (سورۂ نساء آیت ۸۳)۔[1]

اب ہم یہاں اہلبیت طاہرینؑ سے منقول چند ایسی روایات پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قابل رویت نہیں ہے۔

طبری نے امیرالمومنین علی علیہ السلام کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

"اس کی دلیل اس کی نشانیوں میں موجود ہے اور اس کا وجود اس کا اثبات ہے۔[2] اس کی معرفت اس کو یکتا ماننا ہے اور اس کی توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مخلوق سے جدا مانا جائے۔ صفات میں جدائی کا عقیدہ رکھا جائے نہ کہ واقعیت خارج میں۔ وہ پیدا کرنے والا رب ہے۔ اس کی کسی نے پرورش نہیں کی کسی نے اسے پیدا نہیں کیا۔ جو تصور میں آجائے وہ اس کے سوا کچھ اور چیز ہے۔"[3]

جناب امیرؑ کا یہ فرمان کہ "اس کی توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مخلوق سے جدا سمجھا جائے" مطلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہر لحاظ سے مخلوق سے جدا ہے۔ اس کے اور مخلوق کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ نیز خدا کی "صفات میں جدائی کا عقیدہ رکھا جائے نہ کہ واقعیت خارج میں" کیونکہ صفات میں دوئی کا مقصد یہ ہے کہ ہر صفت جو خدا میں پائی جاتی ہے وہ اسی معنی میں مخلوق میں پائی جائے۔ خداوند علی اعلیٰ اس سے پاک ہے۔ نیز ہر وصف یا تقدیس کا مخلوق پر اطلاق کرنا کہ جس سے خدا کی تقدیس بیان کی جاتی ہے صحیح نہیں ہے۔[4]

۱۔ احتجاج طبری ج ۲، ص ۹۴۔۹۵۔

۲۔ ممکن ہے کہ ان الفاظ سے حضرت کی مراد یہ ہو کہ ہر انسان فطری طور پر اس کے وجود کو محسوس کرتا ہے اور یہی چیز اس کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ شاید لفظی اہمیت مراد ہو۔

۳۔ احتجاج طبری ج ۱، ص ۴۷۵۔۴۷۶۔

۴۔ آیت اللہ شیخ محمد باقر ملکی، توحید الامامیہ ص ۲۰۳۔

کتاب کے آخر میں ہم توحید کے متعلق حضرت امام علی رضا علیہ السلام کا وہ خطبہ نقل کرتے ہیں جو آپ نے دربار مامون میں دیا تھا:

امام علی رضا علیہ السلام کا خطبہ

خدا کی پہلی عبادت اس کی معرفت ہے اور معرفت کی بنیاد اس کو یکتا ماننا ہے اور نظام توحید اس سے صفات کی نفی میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہ عقول یہ گواہی دیتی ہیں کہ ہر صفت اور موصوف "مخلوق" ہے اور ہر مخلوق گواہی دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی "خالق" ہے جو نہ صفت ہے، نہ موصوف ہے اور ہر "صفت اور موصوف" گواہی دیتے ہیں کہ وہ "دو چیزیں" ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں اور یہ اتصال "حادث" ہونے کی گواہی ہے اور حادث ہونا "ازلی نہ ہونے کی گواہی ہے" کیونکہ حدوث اور ازل ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

جس نے خدا کو تشبیہ سے پہچانا اس نے دراصل خدا کو پہچانا ہی نہیں اور جو خدا کی ذات کی کنہ کے درپے ہوا اس نے خدا کو یکتا مانا ہی نہیں اور جو خدا کے لیے مثال کا قائل ہوا اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوئی اور جو خدا کے لیے انیت کا قائل ہوا وہ اس پر ایمان نہیں لایا اور خدا کی طرف نہیں جا رہا جو خدا کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جو اس کی تشبیہ دیتا ہے اس نے خدا کا قصد ہی نہیں کیا اور جو خدا کے لیے اجزاء کو مانتا ہے وہ اس کے سامنے جھکا ہی نہیں اور جو اپنے خیال میں خدا کو لائے اس نے خدا کو چاہا ہی نہیں۔ ہر چیز جس کی ذات پہچانی جا سکتی ہو وہ مخلوق ہے اور جو دوسرے کے سہارے پر قائم ہو وہ معلول ہے۔ مخلوق کے ذریعے اس کے وجود کا استدلال کیا جاتا ہے اور عقول کے ذریعے اس کی معرفت تک پہنچا جاتا ہے اور اس کی جہت فطرت سے ثابت ہوتی ہے۔ مخلوق کی وجہ خدا سے پیدائش اس کے اور مخلوق کے درمیان حجاب ہے۔ چیزوں کی متنوع تخلیق بتاتی ہے کہ خدا ان کی موجودیت سے جدا ہے۔ خدا نے [illegible] کی ابتدا [illegible] کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے لیے کوئی [illegible] نہیں ہے کیونکہ جس کی بھی [illegible]

[illegible]

جو خدا کے لیے وصف تلاش کرتا ہے وہ اُس کو پہچانتا نہیں اور جو خدا کے لیے شبیہ تلاش کرتا ہے وہ اُس سے ناتعلق ہو جاتا ہے اور جو خدا کی کنہ ذات کو تلاش کرتا ہے وہ غلطی کھا جاتا ہے اور جو کہتا ہے کہ خدا "کیسا ہے" وہ اُس کے لیے تشبیہ قرار دیتا ہے اور جو کہتا ہے کہ "کس لیے" تو وہ خدا کو معلول جانتا ہے اور جو کہتا ہے کہ "کس میں" وہ خدا کو دوسری چیز میں سمایا ہوا سمجھتا ہے اور جو کہتا ہے "کس طرف" وہ خدا کے لیے انتہا کا قائل ہے اور جو کہے "کب تک" وہ خدا کے لیے غایت متعین کرتا ہے اور جو خدا کے لیے "غایت" متعین کرتا ہے وہ اسے باقی موجودات سے تشبیہ دیتا ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کے لیے اجزاء کا قائل ہے اور جو خدا کے لیے اجزاء کا قائل ہے اس نے خدا کی توصیف کی ہے اور جو خدا کی توصیف کرے یعنی define کرے وہ ملحد ہے۔

مخلوق کا تغیر خدا کو متغیر نہیں کر سکتا اور محدود کی محدودیت خدا کو محدود نہیں کر سکتی۔ وہ "واحد" ہے مگر بلحاظ عدد نہیں، وہ ظاہر ہے مگر بلحاظ صورت نہیں۔ وہ آشکار ہے مگر بلحاظ رؤیت نہیں۔ وہ مخفی ہے مگر بلحاظ ترک مکان نہیں۔ وہ جدا ہے مگر بلحاظ مسافت نہیں۔ وہ نزدیک ہے مگر فاصلہ کم کرنے کے لحاظ سے نہیں۔ وہ لطیف ہے مگر بلحاظ جسم نہیں۔ وہ موجود ہے مگر عدم کے بعد نہیں۔ وہ افعال سرانجام دیتا ہے مگر مجبور ہو کر نہیں۔ وہ اندازہ لگاتا ہے مگر سوچ کر نہیں۔ وہ تدبیر کرتا ہے مگر متحرک ہو کر نہیں۔ وہ ارادہ کرتا ہے مگر برانگیختہ ہو کر نہیں، وہ چاہتا ہے مگر بغیر تحرک کے، درک کرتا ہے مگر بغیر حواس کے، سنتا ہے مگر بغیر کان کے اور دیکھتا ہے مگر بغیر حاسہ چشم کے۔

خدا کے لیے زمان و مکان نہیں ہوتے۔ خلقتیں اس پر طاری نہیں ہوتیں۔ صفات اس کو محدود نہیں کر سکتیں اور وسائل اس کو مقید نہیں کر سکتے۔ اس کی ہستی زمانوں سے پہلے تھی۔ اس کا وجود عدم سے پہلے تھا۔ اس کی ازلیت، ابتدا سے پہلے تھی۔ اس نے حواس کو احساس کی صلاحیت دے کر بتا دیا کہ وہ خود وسائل احساس نہیں رکھتا۔ جواہر کو ظاہر کر کے ثابت کیا کہ وہ جوہر نہیں اور متضاد اشیا بنا کر بتایا کہ اس کی ضد نہیں اور موجودات کو ترکیب دے کر بتایا کہ اس میں اجزاء نہیں۔ نور کو ظلمت کا، ظہور کو خفا کا، خشک کو تر کا، سردی کو گرمی کا متضاد قرار دیا اور مخالف اشیا کے درمیان یگانگت رکھی اور نزدیک اشیا میں فاصلہ رکھا اور فاصلہ، فاصلہ رکھنے والے کی ذات پر اور یکجائی، یکجا کرنے والے کی ذات پر دلالت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم سوچ سمجھ۔ (سورۂ ذاریات، آیت ۴۹) اس طرح خدا نے "قبل" اور "بعد" میں جدائی ڈالی تاکہ معلوم ہو سکے کہ خدا کے لیے قبل و بعد نہیں ہے۔

اشیا کی مختلف طبائع اس امر کی دلیل ہیں کہ ان طبائع کا خالق خود طبیعت سے پاک ہے۔ اشیا کا اختلاف ثابت کرتا ہے کہ اس اختلاف کو پیدا کرنے والے میں اختلاف اور تغیر نہیں پایا جاتا۔

وقت کا پیدا ہونا دلیل ہے کہ وقت کا خالق وقت کی قید سے آزاد ہے۔ اس نے بعض اشیا کو بعض سے خفی رکھا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے اور اس کی مخلوقات کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ جب کوئی پرورش پانے والا نہ تھا تب بھی وہ پروردگار تھا اور جب کوئی مخلوق نہ تھی تب بھی وہ خالق تھا اور جب کوئی سنائی دینے والی آواز نہ تھی تب بھی وہ حقیقت سماعت کا مالک تھا۔ مخلوقات کی تخلیق کی وجہ سے وہ خالق نہیں ہے اور لفظ مُـنْـذُ (حرف ماضی) نے اسے خفی نہیں کیا اور لفظ قَـدْ (نزدیک) نے اسے نزدیک نہیں کیا اور لفظ لَـعَـلَّ (شاید) نے کوئی چیز اس سے خفی نہیں کی اور لفظ مَتٰـی (کب) نے اس کے لیے وقت مقرر نہیں کیا اور لفظ حِـیْـنَ (جب) اس کے شامل حال نہیں ہوا اور لفظ مَـعَ (ساتھ) نے اسے کسی چیز کا قرین نہیں بنایا۔

وسائل نے اپنے آپ کو محدود کیا ہوا ہے۔ اسباب اپنے نظائر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور ان کی فعالیت اشیاء میں ہے۔ حرف مُـنْـذُ اشیاء کی قدامت سے مانع ہے اور حرف قَـدْ نے انھیں ازلیت سے روک دیا ہے اور حرف لَـوْ لَا (اگر نہ ہوتا) نے انھیں کامل ہونے سے ہٹا دیا ہے۔

اشیاء ایک دوسرے سے جدا ہیں، ان کی جدائی، جدا کرنے والے پر دلالت کر رہی ہے اور اشیاء ایک دوسرے سے متفاوت ہیں اور ان کا تفاوت ان کے علیحدہ کرنے والے پر دلالت کر رہا ہے۔ اشیاء کا خالق عقول کے لیے ظاہر ہوا ہے لیکن اس کے باوجود وہ رؤیت سے خفی ہے۔ اوہام کی بازگشت اسی کی طرف ہے اور ہر چیز سے اس کا مختلف ہونا ان میں قائم ہے، ان سے دلیل حاصل ہوتی ہے اور ان کے ذریعے اقرار کی پہچان ہوتی ہے۔

خدا پر ایمان کا عقیدہ وسیلہ عقول سے ہے اور ایمان کی تکمیل اقرار سے ہوتی ہے۔ اگر دین داری ہے تو اس کی معرفت کے بعد ہے۔ معرفت والی قابل قبول ہے جس کے ساتھ اخلاص ہو اور اخلاص تکلیف کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اگر ہم صفات کا اثبات کریں تو لازم آئے گا کہ وہ ذات جس کی لئے کوئی حد نہیں ہو سکتی ہے وہ مخلوق میں نہیں ہے اور مخلوق کے لیے ہو جو محدود ہو وہ خالق کے لیے امکان پذیر نہیں ہوگی۔

خدا کے لیے نہ تو "حرکت" کا لفظ صادق آتا ہے اور نہ سکون کا، نہ کسی چیز کو اس پر عارض (کسی طرح) سے منطبق کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس نے [illegible] صادق آسکتی ہے جبکہ اسی نے اس چیز کو ایجاد کیا ہے اور اگر ایسا ہو تو اس کی ذات میں [illegible] ہوگا اور اس کی حقیقت تجزیہ پذیر قرار پائے گی اور وہ ازلی نہیں رہے گا [illegible]

اگر خدا کی انتہا کے لیے کوئی حد مقرر کی جائے تو اُس کی ادلیت کے لیے بھی حد مقرر کرنا پڑے گی اور اگر اس کے کامل ہونے کی توقع کی جائے تو اس میں نقص کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور وہ ازلیت کے شایان شان کیسے ہوسکتا ہے جو حادث سے ممتنع نہ ہو اور جس کے متعلق ایجاد ہونے کا امکان پایا جائے۔ وہ اشیاء کو کیسے ایجاد کرسکتا ہے اور اس صورت میں تو اس میں مصنوع کی علامت پائی جائے گی اور وہ خود دلیل میں تبدیل ہو جائے گا جبکہ دلائل تو اسی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گفتار محال (خدا کے لیے مخلوقات کی صفات کا اثبات) ہرگز حجت کا ذریعہ نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کے متعلق سوال کوئی جواب رکھتا ہے اور صفات کے اثبات میں خدا کی تعظیم کا کوئی پہلو مضمر نہیں ہے اور صفات خلق سے اس کی جدائی کوئی ظلم نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ازلی کے لیے "وہ ہونا" ممکن نہیں ہے اور جس کی ابتدا نہ ہو اس کے لیے مبدا و منتہا کا امکان نہیں ہوتا۔

خدائے عز و جل کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ جن لوگوں نے کسی چیز کو خدا کی نظیر قرار دیا ہے وہ جھوٹے اور گمراہ ہیں اور نقصان اٹھانے والے ہیں۔[1]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ

۱۔ توحید صدوق ص ۳۳۔

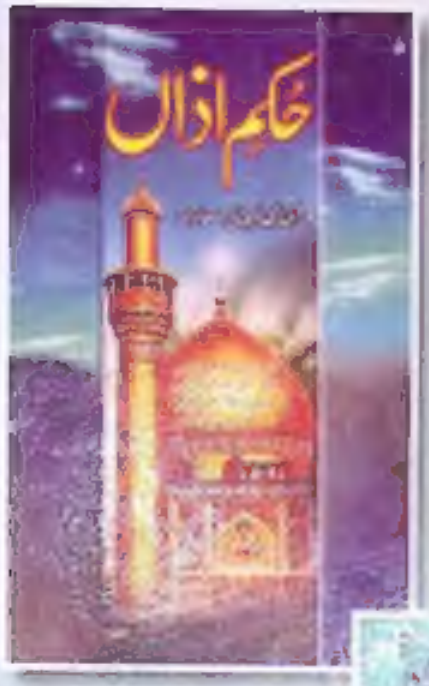
حکم اذاں

تجلی

شیعہ اور جابر حکمران

فریب